ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

# سب رس

## سالگرہ نمبر ۱۹۵۶ء

جنوری و فروری

نگراں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

ایک روپیہ

[illegible]

# فہرست



چیف منسٹر ڈاکٹر بی۔رام کرشن راو ادارے میں تقریر فرما رہے ہیں



نواب لطف جنگ بہادر صدر ادارہ عمارت ادارہ ادبیات اردو کا سنگ بنیاد
رکھنے کی استدعائی تقریر کر رہے ہیں۔ ان کی بائیں طرف۔ ڈاکٹر پی۔رام کرشنا راؤ
ڈاکٹر زور — ایل۔این گپتا — جانکی پرساد — قاضی عبدالرشید وغیرہ بیٹھے ہیں

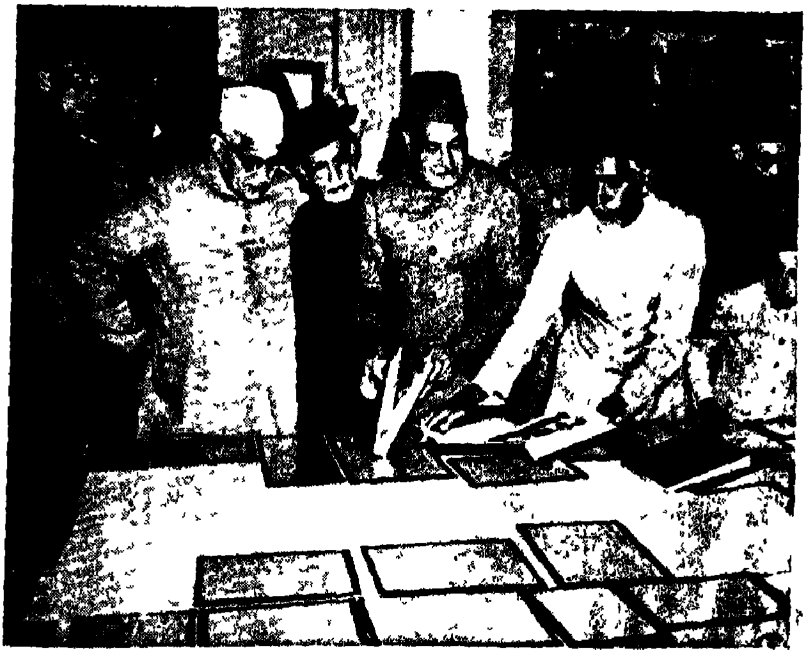


ڈاکٹر سید محمود ادارے میں تقریر فرما رہے ہیں



ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ادارے میں





ڈاکٹر سید محمود ادارے کے مختلف شعبوں کا
معائنہ فرما رہے ہیں



ایل۔این گپتا — حبیب الرحمن — ڈاکٹر راج بہادر گوڑ — سید علی اکبر
اور ڈاکٹر زور ادارے کی ایک محفل میں



پروفسر بھگوت دیال ورما اور مسز اوشا ادارے میں

ادارے کے دو ساتھی جو بچھڑ گئے



سید علی منظور مرحوم



ابوالمکارم فیض محمد صدیقی مرحوم

# قاضی عبدالغفار

از :- جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اضی عبدالغفار اردو کے ایک روشن خیال اور صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی زندگی کی طرح ان
ں ایک خاص شائستگی اور آزادی و بے باکی سے معمور ہوتی تھیں۔ صحیح معنوں میں وہ اردو کے
ادب کے ابتدائی معمار تھے۔ وہ ان چند صاحب نظر ادیبوں میں سے تھے جنھوں نے
مصنفوں اور انشاء پردازوں کی قدیم ڈگر سے ہٹ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ ایک ایسا راستہ
چل کر ترقی پسندوں کی شاہراہ بن گیا اور اس زبان کی تاریخ میں ایک مستقل باب کے اضافے
بنا۔

وہ جس وقت حیدرآباد میں سکونت پذیر ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کو قائم ہوکر پانچ سال گذر
اور یہ ادارہ علم و فضل اور سیاست و ثروت کے صاحبانِ اقتدار کی نظروں میں اپنی روز افزوں
ہ اور عوامی خدمات کے باعث کھٹکنے لگا تھا اور دونوں قسم کے اصحاب اس کے کاموں میں طرح
ر کاوٹیں ڈالنے میں منہمک تھے۔ قاضی صاحب نے بغیر کسی تعارف یا تعلق کے اس کو بھانپ لیا اور
ار پیام میں ادارے کے ہر کام۔ اور ہر تحریک کی تائید میں ہمت افزا اداریے لکھنے شروع کیے۔
بعد قاضی صاحب کو ادارے کے شعبہ زبان کی رکنیت قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے
ہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے ہر اجلاس میں پابندی سے شرکت فرماتے رہے۔ انہی کی تحریک پر انھی
دکن کی کہاوتیں اور ضرب الامثال جمع کرنے کا کام شروع کیا اور نواب مرزا سیف علی خاں صاحب
ازی کتب خانہ ادارہ اس کے کنوینر مقرر ہوئے اور سینکڑوں دکنی کہاوتیں اور ضرب الامثال
۔ اس کام میں جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی اور اضلاع کے شاخوں کے متعدد ارباب کار نے
شعبہ کی مدد کی۔

[illegible] میں جب ادارے نے ایک کل ہند اردو کانگریس کے انعقاد کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر
شروع کیے تو قاضی صاحب نے ادارے کے ساتھ نہ صرف بھرپور تعاون کیا بلکہ ارباب
دوش مولوی عبدالحق اور ان کے بعض ساتھیوں کا جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس

اچھے کپڑے پہنائے۔ ایک ایک کر کے سب کی زلفیں سلجھائیں۔ اور پھر انھیں میٹھے چاول کھلائے اور سات سات پیسے سب کے دوپٹوں کے پلوؤں کے ساتھ باندھ دیئے۔ ہم سارا دن حویلی میں کھیلتے رہے۔ کبھی لڑکوں اور کبھی لڑکیوں والے کھیل۔ کبھی میں ان کے کندھوں پر سوار ہو جاتا تو کبھی وہ میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتیں۔ آنکھ مچولی کے وقت تائی جھتی مجھے چھپاتی رہتی۔ اڈی ترپا[1] کھیلتے وقت تائی جھتی میری پھرتی دیکھ کر جی ہی جی میں مسکراتی۔ کبھی مجھے وہ لڑکیوں کے پیچھے دوڑا دیتی اور کبھی کبھی لڑکیاں آکر مجھے اپنی بازوؤں میں لپیٹ لیتیں۔ اور کبھی ہم گھر بسانے کا کھیل کھیلتے۔ میں مرد بنتا۔ گھر کا مالک زمیندار۔ ایک لڑکی میری بیوی بنتی۔ مجھ سے گھونگھٹ نکالتی اور میرے سامنے سر جھکائے رہتی۔ باقی لڑکیاں نوکرانیاں، دوکاندار اور نہ جانے کیا کیا بنتیں۔ میں اپنے چھوٹے موٹے کھیتوں کو جاتا۔ نوکروں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر خواہ مخواہ برس پڑتا۔ یونہی بناوٹی طور پر تھک کر چور ہو کر گھر واپس آتا۔ پتوں کی تھالی میں ٹھیکرے رکھ کر روٹی کھاتا۔ پھر جھوٹ موٹ یوں ہی رات ہو جاتی اور پھر میری مصنوعی بیوی اور میں بیچ بیچ سو جاتے۔ تائی جھتی آکر ہمیں چادر اوڑھا دیتی۔

"تیری ماں تو نری گدھی ہے۔ اسے کوئی بات بھی آتی ہے؟ اپنی طرف دیکھ اور اپنے بہن بھائیوں کی طرف۔ اگر میں نہ ہوتی تو بھی خراب ہو جاتا۔ ایک دن شام کو میں کیا دیکھتی ہوں کہ تو گوبر میں تھڑا ہوا اپنے دروازے پر کھیل رہا ہے۔ مکھیاں کہہ رہی تھیں کہ ہم آج کے دن ہی ہیں۔ بُرا حال تھا۔ تیری ماں کو تیرا کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ میں نے گرم پانی سے تجھے نہلایا دھلایا۔ تجھے لپیٹ لپاٹ کر تری پھر تری ماں کی گود میں جا لٹایا۔"

اس نے اس قسم کی میرے بچپن کی ہزاروں باتیں مجھے بتائیں۔

اگر میرا جسم گرم ہوتا تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے۔ اگر مجھے چھینک آتی تو وہ منتیں مانگتی۔ میرے سر میں درد ہوتا تو خانقاہ پر دیا جلاتی۔ ایک دفعہ جب مجھے موتی کا بخار چڑھا تو تو اس نے اماوس کی کالی اندھیری رات میں گاؤں سے دور جا کر چوراستے پر ٹونا کیا۔ جاڑے کے دن میں مٹی کے کورے گھڑے کے برف ایسے سرد پانی سے چوراستے میں جا کر نہائی اور خود کو نمونیہ کر لیا۔ میں تو جو تھے روز شفایاب ہو گیا لیکن وہ مرتے مرتے بچی اور جب مجھے چیچک نکل آئی ڈاکٹروں اور حکیموں نے جواب دے دیا۔ گھر والے جب مجھے رو پیٹ چکے جب میری نبضیں چھوٹ گئیں۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ رشتہ داروں میں کہرام بپا ہو گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ شام کے دھندلکے میں دروازے میں کنڈی چڑھا کر بیٹھ گئی۔ دیوی کی مورتی کے سامنے گھی کا دیا جلایا۔ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو اپنی جھولی میں ڈال کر اس نے پرماتما کے ساتھ سودا کر لیا۔ اسی دن چیچک یعنی دیوی ماتا مجھے چھوڑ کر اس کے چھوٹے بیٹے سے لپٹ گئی اور تین دنوں کے اندر اندر اسے جلا کر راکھ کر دیا۔

آہستہ آہستہ میں بڑا ہو رہا تھا۔ اسکول کی جماعتوں کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ سائیکل چلانی سیکھا تو ہر وقت اس سے الجھا رہتا۔ شام کو ہاکی کھیلنے کے نئے کھیتوں پر دور گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ نئے نئے دوست بنتے۔ کتابوں اور استادوں کے ساتھ میرا پیار بڑھتا جا رہا تھا۔ میں عمر میں جس قدر بڑھتا جاتا اسی قدر تائی جھتی کے حلقۂ اثر سے اور اس کی رسائی سے دور نکلتا جاتا۔ مجھے وہ چھپ چھپ کے دیکھتی۔ ٹیلوں پر چڑھ کر جھانکتی۔ گلی میں یا کسی گھر میں اگر میں اسے نظر آ جاتا تو وہ مجھے چھوٹے چھوٹے کام بتاتی۔ مجھ سے کچھ جھجکتی اور کچھ شرمائی شرمائی سی رہتی۔ ایک دن میں سائیکل پر سوار اس کی ڈیوڑھی کے قریب سے گزر رہا تھا کہ میں اچانک سے زمین پر گر پڑا۔ اس نے گولی کی طرح اٹھ کے مجھے سائیکل کے نیچے

---

[1] پنجاب کے دیہاتی بچوں کا ایک کھیل۔

کالا اور اپنی آغوش میں لے لیا ۔" خدا غارت کرے ان بیری نظروں کو۔" جب میں اٹھا تو میں نے اسے اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

جب اسکول جاتے ہوئے میں اس کے گھر کے قریب سے گزرتا تو وہ کچھ نہ کچھ پیسے میری ہتھیلی پر آکر رکھ دیتی ۔ پیسے میری ہتھیلی پر رکھ کر مجھ سے کوئی کام کرنے کو کہہ دیتی۔ میرے لئے یہ لے آنا وہ لے آنا اور جب میں اس کے کام کر دیتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو ـــ 'کاٹھ کے الّو ۔ مٹی کے مادھو ــ کبھی تو یہ چیزیں لانا بھول بھی جایا کر ۔ اچھا اگر اب تو لے آیا ہے تو یہاں رکھ دے تـــ اور وہ میری لائی ہوئی چیز کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھاتی ـــ وہ مجھے دیکھتی رہتی ـــ دیکھتی رہتی ـــ میں گلی کا موڑ مڑ جاتا۔

میں اور بڑا ہو رہا تھا ـــ

گاؤں کے اسکول کے تمام امتحانات پاس کرنے کے بعد میں نزدیکی شہر کے اسکول میں داخل ہو گیا ۔ صبح سویرے سائیکل پر سوار ہو کر میں گاؤں سے نکل جاتا ۔ رات گئے کھیل کر اور پڑھ کر، نئے شہر کے دوستوں سے مل ملا کر واپس آتا۔ گرمیوں میں ہر سال میں پہاڑ چلا جاتا ۔ سردیوں کے چھوٹے دن شہر میں تمام ہو جاتے ۔ گاؤں والوں کے لئے میں روز بروز بیگانہ سا ہوتا جا رہا تھا۔

ان دنوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا ۔ مجھے یاد ہے ۔ میری بہن کا بیاہ تھا آٹھ دس دن پہلے ہی ہم نے "گیت بٹھا" دیئے تھے ۔ رات کو ہر روز گاؤں کی لڑکیاں، عورتیں اور بڑھیاں ہمارے گھر میں آکر مل کر ہنسی ٹھٹھول کرتیں ۔ گاتیں اور فقاریاں مارتیں ۔ تائی چھجی کو سب سے زیادہ گیت آتے تھے ۔ آدھی رات تک رونق سی لگی رہتی ۔ میں بھی عورتوں میں سکڑا ہوا بیٹھا رہتا ۔ ایک رات کو تائی چھجی نے اکیلا نیا گیت سنانے کا وعدہ کیا ۔ روز کی طرح اس رات کو بھی میں وہاں بیٹھا تھا۔ اڑوس پڑوس کے ادھیڑ لوگ بھی وہیں تھے۔

گیت شروع کرنے سے پہلے تائی چھجی نے اپنے دوپٹے کی پگڑی بنائی اور سر پر رکھ لی ۔ اپنے لمبے لمبے بالوں کو اس میں اڑس لیا ۔ کسی اور لڑکی کا دوپٹہ لے کر کندھے پر رکھ لیا اور اس دوپٹے کا کچھ حصہ کمر میں لپیٹ لیا ۔ ہماری رسوئی میں سے دوڑ کر سونٹا اور کھرل اٹھا لائی ۔ کھرل کو اس نے دالان کے بیچ میں رکھ دیا اور سونٹا اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔

مردوں کے برے بھلے پہناوے میں اس نے مرد کی سی آواز میں گانا شروع کر دیا ۔ گاتے گاتے جیسے اسے نشہ سا چڑھ رہا تھا ۔ اس کی ہیئت سے وحشت سی برس رہی تھی ۔ ہاتھوں سے، بازوؤں اور آنکھوں سے وہ اشارے کرتی ہوئی ایک بھنگ پینے والی کی ہو بہو تصویر بنا رہی تھی۔ وہ گا رہی تھی ۔

وے بھنگیا توں نے گراں ناواں　　اے بھنگی !
وے بھنگ گھوٹنے　　گرو کا نام لے
اور بھنگ گھوٹنے جا۔

اس نے سونٹا کھرل میں گھمانا شروع کر دیا ۔ ڈھولک کی تال کے ساتھ وہ ایک لے میں ایک سر میں گانے جا رہی تھی ۔ "بھنگ گھوٹنے ۔ بھنگ گھوٹنے" ۔ اور وہ کھرل میں سونٹا گھمائے جا رہی تھی۔

یہ بھنگ کا گیت تھا کہ کس طرح بھنگ پینے والے نشے کی ٹوٹ محسوس کرتا ہے ۔ اس کے بازوؤں میں اور اس کے بدن میں کس طرح سستی سی آجاتی ہے ۔ آخر میں چھپتے چھپاتے بازار سے بھنگ لاتا ہے ۔ خدا کا نام لے کر بھنگ گھوٹنا شروع کر دیتا ہے ۔ رگڑتے ہوئے پانی ڈالتا ہے اور بھنگ پیٔے جاتا ہے ۔ پھر پیالا بھر لیتا ہے ۔ خوش ہوتا ہے اور خدا کا نام لے کر ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیتا ہے۔

تائی چھجی اسی طرح گائے بھی جاتی اور ساتھ ہی ساتھ اداکاری کے جوہر بھی دکھاتی جاتی ۔ حاضرین ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے ۔ ڈھولک کی تال تیز ہوتی جا رہی تھی ۔ تائی چھجی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔

دے جھنگیا لے گراں داناں اے جھنگی
گرو کا نام لے جھنگ چڑھ گئی
جھنگ چڑھ گئی۔

اس نے ناچنا اور جھومنا بھی شروع کر دیا۔ اس کا ایک ایک کنایہ، اس کا ایک ایک اشارہ اس کی ایک ایک حرکت بدمست جھنگی کی حالت کا اظہار کر رہی تھی۔ ہم سب جیسے نشے میں چور ہوئے جا رہے تھے۔ ناچتے ناچتے تائی چھتی کا بندھا ہوا دوپٹہ کھل گیا۔ اس کے بال دیوانوں کی طرح بکھر گئے۔ اس کے کندھے پر سے دوپٹہ ڈھلک کر اس کی کمر کے ساتھ لٹکنے لگا جب وہ گھومتی اس کی شلوار اور اس کی قمیص لہرا اٹھتی۔ ڈھولک کی تال اس گھڑی اور بھی تیز ہو جاتی۔ اس کے پاؤں جیسے زمیں پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس کی باہیں لہرا رہی تھیں۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ ڈھولک بلند اور تیز ہوتی جا رہی تھی نشے میں ایک جنونی کیفیت میں تائی چھتی مجھ پر آ گری۔
لڑکیوں نے ہنس ہنس کر قہقاریاں مار مار کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ میں شرما کر دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس دن سے تائی چھتی سے مجھے شرم سی آنے لگی میں اس سے خفا نہیں تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر اب میں کالج میں آ چکا تھا۔ سائیکل چھوڑ کر میں نے موٹر سائیکل لے لی تھی۔ گاؤں والے گھر سے میں صبح سویرے نکل پڑتا اور شہر سے کافی دیر کے بعد واپس آتا۔ تائی چھتی کا گھر ہمارے سے پہلے آتا تھا۔ کبھی اس کے گھر کا دروازہ بند ہوتا اور کبھی کھلا ہوتا۔

جس رات کو تائی چھتی نے جھنگ والا گیت
اس رات کے بعد میں نے تائی چھتی سے نہ تو کوئی بات نہ کبھی اس کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے چرخے کی گھوں اکثر میرے کانوں میں پڑتی تھی۔ کالج میں ہمارے امتحان ہو رہے تھے اور میں اپنے کمرے میں امتحان کی تیاری کر رہا تھا کہ ایک دن میری ماں مجھ سے آکر کہنے لگی۔ "اگر فرصت ملے تو تائی چھتی کے ہاں ذرا سی دیر کے لئے بیچاری کا برا حال ہے۔ غشی آ گیا تھا اور وہ تمہیں پوچھ
ایک دو دن کے بعد میری ماں نے مجھ سے پھر کہا۔ "تائی چھتی کے گھر گئے تھے بیٹا؟ ضرور ہو آنا بیچاری تمہیں یاد کر رہی تھی۔"
اگلے روز میں دوپہر کو تائی چھتی کی ڈیوڑھی پار سنسان دالان میں سے گزرتا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا وہ تنہا لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم آیا آنسو خود آنکھوں میں بیٹھ گئی — "مجھے معلوم تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔ آج تم آؤ گے۔" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔
میں فرط حیرت سے گم صم ایک بت کی طرح رہ گیا اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کب میں اس کے پلنگ سے گر پڑا۔

# مسدس حالی کے چند نقاد

از۔ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی)

مسدس حالی ان کتابوں میں سے ہے جن کے متعلق نہ صرف مختلف بلکہ متضاد رائیں ملتی ہیں اور ظاہر کرتی ہیں کہ شعر و ادب کی دنیا میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے معیار اب بھی زیادہ تر انفرادی ذوق کے نقطۂ نظر سے قائم کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ دورِ جدید میں اصول تنقید کو بڑی حد تک سائنٹفک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالی نے اپنا مشہور مسدس "مدوجزرِ اسلام" جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے سرسید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں لکھا۔ سرسید ہی نے موضوع کا انتخاب کیا تھا اور سب سے پہلے سرسید ہی نے اس کی داد بھی دی۔ مسدس کو پڑھ کر حالی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے ——— میں اس کا محرک ہوا اور اس کو اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں ———" یہی نہیں ان کی تو خواہش تھی کہ اس نظم کو لڑکے گلیوں میں پڑھتے پھریں، رنڈیاں جلسوں میں گائیں اور قوال محفلوں میں سنائیں۔ خود حالی نے اس کے متعلق کہا کہ "اس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ہے، نہ مبالغہ کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے ——— گویا اہل دہلی اور لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے واسطے کی گئی ہے۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو ان کا احسان ہے ورنہ کوئی شکایت نہیں۔" مولانا عبدالحق نے کہا ہے کہ "مسدس حالی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے درد مندانہ اقوال دلوں کو بے چین کئے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر دیکھیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔" سر راس مسعود کا خیال ہے کہ "مسدس میں چند بند ایسے ہیں جن سے بہتر یورپ کی کسی زبان کے ادب میں آج تک کوئی چیز نہیں لکھی گئی ہے۔"

ان اقوال میں خود حالی کے قول کے سوا ہر جملہ مسدس کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے لیکن جب مسدس شائع ہوا تو صرف یہی نہیں لکھے گئے بلکہ ہجویں بھی لکھی گئیں۔ ایک واقف کار کے الفاظ سنئے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں۔ "وہ وقت خوب یاد ہے جب یہ مشہور مسدس پہلا بار شائع ہوا تھا۔ مدوجزر کا ایک طوفان اٹھا۔ مکاتیب میں مرحوم سرسید مخالف فرقہ کے ایک جماعت کے شیدائی جو ہر مذہبی خیال والے بھی شامل تھے۔ بجائے اس کے کہ ۔۔۔

ہیں جس بے باکی سے ہمعصر مذہبی و معاشرتی طبقات پر جرح کی گئی تھی، اس نے احساس مخالفت کو مشتعل کر دیا تھا۔ خصوصاً مذہبی احمد کو۔ شعرا کو شکوہ تھا کہ مسدس کے قوافی وغیرہ نامانوس ہیں...... اس میں شاعری کی اہانت کی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر بھی خیال یوں ادا ہوا: "آج سے پچاس اسّی نوّے سال ادھر جب پہلی بار حالی کے منہ سے یہ بات نکلی تو بس ایک آگ لگ گئی اور آگ بھی کہاں؟ رادوں کی لٹھ عفریتوں اور راکشسوں سے بھری اور پٹی پڑی ہوئی تشکالیں، بڑے بڑے پیل تن یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ جواب لکھئے۔ تردید کیجئے۔ تضحیک کے لئے کوئی حالی کے جواب میں قالی کے قالی بن کر آئے۔ کسی صاحب نے معنی سے تہیدست ہو کر صرف لفظی بلکہ حرفی مناسبت سے خالی کا چہرہ لگا اور کسی نے خیالی کا روپ بھرا اور پنچ اخبارات کی تو پوچھئے نہ۔ ان بچاروں کا تو آ ذوقہ کھل گیا۔" حالی کا حال، اور "میدان پانی کی طرح پامال" یہ تھا ان کی تک، بندیوں کا جال ... ادب کی مسخرگی کا کمال! دوسروں کو بنانے سے پیشتر مسخرے خود ہی بن کر رہ گئے گو ان جملوں کی تنقیدی نوعیت عقیدت مندی کے دور میں نمایاں نہیں ہوتی۔ تاہم ان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ مسدس کی اہمیت کو موافقین اور مخالفین دونوں نے تسلیم کیا۔ رایوں میں اختلاف ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن جب یہ اختلاف موضوع، مواد اسلوب اور فن ہر پہلو سے متعلق ہو اس وقت ایک نئے جائزے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اکوئی اہم کتاب جس وقت شائع ہوتی ہے اس کے اثرات کچھ اور ہوتے ہیں اور کچھ دن گذر جانے کے بعد اور۔۔۔ اگر موضوع ہنگامی اور عارضی ہے تو شہرت اور اثر کی آگ بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔ اگر اس میں گہرائی اور قوت ہے تو اکثر اس کا اثر آہستہ آہستہ پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ مسدس شائع ہوا تو وقتی مخالفت کا ہنگامہ ختم جانے کے بعد اس کا اثر شروع ہوا اور جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا ذکر چند برس بعد حالی نے خود کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے کوئی معتدبہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت یا شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے۔ نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے۔ قوم کی نرابیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سنان کا کام لیا گیا تھا۔ ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ارباب اعتقاد مذہبی سوء ظن رکھتے تھے۔ تعصب عموماً کلمۂ حق سننے سے مانع تھا۔ باایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ اڈیشن اب سے پہلے چھپ چکے ہیں۔ بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں اور کہیں کہیں تھیٹر میں اس کے مضامین ایکٹ کئے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالحق نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ پنجاب کے کسی شہر میں مرید احمد خاں مسدس کے چند بند بعض مشاعروں میں کسی طوائف کی زبان سے سنے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ بعض لوگ وجد میں آگئے چیخیں مار اور سر پٹک پٹک کر روئے۔"

بعض ناقدوں نے حالی کو قوم کا "مرثیہ خواں" کہا ہے۔ غالباً یہ غلط ہے۔ اس مسدس کے لکھنے کے [illegible] میں جب [illegible] میں مد کے بعد جزر ہی کا نہیں "مسلمانوں کی ترقی کے بعد تنزل ہی کا [illegible] اور یوں سارا آہنگ پر نظم ہوا تھا۔ اس میں امید کی کوئی کرن نہ تھی۔ لیکن جب لوگوں نے اس کی [illegible] گذشتہ کے حالات بھی بدلتے ہوئے معلوم ہوئے تو حالی نے ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جس میں دوبارہ [illegible] اکسایا گیا ہے۔ اس طرح اس نظم میں جو مقصدی خامی تھی وہ دور ہو گئی۔ لیکن پھر بھی سوال [illegible]

اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی شاعرانہ اور فنی حیثیت کیا ہے اور اس کے متعلق موجودہ نقادوں کے تاثرات کیا ہیں۔
جہاں تک سماجی زندگی کا تعلق ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غدر کے بعد سرسید اور ان کے ہمنواؤں نے طے کر لیا تھا
ا زمانہ بدل چکا ہے۔ حکومت ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ وقت کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ چنانچہ حالی نے لیے درپے اپنی نظم و نثر
میں اس کا تقاضہ کیا ہے۔

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا　　کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا　　تجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت قومی تصور بڑی حد تک مذہبی تصورات سے وابستہ تھا اور کوئی رہنما ایسا نہیں تھا جو متحدہ قومیت کے نقطۂ نظر سے کوئی پیام پیش کرتا ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس محدود قومی تصور میں تعصب یا کٹرپن کا شائبہ تک نہ تھا۔ سرسید اس تحریک کے لیڈر تھے۔ انھیں کے اشارہ پر مسدس لکھا گیا۔ اس کا اعتراف خود حالی نے کیا۔ لیکن بعض نقادوں نے اس تحریک کو بھی مسدس کے عیوب میں شمار کیا ہے۔ کلیم الدین احمد ان میں پیش پیش ہیں۔ انھوں نے مسدس پر شاعرانہ اور فنی نقطۂ نظر سے بھی زبردست اعتراضات کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقرر کردہ موضوع پر نظمیں طلب کی جاتی ہیں اور بہترین نظم انعام کی مستحق ہوتی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں اہم ترین نقص یہ ہوتا ہے کہ اصلیت کہیں نظر نہیں آتی۔ شاعر کسی زبردست جذبے سے مجبور ہو کر آمادۂ شاعری نہیں ہوتا۔ بلکہ قصداً انعام کی خاطر مخصوص موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس لئے اصلیت کی تمنا ہی خیال خام ہے۔ مسدس میں یہی نقص ہے کہ نظم قصداً لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس میں ہر جگہ آورد کی جلوہ گری ہے۔" اب اس خیال کو مولانا عبدالحق کے اس خیال سے ملائیے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہ کہتے ہیں:-

"اس کی روانی حیرت انگیز ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا امڈا چلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحہ کے لئے بھی رکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ ابلا رہا ہے اور ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت پر ہے۔"

کلیم الدین احمد کو اس نظم میں تسلسل بھی نظر نہیں آتا وہ اس نظم کو بے لطف، طبیعت کو مکدر کر دینے والی اور خشک قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں "مسدس مثل ایک ریگستان کے ہے جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سا سرسبز شاداب جگہ نظر آجاتی ہے۔ نظم میں شاعری مفقود ہے۔ ارتقاء کے خیالات فطری نہیں بلکہ ارادی ہیں۔ مضامین پھول کی طرح کھلتے نظر نہیں آتے بلکہ [illegible] اینٹ رکھی گئی ہے اور یہ اینٹیں ایک دوسرے میں پیوست نہیں۔ دیواریں کچی ہیں اور بے ڈھنگی۔ بنیاد و سقف [illegible] نثر کا سا ہے اور شاعرانہ مسدس میں یک رنگی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حالی میں صحیح معنی میں [illegible] [illegible] [illegible] کے برابر ہے لیکن شاعر ہونے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ قوت حاسہ مفقود، تخیل معدوم، [illegible] [illegible] خشک بے رنگ۔"

[illegible] [illegible] ہے کہ کسی استاد نے کسی طالب علم کی نظم کو بھی اتنے سخت اعتراضات [illegible]

نہ کئے ہوں گے ظاہر ہو کہ یہ تنقید انتہا پسندانہ ہے کیونکہ جو نظم صداقت اور حقیقت سے معرا ہو، شاعری کی افسوں سے خالی ہو، اور معمولی ہو، پچھتر سال تک عزت و عظمت کی چیز نہیں بنی رہ سکتی۔ محض سرسید کی تحریک کی وجہ سے حالی کے جذبات اور خیالات نظر انداز کر کے یہ کہنا کہ یہ فرمائشی نظم ہے بڑا سطحی خیال ہے۔ جس جذبہ نے سرسید کے لئے اس موضوع کو اہم بنایا تھا وہ حالی میں بے حد قوی تھا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض حیثیتوں سے وہ آگ حالی کے سینہ میں اس سے زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک رہی تھی جتنی کہ سرسید کے سینے میں۔ مجنوں گورکھپوری نے حالی کی شاعری پر تبصرہ لکھا ہے کہ "مسدس تبلیغی ادب کے عنوان کی چیز ہے وہ خاص دور کی چیز ہے اور اس دور میں بھی ملک کی ایک محدود جماعت کے لئے مخصوص ہے لیکن وہ شاعری بھی ہے اور صحیح معنوں میں شاعری۔ خود حالی نے مسدس کو ابالی کھچڑی سے تشبیہہ دی جو مزے لے کر نہیں کھائی جا سکتی۔ شمس العلماء مولانا امداد امام نے بھی اس رائے سے اتفاق کر کے کہا ہے کہ "ہر بریانی اور مرغ مسلم پکانے والا ایسی کھچڑی تیار نہیں کر سکتا ہے"۔ مجنوں۔ موافق اور مخالف رایوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مسدس جہاں تک پیغام ہے وہاں تک شاعری نہیں۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مسدس اپنے موضوع پر اپنے نوعیت کی اردو میں بلکہ شاید دنیا کی اور زبانوں میں بھی سب سے زیادہ طویل نظم ہے اور اس پر بھی ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ گھر گھر پڑھی گئی اور کسی زمانے میں بار بار پڑھی گئی۔ ایسی طویل نظمیں عموماً پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہیں لیکن مسدس حالی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تسلسل اور اس کی زبان کی سنجیدہ سادگی ہے جو اس کی تاثیر کے وزن کو اول سے آخر تک یکساں قائم رکھے ہوئے ہے۔ تاریخ اسلام کے ایک خاص رخ کو اس سے زیادہ دلکش اور پر تاثیر پیرایہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اگر ہم کو غم دنیا سے سر اٹھانے کی مہلت مل سکی کہ شعر و ادب سے لطف اٹھا سکیں تو آئندہ وہ یقیناً زیادہ پڑھی جائے گی جتنی کہ اس وقت پڑھی جاتی ہے۔ اپنے وقت میں وہ شاعری سے زیادہ پیغام بن گئی۔ اب وہ زمانہ آ رہا ہے کہ اس کو شاعری میں شمار کیا جائیگا۔

مجنوں کی رائے متوازن اور فکر انگیز ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں کوئی فلسفہ تمدن نہیں اور نہ کوئی واضح اور مرکزی تخیل ہے لیکن پھر بھی وہ اردو شاعری میں ایک اہم اور عہد آفریں نظم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسدس حالی میں بعض جگہ نثریت اور پھیکاپن پایا جاتا ہے۔ بندش میں چستی کی کمی بھی ہے لیکن ایک طویل مقصدی نظم میں ان عناصر کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ جس وقت حالی نے یہ نظم لکھی اس وقت ادب کی تاریخ اس موڑ پر آ گئی تھی جب شاعری اور فنی لطافت سے زیادہ مقصد عزیز ہوتا ہے اور حالی تو ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی مقصدیت کو پوشیدہ بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس نظم میں وہ شاعری کی ان روایات سے کھلم کھلا انحراف کر رہے تھے جو اس وقت تک پسندیدہ تھیں اور اگر قدیم شاعری کے پرستاروں کو اس نظم کے نئے پن سے دھکا پہنچا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ نظم محض پیام ہو کر رہ گئی ہے یا اخلاقیات کا ایک بہی کھاتہ ہے۔ جس میں شعریت کا پتہ نہیں۔ حالی ایک باکمال شاعر تھے اور اس نظم کو ظاہری آرائشگی اور فنی لطافت سے بچا کر اپنی بات کو پر اثر بنانے کی کاوش ارادی تھی۔ وہ اپنے بھرپور وار کو شاعرانہ لطافتوں میں گم کر دینا نہیں چاہتے تھے انہیں اس بات کا تجربہ تھا کہ اخلاقیات، حب وطن، بے تعصبی، محنت اور مشقت کی قدر و قیمت، ہمدردی، انسانیت، دلسوزی کا صدق وقت کا ساتھ دینے کا جو پیام وہ پیش کر رہے ہیں وہ کسی ملک کی قومی زندگی میں اپنی جگہ آپ بنا لے گا۔ نظم کی سنجیدگی ظاہری کمی کو خود ہی پورا کر دے گی اور دنیا اس کی توانائی، خلوص اور انسانیت ہی کو اصل جوہر سمجھنے لگے گی۔ حالی کا یہ اندازہ غلط نہیں نکلا اور مسدس حالی آج بھی اسی طرح ایک اہم نظم ہے جیسی وہ ۱۸۷۹ء میں تھی اور میرا خیال ہے کہ اس پر سب سے اچھی تنقید وہی ہے جو خود حالی نے مسدس کے دونوں دیباچوں میں کی ہے۔

# کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے

از:- مس رشید موسوی (بی۔اے)

میرؔ کے کلام کو نقادوں نے "یاس و قنوطیت، نوحہ و ماتم کا مجموعہ" کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرؔ کا کلام درد و الم کا
ہے جیساکہ خود انھوں نے کہا ہے ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب نے  درد و غم کتنے کئے جمع کر دیوان کیا

اس کے وجوہات بھی قابلِ غور ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میرؔ صاحب اپنی زندگی میں بچپن ہی سے مسلسل ناکامیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ
تے آئے ہیں۔ ان کی سب سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ ماں کی محبت سے جو تمام محبتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے محروم
ئے۔ اس کے بعد باپ کی وفات اور عزیز و اقارب کی طوطا چشمی، بے سر و سامانی اور زمانے کی بے مروتی۔ یہ ایسی حالتیں نہ تھیں کہ
جیسے حساس شخص کے دل پر اثر نہ کرتیں۔ اپنی زندگی سے انھوں نے جن تلخ تجربات کو حاصل کیا تھا انہی کو انھوں اس انداز
یان کیا کہ وہ سارے عالم کے محسوسات و تجربات ہو گئے۔ اور کلام کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا۔

کسی شاعر کے کلام کا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے اور عوام میں اس کی مقبولیت۔ اس معیار پر میر صاحب کا رتبہ اردو کے
میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا شعر جو سوز و گداز اور درد کی تصویر ہوتا ہے دل میں گھر
بنا ہے اور میرؔ ہی وہ پہلے خوش نصیب شاعر ہیں جن کے کلام کی قدر ان کی زندگی ہی میں ہوئی اور مرنے کے بعد بھی۔ جب تک
زبان کے جاننے والے دنیا میں باقی ہیں ان کا کلام قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

فانیؔ نے میر کی تقلید کی لیکن فانیؔ کے یاس و قنوط اور میرؔ کے یاس و قنوط میں نمایاں فرق ہے۔ فانی کے یاس زندگی کی
کی شکل ہے جس میں ہنسی خوشی، امید اور رجائیت کی جھلک بالکل نہیں ہے۔ فانیؔ نے زندگی سے پیار کے بجائے نفرت کرنا سکھایا۔
ن کے یاس زندگی سے فرار اور گریز ملتا ہے۔ برخلاف اس کے میر کی شاعری زندگی سے بہت قریب لاتی ہے۔ زندگی سے محبت
نا سکھاتی ہے۔ یاس میں امید کی کرن بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔ غم کے اندھیرے میں مسرت کی ہلکی سی جھلک بھی ملتی ہے۔ میرؔ خود
بدنصیب ہیں لیکن دوسروں کو اس بدنصیبی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔ اپنی زندگی میں میرؔ کو آسائش و آسودگی میسر نہ ہوئی اور وہ یہ
چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اس سے محروم رہیں۔ میرؔ انھیں زندگی کی وہ ساری خوشیاں دینا چاہتے ہیں جس سے وہ خود محروم
میرؔ کے "تشنۂ الم" نے انھیں "خدائے سخن" بنا دیا۔

میرؔ کے اشعار میں الفاظ ملائم، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش اور درد چھپا ہوا ہے۔
... سلیس، سادہ اور معمولی ترکیبوں میں کیا کیا دقیق مطالب بھرے پڑے ہیں۔ اپنے اندازِ بیان کی سادگی

سلاست سے میر صاحب لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

---

جو اس شور سے میر روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

---

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

---

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا انداز بیان کس قدر دلکش اور پُر اثر ہے۔ سادگی و صفائی اور روزمرہ کا پابند جو اس زمانے کا خاصہ تھی اس کے ساتھ ساتھ کلام میں درد اور تاثیر نے انھیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز بنا دیا۔ ایہام گوئی جو دوسرے ہمعصر شاعروں کے پاس ملتی ہے میر کے پاس نہیں ہے۔

میر انیس سوز و غم کے بیان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے لیکن وہ بھی میر کے گرد کو نہیں پہنچے۔ انیس کے ہاں تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے۔ میر خود سوز و غم کا پتلا ہے اور اس کے اپنے ذاتی غم کی سچی تصویر ہے جس میں تکلف نام کو نہیں۔ انیس کے ہاں خیالی تخیل میں الفاظ کی کثرت ہے اور خیال سے پہلے لفظوں پر نظر پڑتی ہے۔ لیکن میر کے شعر اور الفاظ اس طرح ایک دوسرے سے گھل مل ایک ہوئے ہیں کہ لفظ اور خیال پر علیحدہ نظر نہیں پڑ پاتی۔ انیس کے ہاں الفاظ کی شان و شوکت اور ہنگامہ ہے لیکن میر کے ہاں سکون، دھیما پن اور خاموشی ہے اور خاموشی سے اپنا اثر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

ہو گا کسو دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

لفظ "آرام طلب" ملاحظہ ہو۔ عشق و محبت میں یہ حال ہو گیا کہ اگر گھر بار چھوڑ کر بے یار و مددگار محبوب کی دیوار کے نیچے پڑا ہو۔ اسے طنز سے آرام طلب کہا جا رہا ہے کہ اسے محبت سے کیا کام۔ آرام طلبی کا یہ حال ہے تو محبت میں مصیبت کیا ہو گی۔ ایک شعر کی سادگی ملاحظہ ہو ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس قبیل کا ایک شعر ان کے ہمعصر مرزا رفیع سودا کے دیوان میں ملتا ہے ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

دونوں شعر ملاحظہ ہوں۔ ایک سونے والے کے سرہانے بیٹھ کر دوسرے کو خاموش رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ میر کے ہاں ایسے ہی الفاظ کا انتخاب ہے اور بیان کی سادگی و سلاست اور دھیما پن ہو کہ سونے والے کے آرام میں خلل نہ آنے پائے۔ سودا کے ہاں وہ نرمی اور سادگی نہیں جو میر کے شعر میں ملتی ہے۔ میر کی شاعری میں ایک ٹھنڈک اور میٹھی تڑپ، ایک آواز [illegible] اور میر اپنے غم کی داستان وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہمارے ہی دل کی بات ہو۔ ان کا ہر شعر دل میں [illegible] سامنے لئے ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا "میر کے شعر کو سمجھا جا سکتا ہے، سمجھایا نہیں جا سکتا۔" [illegible] اسی طرح میر کا شعر دل پر اثر کرتا ہے۔ کلام میں قنوطیت کے باوجود پژمردگی یا پسپائی نہیں [illegible]

ـشتی قربان کردی جائے۔ میر کا غم انسان کو پست نہیں بناتا بلکہ ہمت افزائی کرتا ہے ایک ایسا الیہ ہے جس کے دل مرجھا نہیں بلکہ شگفتگی پیدا باتی ہے۔ آنسو بہتے ہیں لیکن خوشی کے ۔۔ یہاں پر محمد اکرم صاحب کا خیال نقل کر دینا ناموزوں نہ ہوگا کہتے ہیں۔ میر کی مقبولیت کا ایک بڑا ب تو زبان اور بیان کی دل آویز پاکیزگی ہے جہاں تک غالب اور میر کا تعلق ہے اگر پاکیزگی زبان اور سوز و گداز کو کمال شاعر سمجھا جائے میر کو غالب پر فوقیت ہے ۔ غالب کی زبان میں وہ صفائی نہیں جو میر کی غزلوں میں ہے اور جو سوز و گداز میر کے اشعار میں عام ہے وہ عام طور پر غالب کو میسر نہیں۔ ان دونوں باتوں میں میر کا رتبہ غالب سے بالا ہے۔ زبان اور پاکیزگی بیان وسلاست ملاحظہ ہو۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

---

نازکی اس کے لب کی کیا کہیئے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

---

میر ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میر صرف غزل کیلئے پیدا ہوئے تھے۔ اخلاقی مسائل اور تصوف اور دوسرے موضوعات پر نسبتاً کم شعر ہیں لیکن ب میں اپنے مخصوص انداز میں ہیں۔ سادہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے در پردہ وہ بلند خیالات پوشیدہ ہیں۔ ملاحظہ ہو اس شعر میں کس قدر مضمون کو کس خوبی، سلاست اور آسانی سے ادا کر دیا ہے ؎

سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

ـقی مسائل کو بیان کیا ہے ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا — یکسر وہ استخوان شکستہ سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُر غرور تھا

ـفنا کے مضمون جس کو بیشتر شعرا نے باندھا ہے اس کو بھی میر اپنے مخصوص انداز میں نظر آتے ہیں۔ غالب نے کہا ہے فنا کے بارے میں ؎

یک نفس بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

؎ — پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

ذوق نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

کیا اعتبار ہستیٔ ناپائیدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اسی نکتہ کو میر نے سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

ـگریباں کا مضمون جو نہایت فرسودہ اور پامال قسم کا ہے میر نے سادگی اور دلکش اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے — دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ـباز ہے کہ انسان کے کلام سے اس کی سیرت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور زیادہ صادق آتا ہے۔ غالباً کسی شاعر ـلام پر اس کی سیرت اور طبیعت کا اس قدر اثر نہ ہوا جتنا کہ میر کے کلام میں نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر معلوم ہوتا ہے ان کے لئے کچھ

لفظ، طرزِ بیان، ترتیب و بندش، الفاظ ان کے قلبی واردات و احساسات کا صحیح مرقع ہیں۔

میر نے شاعری کو ذریعہ عزت یا وسیلۂ معاش نہیں بنایا۔ چاہتے تو وہ بھی سودا کی طرح دربارداری کرتے ہوئے آرام سے گزار سکتے لیکن ان کی حساس و خوددار فطرت نے انھیں بادشاہوں کی نازبرداری اور دربارداری دونوں سے دور ہی رکھا۔ فاقے کئے۔ رنج اٹھائے لیکن دستِ سوال دراز نہ کیا اور نہ ہی حرفِ شکایت زبان پر لائے۔ مسرت و آرام ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ قسامِ ازل نے حساس اور خوددار طبیعت دی تھی۔ ایک تمام نصیب قیدی کی زندگی گزاری لیکن کوئی ایسا فعل نہ کیا جو ان کی وضع داری اور اخلاق کے خلاف۔ محبت میں ناکامی، زمانہ والوں کا غلط برتاؤ اور حد سے بڑھی ہوئی خودداری نے انھیں مجنوں بنا دیا تھا۔ عشق میں ہمیشہ ناکام ہی رہے۔ آدابِ عشق کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ عشق کو رسوا نہ کیا ؎

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ — کتنے آنسو پلک تلک آئے

غمِ عشق نے انھیں کہیں کا نہ رکھا اور اس حال پر پہنچا دیا ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

شاعری، موسیقی اور مصوری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور شاعری تو اپنے مطالب صاف طور پر بیان ہونے ہی نہیں دیتی۔ ہم لاکھ کوشش کریں لاکھ نکتے نکالیں پھر بھی واضح طور پر نہ ہم مطلب سمجھ سکتے ہیں اور نہ دو کو سمجھا سکتے ہیں۔

ہر بڑے شاعر نے میر کو مانا ہے اور ان کے کمالِ فن کے معترف ہیں۔ غالب نے کہا ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

دوسرے مقام پر بطور شہادت ناسخ کے خیال کو اپناتے ہیں ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور ذوق اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب — ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سودا بھی میر کی استادی کے قائل ہو ہی جاتے ہیں ؎

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح

مولانا حالی میر کی تقلید کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے — غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

اور خود کو اپنی برتری اور بزرگی کا کچھ کم احساس نہ تھا۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے — معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور اس مقام پر تو حد کر دی میر نے ؎

مستند ہے میرا فرمایا ہوا — دونوں عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا

# اسرارالحق مجازؔ اور ان کی فنکارانہ عظمت

از:۔ جناب اخترؔ کاشی پوری صاحب

سنہ ۱۹۵۵ء فوت تو ہو گیا لیکن دلوں پر وہ زخم چھوڑ کر جو سالہاسال تک رستے رہیں گے۔ یادداشت ساتھ نہیں دیتی کہ کوئی اور
ال اس سے زیادہ منحوس گزرا ہو اور اردو کے ان گنت ادیب یکے بعد دیگرے نگاہوں سے اوجھل ہوتے گئے ہوں۔ ان ادیبوں کی یاد میں
وں کے آنسو رلوا رہی ہیں جن کو اس منحوس سال نے اردو کی سبز و شاداب، نکہت و نور سے بھرپور وادیوں سے اٹھا کر اجل کے دہکتے ہوئے
لزار میں پھینک دیا۔ سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر اعظم کریوی، سید بیخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی۔ چراغ حسن حسرت۔ برجموہن دتاتریہ کیفی۔
ہم ناقوپردیسی کے غم کے آنسو ابھی خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ہندوستان کے محبوب شاعر مجازؔ کے انتقال کی خبر بد کا دھواں فضا میں
ب رچ گیا۔ یہ غم اتنا عظیم ہے کہ آنسو بھی ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

اردو کے اس نامور اور تابناک پینتالیس سالہ ستارے کو ۵ر دسمبر رات کے دس بجے فالج کے دماغی حملے نے اردو ادب
کے آسمان سے نوچ کر پھینک دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ مرحوم ایک عرصے سے مختلف امراض میں مبتلا تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ یہ ادیب خود ملا
ہ زہر آلود فضائیں جن کا ادیب مقابلہ کرتے آرہے ہیں، جن میں جی رہے ہیں۔ خود موت نما ہیں لیکن پھر بھی یہ وقت اچانک ساتھ
چھوڑ دینے کا نہیں تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء کی طرح ابھی ایک بار اور یہ دکھا دینا تھا کہ زندگی موت سے مغلوب نہیں ہو سکتی۔ زہر پی کر زندہ رہ
سکتی ہے۔ مر نہیں سکتی لیکن ایک ننھی سی کرن کہاں تک دیو پیکر تیرگی کے مہیب سایوں کا مقابلہ کرتی۔ آخر مغلوب ہو گئی۔ خود انھوں نے
بھی ایک قطعہ میں اس کا اعتراف کیا ہے ؎

| | |
|---|---|
| وقت کی سعیٔ مسلسل کارگر ہوتی گئی | زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی |
| سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا سازِ حیات | موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی |

لیکن اے گردشِ دوراں! اے ناز ہائے روزگار فضاؤ! اس شمع کو مجازؔ روشن کر گئے ہیں ہم دل کے لہو کا آخری قطرہ دے کر بھی فروزاں
رکھیں گے۔ ہم اپنے ارادوں کی بجلیوں کی کرنوں کا سہارا دے کر اس کی لو کو منزل تک لے جا کر ہی چھوڑیں گے۔ ہم نے ظلمت
کو مٹانے کی قسم کھائی ہے اور ہم ناکامیاب نہیں ہو سکتے۔

اسرارالحق مجازؔ رودولی سنہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے اور علیگڈھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے
"آواز" کی ادارت پر مقرر ہوئے اور تقریباً دو سال تک انجام دینے کے بعد دست کش ہو گئے۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ "نیا ادب"
جاری کیا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ جنون کا ایک حملہ ہوا جس سے وہ بچ گئے اور صحت یاب ہونے کے بعد ہارڈنگ لائبریری
میں ملازمت کرلی [illegible]

زمانہ ہوا دو ماہی "سویرا" لاہور ۴۳ء میں ساحر لدھیانوی نے "جان پہچان" کے عنوان سے مجاز کا ایک چھوٹا سا مگر جید تعارف دیا تھا۔

"علیگڈھ یونیورسٹی کا شاعر محفل وفا' مطرب بزم دلبراں' بحیثیت مجموعی ان فنکاروں میں سے ہے جو اپنی عمر سے پہلے پختہ ہو جاتے ہیں اور دنیا کو اپنے تصورات سے ہم آہنگ نہ پاکر یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا دیوانے ہو جاتے ہیں۔ مجاز دو بار دیوانگی کے مراحل بھی طے کر چکا ہے اور قدم بقدم خودکشی کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ عصمت کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں کالج کی لڑکیاں مجاز کے نام کی پرچیاں نکالا کرتی تھیں "مجاز ہم میں سے کسے چاہے گا۔ کسے دلہن بنائے گا؟" آج کل عورت مجاز کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں مجاز نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے اور اتنا کچھ دیا ہے جو اس کے ہمعصروں کے زندگی بھر کے اثاثہ سے زیادہ ہے۔ نوجوان شعرا میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے فن کا رشتہ شعوری طور پر عوامی قوتوں سے جوڑا اور سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد اور تاریخی تحریکات کے بہاؤ کو سمجھ کر انسانیت کو آزادی کی سرخ صبح کا مژدہ دیا۔ پچھلے دو تین برس سے بے حد خاموش اور افسردہ رہنے لگا ہے' دن رات شراب پیتا ہے اور گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ زندگی' صحت' مستقبل ہر شے سے بے نیاز ہو چکا ہے پھر بھی جب کبھی جلوسوں اور جلسوں میں تپتے ہوئے سینوں اور بھنچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ مزدور اس کے گیت گاتے ہیں تو اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک آہ بھر کر کہتا ہے ؎

یہ ایا رندی مجاز اک شاعر' مزدور و دہقاں ہے
اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

جنگ سے پہلے آل انڈیا ریڈیو میں تھا' پھر ہارڈنگ لائبریری میں ملازم ہو گیا۔ پچھلے دنوں بمبئی چلا آیا اور لیگ پکچرز کی نئی فلم "دوراہے" کے گانے لکھ رہا تھا۔ سنا ہے اب وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن لکھنؤ چلا آیا ہے' اپنی محبوب مے نوشیوں اور مشہور آوارگیوں کی طرف۔"

۱۹۳۸ء میں ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن "شب تاب" کے نام سے اور پھر تیسرا اور چوتھا "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ ابھی کچھ ہی سال پیشتر ان کی قدیم اور جدید نگارشات کا مجموعہ "ساز نو" کے نام سے کتابی دنیا لکھنؤ سے شائع ہوا۔

اردو کے شعری ادب میں مجاز کا ایک مخصوص مقام ہے۔ ان میں احساس کی شدت' مشاہدہ' تفکر کی گہرائی' آہنگ اور ماحول کی اثر آفرینی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کی زندگی پر ہر سمت سے حملے بھی ہوئے۔ جن کا انھوں نے ثابت قدم رہ کر مقابلہ کیا۔ اس وجہ سے بھی ان کی نظر میں گہرائی' شعر و ادب میں صلابت اور فن میں پختگی اور معنویت پیدا ہوئی۔ اقتصادی کشمکش' بھوک' آہ و فغاں' زرد چہرے' تپتی ہوئی توانائیوں' تہذیب و تمدن کے رستے ہوئے ناسوروں' آئین و روایات کی مضبوط زنجیروں میں جکڑی ہوئی مجبوری نے ان کے مشاہدے کو گہرائی بخشی اور ان کے فن کو حقیقت کی ترجمانی کا شعور عطا کیا۔ ان کے کلام میں شکست خوردہ ارادوں کی پرواز میں اور بکھری ہوئی سرد اشکوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ حوادث دوراں کا ہمیشہ بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے منفرد اور پختہ اسلوب کے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے وہ فن کی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں ندیم قاسمی نے فرمایا تھا۔

"یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ گزشتہ دس پندرہ برس میں بے شمار تجربات کئے گئے۔ نظم کی نئی نئی ہئیتیں نکالی گئیں۔ کسی نے ماضی کی روایات سے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ کسی نے معمولی سی تبدیلی پر اکتفا کی۔ کوئی نظم کی پرانی صورتوں میں نیا مواد پیش کرنے میں کوشاں رہا۔ کسی نے نفسیاتی مضمون کو مضمون بنا میں نظم کر ڈالا۔ کسی نے ترغیبات کے کھلم کھلا ذکر سے گھبرا کر انتہا درجے کے مبہم استعاروں کی پناہ لی۔ الغرض بیشمار پینترے بدلے گئے اور بدلے جا رہے ہیں لیکن کسی تجربے نے صداقت کی صورت اختیار نہ کی بلکہ ہر تجربہ مزید تجربات کے بوجھ تلے بود اور پوچ ہوتا گیا اور آج کی یہ حالت ہے کہ اردو شاعری کا اپنا نظام افراتفری کے عالم میں ہے۔ دور جدید کے چند ممتاز شعرا کا کلام دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تمام حضرات ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں مگر ان کی منزلیں بلکہ راہیں تک متعین نہیں۔ نصب العین کا فقدان ہے اور وہ شاعری جس نے جمہور کی بیداری کا بیڑا اٹھایا تھا ابہام اور بے راہ روی کا ایک طومار بن کر رہ گئی ہے۔"

۔ کی شاعری بھی گذشتہ بیس بائیس سالوں میں پروان چڑھی اور پھولی پھلی۔ انھوں نے بھی ماضی کی روایات اور حال کی دست برد کے خلاف آواز بغاوت بلند کی مگر ان کی قوت بیان نے ان کو بے راہروی اور افراتفری کی لعنتوں سے محفوظ رکھا۔ ان کے تاثرات کوئی الجھن پیدا کئے قاری کے ذہن و دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم خوبی ہے کہ انھوں نے نظم کی پرانی صورتوں میں نیا مواد پیش کیا۔ اردو نظم میں ہئیتی انقلاب لانے والوں میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہئیتی انقلاب لانے والوں میں معرا، نظم آزاد اور گیت چلے آتے ہیں جن میں سے کسی صنف سخن کو مجاز نے نہیں اپنایا۔

بقول ڈے جی پیٹرلیس

"ہئیت کی آواز پر معنی کے قدم اٹھتے ہیں رکتے ہیں۔ فرسودہ مواد میں بھی اس وقت زندگی پیدا ہو جاتی ہے جب فنکار ہئیت کی تخلیق سوچ بوجھ اور احتیاط سے کرتا ہے۔ فن میں بعض ایسی باتیں ہیں جن میں کوئی کشش نہیں ہوتی لیکن فنکار صورت کو خوب بنا کر ان میں حسن اور کشش پیدا کر دیتا ہے۔"

مجاز نے اپنی نظموں کی تخلیق میں انتہائی سوجھ بوجھ اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ اسی لئے ان کی معمولی معمولی باتوں میں بھی کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ سرمایہ داری پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس کے ذکر میں کوئی کشش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن مجاز کی نظم "سرمایہ داری" پڑھنے کے بعد ذہن پر سرمایہ داری کی اصلی تصویر کھنچ آتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں جو نہیں جانتے تھے جان گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر

یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

ان تمام دماغوں پر جو سرمایہ داری کو خدا اور تقدیر کی دین سمجھتے ہیں ایک ضرب کاری ہے۔ اس کو انسانی بلا کہہ کر انھوں نے وہ انکشاف کیا ہے کہ اس کے آگے خدا اور تقدیر کے قدیم دلالوں کی کوئی دلیل نہیں ابھرتی۔ اسی طرح ان کی ایک دوسری نظم ہے "غدار" بظاہر سبھی جانتے ہیں کہ غدار کس کو کہتے ہیں۔ نہ اس لفظ میں کوئی حسن ہے نہ کشش مگر مجاز نے اس ڈھنگ سے غدار کا کیرکٹر پیش کیا ہے کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر اس نظم کا آخری بند

جب ۔۔۔ کا ۔۔۔ نکل جائے گا جب زمیں کیا آسماں تھرّا اٹھے گا

تھامے اپنے مقابل پائے گا
یارو یہ کرچیں کہ یہ غدار ہے

مجاز کے یہاں اشتراکیت کی تبلیغ کرنے والی نظمیں کافی تعداد میں موجود ہیں جن میں مزدوروں، کسانوں کی نمائندگی کی گئی ہے حکومت و سرمایہ داری کے خلاف اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان نظموں سے ان کی صداقت کا جوش، خلوص کی قوت اور عمل کا جذبہ جھلکتا ہے۔ ان نظموں میں ان کے اسلوب بیان کی دلکشی، تیغ اشاریت و کنایت بھی کچھ موجود ہے۔ "ایک جلاوطن کی و... "ہمارا جھنڈا" "انقلاب" "خانہ بدوش" "نوجوان سے" "مزدوروں کا گیت" "آہنگ نو" "بول ارّی او دھرتی بو... وغیرہ ان کی بہت کامیاب نظمیں ہیں۔ ذیل میں انھیں کے کچھ اقتباسات دیئے جا رہے ہیں:-

تجھ پہ یہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنس آزادیٔ انساں کے خریدار ہیں ہم
برہمن تیرے ہیں کل ملت اسلام تری
صبح کاشی تری، سنگم کی حسیں شام تری
دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ
سرفروشان بلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

(ایک جلاوطن کی واپسی)

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا
توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا ابھی یوں ہی لہرائے گا
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

(ہمارا جھنڈا)

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں بلووں میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

(انقلاب)

ان کی کہیں زمیں ہے نہ ان کا کہیں مکاں
پھرتے ہیں یوں ہی شام و سحر زیر آسماں
دھوپ اور ابر و باد کے مارے ہوئے غریب
یہ لوگ وہ ہیں جن کو غلامی [illegible]
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

(خانہ بدوش)

نظم بھی موثر ہے لیکن طوالت کے لحاظ سے صرف چند ہی شعروں پر اکتفا کی ہے۔ یہ دو مصرعے "یہ لوگ وہ ہیں جن کو
نصیب" اور "روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں" کتنے غم انگیز ہیں۔ کونسا ایسا انسان ہے جو انھیں پڑھ کر غم کی عمیق
میں ڈوب نہ جائے گا۔

شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے ۔۔۔ تو اب امیر کے خون سے شراب پیدا کر
گرے زمیں پہ جو میرا لہو تو غم مت کر ۔۔۔ اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر ۔۔۔ جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

(نوجوان سے)

بننے کی تمنا رکھتے ہیں ۔۔۔ مٹنے کا کلیجہ رکھتے ہیں
سرکش ہیں سر اونچا رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم

گو آج بھی ہیں ادبار میں ہم ۔۔۔ کہتے ہیں کھلے بازار میں ہم
ہیں سب سے بڑے سنسار میں ہم
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم

ہم قبضہ کریں گے دفتر پر ۔۔۔ ہم وار کریں گے قیصر پر
ہم ٹوٹ پڑیں گے لشکر پر
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم

(مزدوروں کا گیت)

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دمساز بھی ہیں ۔۔۔ روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں ۔۔۔ اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں
دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنت کر دو

(آہنگ نو)

ان نظموں میں ملک کے بچے بچے بھی خواہ کی روح بول رہی ہے۔ ایک ایسے انسان کا دل دھڑک رہا ہے جو انقلاب کی آمد کے لئے
... کا آرزومند ہے۔ یہ نظمیں ہندوستان کی تحریک آزادی کا لافانی اثاثہ ہیں۔ مجاز کے کلام میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ،
... الفاظ کا انداز اور بندش کا طریقہ استعمال صاف جھلکتا ہے۔ ان کے شیشے میں بادۂ شیراز کا رنگ بھی آسانی سے بھانا
ہے۔ مثال کے لئے ان کی نظم "نذر علیگڑھ" کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:-

اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا، یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

علیگڈھ سے اپنی عقیدت کا اظہار صرف ایک ہی شعر میں کس خوبی سے کیا ہے ؎

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

مضامین کے تنوع، شاعرانہ قدرتِ بیان اور جمالیاتی تاثرات کے لحاظ سے ان کی نظمیں "آج کی رات"، "بتانِ حرم" بے حد کامیاب ہیں۔

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
محو گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گذر آج کی رات
اور کیا چاہیئے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا تو بہ اندازِ دگر آج کی رات
پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات
نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیئے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات
ان کے الطاف کا اتنا ہی کرم کافی ہے
کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

(آج کی رات)

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرمِ نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا
دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھا نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم
وہ حجاب آگیں تکلم وہ رسیلے قہقہے
وہ نشاط آگیں تبسم وہ مد بھرے قہقہے
قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت
نقرئی لے کی صدا جنت کے سیاروں کے گیت
میرا نغمہ باعثِ دلداریٔ خوباں تو ہے
میرا نالہ غیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

(بتانِ حرم)

اور یہ ہیں ان کی "نورا" کے خلوص اور محبت کی رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے چند اشعار ؎

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارہ
وہ دیر و حرم کے لئے اک شرارہ
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
لبوں پہ تھا لعل و گہر کا خزانہ
نظر عارفانہ، ادا راہبانہ
مجھے بیٹھے بیٹھے شرارت کی سوجھی
جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
لبِ لعل افشاں سے اک شے چرا لی
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمعِ حیا رہ گئی جھلملا کر

(نورا)

...ی اور ریل" ان کی بہت مشہور نظم ہے جس سے ان کے فن کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں قافیوں پر قدرت ہی حاصل نہیں تھی ...حساس میں وہ حدت بھی تھی جس نے بیان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال دیا ہے۔ اس نظم میں دریا کی سی روانی ہے جس میں کہیں ...ُ نہیں اور آخری شعر پڑھ جانے پر بھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ نظم کا اختتام ہو گیا۔

مجاز کے سینے میں باغی سپاہی کا دل تھا جو اپنے ملک کو بہر صورت آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ انگریزوں سے انھیں شدید نفرت تھی۔ ...ظم "بدیسی مہمان سے" میں انھوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے کو کس خوبصورتی اور دلیری سے منظوم کیا ہے ؎

مسافر بھاگ وقت بے کسی ہے ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں سونے کے توڑے یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
یہ عالم ہو گیا ہے مفلسی کا کہ رسم میزبانی اٹھ گئی ہے
مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

...ہیں کہ انگریز حکمرانوں کو ہندوستان کی طاقت اور باغی ارادوں کی بیداری سے روشناس کراتے ہیں ؎

گھٹا جو اس سمندر سے اٹھی ہے دُرِ خوش آب بھی برسا چکی ہے
مگر اب اس کا عالم ہی جدا ہے یہ بدلی آگ برساتی اٹھی ہے
ستارہ صبح کا بے نور ہے اب در و دیوار پر دھوپ آ چکی ہے
یہاں ہر شاخ شمشیر برہنہ گلوں سے خون کی بو آ رہی ہے
یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہے

...وسری عالمگیر جنگ کا اختتام اپنے ساتھ برطانوی اقتدار کو بھی لیتا گیا۔ ہندوستان کو بھی آزادی نصیب ہوئی لیکن مونٹ بیٹن پلان ...کے مطابق دو حصوں میں تقسیم ہو کر۔ شروعات میں تو خارجیت پسند شعرا اور ادیب مونٹ بیٹن پلان کی آئینی باریکیوں سے متعارف نہ ہوئے ...ر رفتہ رفتہ ان پر اس نام نہاد کی آزادی کے تمام ناگزیر نتائج ظاہر ہوئے۔ چنانچہ مجاز بھی تمام عمر آزادی کے خواب دیکھ کر اپنی ...ظم "جشن آزادی" کا یہ بند لکھنے پر مجبور ہوئے ؎

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں ابھی وہ سعی جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغاز کار مرداں ہے

عرصہ دراز سے عورت فنکاروں کے اعصاب پر سوار رہی ہے اور کسی زمانے کا شعری ادب اس کے ذکر سے خالی نظر نہیں آتا۔ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہوگا کہ عورت کا ذکر ہی شعر و ادب میں نہیں ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے اور ضرور ہونا چاہیے کیونکہ عورت کے بغیر زندگی ادھوری ہے لیکن صحت مندانہ انداز میں۔ ذہنی عیاشی کی لذتیت کے طور پر جہاں بیشتر ادیبوں نے عورت کا ذکر کیا ہے جو قاری کو صحت مند اثرات قبول کرنے کے عوض ذہنی عیاشی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس قسم کے ادب سے جو انحطاطی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ سماجی زندگی کو مسموم کرتی ہے لیکن مجاز کے یہاں ذہنی عیاشی یا فراری ذہنیت کی مثالیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے عورت کو اپنی بہت سی نظموں کا موضوع بنایا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے بہت صحت مند انداز میں، جس سے جنسی بھوک کے غلبے کو زندگی نہیں ملتی بلکہ اس سماجی نظام سے جس کا عورت بھی مرد کی طرح شکار ہے دلوں میں ایک شدید نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے لیے

ان کی نظم "نوجوان خاتون سے" کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کا پردا بنا لیتی تو اچھا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس نظم سے مجاز کی وسعت نظر، بیداری شعور اور پختگی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔ نظم طویل نہیں لیکن بےحد کامیاب ہے۔ ایک ا
"مجھے جانا ہے اک دن" ؎

مجھے جانا پڑے گا تیری بزم ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو حسن کے پیروں میں ہے زنجیر حنابندی
ابھی ہے عشق پر آئین فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریک طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیر زنداں منتظر میری

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

یہاں محفل حسن و شباب سے جانے کا سبب تغافل یار نہیں بلکہ زندگی کے وہ اہم تقاضے ہیں جن کو حسن و عشق پہ فوقیت حاصل ہے

قریب قریب ہر شاعر ابتدائی دور میں حسن و عشق کی سبز و شاداب وادیوں سے گزرتا ہے۔ مجاز نے بھی خالص رومانی نظمیں کہی ہیں جو اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ مثلاً "عیادت"، "اعتراف"، "نذر دل"، "کس سے محبت ہے"، "ان کا جشن سالگرہ"، "بربط شکستہ"، "اصنام عشق"، "گریز"، "دام" وغیرہ۔ چند اقتباسات پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

ہر نفس روح میں لئے شورش طغیان بہار
ہر نظر شوق کا افسانہ [illegible] لئے

نشۂ ناز جوانی میں شرابور ادا
جسم ذوق [illegible] لئے

ایک سیلاب خروش اندام سواد مشترک
زلف [illegible] لئے

(۱)

[illegible]

جگمگاتا رہا ہر چشم نرگسیں ہیں۔
۔ [illegible] ہنسی کے ہر م طوفاں

وہ گورا پن سی سینوں پہ نمایاں
فضائے نور میں کیوپڈ کے شہپر
ادھر ہم نے اک آہ سرد کھینچی
ادھر پھر آگئی اپنے کئے پر

(اصنام عشق)

اے ٹو کہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی
چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

(ان کا جشن سالگرہ)

ین و جمیل خاتون کے لئے اس سے بہتر دعا کیا ہو سکتی ہے۔

لب علیں پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبین نور افشاں پہ نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی ہے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودۂ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

(کس سے محبت ہے)

تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے
گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں
میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردا اٹھا سکتا ہوں میں
تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر
مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

خر میں کہتے ہیں —

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

(نذر دل)

کا یہ شعر کتنا حسین ہے

ملی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی
کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے

ق میں مثلاً "حسرت تنہائی"، "اندھیری رات کا مسافر"، "خواب سحر"، "طفلی کے خواب"، "شکوۂ مختصر"، "پیمان"، "تنہا"
یہ تخلیقات ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے لحاظ سے الگ الگ بحث کرنا اور اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف
کا ذکر ضروری ہے اور وہ ہے "آوارہ"۔ یہ نظم ان کے دیوان کی سب سے زیادہ بلند کامیاب اور مشہور ہے۔
ہندوستان کے گوشے گوشے میں گونج چکا ہے۔ اردو ادب میں بہت کم نظمیں ہوں گی جن کو اس سے زیادہ
ان کی حسن و عشق کی جذباتی تصویر ہے۔ اس نظم میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، نشست الفاظ کا انداز۔

بندشوں کا طریقہ استعمال قابل قدر ہے اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ انکا روداد حیات ہے جو مجاز نے اپنے قلم سے کاغذ پر پھیلا دی ہے۔ نظم طویل ہے اس لئے ایک دو بند ہی مثالاً پیش کر رہا ہوں

راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ایک نظم اور جو انھوں نے گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر کہی تھی ذکر سے رہی جا رہی تھی۔ اس کے بھی دو اشعار بطور مثال پیش

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انساں چلا گیا
خوش تھے بدی جو دام پہ نیکی کو ڈال کے — رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

اب اردو شاعری کی اس حد سے زیادہ بدنام صنف پر آئیے جس کو غزل کہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہی کہ اس صنف ادب میں جبر کو زیادہ دخل ہے اور زندگی کے اہم مسائل کو کم لیکن اردو کے جدید غزل گو شعرا نے جنھوں نے غزلیات میں نئی قدروں کو اپنایا ہے۔ مجاز بھی ان میں سے ایک ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید ترین مرکزیت اور داخلیت بھی ہے اور ماورائیت اور جامعیت بھی۔ غزل میں اجمال اور رمزیت ہوتی ہے اس کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ معانی و مطالب کی تلخیص کر کے ایک طویل مضمون کو ایک یا دو اشعار میں ادا کر دیا جائے۔ مجاز کی غزلیات کے مندرجہ ذیل اشعار بھی نظموں سے کسی حالت میں کم زوردار نہیں ہیں ؎

اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے — جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

---

ہماری محفل جشن پہ جھوم اٹھی مجاز — وہ تو آواز شکست ساز ہے

---

یہ سب ہاتھ ہیں خون سے جن کے تر — یہی تھے مسیحا، یہی چارہ گر

---

خامشی کا تو نام ہوتا ہے — ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے

---

آشفتگی وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم — اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم راز تبسم پا ہی گئے
یہ رنگ بہار عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی — محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

---

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے میں نے اس کا جلال دیکھا ہے
جب بھی آنکھیں ملیں ان آنکھوں سے دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے

کہیں اک رند اور واماندۂ افکارِ تنہائی کہیں محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی

اے شوق نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجئے، ہم صورت جاناں بھول گئے

نہ پوچھ میری دنیا کو، میری دنیا میں خود آفتاب بھی ذرّہ ہے آفتاب نہیں

حسن کا غم بھی حسیں، فکر حسیں، داد حسیں ان کو ہر رنگ میں ہر طور سنور جانا تھا

بہت مشکل ہے۔ دنیا کا سنورنا تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے
ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں ابھی تو آنکھ بھی پرنم نہیں ہے

مجازؔ نے اچھے قطعات بھی کہے ہیں جن میں سے دو ذیل میں دیئے جا رہے ہیں ۔

اپنا غم اوروں کو دے، اوروں کا غم لینے سے کیا تیری کشتی پار لگ جائے گی اس کھینے سے کیا
بات تو جب ہے کہ مر جا عرصہ گاہ رزم میں اس پہ دم دینے سے کیا اور اس پہ دم دینے سے کیا

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے سحر و اعجاز دے رہا ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے موت آواز دے رہی ہے مجھے

مجاز نے اپنی نظموں، غزلوں، قطعات وغیرہ کی تخلیق میں انتہائی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ ان میں فکر کی گہرائی اور ماحول کی اثر آفرینی بدرجۂ اتم موجود تھی اور انھیں تمام چیزوں کی بدولت وہ وقت سے کچھ پہلے ہی پختہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر میں بہت زیادہ نہیں لکھا لیکن جو لکھا ہے وہ اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ ان کی موت سے اردو ادب کو جو زبردست نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔

# نواب سر نظامت جنگ بہادر

از:۔ جناب غلام پنجتن صاحب

آج سے سو سال پہلے روسو نے کہا تھا کہ "گو انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں ہے"۔ انسان کے دماغی ارتقاء نے ہر جگہ ان زنجیروں کے جوڑ کھول دیئے۔ انگریزی سامراج دماغی ارتقاء کو تو نہ روک سکا لیکن دیسی ریاستوں میں آزاد خیالی اسی حد تک آنے دی جو اس کی سامراجیت کی ہمنوا رہے۔ جب تک ہم اس بجڑا بٹاؤن نکالے بغیر اپنے اس زمانے کے مشاہیر کو دیکھیں گے ہم ان کی وہ قدر نہیں کر سکتے جس کے وہ حقیقتاً مستحق ہیں۔ ان کے وہ خد و خال نظر آ سکتے ہیں جو ان کو ایک امتیازی مقام پر پہنچاتے ہیں۔ نظام الدین احمد نواب افسر بہادر کے انتقال کے دو سال بعد ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ یہ سالار جنگ اول اور امیر کبیر کی کو ریجنسی (Regency) کا زمانہ تھا اس وقت برٹش ریذیڈنٹ کی سیاسی تحریکیں بندربھبکیوں کی حد سے نکل کر واجب التعمیل مشوروں کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس وقت بھی ان کا خاندان انتظامات ملکی میں منسلک تھا۔ ان سیاسی گھرکیوں کی ان کے بچپن کے کانوں میں پڑی تھیں۔ انہوں کے مقابے میں امراء کا غرور و نخوت کا جذبہ اور "صاحب عالیشان بہادر" احساس بے چارگی کا اظہار انھوں نے دیکھا تھا۔ ثروت و نکبت کے دلخراش فرق اور علم و فضل کی بے مائیگی کا ان پر اثر پڑا تھا اور یہ اپنی پختگیٔ عقل و سال و عروج کے زمانے میں اس خط پر بھی آنسو بہائے تھے جو لارڈ ریڈنگ سر علی امام کی برار کی واپسی کی کوششوں کے جواب میں شہریار دکن کو لکھا تھا۔ ان کے میٹرک کامیاب ہونے کے ایک پہلے سالار جنگ اول اپنی شکست خوردگی کا صدمہ لئے ہوئے دنیا سے سدھار چکے تھے۔ سالار جنگ نے جو طریقہ زندگی میں اچھے خاندانوں کے ہونہار بچوں کو انگلستان میں تعلیم دلانے کا کام شروع کیا تھا۔ اسی سے مستفید ہو کے تیاری انھوں نے سروجنی نائیڈو کے والد ماجد ڈاکٹر اگھور ناتھ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر کی اور مدرسہ عالیہ میں تعلیم کی۔ گو ان کی تعلیم کی ابتداء مدرسہ اعزہ میں ہوئی جس کی ترقی و توسیع کا خیال ان کو مدت العمر رہا۔ اسی زمانے میں سروجنی دیوی سے جو ادبی رشتہ قائم ہوا وہ ان دونوں میں باوجود سیاسی بعد المشرقین کے مدت العمر قائم رہا۔ خدادادی علم و داد کی صنف شاعری میں منزل بہ منزل استادی کے درجہ پر پہنچے۔ فرق اتنا رہا کہ سروجنی دیوی کا کلام شہرت دوام حاصل کر گیا اور انھوں نے اپنے احساسات ذہنی اور واردات قلبی کے شہ پاروں کو ایک خاص حلقہ سے باہر آنے نہ دیا۔ ۱۸۸۸ء میں یہ مرحوم ٹرینٹی کالج کیمبرج میں شامل ہوئے۔ وہ پہلے حیدرآبادی نوجوان تھے جنھوں نے ایل ایل بی کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور بیرسٹری کی سند لی۔

اگرچہ اس دور میں ٹوریزم (Toryism) کا دور انگلستان میں ختم ہو چلا تھا اور ڈیموکریسی اور ریڈیکل کالجوں میں آ گئی تھی۔ پھر ہندوستانیوں کو جن ٹیچروں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا وہ انھیں کا دل جانتا ہے جنھوں نے انیسویں کے آخری دور میں اس کو سہا۔ اس دور میں جو ہندوستانی نوجوان یورپ سے تعلیم حاصل کر کے واپس آتے تھے وہ سوائے چند خوش قسمتوں کے انگریز افسروں کی نظروں میں کھٹکتے تھے۔ وہ یا تو (yes-men) بنی خوشامد ...ار ہو جاتے تھے یا شہنشاہیت کے خلاف نفرت کا بیج بونے لگتے تھے۔ انھیں نوجوانوں کی زبوں حالی پر اکبر ...وی نے کہا تھا ؎

کچھ قدر نہیں اس کی پرستش بھی نہیں اس کی ۔ نیٹو کی لیاقت بھی مفلس کی جوانی ہے

فلسفہ جدید کے اکتساب کے باوجود نظام الدین احمد کی خاندانی سنجیدگی یورپ کے اخلاق سوز عادات پر ناک بھوں چڑھاتی رہی۔ انھوں نے تمدن جدید کے ہر آئین کو قطعی اور الہامیانہ سمجھا۔ تکمیل تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ حیدر آباد آئے تو انھوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح غیرت مندی کو ہر چوکھٹ پر ٹھوکر کھاتے دیکھا جس کو ان کی خودداری گوارا نہ کر سکی اور انھوں نے ترک وطن کر کے مدراس کا رخ کیا اور وہاں کے ہائیکورٹ میں "این رول" ہو گئے۔ ان کے دوران قیام انگلستان میں امراء کے محل صاحب کردار اور غیور طبیعتوں سے محروم ہو کر مصنوعی خلوص و محبت کے شیش محل بن چکے تھے۔ مدار المہام اور معین المہام کی حکومت ان کے معتمدین کے بل بوتے پر چلتی تھی۔ ۱۸۹۳ء میں محسن الملک، اس کے بعد وقار الملک پھر سردار الملک حیدر آباد سے خارج البلد ہو چکے تھے اور سردار دلیر الملک کی دلاوری کو گھن لگ چکا تھا۔ عماد الملک ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ ہی دنیاوی اقتدار سے قطع نظر کر کے پیشگاہ خسروی سے سررشتہ تعلیم کی جانب رجعت کر چکے تھے اور تمدن انسانی کے ضروری شعبہ جات کو قابل قدر امداد اور ملکی سیاسیات سے ہٹ کر خاموشی کے ساتھ پہنچا رہے تھے۔ مسٹر ہرمز جی ہوم سکریٹری تھے۔ ہرمز جی کو جب یہ معلوم ہوا کہ جس نوجوان کو ان کے بنگلے کا ایک ہی طواف عہدہ دلا سکتا تھا وہ مدراس ہائیکورٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے تو فوراً اطلاع نامہ جاری ہوا کہ حسب قرار داد یا تو سرکاری خدمت انجام دو یا تعلیم کی رقم واپس کر دو۔ جس طرح دوسرے درمیانی طبقے کے خاندانوں کی حالت تھی رفعت یار جنگ اولی کا حرم بھاری اور پٹارہ خالی تھا۔ نظام الدین احمد کے بڑے بھائی فصیح الدین احمد جو آگے چل کر رفعت یار جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اس وقت محض دوم تعلقدار تھے۔ نظام الدین احمد نے یہ گوارا نہ کیا کہ اتنی بڑی رقم کا بار ان کی خاندانی جائداد پر ڈالا جائے اس لئے وہ بادل ناخواستہ اپنی امنگوں اور امیدوں کی قربانی کر کے واپس آئے۔ انھیں صیغہ عدالت میں تقرر کر کے نچلا دیا گیا۔ اسی سال محض اپنے کردار اور قابلیت کے بل بوتے پہ انھوں نے ہوم سکریٹری دفتر میں دوم مددگاری حاصل کر لی۔ پھر معتمد عدالت عالیہ ہوئے۔ فوجداری بلدہ کی نظامت اول کو سنبھالا۔ انڈر سکریٹری مجلس وضع قوانین بنے۔ پھر رکن عدالت عالیہ اور میر مجلسی کی خدمت انجام دیتے ہوئے ۱۳۲۷ف کے پرآشوب زمانے میں معتمد سیاسیات ہوئے۔ کچھ سال کے بعد صدر المہام بنائے گئے۔ ان چوٹی کے عہدوں پر جو کچھ انھوں نے کیا اس کی تفصیل جاننے والے کو بیزار ... دیکھنی پڑیں گی۔ الحاصل انھوں نے مذہبی طغیانی کی تباہ کاری بھی دیکھی اور پھر حیدر آباد کو عروس البلاد ... ہوتے بھی دیکھ لیا۔ جب تک وہ عہدہ دار تھے زمانے نے ان کا ساتھ دیا مگر عمر کے آخری دور میں ... اور حیات اتنی بڑھی کہ انھوں نے وہ سیاسی طغیانی بھی دیکھ لی جس کے

روکنے کے لئے ۱۸۹۵ء سے اپنی پوری تدبرانہ قوت صرف کر رہے تھے۔

ان کا عمل بچپن سے بڑھاپے تک "زیستن برائے خوردن" پر نہیں رہا۔ ذمہ دارانہ عہدوں کی مصروفیت کبھی انحطاط پر نہیں ڈالا۔ ان کا علمی اور ادبی ذوق عماد الملک کی صحبت میں عالمانہ راستہ پر بڑھتا گیا۔ دائرۃ المعارف کی توسیع میں نظامت جنگ ان کے صلاح کار و معاون رہے۔ انھیں کی صحبت میں نظامت جنگ کو یہ یقین ہو گیا کہ امور والسنہ کی جانب توجہ نہ کی جائے اور محاسن مذہبی کو اجاگر نہ کیا جائے ترقی ناممکن ہے۔ ان کے مزاج کی شگفتگی سنجیدگی انھیں مرجھائے رکھتی تھی۔ مغرب کے بعد ان کے ہاں گنے چنے دو چار دوستوں جن میں نواب عابد نواز جنگ خصوصیت قابل ذکر ہیں کی صحبت میں ان کے ادبی لطیفے اور علمی بذلہ سنجیاں اپنا رنگ جماتی ہیں۔ جہاں ان کو اپنی انگریزی نظم اور وہ عابد نواز جنگ کی انگریزی نظموں کے اردو نظم میں ماہرانہ ترجموں کی داد دیتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ ان دونوں منظر عام پر نہیں آئے۔ ۱۹۱۸ء میں ان کی چند نظموں کا مجموعہ لندن میں بڑے اصرار کے بعد شائع ہوا۔ انگلستان کی ادبی د کی بڑی آؤبھگت ہوئی۔ جنگ عظیم کے بعد بہت کچھ کالے پن کا پردہ اٹھ چکا تھا اور ہندوستانیوں کی لیاقت کا اعتراف برکھلا کم ہو گیا تھا۔ نظامت جنگ کے پاس تحسین و مبارکبادی کے بہت سے خطوط آئے۔ والد مرحوم نواب سراج یا بہت کچھ چاہا کہ وہ کم سے کم چند خطوط کے اقتباسات شائع کر دیئے جانے پر راضی ہو جائیں مگر انھوں نے مرئیں میں نہ ا باوجودیکہ ان کے کلام و گفتار میں موسیقیت تھی وہ عیش و نشاط کی صحبتوں سے خواہ ان کے ہم عمر و ہم رتبہ دوستوں ہی کی کیوں بہت دور بھاگتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ساری عمر برہمچاری رہے۔ ان کے اخلاق و تہذیب کی بلندیاں بڑے بڑے سربلندوں دا تعظیم کرا رہی تھیں۔ ان کی خودداری میں جبیں سائی کے فقدان اور تنہا پسندی کے میلان نے انھیں مغرور اور جاہ پسند مشہور کر مگر جن کو انھیں قریب سے دیکھنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا وہ ان کے دلدادہ رہے۔ ان کو مرحوم میں وہ خوبیاں نظر اور ان کی دوستی میں وہ راحت اور استقامت تھی جس کا اس پُر بہار ملک میں قحط تھا۔ ان کی سب میں بڑی خوبی جس نے ہر دلعزیز بنا رکھا تھا یہ تھی کہ وہ نوجوان اہل غرض کو امیدوں میں بہلانا ناپسند کرتے تھے اور پہلے ہی ملاقات میں معلوم کرا دیتے اسے کس حد تک مدد کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ یہ کہنے والے تو بہت سے ملیں گے کہ نظامت جنگ نے مجھے ٹکا سا جواب دے ایسے غالباً مشکل سے ملیں گے جو یہ کہہ سکیں کہ مجھے نظامت جنگ نے یہ کہا تھا مگر کیا کچھ نہیں۔

۱۹۰۱ء میں سرور نگر میں ملکہ وکٹوریہ کی یادگار میں ایک یتیم خانہ قائم کرنے کی تجویز ہوئی۔ اسی غرض سے ایک کمیٹی فراہم کرنے کے لئے بنائی گئی جس کے وہ اعزازی معتمد بنے۔ جو کوششیں انھوں نے اس سلسلہ میں کیں اس کے افتتاح پر سر ڈیوڈ بار رزیڈنٹ وقت نے پرخلوص الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ اسی وقت سے جو رزیڈنسی کی نظروں میں چڑھے ہی تو ہی چلے گئے۔ پہلی جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں ۱۹۱۹ء میں وہ او۔بی۔ای ہو گئے پھر سی۔آئی۔ای اور نواب صدر المہامی پر بن گئے۔

سر آسمان جاہ کی وزارت کے زمانے ہی سے سکّے کا مسئلہ ایک پریشان کن صورت اختیار کرتا چلا آ رہا تھا جس کو سر کیسن نے اپنی معین المہامی کے دور میں ایک قانون منظور کرا کر ختم کرا دیا۔ سر کیسن نے اس سلسلہ میں نظامت جنگ کی معلومات و معاملہ فہمی کا کھلم کھلا اعتراف کیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ سب عہدہ داروں سے زیادہ مفید مشورے نظامت جنگ نے دیئے جن کی بنا پر انھوں نے اس مسودے کے دفعات پر غور کر کے اور ترمیمیں کیں۔ رود موسیٰ کی طغیانی کے بعد بازیابی و تقسیم مال کی جو

کی گئی اس کی نگرانی حلقۂ بیرونِ بلدہ بھی ان کے سپرد ہوئی۔ اس کام کو جس خوش اسلوبی اور ہمدردی سے انھوں نے
کو پہنچایا اس کے سراہنے والے اور مرحوم کو دل سے دعا دینے والے آج بھی موجود ہیں اور ان کی خلوص اور ہمدردی
تے ہیں۔ عدالت اور امورِ عامہ کی معتمدی کے زمانے میں انھوں نے بیت المعذورین کے قیام کی کارروائی شروع کی اور
سے دو ہزار روپئے ماہوار کی ماہانہ امداد منظور کرائی۔

جوڈیشل اور ایگزیکیوٹو اختیارات کی علحدگی کی داغ بیل انھیں کے ہاتھوں پڑی۔ جب انھوں نے اپنے زمانۂ معتمدی میں
انونی کی شرکت میں تحصیلداروں سے دیوانی کے اختیارات لئے جانے اور منصفوں کی تعداد بڑھانے کی اسکیم سرکار میں پیش
تھوڑی ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی۔ جب حیدرآباد میں سٹی امپروومنٹ بورڈ قائم ہوا تو اس کی اعزازی معتمدی کے فرائض
انھیں کے کاندھوں پر ڈالا گیا۔ یہ کام کافی وقت اور سردردی چاہتا ہے۔ شہر کی آرائش اور گنجان آبادی کی توسیع و اصلاح
کا نام صدیوں زندہ رکھے گا۔ کرشنا اور تنگبھدرا کی تقسیم آب کا جھگڑا مدراس اور حیدرآباد کی حکومتوں کے درمیان سالہا
سے چلا آرہا تھا۔ دونوں حکومتوں کا ایک مشترکہ بورڈ اس مسئلہ کو تصفیہ کرانے کے لئے بلایا گیا۔ انھوں نے لارڈ پینلینڈ
(Lord Pentland) کو راضی کرلیا۔ حکومت کی طرف سے مسٹر مکینزی چیف انجنیر اور مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم شریک
ئے۔ اس بورڈ کے ذریعہ اس امور کو منظور کرالیتے ہیں جن پر حیدرآباد کی حکومت کو اصرار تھا یہ وہ کامیاب ہوگئے۔

سر علی امام جب حیدرآباد میں آئے اور بابِ حکومت کی تنظیم عمل میں آئی تو انہیں میں انھوں نے سر علی کی بڑی مدد کی
کا خود سر علی نے باربار اعتراف کیا ہے۔ دو سیاسی شخصیتوں کے درمیان باوجود دوستی اور ہم جلیسی کے شبہات کا جو غبار خود
وا پیدا رہتا ہے وہ تھوڑے ہی دنوں میں چاک ہوگیا۔ سر علی اور ان میں اختلافات ہوئے لیکن کبھی ایک دوسرے کی نیت پر
نہ ہوسکا اور نہ ذاتیات کا بیر کبھی ان اختلافات میں نمایاں ہوا۔ دونوں کی انداز زندگی اور طبیعتوں میں فرق تھا۔
امت جنگ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے عادی تھے۔ سر علی گو ایک ماہر ڈپلومیٹ اور کامیاب ایڈوکیٹ تھے لیکن
کبھی ان کی طبیعت جوش میں آجاتی تھی اور وہ اپنے پیش نظر مقصد کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ داؤں پر لگادیتے تھے۔
ں نے شملہ اور دہلی کا گرم و سرد دیکھا تھا وہ حیدرآباد اور بلارم کے خشک و تر سے قطعی ناواقف تھے۔ نظامت جنگ ان او نچے
باروں سے واقف تھے جو آئے دن ہندوستانی ریاستوں میں چلتے رہتے تھے۔ پرنس آف ویلز کی مہمان داری کے سلسلے میں راج
منوانے میں سر علی نے لارڈ کرزن اور ایسے بلند پایہ انگریز سے ٹکر لی اور نظام دکن کی شان رکھ لی۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ وہی جس کا
امت جنگ کو خدشہ لگا ہوا تھا ادھر جب سر اکبر اور سر علی کی بھی تو حضور نظام نے علی امام کے بازو پر رخصتی امام ضامن
ھ دیا۔ ادھر گورنری کیا بلکہ شہنشاہ ہند کی پریوی کونسل کی ممبری تک سے سر علی محروم ہوگئے جو وائسرے کے دوسرے ممبران
ن کو ملی اور سر اکبر کو ۱۹۳۶ء میں یہ اعزاز بھی دیا گیا۔ انھیں سر علی کے چلے جانے کے بعد سے جن سیاسی گتھیوں میں آئے اور جہاں
ی الجھا پڑا ان پر نظر ڈالتا۔ آج جب کہ شہنشاہیت اور آصفجاہیت دونوں ختم ہوچکی ہیں عبث ہے۔ اپنی سیاسی زندگی میں
ں نے اپنے ادبی ذوق کو کم ہونے نہیں دیا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے نزن ادب کے میر مجلس بنے۔ انھوں نے پہلے کونوکیشن کے جلسہ
یم اسناد و انعامات میں جو خطبہ پڑھا وہ آج بھی اتنی تعلیمی ترقی کے بعد کسی ماہر تعلیم کے سامنے رکھ دیا جائے تو وہ یہ بھی کہے گا
ں کا مصنف تعلیم کا حقیقی دوست ہے اور علم کو علم بالذات سمجھ کر اس سے شیفتگی رکھتا ہے۔ اس کے فقرے فقرے سے عالمانہ
ن ٹپکتی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں ایسے پروفیسر چاہتے تھے جو تعلیم کا اصل اصول شفقت اور تربیت کو قرار دیں۔ اگر اساتذہ کے

تقریر میں ان کی جان جاتی تو ہندسے ماتم سے شروع ہو کر دکنشا پر چڑھائی تک کے جو سلسلے ہیں سر اکبر حیدری کو دیکھنا پڑے اس کی نوبت نہ آتی۔ اس سے زیادہ ملک کی کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ جس نے اپنی پوری پوری عمر فنون لطیفہ کی خدمت میں صرف کر دی ہو اس کے مرنے کے بعد اس کے شاعرانہ دل و دماغ کو لندن میں سڑایا جائے اور یہاں ایک نوجوان گریجویٹ بھی نہ نکلے جو ان کی انگریزی نظم سنا سکے۔

ذاتی اغراض کے تحت اور بے غرض خدمت خلق کرنے والوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن کھل ہی جاتا ہے۔ جزا سزا کی قائل، قیامت پر ایمان بالغیب رکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ حکومت سے علٰحدہ ہو کر سر نظامت جنگ مرحوم و مغفور کا جو زمانہ گزرا اس میں انھوں نے کتنا توشۂ آخرت جمع کیا یہ ان کے خلوص ہی کا کرشمہ تھا کہ ان کا قلب "دیار حبیب" کی لیس ماندہ فاقہ کش مصیبت زدہ عوام کے درد سے تلملا اٹھا۔ حج و زیارت کی دولت سے مالا مال ہو کر جب واپس لوٹے تو وہ شیخ سعدی کے "خر عیسیٰ" کے مصداق نہ بنے۔ انھوں نے "دامے، درمے، قدمے" مدینہ والوں کو راحت پہنچانے کے لئے اپنے مقدور سے کہیں زیادہ کیا۔ اس ضعیف العمری میں گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر جو خدمت انھوں نے کی وہ ان کی قبر کو تا قیامت منور رکھے گی اور میدان حشر میں ایسی آن بان سے چلتا دیکھے گی جس سے وہ دنیا کے درباروں میں چلتے تھے۔ ان کی عمر کچھ اور رہ کر وفا کرتی تو وہ ہز مجسٹی سلطان نجد اور خادم حرمین شریفین کو اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے دیکھ لیتے۔ مگر انھیں موت نے ایروڈرام پر جانے نہ دیا اور دنیا ہی عقائد کی بندشوں نے خادم مدینہ کو اس شیدائے مدینہ کے مزار پر آنے نہ دیا۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار — گلچین بہار توز داماں گلہ دارد (از سیاست)

---

# سر نظامت جنگ مرحوم کو خراج عقیدت

**ڈاکٹر سید محمود کی تقریر**

ڈاکٹر سید محمود وزیر خارجہ امور ہند نے سر نظامت جنگ مرحوم کے رفقائے کار سے خواہش کی کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں جو کام شروع کئے تھے انھیں جاری رکھیں۔ ڈاکٹر سید محمود نے آج صبح مرحوم کی قائم کردہ مجلس علم و عمل کا معائنہ کیا اور مجلس کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی

نواب مہدی نواز جنگ وزیر طبابت، ڈاکٹر جی۔ ایس ملکوٹے وزیر تعمیرات اور سابق وزیر نواب لیاقت جنگ، ڈاکٹر نظام الدین اور مسٹر حسن الدین احمد بھی شامل ہیں' ڈاکٹر محمود کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے اس موقع پر ممتاز اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نظامت جنگ مرحوم اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ ہندوستان ہی میں مقبول نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت بین الاقوامی تھی وہ ایک انسان کامل تھے۔ انھوں نے جس ڈھنگ سے اپنی زندگی گزاری ہے وہ سب کے لئے قابل نمونہ ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مرحوم نے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اب مسلمانوں خصوصاً ان کے رفقائے کار کا یہ فریضہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کام کو آگے بڑھائیں جسے انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔

**ڈاکٹر ملکوٹے کی تقریر**

ڈاکٹر جی۔ ایس ملکوٹے نے نظامت جنگ مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موجودہ زندگی مرحوم کی رہبری اور ہدایت کی منت پذیر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ مرحوم کا اپنے والد کی طرح احترام کرتے تھے اور وہ بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی موجودہ زندگی مرحوم کی زندگی کا عکس ہے

مرحوم نے نہ صرف نوع انسان کی بے لوث خدمت کا سبق نہیں سکھایا بلکہ سیاسی زندگی میں بھی ان کی رہنمائی کی۔ مرحوم کی شخصیت عالمی حیثیت کی حامل تھی۔ مرحوم بعض باتیں ایسی کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے باخبر ہیں۔ غرض کہ وہ ایک سچے مسلمان اور اچھے انسان تھے۔ ڈاکٹر ملا ہوترا نے کہا کہ نواب صاحب مرحوم نے جو زمین جس کی قیمت تقریباً (۴۰) ہزار روپے ہے بغرض تعمیر دواخانہ مجھے مفت عنایت کی تھی اس کو میں بخوشی واپس کرنے تیار ہوں کیونکہ میں موجودہ حالات کے لحاظ سے تعمیر دواخانہ کے موقف میں نہیں ہوں۔

## مرحوم کی یادگار

نواب ناظر یار جنگ بہادر نے معزز مہمانوں سے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا اور ایک مختصر اور جامع تقریر کی جس میں انجمن کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور نواب صاحب مرحوم کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک مکمل انسان تھے اور آخر عمر تک اپنی تمام صلاحیتوں کو نہ صرف علم و ادب بلکہ قوم کی اصلاح کے لئے کوشش کرتے رہے اور اپنی تمام جائداد وقف کر دی۔ یہ ان کے ایثار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس پر ہم لوگ ان کی یادگار کے طور پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

نواب لیاقت جنگ بہادر نے کہا کہ نواب سر نظامت جنگ مرحوم نے جس قدر ایثار کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مرحوم ایک سچے مسلمان اور مکمل انسان تھے۔ مرحوم نے اپنی یادگار ایک انجمن چھوڑی ہے جس کو چلانا اور اس کے کام کو آگے بڑھانا نہ صرف ان کے جانشینوں بلکہ دوستوں کا بھی فریضہ ہے کہ مرحوم کی روح کے لئے خوشی کا [illegible] یا ہو۔ مولوی نور الاسلام صاحب نے نواب چھتاری کا پیغام تعزیت اور لندن ٹائمز و دیگر اخبارات کے اقتباسات پڑھ کر سنائے ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے سر اسٹیورڈ فریز سابق رزیڈنٹ حیدرآباد کا پیام تعزیت موسومہ مولوی میر باسط علیخاں صاحب پڑھ کر سنایا جس میں نواب صاحب مرحوم کو دولت مشترکہ کا بہترین تاجر خیال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب کو صدر نشین انجمن علم و عمل نواب مرحوم کے جملہ تصانیف کا ایک سٹ پیش کیا گیا۔ موصوف نے حسب استدعا اراکین انجمن علم و عمل نواب صاحب مرحوم کی تصویر کی نقاب کشائی کی جس کے لئے مولوی میر باسط علیخاں صاحب نے خاندان کی جانب سے ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کی کہ خدا ہم سب کو مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

## مکتوب ڈاکٹر جی۔ ایس ملکوٹے (وزیر تعمیرات حکومت حیدرآباد) بنام نواب مولوی عظیم الدین احمد صاحب برادر خورد نواب نظامت جنگ مرحوم

محبی نواب عظیم الدین احمد صاحب اور افراد خاندان!

اس دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ یہ واقعہ ہے کہ اگرچہ ہم میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں ہماری ہستی بالکل فانی ہوتی ہے تاہم ہر ایک آخر وقت تک توقع رکھتا ہے کہ ہمیشہ جیوں گا۔ یہی امید انسان کو ہمت دیتی ہے اور اسی وجہ سے ہم کو امید تھی کہ نواب صاحب اگرچہ عمر رسیدہ ہیں لیکن وہ طویل عرصہ تک زندہ رہیں گے۔

آدمی روز پیدا ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ایسا نہیں بن سکتا کہ لوگوں کی محبت اور عقیدت حاصل کر سکے۔ ان کے اعلیٰ تصورات، سادہ زندگی، وسعت خیال، طریقہ غور و فکر، ان کی اپنے اطراف پیدا کی ہوئی روحانی فضا، ہر قریب آنے والے کے ساتھ پدرانہ شفقت، بچوں سے محبت، وسیع فیاضی، اعلیٰ انتظامی قابلیت اور پاکیزہ تصورات وغیرہ کی وجہ سے ہر بڑا اور چھوٹا ان سے محبت اور احترام کرتا تھا۔ وہ جس طرح تفصیلات پر نظر رکھتے اور غریبوں سے محبت کرتے تھے اس سے وہی شخص واقف ہو سکتا تھا جو ان کو قریب سے جانتا تھا۔ انھوں نے جو کچھ بھلائی کی اس کی اطلاع و تشہیر کی کبھی اجازت نہیں دی۔ اس لئے جب تک کوئی ان کے قریب نہ ہو جاتا ان کو معلوم ہی نہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے انسان تھے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ ان کی وفات کے باعث گویا میں اپنے باپ سے محروم ہو گیا ہوں۔ میرے ساتھ ان کو بہت

غیر معمولی محبت تھی اور اگرچہ میرا دماغ یہ صدمہ اٹھانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تاہم ان کی موت کی خبر نے مجھے مبہوت بنا دیا۔ آج بھی ہر وقت میں دیوار پر سے نظر ڈالتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ان کی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ آج وہ بالکل تاریک ہے۔ ان کا جسم نہیں بلکہ ان کا روحانی فیضان مجھے متاثر کرتا ہے اور میں اب بھی ان کو موجود پاتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان کا یہ فیض ہمیشہ جاری رہے۔

میں آپ کے جذبات میں آپ سے ہم آہنگ ہوں اور اپنی بیوی، بھائیوں، بچوں، دیگر افراد خاندان اور خود اپنی طرف سے آپ اور خاندان کے ہر فرد کو اور ان کے قریبی دوستوں کو پیام تعزیت بھیجتا ہوں۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔ وہ ہمیں اور آپ سب کو اس صدمہ کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

آپ کا مخلص جی۔ ایس۔ ملکوٹے

(انگریزی سے ترجمہ)

## مکتوب سر اسٹیورڈ فریزر (سابق ریزیڈنٹ حیدرآباد) بنام نواب میر باسط علیخاں صاحب (داماد نظامت جنگ مرحوم)

عزیزی باسط!

سر نظامت جنگ کی وفات نے مجھے اپنے ایک قدیم ترین دوست سے محروم کر دیا۔ یہ معلوم کر کے تسلی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ضعیفی میں تنہا نہیں تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نیند میں اطمینان کے ساتھ فوت ہوئے اور اس طرح ان کو اور ان کے دوستوں کو ایک طویل علالت کی زحمت برداشت کرنی نہ پڑی۔ وہ ایک غیر معمولی اہمیت کے انسان تھے۔ میری رائے میں تو دولت متحدہ نے ان سے بڑا شاعر نہیں پیدا کیا اور یہ قابل غور ہے کہ ان کے الہامات کا ماخذ ان کی آخر عمر تک جھلکتا رہا۔

ہماری دوستی طویل المیعاد ہونے کے سبب ایک غیر معمولی قسم کی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو سنہ ۱۹۱۴ء، سنہ ۱۹۱۸ء کی لڑائی کے زمانے میں اچھی طرح پہچان لیا۔ لیکن جب میں سنہ ۱۹۲۰ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہو گیا تو پھر ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے اور ہماری دوستی (۳۵) سال تک بذریعہ تحریر جاری رہی۔

میں آپ کو تعزیت کا خط پہلے ہی لکھتا لیکن میں نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ اس غیر معمولی فلسفی شاعر پر لندن ٹائمز میں ایک تعزیتی مضمون نہ چھپا لیکن چونکہ اس میں ان کے آخر زمانہ کا ذکر نہ تھا اس لئے میں نے حسب ذیل تعزیتی تحریر ٹائمز میں چھپوائی۔

"میں نے سر نظامت جنگ کے بارے میں آپ کا تعزیتی نوٹ پڑھا لیکن میں ان کی عمر کے آخری سالوں کے کارناموں کے بارے میں چند سطور کا اضافہ چاہتا ہوں۔

انگریزی شاعری اب بھی عوام میں ان کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور ان کے کلام کے جو نسخے مجھے وقتاً فوقتاً ملتے رہے ان کا موضوع ان کی ابتدائی نظموں کی طرح انگلستان کی محبت اور اس کی بڑائی سے تعلق خاطر ہی رہا۔ مثال کے طور پر یہ نظمیں قابل ذکر ہیں — یوم سلطنت (ایمپائر ڈے) پر ان کے خیالات جو سنہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۱ء کی لریکل نظمیں اور شاہ جارج ششم کی وفات پر سنہ ۱۹۵۲ء میں ان کی نظم اور دوسری الزبتھ کی تخت نشینی کی نظم جو ایک رات قبل پہلی جون کو جوا [illegible] لکھی تھی وغیرہ وغیرہ۔

پکا مذہبی ایقان رکھنے والے صوفی کی طرح انھوں نے قرآن بحیثیت رہبر زندگی ایک مضمون لکھا تھا اور باوجود ضعیفی اور کمزوری صحت کے آخر وقت تک [illegible] مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی جرائد بھی اس غیر معمولی انسان کے بارے میں ضرور لکھیں گے۔ براہ کرم میری مخلصانہ تعزیت قبول کیجئے۔

آپ کا مخلص

(انگریزی سے ترجمہ)

# گولکنڈہ

از:- جناب اشفاق حسین صاحب

— یہ بالا حصار ہے۔ گولکنڈہ کی اس بلندی سے
قطب شاہی بادشاہوں نے آندھرا دیس میں ایک
نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔
۱— ایسا تمدن جس میں ترکستان اور ایران کے شان و شکوہ
کے ساتھ تلنگانہ کی سندرتا اور کومتا بھی
۱— بلند اور عظیم الشان محلوں کے پاس ہی مندر اور
مسجد کی تعمیر اس تمدن کی حقیقی آئینہ دار ہے۔
۲— تلنگانہ کے نظر فریب مناظر، دلکش تالاب اور
حسین چٹانیں اور ان کے دامن میں دور دور
تک پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت۔
۱— اور کھیتوں میں گونجنے والے دلکش گیت۔
۲— ان سب نے قطب شاہوں کے دل میں رس اور
مٹھاس بھر دی۔ اور انھوں نے ایسے تمدن کی داغ
بیل ڈالی جس میں ایرانی نغموں کا کومل پن اور
دکنی گیتوں کا رس ہے۔
۱— گولکنڈہ کی سلطنت کو ختم ہوئے ڈھائی سو سال ہوچکے
مگر آج بھی ان کے تمدن کے نقوش سرزمین دکن پر ثبت
ہیں اور اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب یہ سرزمین
انسانوں کے میل جول کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔
۲— گولکنڈہ کا پہلا فرمانروا سلطان قلی قطب شاہ ترکستان کے
[illegible] سے آیا تھا۔ بہمنی سلطنت کے آخری دور
میں [illegible] اور ذہانت سے

گولکنڈے کا صوبہ دار تھا اور جب بہمنی سلطنت ختم ہوئی
تو اس نے گولکنڈے میں قطب شاہی سلطنت کی
بنیاد رکھی۔
۱— اس طرح ترکستانی اور بہمنی تمدن کا ملاپ تلنگانے
کے تمدن سے ہوا اور قطب شاہی تمدن پر مقامی
رنگ اس درجہ غالب آگیا کہ نصف صدی کے بعد
گولکنڈہ ایک آندھرا راجدھانی بن گیا۔
۱— اور قطب شاہی بادشاہ آندھرا کے راجہ معلوم ہونے
لگے۔ اہل تلنگانہ گولکنڈے کو اپنی سلطنت سمجھنے لگے۔
۲— قطب شاہوں نے تلنگانے کو اپنا گھر بنالیا اور
آندھرا کی معاشرت کو اپنا کر ترکستانی وضع قطع چھوڑ
مقامی لباس اور طور طریق اختیار کیا۔
۱— انھوں نے تلگو کی سرپرستی ہی نہیں بلکہ خود تلگو سیکھی
اور اس میں شاعری کی۔
۲— تلگو کے علاوہ صدیوں کے میل جول سے دکن میں
جو نئی زبان دکھنی بن رہی تھی۔ قطب شاہوں نے
اس کی ترقی میں دل کھول کر حصہ لیا۔
۱— نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کی اور نثر نگاروں کو
نوازا بلکہ خود شاعری کی اور ایک لازوال سرمایہ چھوڑ گئے۔
۱— گولکنڈے کی علم نوازی کے ساتھ اس کی دولت و ثروت
کی شہرت دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی اور
گولکنڈے کے ہیرے ساری دنیا میں مشہور ہوگئے۔

دنیا کے مشہور ہیرے کوہ نور کو گولکنڈہ ہی کی چٹانوں نے اگلا تھا۔

۲۔ ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں سے تجارتی کارواں اور سیاح گولکنڈہ آنے لگے۔

۱۔ اور گولکنڈہ کا شمار قرون وسطیٰ کے متمدن ترین ملکوں میں ہونے لگا۔

۲۔ گولکنڈہ کی تاریخ کا زریں دور ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔

۱۔ اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد میں ابراہیم کو وجیانگر کے راجہ رام راج کے یہاں پناہ لینی پڑی۔

۲۔ راجہ رام راج نے ابراہیم کی غیر معمولی آؤ بھگت کی۔ ابراہیم سات سال تک وجیانگر میں رہا۔

۱۔ جنوبی ہند کی اس عظیم الشان سلطنت میں رہ کر ابراہیم نے تمدنی بصیرت حاصل کی اور وہیں گولکنڈہ کی سلطنت کو ایسی بنیادوں پر قائم کرنے کا عزم کیا جن میں ایران اور تلنگانہ کا حسین ملاپ ہو

۲۔ جمشید قطب شاہ کے بعد ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی تلنگانہ کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا۔

۱۔ وجیانگر سے چل کر جب ابراہیم کا کاروان گولکنڈہ کی دیواروں کے قریب پہنچا تو گولکنڈہ کا بچہ بچہ شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

۲۔ ابراہیم کے استقبال کے لئے گولکنڈے کے بوڑھے جوان بھی قلعہ کے باہر نکل آئے اور شاہانہ جشن کا اہتمام کیا گیا۔

(پس منظر میں ہجوم کی آوازوں کے ساتھ باجوں اور ہاتھیوں کی آوازیں)

۱۔ جگدیو راؤ اور اس کے ساتھیوں نے قلعہ کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعہ میں چلنے کی درخواست کی۔

۲۔ ان ہی جاں بازوں کی مدد سے ابراہیم کو گولکنڈہ کا تخت نصیب ہوا۔

۱۔ ابراہیم کی تخت نشینی گولکنڈہ کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا۔

۲۔ دیورکنڈے اور وجیانگر کے قیام نے اسے تلگو زبان اور تلگو ادب سے روشناس کرایا۔ ابراہیم نے نہ صرف سیکھی بلکہ اس پر اتنا عبور حاصل کیا۔

۱۔ تلگو ادب کے آسمان پر اس وقت جو تارے تھے وہ ابراہیم کی توجہ اور سرپرستی سے تابناک ہو

۲۔ اسی دور میں مشہور تلگو شاعر گنگادھر نے تلنگانہ فضاؤں میں اپنے نغمے بکھیرے۔ ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی میں اس نے تلگو ادب کی مشہور کتاب "تپتی سمورنا پاکھیانم" لکھی

۱۔ تلگو ادب اور آندھرا کلچر سے بادشاہ کی اس دلچسپی دیکھ کر قطب شاہی امرا نے بھی تلگو ادب کو نوازا۔

۲۔ پٹن چیرو کے صوبہ دار امیر خاں کے دربار میں تلگو ایک اور مشہور شاعر "ہنگر کنٹی تنگا آریہ" کی قدر و منزلت ہوئی اور اس نے مشہور کتاب "یایاتی چرترا" اپنی یادگار چھوڑی۔

۱۔ ابراہیم قطب شاہ کے فیض سے جہاں علم و ادب سرسبز ہوئے اس کی حسن نظر نے آندھرا دیس کے قطعوں کو گلزار بنا دیا۔ یہ دیکھی کا تالاب یعنی ابراہیم پٹن اور حسین ساگر اس کی ذوق تعمیر کی یادگار

۲۔ اور سب سے بڑھ کر موسیٰ ندی کا پہلا پل ہے۔ محبت بھرے دلوں کی دھڑکن جس کی تعمیر کا باعث اور دو بچھڑے دلوں کو ملانے کے لئے موسیٰ ندی کنارے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے

۱۔ ابراہیم کے سب سے چھوٹے صاحب کردار بیٹے شہزادہ محمد قلی کی سچی محبت کی خاطر شاہی کی مسار

مصلحت پسندیوں کو قربان کردیا۔

۲۔ شہزادہ قلی اور بھاگ متی کے فسانۂ عشق کی یہ اولین یادگار ۔۔۔ پرانا پل ۔۔۔ اپنی تعمیر کے لئے شہزادہ کے جذبِ عشق اور ابراہیم کی بے مثل بصیرت کا رہین منت ہے۔

۱۔ شہزادہ قلی اور بھاگ متی کی داستان عشق۔

(چار پانچ لڑکیوں کے قہقہے)

**شہزادہ** یہ سب کیا ہورہا ہے اخلاص خاں۔

**اخلاص** جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل۔ صاحب عالم

**شہزادہ** ہم تنہائی چاہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہاں سے چلی جائیں کہدو کہ یہ قہقہے ہمارا دل بہلانے کی بجائے ہمیں کچوکے دے رہے ہیں۔

**اخلاص** عرب، ایران، ارمینیا، ترکی اور گجرات کی یہ حسین دوشیزائیں جہاں پناہ نے یہاں اس لئے رکھی ہیں کہ شہزادہ کا دل بہلے ۔۔۔ جہاں پناہ کا خیال ہے کہ صاحب عالم کا بھاگ متی سے لگاؤ جوانی کی ایک ترنگ ہے۔

**شہزادہ** جوانی کی ترنگ ۔۔۔ جو آگ ہمارے جسم و جاں میں لگی ہوئی ہے اسے کون جان سکتا ہے۔ یہ کمزور بند اس طوفان کو نہ روک سکیں گے اخلاص خاں۔ ہمارا جسم چھلکا جارہا ہے۔

**اخلاص** ایک رقاصہ کی خاطر یہ بے چینی صاحب عالم

**شہزادہ** اخلاص خاں ۔۔۔ تم ہمارے پرانے رفیق ہو ہمارے غم کے شریک بن سکو تو کچھ کہے نہ دو۔

**اخلاص** صاحب عالم ۔۔۔ دنیا کی حسین سی حسین دوشیزہ آج شہزادہ کے نظرکرم کی منتظر ہے۔

**شہزادہ** پر اب ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ایک دل تھا سو وہ نذر ہوگیا۔

**اخلاص** خوب سوچ لیجئے صاحب عالم ۔ جہاں پناہ کا خیال کیجئے۔ اس عظیم سلطنت کا خیال کیجئے جس کی عنان ایک دن آپ کو سنبھالنی ہے۔

**شہزادہ** محبت کی اس راہ پہ ہم اتنا آگے بڑھ چکے کہ لوٹنا ممکن نہیں۔ اب کوئی آہنی دیوار بھی سرراہ ہو تو ہم اس سے ٹکر لینے میں دریغ نہ کریں۔ محبت کی خاطر ہم بڑی سی بڑی قربانی دینے کا عزم کرچکے ہیں۔ آخر بار سن لو اخلاص خاں ہم سلطنت کو ٹھکرا سکتے ہیں مگر بھاگ متی کو نہیں۔

**اخلاص** صاحب عالم!

**شہزادہ** ہم جو عہد کرچکے اسے نبھانا ہمارا فرض ہے۔ چاہے اس میں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگا دینی پڑے۔

**اخلاص** صاحب عالم!

**شہزادہ** (کھوئے ہوئے انداز میں) کسے خبر تھی کہ محبت کی ٹھنڈی چھاؤں ریگستان کی تپتی دھوپ بن جائیگی۔ کون جانتا تھا کہ سکھ اور شانتی کی چند گھڑیوں کے بعد مسلسل اضطراب ہمارے زندگی سے لپٹ جائے گا۔ محبت کی وہ مسرت آگیں اولین گھڑی آج بھی ہمارے تصور کے گوشے میں امانت کے طور پر محفوظ ہے۔

(پس منظر میں رقص)

جب کسی کے جھومتے اور لہراتے قدم اپنی فنکارانہ جنبشوں سے ہمیں ایک نئی زندگی کی سوغات دے رہے تھے۔ (رقص نمایاں) ۔۔۔ زندگی کے یہ عزیز ترین لمحے ہمیں اب بھی یاد ہیں۔ جب پہلی بار ہم نے اسے رقص کرتے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی رقص کر رہی ہے۔ کائنات رقص کر رہی ہے اور اس وقت ہمارے دل کا ہر تار لرز اٹھا اور اس مدبھری سنگیت سے ایک نشہ سا چھاگیا۔ پھر جب یہ لمحے بیت گئے تو زمانہ نے ساری بیدردیاں ہم پہ صرف کردیں۔ ہم اس محل

سب مل

کی چاردیواری میں بند کر دیئے گئے اور ہمارا دل بہلانے
کے یہ الٹے سیدھے سامان کر دیئے گئے۔ خداوندا

اخلاص۔ ہوش میں آئیے صاحب عالم

شہزادہ۔ خداوندا یہ اضطراب، یہ مسلسل اضطراب کبھی کم بھی ہوگا۔

اخلاص۔ صاحب عالم

شہزادہ۔ یہ شمعیں گل کر دو اخلاص خاں۔ بجھا دو یہ شمعیں۔
یہ روشنی ہمارے خیالات کی راہ میں تاریکی بن کر لہرا
رہی ہے ـــ اور تم ـــ اور تم اب جا سکتے ہو ـــ
ہمیں بالکلیہ تخلیہ چاہیئے۔

(پس منظر میں طوفان اور بارش)

شہزادہ ـــ باہر یہ آوازیں کیسی ہیں۔

اخلاص۔ صاحب عالم ـــ کئی گھنٹوں سے بارش اور طوفان
نے فضاؤں کو گھیر رکھا ہے اور سنا ہے موسیٰ ندی
میں بڑے زور کا سیلاب آیا ہے۔

شہزادہ۔ کیا کہہ رہے ہو اخلاص خاں ـــ کہیں چچلم پر تو آفت
نہیں آئی۔ الٰہی کہیں ـــ اخلاص خاں یہ شمع اٹھاؤ
اور جلد بالا خانہ پر چلو ـــ جلدی کرو (تیز ساز)
ـــ ارے چچلم کا تو کہیں پتہ ہی نہیں کوئی چراغ
تک نہیں ٹمٹا رہا ہے۔ اُف یہ بارش اور یہ طوفان
ـــ اب کیا ہوگا اخلاص خاں ـــ اگر بھاگ متی
کو کچھ ہو جائے تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے ـــ
زندہ نہیں رہ سکیں گے ـــ محبت ہمیں آزما رہی
ہے۔ لو ہم اسی آزمائش میں کود پڑتے ہیں۔

اخلاص۔ صاحب عالم۔

شہزادہ۔ تم ہٹ جاؤ اخلاص خاں ـــ ہمارے لئے اس سے بڑھ کر
کوئی تزئین نہیں ہو سکتی ـــ لو ـــ خدا حافظ ـــ
کسی کو خبر نہ ہو ـــ کسی کو خبر نہ ہو۔

اخلاص۔ صاحب عالم ـــ رکئے صاحب عالم ـــ
صاحب عالم ـــ

دو چار آوازیں ـــ اس بارش اور طوفان میں کون
ہاتھی پر چلا آرہا ہے۔

۲ ـــ ارے شہزادہ محمد قلی ـــ اور یہ گھوڑے پیچھے کون ہے

۱ ـــ یہ تو اخلاص خاں ہیں۔

۳ ـــ ہاتھی تو ہوا کی طرح گزر گیا۔

(سب چیخ کر) حضور شہزادے شہزادہ عالم

سلحدار۔ کیا ہوا پہرہ دار۔

سب مل کر۔ شہزادہ محمد قلی ہاتھی پر سوار چچلم کی طرف ہوا کی
رفتار سے جا رہے ہیں۔

سلحدار ـــ دوڑو گھوڑوں پر شہزادے کا تعاقب کرو۔
(گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز) ـــ جلدی کرو
کہیں شہزادہ سیلاب کی زد میں نہ آ جائے۔

اخلاص۔ صاحب عالم ـــ صاحب عالم ـــ خدا کے لئے
آگے نہ بڑھئے۔

شہزادہ۔ تم پھر پہنچ گئے اخلاص خاں ـــ دیکھتے ہو موسیٰ ندی
کس بے رخی سے امنڈ آئی ہے۔ ارے یہ ہاتھی
تو پانی میں کودتے جھجک رہا ہے۔

اخلاص۔ خدا کے لئے صاحب عالم ـــ ہم پر رحم کیجئے۔

شہزادہ۔ کچھ کہنے کا یہ وقت نہیں ہے اخلاص خاں۔ لاؤ
مجھے اپنا گھوڑا دے دو۔ جلدی کرو۔ کہیں میں دیر
سے نہ پہنچوں ـــ یہ گھوڑوں پر کون آ رہے ہیں۔

اخلاص۔ پہرہ دار حضور

شہزادہ۔ ان سے کہو کہ یہیں رک جائیں ـــ میرا پیچھا نہ کریں۔

اخلاص۔ خدا کے لئے شہزادے ـــ صاحب عالم

شہزادہ۔ (دور سے) تم لوگ جاؤ اخلاص خاں ـــ ہم تو دریا
میں کود پڑے۔

اخلاص خاں اور پہرہ دار۔ صاحب عالم ـــ
صاحب عالم ـــ

(تیز ساز)

۔ اس طرح شہزادہ محمد قلی جان کی بازی لگا کر بھاگ متی تک پہنچ گیا۔

۔ جب دوسرے دن یہ خبر ابراہیم قطب شاہ کو ملی تو انہوں نے شہزادے کے اس بے پناہ جذبہ کی قدر کرتے ہوئے موسی ندی پر پل کی تعمیر کا حکم دیا۔

۔ کچھ عرصے بعد شہزادے نے بالا حصار کی بلندیوں سے دیکھا کہ موسی ندی کے سینے پر اس کی محبت کا نقش ثبت ہو گیا ہے۔

۔ اس جذبۂ محبت نے نہ صرف پرانے پل کی تعمیر کی بلکہ شہر حیدرآباد کی تخلیق بھی اسی باعث ہوئی۔ (چار مینار، چار کمان، بادشاہی عاشور خانہ اور دار الشفا محمد قلی ہی کی یادگاریں ہیں۔)

۔ ابراہیم قطب شاہ کے بعد جب شہزادہ محمد قلی کے سر پر چتر شاہی رکھا گیا تو گولکنڈے کے گلی کوچے جشن مسرت کے ترانوں سے گونج اٹھے۔

۲۔ ابراہیم قطب شاہ نے گولکنڈہ کے چمن میں ملے جلے تمدن کے جو پھول کھلائے تھے وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مہک اٹھے اور ساری فضا ان کی خوشبو سے معطر ہو گئی۔

۱۔ ایران و تاتار کے لباس اب دکنی رنگ میں رنگ چکے تھے۔

۲۔ محمد قلی قطب شاہ نے اس رنگ کو اس درجہ چمکایا کہ وہ بالکل دکنی معلوم ہونے لگا۔

۱۔ اس نے تاتاری لباس کی بجائے دکنی لباس سے اپنے بدن کو زینت دی۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی، پستہ اور بادامی قبا کے بدلے ململ کا جامہ اور قلیجہ کی جگہ پٹکا۔ [illegible] جو بالکل تلنگانہ کی طرز تھی۔

۲۔ اور سب سے بڑھ کر محمد قلی نے اسی زبان کو ترقی دی [illegible]

۱۔ یہ دکنی زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی آئینہ دار تھی اور جو گولکنڈے کے قدرتی مسکن میں کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ محمد قلی نے نہ صرف اس زبان کی سرپرستی کی بلکہ فارسی کی بجائے دکنی کو اپنایا اور اس زبان میں شعر کے لیے پیکر تراشے جن کا حسن اب تک ماند نہیں پڑ سکا۔

۱۔ اس نے دکنی میں پچاس ہزار شعر کہے اور فارسی اور تلگو میں بھی طبع آزمائی کی۔

۲۔ اس کی شاعری کا موضوع اس کی زندگی کی طرح رنگا رنگ رہا ہے اس کا تخیل سرزمین تلنگانہ کی طرح شاداب اور اس کا اسلوب سادہ، سلیس اور رنگین ہے اور جگہ جگہ اس نے اپنی شاعری میں تلگو کے لفظ استعمال کیے ہیں۔

۱۔ تلنگانہ کے ہرے بھرے کھیتوں، نظر فریب تالابوں اور حسین پہاڑیوں نے اس کی فکر کی آبیاری کی۔

۲۔ اس کی شاعری پر شکوہ محلوں میں بند نہ رہ سکی۔ وہ محل کے شان و شکوہ کو چھوڑ کر عوام کے ساتھ کھلے میدانوں میں نکل آتا ہے جہاں وہ عوام کے رنج اور غم اور خوشی اور مسرت میں ان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

۱۔ اس کے یہاں عیدوں، تہواروں، کھیل کود، تماشوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عام رسم و رواج پر بیسیوں نظمیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر اعظم کا دل عوام کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا اور اس نے عوام کی زندگی کو اپنی زندگی میں سمو لیا تھا۔

(پس منظر میں شور اور باجے)

۲۔ یہ اسی کا فیض نظر تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی اسی جوش اور عقیدت کے ساتھ محرم مناتے تھے اور دکن کی سرزمین پر اب بھی اس کی جھلکیاں باقی ہیں۔

۱۔ محمد قلی کی بصیرت نے یہ جان لیا تھا کہ یہاں ایک ملا جلا تمدن ہی زندہ اور پائندہ رہ سکتا ہے اور اس نے آرٹ

ساڑھے تین سو سال پہلے اس تمدن کو معراج پہ پہنچا دیا تھا۔

۲۔ وہ عید اور بقر عید کے علاوہ، نوروز، بسنت اور مرگ کی تقریبوں کے جشن بھی مناتا اور ان موقعوں پہ وہ سب کے ساتھ مل کر خوشی کے نعرے لگاتا۔

ا۔ نوروز پر وہ کہتا ہے۔ "نورانی نوروز کے جلووں کے ساتھ آیا اور سارا چمن چاند کی طرح جگ مگ کر رہا ہے۔ چمن میں بلبلیں جگہ جگہ ایسی دکھائی دے رہی ہیں جیسے حسینوں کی آنکھوں میں تل۔

۲۔ پھولوں کے گچھوں میں کالے کالے بھونرے ایسے نظر آتے ہیں۔ جیسے کالی کوئلیں ہری ہری ڈالیوں میں اڑتی پھر رہی ہوں۔

ا۔ ایک بار عید اور نوروز مل کر آئے تو محمد قلی نے کہا۔

۲۔ نوروز اور یوم عید آپس میں بھائی بہن کا سینہ جوڑ کر ایک ہو گئے ہیں اور عید کی دوہری خوشیاں اپنے ساتھ لائے ہیں۔

ا۔ سخت گرمیوں کے بعد جب بارش شروع ہونے لگتی ہے۔ تو زندگی کی ناخوشگواری خوشگواری میں بدل جاتی ہے۔ محمد قلی نے بارش کے آغاز کو بڑی اہمیت دی کیونکہ دکن میں بارش کا موسم ہی بہار کا موسم ہے۔

۲۔ جس روز مرگ ہوتا وہ بڑی دھوم دھام سے محفل آرائی کرتا۔

ا۔ شاہی محلوں میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھائی جاتیں اور ہر طرف خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا۔

۲۔ عوام بادشاہ کو اپنا شریک مسرت دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔

ا۔ محمد قلی کا جذبہ تخلیق اس جشن کی مسرت میں شعر کے نئے نئے پیکر تراشتا۔

۲۔ برسات کی آمد پر وہ کہتا ہے۔

ا۔ بارش کا موسم آیا اور کھیتوں کا راج شروع ہو گیا کیونکہ آج ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔

۲۔ زمین نے سر پہ جواہر کی پگڑی باندھ لی اور آنکھوں میں کانچ کے رنگ کا سرمہ لگا لیا۔

ا۔ ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں۔

۲۔ ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کی گلگیر میں شمعی تیل کی شمعیں جل رہی ہیں۔

ا۔ جب بسنت کا موسم آتا اور گولکنڈہ کے حسین سبزہ زاروں میں بسنتی پھول کھل اٹھتے تو محمد قلی کی زندگی بھی جھوم اٹھتی۔

۲۔ گولکنڈے کے وسیع میدان ایک پر کیف منظر میں بدل جاتے جہاں محمد قلی سب کے ساتھ جشن میں شرکت کرتا

— (لطیف قہقہے) —

ا۔ اور بسنت کے سواگت میں محمد قلی کے دھڑکتے دل کی آوازیں شعر کے روپ میں اس طرح گونج اٹھتیں۔

(کورس)

شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لایا بسنت
نین پتلی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت
سبز سارے نورتن کسوت کئے ہیں رنگ رنگ
سرو کی مینا میں بھی شبنم کی مے بایا بسنت
سارے پھولوں کی 'بسنت کا پھول' مہمانی کیا
گل پیالہ بن کے خدمت کے لئے آیا بسنت
بھرکے رنگ میں بسنت کا رنگ جھلکتا نور سا
اور چندر کے حوض میں چندن سی مہکایا بسنت
موتی اور یاقوت کے گھر گھر میں انبار لگے
ہر گدا کو شل خاقاں کر کے دکھلایا بسنت
شکر ایزد کر معانی رات دن آنند سے
تیرے مندر میں خوشی آنند سے آیا بسنت

ا۔ قلعہ گولکنڈے کے پاس نئے قلعہ میں جو پر فضا تالاب اور وسیع مرغزار ہے وہاں اب بھی بسنت پنچمی ایک میلہ

سا لگا رہتا ہے۔

۲۔ اس طرح بسنت کے مشیدائی، محمد قلی کے جشن کی یادگار اب بھی منائی جاتی ہے۔

ا۔ محمد قلی نے شادی بیاہ کی رسموں پر بھی کئی نظمیں لکھی ہیں۔ مہندی، سانچق، جلوہ یہ سب اس کی شاعری کا موضوع بنے ہیں۔

۲۔ جلوہ کی نظم تو اب بھی دکن میں شادیوں کے موقع پر گائی جاتی ہے۔

ا۔ عوام کی زندگی میں گھل مل جانے کی یہ مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔

ا۔ محمد قلی کا عہد گولکنڈہ کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔

۲۔ جہاں میر مومن اور مرزا محمد امین جیسے صاحب کمال اور صاحب تدبیر اس کی دربار کی زینت بنے تو اسیر راؤ اور دھرما راؤ جیسے دکھنی سورما اس کی سلطنت کی ترقی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئے۔

ا۔ میر مومن نے گولکنڈہ کی تمدنی قدروں میں اضافہ کیا تو اسیر راؤ سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن اور امان کا باعث بنا۔

۲۔ کچھ یہی بات تھی کہ جب محمد قلی کے بعد اس کے بھتیجے اور داماد محمد قطب شاہ نے عنان سلطنت سنبھالی تو ملک میں ہر طرف خوش حالی اور امن و امان کا دور دورہ تھا۔

ا۔ اور محمد قلی نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا تھا۔ محمد قطب شاہ نے اسے سینے سے لگائے رکھا اور اس دور میں دکن کا گوشہ گوشہ علم و ادب کی جوت سے جگمگا اٹھا۔ محمد قطب شاہ کو تعمیری ذوق بھی ورثہ میں ملا تھا۔ کہ مسجد اسی کی یادگار ہے۔

ا۔ گولکنڈہ میں گلاب نما کٹورا حوض کے کنارے جو اب بھی عہد ماضی کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔ شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کے جمگھٹے رہتے اور رونق کے ان محفلوں میں علم و ادب کے چرچوں سے

گونج اٹھتے۔

ا۔ اس حوض کے کنارے ہر بڑے شاعر کا گروہ الگ الگ اپنی محفل جماتا۔

۲۔ اس طرح کٹورا حوض کے گوشے کئی شعری حلقوں میں بٹ گئے۔ کٹورا حوض کا مغربی حلقہ ملا وجہی کے نام سے منسوب تھا۔

ا۔ وجہی محمد قلی کے دربار کا ملک الشعراء اور سب رس اور قطب مشتری کا مصنف، دکھنی کا سب سے بلند پایہ شاعر ہے۔

۲۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس کا ستارہ عروج پر تھا محمد قطب شاہ کے دور میں غواصی نے اس کی جگہ لے لی اور کٹورا حوض کا جنوبی گروہ غواصی کے نام سے منسوب تھا۔

ا۔ گو محمد قطب شاہ وجہی کی بڑی قدر کرتا تھا۔

۲۔ ان دو استاد شاعروں کے علاوہ طبعی، قطبی اور ابن نشاطی گولکنڈہ کی محفل ادب کی زینت تھے۔

ا۔ محمد قطب شاہ کے ذوق شعر کے باعث ہر مہینہ بالا حصار میں محفل شعر و سخن منعقد ہوتی جس میں بادشاہ خود شرکت کرتا اور نہ صرف داد سخن سے نوازتا بلکہ خلعتوں سے بھی سرفراز کرتا۔

۲۔ اس محفل شعر میں عرش آشیانی محمد قلی قطب شاہ کا کلام بھی پڑھا جاتا۔

(پس منظر میں مجمع کا شور)

ا۔ سب شاعر اور درباری امراء اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ ملا وجہی دیر سے پہنچے۔ انھیں سامنے کی نشست پر جگہ نہ مل سکی۔ یوں بھی دربار کے ملک الشعراء ملا غواصی سے ان کی چشمک ہے۔

۲۔ لیجئے بادشاہ کی آمد آمد کا اعلان ہو رہا ہے۔ سب حاضرین کھڑے ہو گئے۔

چوبدار۔ جہاں پناہ، شاہ [illegible] ان، سلطان اقلیم سخن،

سلطان محمد قطب شاہ۔

سلطان۔ ملا غواصی

غواصی۔ جہاں پناہ۔ سب شاعر حاضر ہیں اجازت ہو تو۔

سلطان۔ ملا وجہی نظر نہیں آتے۔

وجہی۔ بندہ حاضر ہے جہاں پناہ۔

سلطان۔ آپ ادھر یہاں آ جائیے۔ اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں آپ۔

وجہی۔ بندہ نوازی۔

سلطان۔ ہاں ملا غواصی مشاعرہ شروع ہو۔ پر حضرت عرش آشیانی کا کلام پڑھنے کی سعادت کون حاصل کرے گا۔

غواصی۔ حضرت اجازت ہو تو بندہ ۔۔۔

سلطان۔ نہیں یہ حق ملا وجہی کو دی جائے۔ اس کا حق انھیں کو پہنچتا ہے۔

وجہی۔ بندہ اس سرفرازی پر نازاں ہے۔

غواصی۔ حضرت اجازت ہو تو گولکنڈہ کے نوجوان شاعر طبعی اپنا کلام عرض کریں۔

سلطان۔ اجازت ہے۔

طبعی۔ ہوا مجنوں برہ سے سدھ گنوا میں
اتھا دانا سو دیوانا ہوا میں
تجھے دل میں چھپایا ہوں ایس کے
خرابے میں لگایا ہوں دیوا میں
اچایا ہوں تیرے غم کے پہاڑاں
عجب ہے نیں سینا پھنکر سوا میں
صنم تیرے بدل ہو کر براہمن
گلے میں اپنے بھایا جنیوا میں
نہ کیا دیکھتے ازاں لگ انداز
پرانا ہوں نہیں عاشق نوا میں

غواصی۔ اب ایک اور نوخیز شاعر ابن نشاطی اپنا کلام پیش کریں گے۔ انھوں نے برہ کے درد کو نقطۂ یہ تین سو کر نظم عشق کا ایک دلگداز منظر کھینچا ہے۔ عرض کرتے ہیں۔

ابن نشاطی۔ لگے چشمہ ہو کر نیناں ابلنے
لگیا جیوں شمع ہو کر جیو جلنے
دھنواں آہاں کا سر پر ہوئے دل تھا
گرم بھاپاں سوں گتاں پر چھالے آئے
کلی سنتے ہوا دل تنگ و ناشاد
ہوا لگڑے گریباں پھول کی داد
برہ کی آگ سوں دل جل ہوا راک
صبوری کا جو تھا دامن ہو اچاک

غواصی۔ اجازت ہو تو اب فدوی کچھ عرض کرے۔

سلطان۔ اجازت ہے۔

غواصی۔ عرض کرتا ہے جہاں پناہ۔

(یہ شعر تحت اللفظ پڑھے جائیں)

ہوئے جمع جنگی ہزبراں تمام
قوی اور خونخوار اسیراں تمام
یک یک جان ایک کوہ یا برج جیوں
لے ہاتاں میں تیغے پھرے گرز جیوں
غضب ناک ہو جیوں اٹھے دل ہوئے
کلیجے پہاڑاں کے پھوٹ جل ہوئے
اوٹھیا غل جدھر کا ادھر ار بار
قیامت زمیں پر ہوا آشکار
جھلک دیکھ بجلیاں سی تروار کی
اڑی فاختی سخت سنسار کی
بیٹے دھرت پو یوں منڈیاں کاٹ کاٹ
سو کس کوں سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ
جو دریا لہو کا ابلنے لگیا
گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا

سلطان۔ گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا۔

کیوں ملا وجہی۔

وجہی۔ جہاں پناہ نے بجا ارشاد فرمایا۔ اجازت ہو تو بندہ بھی کچھ عرض کرے۔

سلطان۔ ضرور ضرور۔

وجہی۔ طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا
تج بن مجے جینا بہت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کھتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں
تجھ سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہردم توں یاد آتا مجے اب عیش نیں بھاتا مجے
برہا یوں ستاتا مجے تج باج تل تل رتے پیا
تو جیو میرا ہیں سو دل کے سات رہتا کیوں نہ تل
دن رات میں ہیں ایک تل نیں تجھ سے غافل رے پیا

سلطان۔ واہ واہ لفظ لفظ میں درد بھر دیا۔ "تجھ سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا" کیا خوب کہا ہے۔

وجہی۔ جہاں پناہ کی سرفرازی ہے۔

داعی۔ اب حاضرین جہاں پناہ کا کلام سننے کی عزت اور فدوی پڑھنے کی سعادت حاصل کرے گا۔

حاضرین۔ ارشاد ارشاد

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا
کہ اس بن نیں ہمیں یک تل قرارا
... صبوری کو نہیں ہے ٹھار دل میں
صبوری کیوں کرے ہو کر تہارا
میا کرنا کرے معشوق اسے ہو
کہو نا کیا کرے عاشق بچارا
بہشت مجھے ہیں اور سا چاپیں
کہ آسمان رنگ شفق پایا ہے پیارا

وجہی۔ جہاں پناہ نے دل کی حسرت کو ایسا حسین جامہ پنایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

سلطان۔ آج کی محفل سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ سب شاعروں کو ہماری طرف سے خلعت عطا ہوں۔ اب ہم حضرت عرش آشیانی کا کلام سننے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حاضرین باادب ہو جائیں۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں
کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے
کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجہ دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

ا۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے بعد محفل برخاست ہوگئی۔

۲۔ گولکنڈہ کی ان محفلوں نے جن شاعروں کو جنم دیا وہ زمانے کو بہت کچھ دے کر رخصت ہوئے۔

ا۔ محمد قلی قطب شاہ کی ہمہ گیر شعری صلاحیتیں اپنی تمام رنگا رنگیوں کے ساتھ اب بھی اس کے دیوان میں محفوظ ہیں۔

۲۔ وجہی کی سب رس اور قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، ابن نشاطی کی پھول بن اور طبعی کی بہرام و گل اندام اب بھی دکھنی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

ا۔ گولکنڈہ نے شاعروں اور ادیبوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔

۲۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب بیجاپور سے گولکنڈہ کا قدیم شاعر ملک خوشنود سفیر بن کر آیا تو گولکنڈے سے ملا غواصی کو سفیر بنا کر بیجاپور بھیجا گیا۔

ا۔ محمد قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جہاں علم و فن کی سرپرستی ہوئی۔ یہ دور گولکنڈہ کی

تاریخ کا اختتامی باب بھی ثابت ہوا۔
۲۔ احمد نگر اور بیجاپور کے بعد اب مغل حکمران گولکنڈے کو اپنانے کی فکر میں تھے۔
ا۔ اس دور میں حیات بخشی بیگم کی شخصیت گولکنڈہ کی تمدنی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔
۲۔ یہ خاتون محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی، محمد قطب شاہ کی بیوی اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھی۔
ا۔ حیات آباد اور پانچویں محرم کا لنگر اب بھی اس کی یادگار کے طور پر باقی ہیں۔
۲۔ پانچویں محرم کا لنگر حیدرآباد کے گاؤں گاؤں میں اب تک منایا جاتا تھا۔
ا۔ ایک مست ہاتھی جس پر عبداللہ قطب شاہ سوار تھا جنگلوں میں بھاگ نکلا اور کئی دن تک عبداللہ قطب شاہ کی کوئی خبر نہ ملی تو حیات بخشی بیگم نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں منت مانی۔
۲۔ (خاتون) اے امام شہید مظلوم! آپ کی اس لونڈی کے جگر کا ٹکڑا اگر خیر و خوبی سے لوٹ آئے
تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے
پہلے چالیس من سونے کی زنجیر بنواؤں گی
اور مست ہاتھی کے پاؤں میں لنگر کر کے آپ کے
غلام سلطان عبداللہ کی کمر میں باندھ کر قلعہ
گولکنڈہ سے حسینی علم تک پاپیادہ لے جاؤں گی۔
ا۔ عبداللہ قطب شاہ جب صحیح سلامت لوٹ آیا تو حیات بخشی بیگم نے یہ منت پوری کی۔
۲۔ حیدرآباد میں یہ لنگر صدیوں تک جاری رہا۔ عوام بھی ہر سال محرم میں یہ لنگر مناتے رہے۔
ا۔ عبداللہ قطب شاہ شاعری کے علاوہ فن موسیقی کا بھی دلدادہ تھا۔
۲۔ اس کے دربار میں لاہور، آگرہ، بیجاپور اور احمد نگر سے اہل کمال اور موسیقار آتے اور اپنے کمال فن کی داد پاتے۔
ا۔ قلعہ کے باہر پیامتی بیٹھ اب بھی عبداللہ قطب شاہ کے ذوق سرود کی یاد دلاتا ہے۔
۲۔ جب وہ امور سلطنت سے تھک جاتا تو پیامتی بیٹھ میں رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتا۔
ا۔ پیامتی بیٹھ کے محل کی تعمیر اس طرح ہوئی تھی کہ وہاں کے مدھر سنگیت کی آوازیں بالا حصار میں سنی جا سکتی تھیں۔
۲۔ کبھی عبداللہ قطب شاہ پیامتی بیٹھ نہ جا سکتا تو بالا حصار کی بلندیوں سے پیامتی بیٹھ کے مطربوں کے نغمے سنتا۔
ا۔ رات کے پچھلے پہر جب گولکنڈہ کے عظیم الشان ایوان خاموشیوں میں ڈوب جاتے تو فن موسیقی کا رسیا عبداللہ قطب شاہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے رات بھر جاگ کر صبح کر دیتا اور پھر پیامتی بیٹھ کے محل کے نغمے اس کے کانوں میں گونج اٹھتے۔
۲۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل کئی بار گولکنڈہ کی دیواروں تک چڑھ آئے اور اسے ہر بار صلح کرنی پڑی۔
ا۔ گولکنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کا دور اپنے ہی ہنگاموں سے پُر رہا۔
۲۔ تانا شاہ کے عہد میں تلنگانہ کے امیروں کو بڑے بڑے عہدے ملے۔ تانا شاہ تلنگانہ ہی کی سرزمین سے اٹھا تھا اور فطری طور پر اسے اس ماحول سے بڑی محبت تھی۔
ا۔ ابوالحسن کے دور میں مادنا اور اکنا گولکنڈے کی [illegible] پر چھائے رہے۔
۲۔ اور ان دونوں وفاداروں نے آخر تک ابوالحسن کا ساتھ دیا اور اس کی خاطر اپنی جان کی بھی پروا نہ کی۔
ا۔ آخر ۱۶۸۶ء میں مغل حملہ آور سیلاب کی طرح گولکنڈہ کی دیواروں سے ٹکرا گئے۔
۲۔ مگر یہ دیواریں اتنی مضبوط ثابت ہوئیں کہ [illegible] آٹھ مہینے تک محاصرہ کرنا پڑا [illegible]

اس کے جانبازوں کے عزم و ہمت میں ذرا سی لغزش ہو گئی
اس کا محاصرہ سے تنگ آکر مغلوں نے گولکنڈے کے ایک
سپہ سالار سے سازباز کر لی اور اس نے رات کے پچھلے پہر
مغل فوجوں کو ایک چور دروازہ کی راہ قلعہ میں داخل کرلیا۔
مگر ابوالحسن کے جانثار اس پر بھی تلواریں سونت کر سامنے
آگئے۔ ابوالحسن کے باہمت سپہ سالار عبدالرزاق لاری
نے تو شجاعت اور وفاداری کی مثال قائم کر دی
وہ چند جانبازوں کے ساتھ اس مغل سیلاب میں کود پڑا
جو قلعہ کی سمت بڑھا آرہا تھا۔

۲۔ اس کی اس بہادری اور وفاداری کو زمانہ ہمیشہ سراہتا ہے۔
۱۔ گولکنڈہ پر پوری طرح مغلوں کا قبضہ ہو گیا مگر مغل شہنشاہ
یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر گولکنڈہ میں عبدالرزاق لاری
سا ایک اور سپہ سالار ہوتا تو شاید گولکنڈہ کبھی فتح نہ ہوتا۔
۲۔ تقریباً دو سو سال تک ایک ملے جلے تمدن کو پروان چڑھا کر
گولکنڈہ کی حکومت ختم ہو گئی۔
۱۔ مگر اس نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا ہے وہ اب بھی دکن کیلئے
سرمایۂ امتیاز ہے۔
۲۔ اور آنے والی نسلیں اس ورثہ کو اپنے سینوں سے لگائے رکھیں گی۔

# کوئی کہہ دے

افسانہ - جناب قمرالدین اپل صاحب

میں چک کے پیچھے کھڑی ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ نہ جانے آج میرا دل کیوں چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہے۔ آج میری بہن نعیمہ کی لاش صحن میں ایک چارپائی پر پڑی ہے۔ ایک سفید کفن میں لپٹی ہوئی۔ ایسا معلوم دیتا ہے۔ جیسے آج کی رات وہ ایک پرسکون نیند سوئے گی۔ اسے کھانسی نہیں ستائے گی۔ ہم تین بہنیں تھیں۔ آج میں اکیلی ہوں۔ میری دو بہنیں میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ دونوں مجھ سے بڑی تھیں۔ شکیلہ بڑی کا نام تھا۔ یہ لاش نعیمہ کی ہے۔ آج یہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیگی۔ میری لاش بھی شاید کسی دن اسی جگہ ایک کفن میں لپٹی پڑی ہوگی۔

میری ماں شاید اس وقت تک جیتی رہے۔ وہ بہت بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ وہ روئی لاکر کاتتی ہے۔ میری دو بہنیں اس کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان دونوں نے مجھے کبھی روئی اور چرخے کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ پر اب میں اپنی ماں کی مدد کیا کروں گی۔ میرے دو بھائی اختر اور قیصر ماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انور جیل میں ہے۔ صحن میں عورتیں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ میری پھوپھیاں نعیمہ کا چہرہ ننگا کرکے دیکھنے والوں کو دکھا رہی ہیں۔ نعیمہ کے سر سے ابھی تک خون رس رہا ہے۔ عورتوں کے رونے کی آواز آرہی ہے۔ میری ماں ہوش میں آگئی۔ اس نے میرا نام لے کر بڑبڑانا شروع کردیا ہے۔ میرے بھائی نے میرا نام لے کر پکارا "ارے عذرا! ادھر آؤ"

میری ماں مجھ سے چمٹ گئی۔ وہ کہہ رہی ہے۔ "میری بیٹی۔ تم کیوں رو رہی ہو۔ نہ رو میری بیٹی"

اس کی آنکھیں خشک ہیں۔ پھر وہ اٹھ کر نعیمہ کی لاش کی طرف بھاگی۔

"ماں کیوں پاگل ہوگئی ہو۔ صبر کرو" میرے ایک بھائی نے کہا۔

وہ لاش سے چمٹ گئی اور چیخنے لگی "میری نعیمہ! تو مجھ سے آج جدا ہو رہی ہے۔ تو ہمیں اپنی شکل پھر کبھی نہ دکھائے گی میری شکیلہ بھی مجھے چھوڑ گئی"

عورتوں کے رونے کی آواز اونچی ہونے لگی ہے۔ میرا دل چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہے۔ پر مجھے ڈر لگتا ہے کہیں میرے بھائی مجھے برا بھلا نہ کہیں۔ میری ماں کا سفید سر کھلا ہے میری بھاوجیں ایک طرف بیٹھی اس کے سر کو گھور رہی ہیں۔ وہ کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتی ہیں۔ میری پھوپھیاں میرے پاس آگئیں اور مجھ سے کہہ رہی ہیں "نہ رو بیٹی، صبر کرو خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم اپنے بھائیوں کی اب اکیلی بہن خدا تمہیں سلامت رکھے"

مجھے کچھ یاد ہے کچھ اسی قسم کے الفاظ نعیمہ کو میری سب سے بڑی بہن شکیلہ کے مرنے پر کہے گئے تھے۔ نعیمہ نہ رہی۔ اس کی لاش صحن میں پڑی ہے۔ اب میری باری پر مجھے تو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے مرنا نہیں چاہتا۔

اس کی لاش کے اوپر پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔ نیچے گلی میں میرے دو ماموں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور میرے بھائی ایک طرف خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب آ گئے۔ میرے ماموں اور بھائی مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ میری ماں ان کا راستہ روک رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔ "ٹھہرو۔ خدا کے لئے تھوڑی دیر ٹھہرو۔ وہ ہمیشہ کے لئے چلی جائے گی اور میں کبھی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکوں گی۔"

میری ماں چیخ رہی ہے اور چند عورتیں کہہ رہی ہیں "بہن حوصلے سے کام لو۔ صبر کرو۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔"

لاش اٹھ رہی ہے۔ میرے بھائی اور ماموں اسے اٹھائے مکان سے باہر لے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے گی۔ میری ٹانگیں لرز رہی ہیں۔ مجھ سے کھڑا نہیں رہا جاتا۔ میری بہن مجھ سے جدا ہو رہی ہے میں اکیلی ہوں۔ عورتیں چیخ رہی ہیں۔ بچے چلا رہے ہیں اور کلمہ شہادت کی آواز بلند ہوئی۔ میں کھڑکی میں بیٹھی رو رہی ہوں۔ مجھ سے میری بہن کو لے گئے۔ میری ماں بے ہوش پڑی ہے۔

اب خاموشی ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ میری بھاوجیں اپنے اپنے کمروں میں بیٹھی ہیں۔ میری ماں سسکیاں بھر رہی ہے اور میں اس کے پاس بیٹھی خاموش رو رہی ہوں۔ ایک کونے میں سوت کے دو گٹھے پڑے ہیں اور دو چرخے دیوار سے لٹک رہے ہیں۔ میرے بھائی واپس آ گئے۔ میرے ماموں نہیں آئے۔ وہ دوکاندار اور کاروباری آدمی ہیں۔ میرے بھائی مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ "خدارا صبر کرو۔ تم بچی نہیں ہو۔ اس طرح نہیں رونا چاہیئے مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ اپنے کمروں کو چل دیئے۔ میری ماں ایک چارپائی پر پڑی آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی ہے۔ یہ پنکھا شکیلہ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ نفیسہ مجھ سے اکثر کہا کرتی تھی۔ "شکیلہ بہت خوبصورت تھی" نفیسہ کہتی "جس وقت وہ مری اس وقت اس کی عمر (۳۰) سال کے قریب تھی۔ وہ تم سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس کے بال تمہاری طرح سنہرے تھے اور رنگ بہت ہی سفید تھا۔ اکثر لڑکیاں اس کو دیکھ کر جلا کرتی تھیں۔ وہ اونچے قد کی تھی۔ اس کی چال میں بہت تیزی تھی۔ وہ ہر کام بہت جلدی جلدی کر لیتی تھی۔ میں جب پوچھتی تو کہتی جب تک میں کام کو ختم نہ کر لوں مجھے چین نہیں آتا۔ وہ ماں کے ساتھ سوت کاتا کرتی تھی جس طرح میں کاتتی ہوں۔ اس کے لئے اکثر رشتے آتے رہے۔ مگر ہمارے بھائی انھیں رد کرتے رہے۔ وہ اس وقت بمشکل تمام گھر کا خرچ چلایا کرتے تھے۔ انور بیکار تھا۔ انھیں شکیلہ کی شادی کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی بہن کو خالی گھر سے نکالنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر لوگوں نے آہستہ آہستہ رشتے کے لئے آنا ترک کر دیا۔ شکیلہ ماں کے ساتھ دن رات ایک کرنے لگی اور سوت کاتتے لگی۔ اس نے دو سال میں تین سو روپے اکٹھا کیا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اختر کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے۔ وہ جوا کھیلتا ہے اور لوگوں سے قرضہ لیتا ہے۔ اس نے سونے کی زنجیر جو گلے میں ڈالی ہوئی ہے وہ جوئے میں جیتی ہوئی ہے۔ اس زنجیر سے اسے بہت محبت ہے۔ اسے اپنے گلے سے کبھی علیحدہ نہیں کرتا۔ ماں نے دو ایک بار اسے کہا کہ زنجیر توڑ کر مجھے انگوٹھی بنوا دو مگر وہ نہ مانا۔ تو اختر کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے۔ ماں اپنے بھائی کے پاس گئی اور چھڑوانے کے لئے کہا تو اس نے کہا کہ اس کا قرضہ کون دے۔ ماں واپس آ گئی۔ شکیلہ نے یہ سب تماشہ دیکھا۔ ماں کی ممتا اور بھائی کی محبت نے جوش مارا۔ شکیلہ نے وہ تین سو روپے اپنے بھائی کے قرضوں میں صرف کر دیا وہ اس رات بہت روئی۔ ماں اسے دلاسا دیتی رہی اور میں بھی اسے کہتی رہی کہ بہن رونے کی کیا ضرورت ہے اور روپیہ جمع ہو جائیگا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ سوت کاتتے اس کی کبھی ہوئی خواہش پوری نہ ہوگی۔ اس کے بعد جوں جوں

وقت گزرتا گیا۔ اس کی سفید رنگت پیلاہٹ میں بدلنے لگی۔ مگر وہ ماں کے ساتھ سوت کاتتی رہی اور میں مدد کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے بخار آنے لگا اور کھانسی نے اس پر شدید حملے شروع کر دیئے۔ اس کی صحت گرنے لگی اور اس کے آنکھوں کے گرد سیاہی پھیلنے لگی۔ مگر اس کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ آیا۔ صرف ایک فرق تھا کہ وہ اب پہلے کی طرح خوش طبیعت نہ رہی تھی۔ افسردہ خاطر رہنے لگی تھی اور اپنے بھائیوں سے کھل کر بات نہ کرتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی اور بخار اسے دائمی رہنے لگا۔ شروع شروع میں اختر اور دوسرے بھائی انور اور جمیل اس کے معالجے کی طرف رجوع ہوئے مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پھر انھوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قطعاً لاپرواہی اختیار کر لی۔ میں ماں کے ساتھ سوت کاتنے لگی اور جو پیسے بھی ہم کماتیں وہ اس بیماری کے دوا دارو پر خرچ ہو جاتا۔ ماں روتی اور میں شکیلہ کی خاطرداری اور خدمت کرنے میں کوئی کوتاہی نہ برتی۔ مگر اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس کی آنکھیں ڈوبتی گئیں۔ ہمسائے اور قریبی اس کی عیادت کو آنے لگے۔ اور میں اکثر گھبرا کر انور اور جمیل کو کہتی کہ کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ وہ کہتے "آج دوا ضرور لائیں گے۔" مگر جب شام کو گھر آتے تو بھول جاتے۔ ماں کی بندھی ہوئی آس ٹوٹ جاتی۔ اختر کہیں چلا گیا اور ایک مہینہ گھر نہ آیا۔ شکیلہ مجھ سے پوچھتی کہ اختر کہاں ہے۔ میں کیا جواب دیتی۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ ہمارے یہ مشکل دن ہم پر پہاڑ ہو گئے۔ مجھے اکثر سر درد رہنے لگی تھی۔ ماں مجھے زیادہ مشقت سے روکتی اور خود آدھی آدھی رات تک چرخہ کاتتی مگر شکیلہ کی حالت مجھ سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ اسے دوا چاہیئے تھی۔

ایک مہینے کے بعد ایک رات اختر واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ماں سے پوچھا تو کہنے لگا "تمہاری بہو ہے ماں۔" ماں اسے خاموشی سے گھورتی رہی۔ وہ شکیلہ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا "کیا حال ہے بہن۔"

وہ بولی "اچھی ہوں"

شکیلہ نے اختر کو کہا کہ "وہ اس کی بیوی کو دیکھنا چاہتی ہے۔"

"صبح دیکھ لینا شکیلہ" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا "وہ تھکی ہوئی ہو گی۔"

"تو عذرا میری بہن" نعیمہ کہتی "اس رات ایک نحوست اس گھر پر چھائی ہوئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ گلی میں سے چوکیدار کے پکارنے کی آواز کبھی کبھی آتی اور کبھی کبھار کہیں دور سے کتوں کو بھونکنے کی آواز اس گہری خاموشی میں سنسناہٹ پیدا کر دیتی تھی۔ میں شکیلہ کے پاس بیٹھی تھی اور ماں نماز پڑھ رہی تھی۔ یکدم شکیلہ نے کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کی کھانسی کی شدت نے اس کے سانس میں رکاوٹ ڈالی اور وہ بستر پر لوٹنے لگی۔ اس کی کمزور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور ان میں ایک بے رحمی کی جھلک تھی۔ اس کے خوبصورت سنہرے بال اس کے پیلے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ چارپائی پر تڑپ رہی تھی۔ بالآخر اس کا تنفس تھوڑی دیر کے لئے ٹھیک ہوا۔ ماں نماز چھوڑ کر چارپائی کے قریب آگئی اور رونے لگی۔ تینوں بھائی سو رہے تھے۔ شکیلہ کی کھانسی ان کی نیند میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ وہ کھانسنے کی آواز کے عادی ہو چکے تھے۔

اس نے پھر کھانسنا شروع کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے جسم میں ہڈیاں کھنک رہی ہیں۔ ماں نے گھبرا کر روتے ہوئے کہا "نعیمہ اختر کو آواز دو۔ جاؤ شکیلہ کی حالت خراب ہے۔ ان سب کو جگا دو۔"

شکیلہ نے رکتے ہوئے کہا "ماں ابھی تنگ نہ کرو وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ عذرا" عذرا [illegible] تم ہو گئی تھیں۔ عذرا اس وقت تمہیں جگانا [illegible] کھانستے ہوئے اس کے [illegible]

ساکت پڑی تھی۔ اس کے تنفس میں تیزی تھی۔ اس نے اپنی زبان چبا ڈالا تھا۔ وہ مر گئی۔

ماں پنکھا جھل رہی ہے۔ شکیلہ کا پنکھا۔ جسے مرے ہوئے (۱۵) سال ہو گئے۔ آج نعیمہ جو مجھے شکیلہ کی باتیں سنایا کرتی تھی قبر کی تاریکی میں کھو گئی۔ میری دو بہنیں مجھ سے چھن گئیں میرے بھائی اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔ میری ماں اکیلی اور نعیمہ کا صندوق اٹھا لائی۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ نعیمہ کے بنائے ہوئے کپڑوں کو دیکھ رہی ہے۔ ریشمی جوڑے۔ یہ کپڑے اس نے بنائے تھے۔ یہ پھول اس نے کاڑھے تھے۔ وہ رو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی۔

میں مرنا نہیں چاہتی۔ ایسی کربناک موت۔ نعیمہ میری بہن مر گئی۔

نعیمہ کے سر میں درد بڑھنے لگا اور اختر جوا کھیلتا رہا انور اور جمیل اپنی دلچسپیوں میں مشغول رہے۔ نعیمہ اور میں ماں کے ساتھ سوت کاتنے لگیں۔ پھر ایک دن آیا۔ جب جمیل کی شادی ہوئی۔ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لڑکی والوں نے اپنی لڑکی کو کچھ نہیں دیا۔ صرف نکاح پر اکتفا کیا گیا۔ نعیمہ اور میں نے اپنی پس انداز جو تقریباً ایک سو روپیہ تھی اپنے بھائی کی شادی کے موقع پر کھانے پر صرف کر دی۔ وہ کہنے لگا "نعیمہ تھوڑے دن ٹھہر جاؤ میں تمہارے لئے دولت ہی دولت اکٹھی کر لوں گا۔"

ہم دونوں بہنیں جمیل بھائی کے ان ہمدردانہ اور محبت بھرے الفاظ کو سن کر خوشی سے رو پڑیں۔

نعیمہ کے لئے رشتے آنے لگے۔ ماں کہتی رہی کہ "نعیمہ کی نسبت کر دی جائے۔" بھائی کہتے "یہ لڑکا اچھا نہیں۔ یہ لڑکا کوئی ہنر نہیں جانتا۔ یہ بدصورت اور بھونڈا ہے۔ یہ عمر رسیدہ ہے" اور اسی طرح شکیلہ پر گزری ہوئی واردات نعیمہ پر دہرائی جانے لگی۔ شروع شروع میں نعیمہ نے بالکل خیال نہیں کیا۔ پھر دن بھر کی مشقت [illegible] کے پاس سے تھکتیں اور دعا

اپنا وقت ہنس ہنس کر گزارنے کی کوشش کرتی [illegible] ہوا کہ رات زیادہ ہو گئی تو بھاوجوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اب تمہارے بھائی آتے ہی ہوں گے۔ انہیں آرام کرنا ہو گا۔ اب تم جا کر سو جاؤ۔ ان کی آنکھوں میں ایک تلخ حقیقت چھپی ہوتی تھی۔ جو چھپائے نہ چھپتی تھی۔

نعیمہ کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ اس کی خوشی اور ہنسی مزاح میں آہستہ آہستہ کمی آنی شروع ہو گئی۔ جمیل رنڈی کے مکان پر گانا سنتا رہا۔ وہ اکثر وہاں جاتا ہے۔ ضرورت پڑے تو قرض بھی لیتا ہے۔ ماں سمجھاتی ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے "ماں دن بھر کی تھکن کے بعد اگر کبھی کبھی تفریح ہو جائے تو کیا بری بات ہے۔ گانا سننا برا نہیں اور پھر ماں۔ میں وہاں پیسے تو خرچ نہیں کرتا۔ میرے دوست کرتے ہیں۔"

ماں نے رو رو کر اپنی آنکھیں کمزور کر لیں۔ اس کی کمر جھک گئی ہے۔ وہ تھوڑی دور چل کر سستانے کے لئے ٹھہر جاتی ہے۔ نعیمہ چرخے کی اداس آواز میں آہستہ آہستہ کھانسنے لگی۔ میں نعیمہ کو کہتی کہ بہن تم سوت نہ کاتا کرو۔ تمہیں آرام چاہئے۔

"نہیں" وہ کہتی "ہماری ماں میں سکت نہیں رہی۔ وہ اکیلی ہمارا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔" اس کی اداسی اور افسردگی دیکھ کر میرا جی پھٹ جاتا تھا۔

پھر ایک دن وہ پورے جوش اور ولولے کے ساتھ زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں میں دوڑنے کے لئے تیار ہو گئی وہ میرے پاس آئی اور بولی "عذرا۔ آج سے ہم دگنا کام کیا کریں گی۔ تم میرا ہاتھ بٹاؤ گی۔ بتاؤ۔ وعدہ کرو۔"

میں نے اسے "ہاں" کہا اور پھر چرخہ پورے زور سے چلنے لگا۔ روئی سوت میں تبدیل ہونے لگی۔ دن رات ایک کیا جانے لگا اور دو سال متواتر سوت بنتا رہا۔ اختر اور جمیل کے ایک ایک بچہ بھی ہو گیا۔ راتوں کو ہماری آنکھیں تھک کر بند ہونے لگتیں اور کمر میں ہلکا ہلکا درد۔ جب بھی

رات [illegible] کھلتی تو نعیمہ سوتے میں بڑبڑا رہی ہوتی اور پھر کھانسنا شروع کر دیتی۔ میں دعائیں مانگتی۔ اے اللہ اس کی کھانسی کو دور کر دے مگر دعائیں بیکار تھیں۔ نعیمہ گلی میں آنے والے بزاز سے کپڑا خریدتی اور ان کو اچھے اچھے لباس میں تبدیل کر دیتی۔ اپنی خوشی کو آنکھوں میں چھپائے وہ پھول کاڑھتی اور میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ سوت کی کمائی ریشمی کپڑوں میں بدلنے لگی۔ نعیمہ نے اپنی شادی کیلئے پانچ جوڑے تیار کئے۔

اس کے چہرے میں خون نہ رہا اور کھانسی میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک دن میں نے ماں سے جھجکتے جھجکتے کہا "ماں نعیمہ کے جوڑے مکمل ہو گئے۔" ماں نے اختر اور جمیل سے کہا تو انھوں نے جواب دیا "کپڑے تو بن گئے ماں مگر زیور اور فرنیچر کہاں سے آئیگا۔ تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ۔"

نعیمہ کے کانوں نے سب کچھ سن لیا مگر زبان سے اف تک نہ کی۔ اس رات وہ پہلی دفعہ اس پرانے بخار میں مبتلا ہو گئی جو اس گھر میں شکیلا پہ وارد ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنی چارپائی کے قریب بلایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی "عذرا! میری بہن۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں تم سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی مگر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے جلدی یا دیر سے تم سے جدا ہونا ہی پڑے گا۔ تو نے میرے لئے کتنی محنت اور مشقت کی ہے۔ ان کپڑوں کو تیار کرنے میں۔ میری پیاری بہن" وہ مجھ سے چمٹ گئی اور ہم دونوں خاموشی سے روتی رہیں۔

چند دنوں کے بعد وہ بستر علالت پہ دراز ہو گئی مگر اختر اور جمیل خاموش دیکھتے رہے۔ کہتے "ماں! بخار ہے۔ اتر جائے گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ موسم کی خرابی ہے"۔

ہمسائیگی سے عیادت ہونے لگی۔ نعیمہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی وہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی ماموں عیادت کے لئے تشریف لے آتے اور دعائیہ کلمات کہہ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

انور گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ وہ حکومت کے خلاف سر بازار نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ احراری تھا۔

میری ماں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ اس کو چھڑا لاتی۔ کئی دفعہ وہ بار بار ان لوگوں کے ساتھ [illegible] تھا پاؤں پکڑتی اور سماجتیں خوشامدیں کر کے اسے بچا لاتی۔ مگر حکومت کے آگے کس کا زور چل سکتا ہے۔

اور کل رات نعیمہ کی زندگی کی آخری رات چہار شنبہ کی رات۔ ہمارے بازار میں ایک عرس تھا۔ اس موقع پر ایک رنڈی کا ناچ ضرور ہوتا تھا اور ان کو تبرکات تقسیم ہوتے تھے۔ سر شام ہی لوگ آ گئے تھے اور کافی بھیڑ تھی۔ بجلی کی روشنی سے بازار بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بالآخر دس بجے کے قریب ایک عورت نیلی ساری میں ملبوس آکر ناچنے لگی۔ محلے کے بڑے بڑے آدمی بیٹھے تھے اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں میرے ماموں بھی بیٹھے تھے۔ ایک طرف جمیل کھڑا تھا۔ ہمارا مکان سر بازار تھا اور کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ محلے کی عورتیں اور جوان لڑکیاں دیکھنے کیلئے اکٹھی ہو گئیں۔

میں نعیمہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں درد تھا۔ وہ سخت بخار میں مبتلا تھی اور کھانس رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا "آج آخری چہار شنبہ ہے بہن۔ اٹھو۔ آؤ کھڑکی میں بیٹھ جاؤ اور نیچے تماشہ دیکھو"۔ اس نے اپنی کمزور آنکھیں کھولیں اور بولی "مجھ سے چلا نہیں جائے گا۔ عذرا میں وہاں تک کیسے جاؤں گی"۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ماں نے اور میں نے اسے اٹھایا اور کھڑکی تک لے گئیں۔ اسے کھڑکی میں بٹھایا اور چک گرا دی۔ میں اسے تھامے ہوئے تھی اور وہ کھڑکی میں سے نیچے جھانک رہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی اور دونوں ماموؤں کو پہچان لیا۔

وہ کھانستے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ جمیل کھڑا ہے عذرا؟ میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں۔ میرے ماموں [illegible] اس عورت کا لباس کتنا خوبصورت ہے۔ کتنا خوبصورت [illegible] ہے"۔ میں نے اس کی سوکھی کلائیوں کو تھاما ہوا تھا۔

ماں آ گئی۔ وہ خوش تھی۔ وہ [illegible]

ابھی ہو جائے گی۔ عذرا! تمہاری بہن کی قیمت آج ٹھیک معلوم دیتی ہے۔"

"ہاں ہاں" میں نے جواب دیا۔

پیچھے یکدم قہقہے بلند ہوئے اور گھنگھروؤں کی آواز طبلے کے ساتھ ساتھ بجنے لگی۔

میں نے دیکھا۔ میرے ماموں اس عورت کو نوٹ دے رہے ہیں۔ ہر دو تین منٹ کے بعد ایک نوٹ۔ پھر میں نے دیکھا۔ میرے بھائی نے اپنے منہ میں نوٹ پکڑا ہوا ہے۔ وہ عورت ناچتی ہوئی آئی اور اپنا منہ جمیل کے منہ کے قریب لے جاکر نوٹ کو اس کے منہ سے نکال لیا۔ قہقہے پھر بلند ہوئے اور طبلہ زور سے بجنے لگا۔

نعیمہ کھانس رہی تھی اور پھر وہ نقاہت سے بولی "عذرا مجھے یہاں سے لے چلو۔ مجھے میری چارپائی پر پھینک دو۔ تم نے جمیل کو دیکھا؟"

میں خاموش تھی۔ میں نے جمیل کو دیکھا تھا اور اپنے دونوں ماموں بھی دیکھے تھے۔

وہ پھر بولی "سنو عذرا۔ جاؤ ماں سے کہو۔ میرے کپڑے کہاں ہیں۔ وہ لے آؤ۔"

میں نے ماں کو آواز دی اور وہ چھوٹا سا صندوق لے آئی۔ اس نے کپڑے نکالے اور ان کو دیکھا۔ ماں جاچکی تھی۔

"عذرا بہن" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ کانپ رہی تھی۔ اس نے میرا نام دہرایا۔ میں اور اس کے قریب ہو گئی۔ پھر وہ بولی "یہ کپڑے تمہارے لئے ہیں۔ تم ان کو میری موت کے بعد پہن لینا۔ ورنہ یہ صندوق میں پڑے پڑے گل سڑ جائیں گے۔"

"کیا بکواس کر رہی ہو باجی" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں [illegible] عذرا۔ آؤ۔ مجھ سے [illegible]

[illegible]

[illegible] اس کا جسم [illegible] تھا۔

اور وہ ایک ہڈیوں کا ڈھیر بن چکی تھی۔ میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

وہ کھانستے ہوئے پھر بولی "جاؤ عذرا میرے لئے پانی کا ایک گلاس لے آؤ۔ ماں کو نہ بلاؤ۔ میں سنبھل کے بیٹھوں گی۔"

میں پانی لینے چلی گئی۔

وہ کھڑکی میں سے کود گئی۔ تین منزل اوپر سے۔ اس کی لاش جمیل کے قدموں میں پڑی تھی اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

میری ماں کپڑوں کو دیکھ رہی ہے اور رو رہی ہے۔

"ماں اٹھو خدا کے لئے۔ ان کپڑوں کو صندوق میں بند کر دو۔ اس پنکھے کو چھپا دو۔ میرے بھائیوں کو جاکر کہہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھ پر رحم کر دو۔"

# غزلیں

## ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

درازِ گیسوؤں سے ساز باز کرتے ہیں
وہ اپنی قید کی مدت دراز کرتے ہیں

سناتے ہیں انھیں حسن و وفا کے افسانے
اسی بہانے سے عرضِ نیاز کرتے ہیں

گو سنتے دیکھتے ہیں منہ سے کچھ نہیں کہتے
جو راز داں ہیں کب افشاءِ راز کرتے ہیں

ہے انقلاب زمانہ ترا فریبِ نظر
قدیم چال سے افلاک ناز کرتے ہیں

کسی غرض کسی مطلب سے کرتے ہونگے ادا
جو پنجگانہ ادائے نماز کرتے ہیں

مئے دو آتشہ جو صبح و شام پیتے ہیں
ہم اس سے قلب و جگر کو گداز کرتے ہیں

خدا سے مانگتے کچھ بھی نہیں خدا کے سوا
ہم اپنے سجدوں کو یوں سرفراز کرتے ہیں

نہ کہئے گر انھیں دیوانہ اور کیا کہئے
جناب اپنی طبیعت پہ ناز کرتے ہیں

---

## مجیب خیرآبادی

دم بخود ہوائیں تھیں، دور تھی سیاہی تک
کیا خروشِ طوفاں تھا اک مری تباہی تک

ہے انھیں کے قدموں پر تاجِ بادشاہی تک
جن کی خستہ حالی پر ہنس پڑی تباہی تک

ان دلوں بغاوت ہے شکوۂ تغافل بھی
موردِ سزا ٹھہرا عذرِ بے گناہی تک

گردشِ زمانہ بھی ایک سبب سہی لیکن
سلسلہ ہے وحشت کا تیری کم نگاہی تک

دور تک نہ تھا کوئی خطِ رہگذر روشن!
یوں سفینہ آپہنچا ساحلِ تباہی تک

اک ہمیں سے روشن ہے کچھ رہِ طلب ورنہ
کھو گئے دھندلکوں میں راہبر سے راہی تک

مشکلیں مجیب آخر سہل ہو گئیں یعنی
حادثوں کی یورش تھی عزمِ کج کلاہی تک

---

## پنڈت رگھوبندر راؤ جذب عالمپوری

جب پھول بن کے داغِ محبت نکھر گئے
نکہت کی طرح ہم بھی چمن سے گذر گئے

جلوے کو کس کے میری نگاہوں میں بھر گئے
مہر و نجوم و ماہ نظر سے اتر گئے

چھٹکی ہوئی تھی چاندنی جب حسن و عشق کی
راتیں وہ کیا ہوئیں، وہ زمانے کدھر گئے

طعنے کمالِ جذبۂ دل کو نہ دیجئے
نالے کئے ہی کب تھے کہ جو بے اثر گئے

تھا یہ تمہارا فیضِ تبسم بہار میں
دامن اگر کھلی ہوئی کلیوں سے بھر گئے

اللہ رے ان کی بزمِ محبت کی دلکشی
جانا قرینِ وضع نہیں تھا مگر گئے

سوزِ حیات تھی مرے دل کی فسردگی
پہلو میں میرے آتے ہی سب پھول مر گئے

ایسا ہی کچھ کٹھن تھا محبت کا راستہ
دو گام بھی نہ ساتھ مرے راہبر گئے

خانہ خراب عشق پہ رحم ان کو آگیا
ناکامیوں کے تیر بڑا کام کر گئے

گلشن تو اپنے حال پہ قائم رہا مگر
ہم صورتِ بہار ادھر آئے ادھر گئے

وہ اور ہیں جو راہ سے منزل کی لوٹ آئے
اے جذب ہم پہنچ کے رہیں گے، اگر گئے

## نامی انصاری

یہ اشکِ خونِ دل تو بڑے کام آگیا
لیکن حیاتِ حسن پہ الزام آگیا

میخانہ میں تھا ذکرِ شبابِ بہارِ نَو
بیساختہ لبوں پہ ترا نام آگیا

طے کر لیا تھا میں نے کہ میخانہ کو سلام
لیکن خیالِ بیعتِ خیام آگیا

کچھ ذوقِ میکشی کی تڑپ کام کر گئی
کچھ اعتبارِ ساقیٔ گلفام آگیا

آیا تھا صرف عشق لباسِ وجود میں
تخلیقِ کائنات کا الزام آگیا

اس جذبۂ خلوص کی کیا داد دیجئے
صحرا میں بھی خیالِ در و بام آگیا

بن جا رہا تھا سوئے سوادِ حرم مگر
یا کیجئے کہ دَیر سے پیغام آگیا

ان مست انکھڑیوں کی طرف کیا اٹھی نظر
اک بارگی خیالِ مَے و جام آگیا

نامیؔ نے بزمِ ناز میں رکھا ہی تھا قدم
چرچے ہوئے کہ شاعرِ خود کام آگیا

---

## جلال الدین جلال

اس حسن کے رنگین ساحل پر جب موجِ نظر ٹکراتی ہے
جلوؤں کے ستارے چن چن کر یہ تابِ نگہ بن جاتی ہے

جس بزم میں نغمے پلتے تھے واں یاس کا ہے سناٹا اب
ہاں شب کو کبھی اک گوشے میں امید بہک کر گاتی ہے

کیا جانے کھو جاتی ہے کہاں وہ نادیدہ ویرانوں میں
اوہام و خرد کے میداں میں جو راہ افق تک جاتی ہے

اس بارہ پہ آئی مینا میں افلاک سمائے جاتے ہیں
یہ جادۂ موجِ صہبا ہے یاں برق بھی ٹھوکر کھاتی ہے

بادل تو اٹھا ہی کرتے ہیں بادل سے کہیں کچھ ہوتا ہے
آتی ہے جو بجلی گرنے کو یاں مینہ وہی برساتی ہے

آغاز کے شیریں خوابوں سے انجام کا ترشہ کا ڈھلتا ہے
یہ کیف کی دنیا مٹتی ہے تو کیف جنوں بن جاتی ہے

دزدیدہ نگاہی ہائے غضب اور اس پہ جھکانا پلکوں کا
رہ رہ کے عروسِ نو کی طرح اس بت کی نظر شرماتی ہے

اس دل نے جلالؔ آتے آتے کتنوں کو سلایا محفل میں
کہہ دو کہ نہ چھیڑے کوئی ہمیں اب نیند ہمیں بھی آتی ہے

---

## تہذیب

ان کا غصہ ہی بجا ہے شاید
کوئی اپنی ہی خطا ہے شاید

دل کہیں بھی جو نہیں لگتا ہے
درد کا نشو و نما ہے شاید

ہنس کے ملنے لگے وہ ہر اک سے
ان کا معیار گھٹا ہے شاید

اس میں کانٹے ہی نظر آتے ہیں
راہِ اربابِ وفا ہے شاید

وہ بظاہر جو ہے انجان اتنا
اک لطفِ عطا ہے شاید

رہگذر اور کرے سجدہ تہذیب
کوئی نقشِ کفِ پا ہے شاید

## تہنیت

آپ کی چشمِ التفات
اپنی متاعِ کائنات
اور کا ذکر بے مزہ
بات ہے آپ ہی کی بات
آپ کی رہ میں ہو نثار
بس یہی مقصدِ حیات
وجہ وجودِ زندگی
بن گئی آپ ہی کی ذات
کون بیان کر سکے
آپ کی بے کراں صفات
جذبۂ شوق کی کمی
دیدہ و دل کی ہے وفات
دونوں ہیں آزمائشیں
زندگی ہو کہ ہو ممات
دیکھ حرم کی سادگی
چھٹ گئے سب تکلفات
یاد میں ان کی تہنیت
کٹ گئی زندگی کی رات

## سعادت نظیر

یاد جب آئی ادائے چشمکِ قاتل مجھے
ایک اک ذرہ نظر آنے لگا بسمل مجھے

عشق کا ہے اعتبارِ مستقل حاصل مجھے
خود نویدِ زندگی دیتا ہے مستقبل مجھے

قوتِ دل ہے مری طوفان شکن، دریا شگاف
کیوں ہوا دیتا ہے اپنی دامنِ ساحل مجھے؟

گریۂ شبنم بھی دیکھا خندہ ہائے گل کے ساتھ
رازِ فطرت کیا ہے؟ کچھ تو ہی بتا، اے دل مجھے

قوتِ بے باک جب توڑے مسافت کے قیود
پھر نظر آئے نہ کیوں زیرِ قدم منزل مجھے؟

سوزشِ پروانۂ جاں باز میرے دل میں ہے
کیا لبھائے گی کسی کی گرمیٔ محفل مجھے؟

حوصلوں نے جب حوادث کو کیا زیرِ نگیں
کاروانِ شوق سمجھا رہبرِ کامل مجھے

سختیوں سے موت کی بھی کھیلتا رہتا ہوں میں
زندگی کی کوئی مشکل اب نہیں مشکل مجھے

اضطرابِ شوق کے ہاتھوں ہے دل بے اختیار
کھینچتی ہے اپنی جانب دور سے منزل مجھے

میں وہی ہوں، دل وہی، شورش وہی، کاوش وہی
دیکھتی ہے اجنبی نظروں سے کیوں محفل مجھے؟

اک تری نسبت سے مشتِ خاک پہنچی ہے کہاں
رہنے دے برباد ہی، اے گردِ کارِ دل مجھے

زورِ بازو کے سہارے آگے بڑھتا ہے نظیر
خود بنانا ہے عمل سے اپنا مستقبل مجھے

---

## احقر کاشی پوری

جنھیں نور و نغمہ کی چاہ تھی وہ سیاہیوں سے گزر گئے
انھیں موت نے بھی جھڑک دیا جو غمِ حیات سے ڈر گئے

کبھی جس کے محض خیال ہی سے ہزار رنگ بکھر گئے
وہ بہار زیبِ چمن ہوئی تو گلوں کے چہرے اتر گئے

ہمیں اب شکستِ دل و نظر بھی عزیز ہے کہ اسی سے ہم
غمِ عیش و یاسِ امید کے کئی مرحلوں سے گذر گئے

وہی رقصِ رنگ کی چھن چھنن، وہی نکہتوں کی چبھن مگر
جنھیں دل سے نسبتِ خاص تھی وہ پیام جانے کدھر گئے

ترے التفاتِ ستم نما کا میں دل سے شکر گذار ہوں
مری زندگی کے سیاہ دن یہی زہر پی کے نکھر گئے

جنھیں آندھیوں نے نگل لیا وہ حریفِ دورِ خزاں تو تھے
مگر ان گلوں کا قصور کیا جو بہار ہی میں گزر گئے

غمِ زیست پھر غمِ زیست ہے اسے لطف کیف سے کیا غرض
جو ملی نگاہ تو دو گھڑی کو فضا میں گیت بکھر گئے

انھیں راستے ہی میں ڈس لیا کبھی حسن نے کبھی عشق نے
ترے قیدیوں کو زماں مکاں کے پیام شام و سحر گئے

نہیں یہ نہیں کوئی مصلحت، اسے بزدلی ہی کہیں گا مگر
غمِ زندگی سے نظر ملی تو نظر بچا کے گزر گئے

## نور تقی

ذرا سی ٹھیس لگے اور اشک بھر لاؤں
میں کوئی اور نہیں ہوں کہ غم سے گھبراؤں
تمہاری بزم میں ہے کس کو اب شعورِ وفا
کسے خدائی الفت کے راز سمجھاؤں
کہاں کی چارہ گری اور کہاں کی ہم نفسی
دعا کرو کہ غمِ زندگی سے چھٹ جاؤں
جو تیری یاد مرے سوزِ غم کو فرصت دے
نفس نفس سے زمانہ پہ آگ برساؤں
کہاں کے شیشہ و ساغر نگاہِ ساقی سے
نظر ملی بھی نہ تھی ڈگمگا گئے پاؤں
کسی کے پائے حنائی مری جبینِ نیاز
میں کیوں نہ اپنے مقدر پہ نور اتراؤں

---

## سید صادق علی صادق

آسودۂ گلشن تم کو ابھی تکمیلِ بہاراں کرنا ہے
خود اپنا ہی دامن بھرنا کیا اوروں کا بھی دامن بھرنا ہے
ہر غنچہ کھلے، ہر پھول ہنسے، ہر شئے پہ مسرت چھا جائے
اے اہلِ چمن اس طرح تمہیں تنظیمِ گلستاں کرنا ہے
ہر لمحہ جب ہے بارِ گراں ہر سانس ہے جب شعلہ ساماں
پھر تو ہی بتا انصاف سے دل یہ جینا ہے یا مرنا ہے
منزل پہ سیاہی کے پہرے ہر گام پہ ہے رہزن کی نظر
سب کچھ یہ سہی اے دوست مگر ان راہوں کو طے کرنا ہے
یہ شکوۂ رنج و محن کیسا یہ دہشتِ دار و رسن کب تک
اس خوف کو صادق کیا کہیے خود سائے سے اپنے ڈرنا ہے

---

# نظمیں

## چیرہ دستی — قامو صحرائی

نفس نفس میں تلاطم ہے چیرہ دستی کا
کوئی جواز بھی آخر ہو مے پرستی کا
نظر نظر سے عیاں ہیں حکایتیں دل کی
کہیں رکاؤ بھی آخر ہو اپنی پستی کا
قدم قدم پہ بچھی جا رہی ہے تاریکی
اجڑ چکا ہے سکون جب سے دل کی بستی کا
کہیں تو کس سے کہیں درد دل کا افسانہ
رفیق جب کہ ہو دشمن بقائے ہستی کا
جب انتقام پہ آئیں اٹھا کے چھوڑیں گے
دبا ہوا ہے جو طوفان سر میں مستی کا

## قطعات — فیروز نقطہ

بقعۂ نور دل ہے داغوں میں
قابل دید بن گئے ہیں ہم
خیر اپنی منائے تاریکی
رشکِ خورشید بن گئے ہیں ہم

غم کے سانچے میں زیست ڈھلتی پھر
آرزو کروٹیں بدلتی ہے
ہم جہاں ہم نشین رہتے ہیں
ان دیاروں میں موت پلتی ہے

آپ کا مشغلہ ہے مے نوشی
ہم کہ اپنے لہو کو پیتے ہیں
آپ کو زندگی میسر ہے
ہم نہ مرتے ہیں اور نہ جیتے ہیں

## تلخیٔ احساسات — ابو سعد سید اسمعیل سید

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں
آدمی آدمی کا ہے دشمن
زندگی مجرموں کی ہے روشن
کیوں یہ دنیا ہے نیکوں سے بدظن
میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں
جن جبیں پر نہ ہے داغ سجدہ
طاق ابرو میں ہو جس کے قشقہ
فتنہ ان ہی سروں میں ہے خفتہ
میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں
ایشیا سے ہے جن کو عداوت
دیکھتا ہے بنظر حقارت
اب اسی بحر کی ہوگی جو بغاوت
میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں
کمسنی میں ادا ہے جوانی
وقت کے پہلے ہے شادمانی
اور جوانی میں ہے ناتوانی
میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں
کون کب تک سنے لن ترانی
طول ہے زندگی کی کہانی
ہو گئی سنتے سنتے پرانی
میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

## الیاس

تاج گرہنگری

آہ یہ کیا کہ تری آنکھ سے آنسو ہیں رواں
آج میں دیکھ سکوں گا نہ یہ دل سوز سماں
آہ یہ تیری محبت! یہ ترا درد نہاں
منہ نہ پھیرو مرا اے دوست مری جانِ جہاں
دل مجبور کو بھی دیکھو، جنوں کو بھی دیکھو
مجھ کو بھی دیکھو، مرے حالِ زبوں کو بھی دیکھو
اک طرف دیس ہے، ماں باپ ہیں، دشواری ہے
اک طرف پاؤں کی زنجیر ہے رسوائی ہے
اک طرف تیری محبت سے گریزاں ہوں میں
اک طرف تو نے محبت کی قسم کھائی ہے
توڑ کر پاؤں کی زنجیر بغاوت کر لوں
تیرا منشا ہے کہ میں تجھ سے محبت کر لوں
میں وہ دہقاں ہوں اک کوڑی بھی جس کے پلے
میں وہ مزدور کہ ہوں نانِ جویں کا محتاج
میں وہ بھوکا ہوں کہ افلاس ہوں، وہ نادار کہ بس
مجھ کو بھائے گی نہ ہرگز تری غیرت سرتاج
شال کو کملی کا پیوند سزاوار نہیں
تم امیروں کو غریبوں سے سروکار نہیں
میں نے مانا کہ تجھے میرے بنا چین نہیں
اور آتا نہیں اک پل بھی ترے دل کو قرار
پھر کروں کیا کہ مرے پاس فقط اک لنگی
تیرے ماں باپ کو دولت پہ ہے کتنی سرکار
اس لئے اے مرے محبوب تو آنسو پی لے
کسی مزدور پہ دل ہے تو لبوں کو سی لے

---

زبیدہ تحسین

## گمشدہ انگوٹھی کے دوبارہ ملنے پر

کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
تجھ کو کھو کر بڑھ گئی تھیں اور توقیریں تری
منعکس سی ہو گئی تھیں دل میں تصویریں تری
بندگی وہ ہے کہ سجدوں کی ضرورت ہی نہ ہو
زندگی وہ ہے جو مرہونِ مسرت ہی نہ ہو
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
تو مری روٹھی تمنا کا درخشاں خواب ہے
داستانِ زندگی کا جیسے مرے باب ہے
تجھ میں مضمر میرے نغمے گیت ہیں جھنکار ہیں
زیبِ قرطاس و قلم روٹھے ہوئے افکار ہیں
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
ڈر رہی ہوں اس مسرت کی نئی تمہید سے
خوف ہے پھر آج کی اس یاد کی تجدید سے
عارضی میری خوشی یہ رنجِ دیرینہ نہ ہو
آج کی تجدید پھر اک عہدِ پارینہ نہ ہو
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
رشتۂ انس و محبت کو بڑھا کر اور بھی
پیار اور اخلاص کے انداز دکھا کر اور بھی
چھوٹنے پر مجھ سے تو مجبور ہو جائے کہیں
ڈھونڈ بھی پاؤں نہ تجھ کو تو جو کھو جائے کہیں
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری

## خودکشی سے پہلے

شہریار رضوی

دوست اس درجہ مصائب سے پریشان نہ ہو — زیست کو داستانِ وعذرا کا فسانہ نہ بنا
چند بے ربط ارڈانوں کا سہارا لے کر — اپنی الفت کو ہزیمت کا نشانہ نہ بنا

متفق ہوں تیرے ان درد بھرے لفظوں سے — اپنی دنیا میں تو اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
منزلیں پاس سرکتی ہوئی کتراتی ہیں — راہ میں اپنی دھندلکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

اس سے پہلے کہ تیرے ذہن کی محرابوں میں — جل کے بجھ جائیں امیدوں کے ضیا بار چراغ
اس سے پہلے کہ پہنچ جائے کسی چوٹی پر — اپنی فردوسِ تخیل کا نہ پاکر تو سراغ

دیکھ بازاروں میں گلیوں میں چراگاہوں میں — دیکھ کٹیاؤں میں روندے ہوئے دور ابھی
کتنی مخلوق ہے اس دور کی ظلمت کا شکار — کتنے مہتاب سسکتے ہیں حسیں بام پر

دیکھ ان تیرہ و تاریک سیہ خانوں کو — جن میں پھوٹی نہ کبھی آس کے سورج کی کرن
دیکھ ہر موڑ پہ بیٹھے ہوئے انسانوں کو — کھا گیا جن کو زمانے کا بہیمانہ چلن

یوں اگر ہے تو زمانے کا بہیمانہ چلن — توڑ ڈالے گا امیدوں کے حسیں تاج محل
رنج و آلام کے بادل یوں ہی منڈلائیں گے — تمتماتا ہی رہے گا تری آشا کا کنول

یوں نہیں ہے تو مرے دوست سکوں کی خاطر — بڑھ کے للکار سنائے ہوئے انساں کو پکار
تیرہ و تار گھروندوں میں چراغاں کرنے — پھونک دے سارے زمانے میں بغاوت کے شرار

پھر نئی صبح نیا دور نئے آدم زاد — اپنی نفرت کا ہمالہ پہ علم گاڑیں گے
تیری فردوسِ تخیل تجھے مل جائے گی — اپنے دامن سے بھی گرد و الم جھاڑیں گے

## لسانی تقسیم

راجہ کشن پرشاد

رہتے تھے آپس میں ہم مل مل کے سب — اب نہ جانے تم کہاں اور ہم کہاں
ہے ریاست اس کی جس کی ہے زبان — یک اکھاڑہ بن گیا ہندوستاں
خورش نہ گھبراتی نہ ہیں کرناٹکی — ہیں تلنگے اور مرہٹے خونفشاں
ناچ آزادی کا اب ناچیں گے لوگ — ڈال کر پاؤں میں اپنی بیڑیاں
ناخدا ہی جب خدا کو بھول جائے — پھر بھلا کشتی کہاں ساحل کہاں
ملک سارا جب کہ صحرا بن گیا — دیکھئے جائے کدھر کو کارواں
مٹ گئے مذہب کے جھگڑے آجکل — لڑنے والی ہے زبانوں سے زباں

ہے زباں والوں کی یہ دنیا گراں
بے زبانوں کا فقط ہے آسماں

# تبصرے

از:- ادارہ

**ادب لطیف (لاہور)** مکتبہ اردو لاہور کا یہ ترجمان سالہاسال سے شائع ہوتا ہے۔ مرزا ادیب نے یہ خاص اردو نمبر دسمبر ۱۹۵۵ء میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ابتدا میں چند مشاہیر اردو خسرو، ولی، میر، سودا، نظیر، آتش، انسیم، سپرو، کیفی، عبدالحق، ذاکر حسین اور منشی نولکشور کی پوری صفحہ کی تصاویر درج ہیں۔

اس اردو نمبر کو چار پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "اردو ہماری زبان" کے عنوان پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر دیوانہ، گوپی چند نارنگ وغیرہ کے مضامین شریک ہیں۔ دوسرے حصہ کا عنوان ہے "اردو کے لسانی و ادبی مسائل"۔ اس عنوان کے تحت پاکستان کا لسانی مسئلہ اور اردو کی ترقی، کا مسئلہ، اردو اور رومن رسم الخط وغیرہ پر مفید اور اہم مضامین درج ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر اردو لاہور یونیورسٹی نے "اردو کے ناشروں" اور "اردو پنجاب یونیورسٹی میں" کے عنوانوں پر عمدہ اور معیاری مقالے قلمبند کئے ہیں۔ یہ حصہ بہت معلوماتی ہے اور اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے اہل اردو پاکستان میں اردو کی رفتار ترقی سے واقف ہو سکتے ہیں۔

تیسرا حصہ پاکستان کے مشہور شہروں مثلاً کراچی، ڈھاکہ، لاہور، پشاور اور راولپنڈی میں اردو کے کام اور حالت کے جائزہ کے لئے وقف ہے اور یہ بھی بہت پراز معلومات ہے۔

چوتھا حصہ اردو کے اداروں کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیات اردو پر بسیط تعارفی مضمون اسی میں شریک ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو پر غلام حسین نگار صاحب نے محنت اور کاوش سے معلومات فراہم کی ہیں۔ اگرچہ ایک دو جگہ بعض ناموں میں غلطی ہو گئی ہے۔ لیکن اتنی دور بیٹھ کر ادارے کے کاموں کا جس خوبی سے جائزہ لیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ غلطیاں قابل درگذر ہیں۔ جامعہ عثمانیہ پر ڈاکٹر زور صاحب کا مقالہ بھی بہت ہی جامع اور مانع ہے۔

آخر میں "اردو کے ایک عظیم ناشر" کے عنوان سے منشی نولکشور کا تذکرہ درج کیا گیا ہے جو اپنی نوعیت کا اور معلوماتی مضمون ہے۔

عبدالعزیز فطرت اور ہوش صدیقی کی طویل گراں مایہ نظمیں بھی قابل تعریف ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ اردو نمبر ایک بہت کامیاب سعی ہے اور اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت اردو کے مسائل کیا ہیں اور ان کو پاکستان میں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ یقین ہے کہ پاکستانی ارباب فکر اس دعوت غور و فکر پر دھیان دیں گے اور اس زبان کی خدمت کے لئے کربستہ ہو جائیں گے۔

یہ خاص نمبر (۳۱۶) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت دو روپے بارہ آنے کچھ زیادہ نہیں۔

**افکار (کراچی)** | ادبستان بندر روڈ کراچی سے شائع ہوتا ہے اور اب اس نے اپنا دس سالہ نمبر خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کو صہبا لکھنوی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اور کسی خاص موضوع یا مسائل کے لئے وقف کرنے کی جگہ عام نمبروں کی طرح رنگارنگ مضامین نظم و نثر سے اس خاص نمبر کو آراستہ کیا ہے۔ ناولٹ، ڈرامہ، رباعی، نظم، گیت، افسانہ، سفرنامہ، خاکے، دیس دیس کی کہانیاں اور نظم، فنون لطیفہ، مقالے، جائزے اور رفتار عالم غرض جملہ عنوانات کے تحت اردو کے مشاہیر اہل قلم کے رشحات بڑی محنت اور کاوش سے جمع کر دیئے ہیں۔

ابتدا میں چار صفحات کی تصویریں بھی ہیں۔

(۳۴۰) صفحات اور قیمت تین روپے۔

اس کے لکھنے والوں میں پدم کاشی پنڈت، پروفیسر شور، جان نثار اختر، جوش، شاذ تمکنت، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ملک راج آنند، علی اختر، عبدالرحمن چغتائی، احمد ندیم قاسمی بطور خاص قابل ذکر ہیں اور یہ خاص نمبر اپنے گلہائے رنگ رنگ کی وجہ سے شوق سے پڑھا جائے گا۔

**نوائے وقت** | مرتبہ نظام الدین ایس گورے کر ایم اے استاد شعبہ اردو و فارسی سینٹ زیویرس کالج بمبئی۔ ناشر رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ قیمت دو روپے۔

یہ (۱۰۳) صفحات کی ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں جناب گورے کر صاحب کے مختلف مضامین اور تقاریر جمع کی گئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر نظام الدین صاحب بمبئی کے ان اصحاب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جو وہاں کے کالجوں کے طلباء میں اردو زبان اور ادب کا اچھا ذوق پیدا کر رہے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعوں مثلاً مشترکہ زبان، گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ، غالب کی شخصیت، اکبر اور مغربیت اور کیفی کی شاعری پر دلچسپ اور مفید مضامین قلمبند کئے ہیں۔ اردو کے ادب پر ان کی اچھی نظر ہے اور اردو کے مسائل پر غور و فکر کرنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے اور اس قابل ہے کہ طلبہ اور اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے مطالعہ کریں۔

**پیام مشرقی** | مرتبہ میر ولایت علی صاحب ناشر ادارہ علمیہ اعظم پورہ حیدرآباد۔ قیمت [illegible]

(۱۸۲) صفحات کی اس کتاب میں مولوی میر ولایت علی صاحب نے علامہ عنایت اللہ خاں صاحب مشرقی [illegible]

ی مختلف تصانیف کے جائزے اور مستند اقتباسات مرتب کئے ہیں۔ ابتداء میں حالات زندگی لکھے ہیں اور مشرقی صاحب کے خطبات اور تصنیفات پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔

علامہ مشرقی ایک زمانہ میں ہندوستان کے مشاہیر سیاست میں شمار پاتے تھے اور قیام پاکستان سے قبل انھوں نے مسلمانوں کے رہبر کی حیثیت سے بڑا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن قائد اعظم محمد علی جناح کی تحریک پاکستان اور اس کے حصول کے بعد انھوں نے از خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سرسید احمد خاں کے بعد ہندوستان میں جو مختلف مشاہیر اسلام پیدا ہوئے ان کی تاریخ میں علامہ مشرقی کا نام بھی ایک صاحب ایثار مرد مجاہد کی یاد دلائے گا۔ اور یہ کتاب ان کی زندگی اور کام کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

**اسلامی تعلیمات** | مولفہ میر ولایت علی صاحب ناشر ادارۂ علمیہ اعظم پورہ حیدرآباد۔ قیمت چار روپے۔

مولوی میر ولایت علی صاحب جو علامہ مشرقی سے بہت متاثر ہیں اس کتاب کے مولف ہیں اور انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے وسائل شرح و بسیط کے ساتھ پیش کریں۔ اس کتاب کا تعارف ڈاکٹر امیر علی صاحب نے گلبرگہ کیا ہے۔ اور تعلیم قرآن پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مسلمانوں کے مسائل اور مختلف ضروریات کے بارے میں اس کتاب میں مفید معلومات اور مشورے درج ہیں۔

**تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر** | مرتبہ مغنی تبسم صاحب ایم اے۔ ناشر شعور پبلیکیشنز عثمان پورہ حیدرآباد

یہ ایک چھوٹا سا مضمون ہے جس میں تلگو زبان کے آغاز سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی کے ختم تک تلگو ادب کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور مولف کا خیال ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے بعد سے زمانۂ حال تک کے تلگو ادب کی تاریخ دوسرے حصہ میں پیش کی جائے گی۔

مولف نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ تلگو ادب کے بارے میں ان کی معلومات بالواسطہ ہیں۔ بہر صورت یہ چھوٹی سی کتاب اردو میں ایک ایسی زبان کے بارے میں معلومات پیش کرتی ہے جس کی نسبت اس زبان میں اب تک کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔ مولف سے توقع ہے کہ اس موضوع پر مزید محنت کر کے آئندہ ایک مکمل کتاب شائع کریں گے۔

**...فی القرآن** | مرتبہ مولوی حافظ محمد مظہر صاحب ناظم مجلس ایجوکیشن کا غزنش حیدرآباد۔ قیمت بارہ آنے۔

حافظ محمد مظہر صاحب حیدرآباد کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد ہیں اور ان کی کئی ... اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو سے بھی ان کی ایک تاریخی کتاب "دارالعلوم کے سپوت" ... جس میں دارالعلوم کے مشہور فرزندوں کے سوانح کا تذکرہ درج ہے۔ اب انھوں نے تفہیم و ... قرآن کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کے ذریعہ ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے ... آسانی سے اس کتاب کو سمجھ سکیں گے۔ یہ کتاب بہت محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے اور توقع ہے کہ مقبول ہوگی۔

## انگاروں کے گیت

مجموعۂ کلام حسن شہیر صاحب۔ ناشر کتابستان الہ آباد۔ قیمت ڈھائی روپے۔

یہ تقریباً سو صفحات کا ایک مجموعۂ کلام ہے جس کے مصنف حسن شہیر صاحب کے پہلے مجموعہ "صبح زنداں" پر اس سے قبل سب رس میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ حسن شہیر صاحب ترقی پسند شعراء کی صف میں ایک با شعور فنکار ہیں جو آہستہ آہستہ اپنے لئے ایک جگہ حاصل کرتے جا رہے ہیں اور کیا تعجب ہے کہ ان کے کلام کی وجہ سے ترقی پسند شاعری میں ایک نیا باب کھل جائے۔ اس میں ایک خاص انفرادیت ہے اور ان کی ذہنی تخلیق میں ایک نئی شگفتگی اور بانکپن نظر آتا ہے۔ وہ زیادہ تر آزاد نظمیں لکھتے ہیں لیکن ان کا کلام شعریت اور فنکارانہ نزاکتوں سے محروم نہیں ہے۔ یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ "انگاروں کے گیت" پہلے مجموعے کی طرح مقبول ہوگا۔ اور نوجوان شعراء کے لئے نمونہ کا کام دے گا۔

## کتاب نورس

مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد۔ ناشر دانش محل لکھنؤ۔ صفحات (۱۶۸)۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

نورس ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور (۹۸۸ھ۔ ۱۰۳۷ھ) کی نظموں کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر موسیقی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ اپنے خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا۔ اس نے علم و ادب اور فنون لطیفہ اور موسیقی کی بے نظیر سرپرستی کی اور اس کی شہرت سن کر دور دور سے سینکڑوں ارباب کمال اور مشاہیر فن اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔

ابراہیم نے جو نظمیں خود لکھیں وہ نہ تو دکنی میں ہیں نہ گجراتی میں بلکہ اس نے مختلف زبانوں کا ایک ایسا مرکب اپنے اظہار خیال کے لئے استعمال کیا جو اس عہد میں موسیقی کی اصطلاحوں اور موسیقاروں میں رائج تھا۔ اسی لئے اس نے کثرت سے بھی لفظ استعمال کئے جو کرناٹک موسیقی کے لئے رائج تھے اور جن کو مرتب سمجھ نہ سکے۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کتاب کو مرتب کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے مگر اس کے مطالعہ سے جگہ جگہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ابراہیم عادل شاہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ اس کی کتاب نورس کو صحیح طور پر پڑھ سکے ہیں۔ وہ دکنی زبان، کلچر اور تاریخ سے قطعی طور پر ناواقف ہیں اور یہی وجہ ہے اس کتاب کے دیباچہ اور خود کتاب کے اشعار میں ایسی ایسی واضح اور فاش غلطیاں نظر آتی ہیں جو دکنی زبان اور تاریخ سے واقف کار ہرگز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ تمام غلطیاں مشہور انگریزی رسالے "اسلامک کلچر" کے ایک مضمون میں وضاحت سے درج ہیں جو ڈاکٹر زور صاحب نے قلمبند کیا ہے اور جو شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد اس کے دوسرے ایڈیشن میں اس کو درست کر لیں گے اور ہندی اور انگریزی میں بھی چونکہ وہ یہ کتاب چھپوانا چاہتے ہیں اس لئے ان میں بھی ان کا لحاظ رکھیں گے۔ ہم اسلامک کلچر کے اس مضمون کا اردو ترجمہ آئندہ سب رس کے کسی شمارے میں بھی شائع کریں گے۔ اس قسم کی ایک دو مثالیں یہ ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ نے اپنی والدہ کو ان نظموں میں ہر جگہ حاجی بڑے صاحبہ کے لقب سے یاد کیا ہے اور یہ طریقہ دکن میں اب تک رائج ہے کہ خواتین کے لئے مذکر افعال اور صفات استعمال کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ہر جگہ ہند کی یعنی معیاری اردو کے مطابق حاجی بڑی صاحبہ وغیرہ لکھ دیا ہے۔

اسی طرح تلنگہ جہاں کو تلنگی جہاں اور رنگنی کر گئے ہیں اور اجہریج کو اجہ رہج لکھا ہے۔ اسی طرح تاریخی ناواقفیت کی بھی کئی مثالیں ہیں۔ چونکہ آئندہ ڈاکٹر زور صاحب کا تفصیلی مضمون شائع ہوگا اس لئے یہاں اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ یہ کتاب ناواقفیت کی بنا پر بہت ہی غلط مرتب ہوئی ہے اور ابراہیم عادل شاہ جیسے بڑے شاعر اور موسیقار کے ساتھ بہت بے انصافی کی گئی ہے۔

# ادارۂ ادبیات اردو

## علمی، ادبی و کلچرل مصروفیات

## سنہ ۱۹۵۵ء

**اتوار۔ ۲ر جنوری**

شام کے چار بجے سلور جوبلی کی ذیلی کمیٹی برائے ڈراما منعقد ہوئی جس میں ایکٹروں وغیرہ کا انتخاب کیا گیا۔

**پیر۔ ۳ر جنوری**

اعتراف خدمات حضرت امجد کے لئے ایک مشاورتی مجلس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں محمد اسد اللہ صاحب انجینئر کو صدر مجلس منتخب کیا گیا اور مختلف اصحاب کو کام تفویض کئے گئے۔

**جمعرات ۶ر جنوری**

شام ۵ بجے مجلس استقبالیہ سلور جوبلی ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مختلف امور کے لئے ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں اور ان کے کنوینر منتخب ہوئے۔

**جمعہ۔ ۷ر جنوری**

شام کے ۶ بجے شہر [illegible] راؤنڈ ٹیبل منسٹرال و [illegible] مجلس استقبالیہ سلور جوبلی ادارہ نے اورینٹ ہوٹل میں ایک [illegible] کی جس میں حیدرآباد کے چند اخبارات [illegible] کے علاوہ [illegible]

**پیر۔ ۱۰ر جنوری**

شام کے ۵ بجے سلور جوبلی کی مالیاتی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور فراہمی رقم کے وسائل پر غور و خوض اور تقسیم کار عمل میں آیا۔

**جمعہ۔ ۱۴ر جنوری**

۵ بجے شام سلور جوبلی ڈنر کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور انتظامی امور طے کئے گئے۔

**منگل۔ ۱۸ر جنوری**

۵ بجے شام مجلس مشاورت اعتراف خدمات حضرت امجد کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں کام کی رپورٹ پیش ہوئی اور آئندہ کا پروگرام تیار کیا گیا۔

**ہفتہ۔ ۲۲ر جنوری**

شام کے چار بجے سلور جوبلی کی نمائش کے لئے رسم خط اور مخطوطات کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔

**منگل۔ ۲۵ر جنوری**

شام کے ۵ بجے مجلس انتظامی سلور جوبلی کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں جلسوں کے پروگرام اور دیگر تفصیلات طے کی گئیں۔

**جمعرات ۔ ۲۷ر جنوری**

شام کے ۵ بجے ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کا افتتاحی اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر بی۔ رام کرشنا راؤ چیف منسٹر حکومت حیدرآباد نے کی۔

- رات کے آٹھ بجے سلور جوبلی کا ڈنر ترتیب دیا گیا۔
- رات کے نو بجے لوک گیت اور ڈراما پیش کیا گیا۔

**جمعہ ۔ ۲۸ر جنوری**

شام کے ۵ بجے علمی اجلاس بصدارت پنڈت کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اسپیکر حیدرآباد اسمبلی منعقد ہوا۔

- رات کے نو بجے "شام غزل" بصدارت شری ایم۔ این گپتا منسٹر تعلیمات حکومت حیدرآباد شروع کیا گیا۔

**ہفتہ ۔ ۲۹ر جنوری**

شام کے ۵ بجے علمی اجلاس بصدارت شری گوپال راؤ ایکبوٹے وزیر تعلیم شروع ہوا۔

- رات کے ½ ۹ بجے کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جوش ملیح آبادی ۔ جگر مرادآبادی ۔ عرش ملسیانی وغیرہ نے حصہ لیا۔

**پیر ۔ ۳۱ر جنوری**

شام کے ۵ بجے ڈائمنڈ جوبلی حضرت امجد منائی گئی۔

- رات کے ½ ۹ بجے ڈائمنڈ جوبلی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

**اتوار ۔ ۶ر فروری**

شام کے ساڑھے چار بجے اردو میں لفظ شماری کی کمیٹی کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے اس کام میں تعاون کرنے والے اصحاب کی فہرست تیار کی گئی اور ابتدائی لائحہ عمل مرتب کیا گیا

**جمعرات ۔ ۱۷ر فروری**

شام کے ۵ بجے شری پی ہنمنت راؤ صدر استقبالیہ نے سلور جوبلی کے کارکنوں کو چائے پر مدعو کیا۔ شری ڈگمبر راؤ بندو کارگذار چیف منسٹر حیدرآباد نے بھی شرکت کی اور تقریر کی اور کتاب ڈاکٹر زور مرتبہ محمد بن عمر صاحب ڈاکٹر زور صاحب کو پیش کی۔

- شام کے ۷ بجے مجلس انتظامی سلور جوبلی ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسابات آمد و خرچ سلور جوبلی پیش کیے گئے۔

**جمعرات ۔ ۲۴ر فروری**

شام کے ۵ بجے ڈائمنڈ جوبلی حضرت امجد کی مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا جس میں آمد و خرچ کے حسابات کی تفصیل پیش کی گئی۔

**ہفتہ ۔ ۲۶ر فروری**

ساڑھے تین بجے مجلس اردو امتحانات کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں ممتحنین کا انتخاب عمل میں آیا اور نصاب پر نظرثانی کی گئی۔

**جمعرات ۔ یکم مارچ**

سوشیل سنٹر سید علی گوڑہ کا افتتاح کیا گیا۔

**چہارشنبہ ۔ ۲۳ر مارچ**

سوشیل سنٹر ٹانات محل چھتہ بازار کا افتتاح کیا گیا

**جمعرات ۔ ۳۱ر مارچ**

۵ بجے شام ادارہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس منعقد ہوا۔ گذشتہ سال کی تنظیم [illegible] نے پر غور ۔ سال حال کے لئے سفارشات مرتب کرنے کے لئے ایک

بنائی گئی۔ شری پی ہنمنت راؤ کو اس مجلس کا رکن منتخب کیا گیا۔ سلور جوبلی کی تقریبات کی کامیابی پر مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں اور مختلف کمیٹیوں کے معتمدین کو صدر صاحب ادارہ کی طرف سے شکریہ کے خطوط ارسال کرنے کا تصفیہ کیا گیا۔

**جمعہ۔ یکم اپریل**

سوشیل سنٹر دبیر پورہ (ریلوے گیٹ) کا افتتاح عمل میں آیا۔

**ہفتہ۔ ۲ر اپریل**

صبح ساڑھے آٹھ بجے مجلس انتظامی کی منتخبہ ذیلی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ۱۹۵۵ء کی تنظیم ادارہ پر نظر ثانی کر کے جدید سفارشات مرتب کی گئیں۔

**منگل۔ ۱۲ر اپریل**

شام کے ساڑھے پانچ بجے مجلس اردو امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں عام معلومات کی کتاب مرتب کرنے اور پوسٹ نرسی کا نصاب بنانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور اردو امتحانات کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔ بالغوں کے لئے مشاہیر ہند پر کتابیں لکھوانے کا تصفیہ کیا گیا۔

**جمعہ۔ ۱۵ر اپریل**

۶ بجے شام ادارے کی مجلس انتظامی کا اختتامی اجلاس منعقد ہوا۔ ذیلی کمیٹی کی سفارشات بعد ترمیم منظور کی گئیں۔ سوشیل سنٹرس کو خرید و چھاپہ کے لئے جاری رکھنے کا تصفیہ کیا گیا اور ادارے کی مجلسوں کے جملہ دفتروں کو ادارے میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء و ۱۹۵۶ء کا موازنہ منظور کیا گیا۔

**ہفتہ ۱۶ر اپریل**

صبح ساڑھے نو بجے مجلس اردو امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ادارے کے امتحانات بابتہ جون کے ممتحنین کا تقرر کیا گیا۔ ادارے کی شاخ جمشید پور کو نصاب اردو دانی واردو زبان دانی کا ایک ایک سٹ بھجوانے کا تصفیہ کیا گیا۔

**چہارشنبہ۔ ۱۸ر مئی**

رات کے آٹھ بجے ڈاکٹر حفیظ سید صاحب الہ آباد نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

**چہارشنبہ۔ یکم جون**

سوشیل سنٹر جنگم میٹھ کا افتتاح کیا گیا۔

**چہارشنبہ۔ ۸ر جون**

مس دولبی متعلقہ سوئٹزرلینڈ کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر سردار محبوب اور زینت ساجدہ وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**جمعہ۔ ۱۰ر جون**

صبح دس بجے ادارے کے اردو امتحانات (اردو فاضل اردو عالم، اردو زبان دانی اور اردو دانی) حیدرآباد کے زنانی و مردانی مرکزوں کے علاوہ جمشید پور، کلیانی اور ادیرائی (یو۔ پی) میں بھی تین دن تک لئے گئے۔

**ہفتہ۔ ۱۸ر جون**

شام کے سات بجے پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی سپیکر بنگال اسمبلی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

**اتوار۔ ۲۶ر جون**

شام کے چار بجے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب علیگڑھ کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر سروری، سید محمد صاحب، محمد بن عمر صاحب، حمید الدین صاحب شاہد،

اکبرالدین صاحب صدیقی، نصیرالدین صاحب ہاشمی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**جمعہ ۔ یکم جولائی**

سوشیل سنٹر انات محلہ چنچل گوڑہ کا افتتاح کیا گیا۔

**پیر ۔ ۱۸ر جولائی**

شام کے ساڑھے چار بجے پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی بمبئی کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ پروفیسر سروری، سید محمد صاحب، نصیرالدین صاحب ہاشمی، ڈاکٹر حفیظ قتیل، حمیدالدین صاحب شاہد، اکبرالدین صدیقی صاحب، محمود حسین صاحب، محمد بن عمر صاحب وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**چہارشنبہ ۔ ۲۷ر جولائی**

شام کے پانچ بجے ادارے کی مجلس امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں گذشتہ امتحانات کے نتائج منظور کیے گئے، اور آئندہ امتحانات (اردو دانی اور زبان دانی) کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔

**پیر ۔ یکم اگست**

سوشیل سنٹر کوہ پر گلاب سنگھ کا افتتاح عمل میں آیا۔

**ہفتہ ۔ ۲۰ر اگست**

شام کے ساڑھے چار بجے شمس الدین اصغر صاحب لکچرار پشاور یونیورسٹی کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ زینت ساجدہ صاحبہ، محمود حسین صاحب، اکبرالدین صدیقی صاحب، حمیدالدین شاہد صاحب، سید محمد صاحب، محمد بن عمر صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔

**جمعرات ۔ ۱۵ر ستمبر**

سوشیل سنٹر انات خیریت آباد کا افتتاح عمل میں آیا۔

**ہفتہ ۔ یکم اکتوبر**

سوشیل سنٹر کوہ پر لکھن لال منظورہ کا افتتاح کیا گیا۔

**اتوار ۔ ۲ر اکتوبر**

صبح دس بجے ادارے کی مجلس انتظامی کا سہ ماہی اجلاس منعقد ہوا جس میں ریسرچ فیلوشپ، سوشیل سنٹرس، تعمیر عمارت ادارہ اور جدید مطبوعات کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔ ارکان مجلس عمارت کا انتخاب عمل میں آیا۔

**جمعرات ۔ ۶ر اکتوبر**

شام کے ۵ بجے مجلس عمارت کا اجلاس ہوا جس میں تعمیر عمارت ادارہ کی جملہ تفصیلات طے کی گئیں۔

**جمعرات ۔ ۲۰ر اکتوبر**

سوشیل سنٹر کوہ پر عالیجاہ کا افتتاح عمل میں آیا۔

**پیر ۔ ۲۴ر اکتوبر**

سوشیل سنٹر کوہ پر لکھن لال منظورہ میں یوم اقوام متحدہ منایا گیا۔

**چہارشنبہ ۔ ۲۶ر اکتوبر**

شام کے ۶ بجے ایک [illegible] منعقد ہوئی جس میں علی سردار جعفری، [illegible] صبا نوری، شاہد صدیقی، کنول پرشاد کنول، [illegible] ڈنڈا نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ ادارے [illegible] مجلس اور کارکن شریک رہے۔ [illegible] قمرالنساء عباسی

سنز سردار جعفری وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

### جمعرات ۔ ۲۴ر اکتوبر

شام کے پانچ بجے ادارے کی مجلس تحقیق و ادب کا جلسہ ہوا جس میں ۵۸ء و ۵۹ء کے لئے اس مجلس کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۱۹۵۸ء کی مطبوعات ادارے کے مسودے منتخب کئے گئے۔

### اتوار ۔ ۶ر نومبر

شام کے ۵ بجے ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ چیف منسٹر حکومت حیدرآباد نے ادارہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جس کی تفصیلات اور تقریریں سب رس بابت ڈسمبر میں شائع کی گئیں۔

### چہارشنبہ ۔ ۷ر نومبر

سوشیل سنٹر کو پر کھن لال منگلپور ہ کی جانب سے یوم رحمۃ العالمین زیر صدارت نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ منایا گیا۔

### چہارشنبہ ۔ ۹ر نومبر

ادارے کے قدیم ساتھی اور مشہور شاعر مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی نے بعمر شام وفات پائی۔ ان کے کلام کے دو حصے "نقوش زندگی" سنہ ۱۹۴۰ء اور "برگ و بار" سنہ ۱۹۵۱ء ادارے سے شائع ہو چکے ہیں۔

### [illegible] ۔ ۲۳ر نومبر

شام کے [illegible] مولوی حمید علی خاں صاحب [illegible] [illegible] صاحب ، ڈاکٹر [illegible] صاحب [illegible] صدیقی صاحب [illegible]

مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی نے بھی شرکت کی۔ اردو کے ناشروں کی تنظیم اور مطبوعات کی تشہیر و فروخت کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی۔

### چہارشنبہ ۔ ۳۰ر نومبر

ادارے کے اردو ریسرچ فیلو شپ کے لئے درخواستیں طلب کرنے کے لئے اخبارات میں اعلان کیا گیا۔

### جمعرات ۔ یکم ڈسمبر

سوشیل سنٹر چار مینار میں یوم کل ہند سماجی تعلیم زیر صدارت خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد معتمد اردو امتحانات و تعلیم بالغان منعقد ہوا۔ اور بالغان زیر تعلیم میں لیپ اندازی کی اسکیم شروع کی گئی۔ ادارے کے دوسرے سوشیل سنٹروں میں بھی اسی تاریخ کو یوم کل ہند سماجی تعلیم منایا گیا۔

### جمعہ ۔ ۹ر ڈسمبر

شام کے ساڑھے چار بجے صوفی محمود خاں صاحب متعلم انگلینڈ کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد یوسف الدین ، نصیرالدین صاحب ہاشمی ، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ، خواجہ حمیدالدین صاحب شاہد ، زینت ساجدہ صاحبہ ، سید محمد صاحب ، ڈاکٹر حفیظ قتیل ، جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی ، محمد بن عمر صاحب ، سلامت النساء بیگم صاحبہ ، اکبرالدین صدیقی صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔

### چہارشنبہ ۔ ۱۴ر ڈسمبر

شام کے ساڑھے پانچ بجے خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب ایڈیٹر منادی کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ اس صحبت میں دوست محمد اللہ دین صاحب ، فیاض الدین نظامی صاحب ، ظہیرالدین احمد صاحب ، عثمان سبحانی صاحب ، مرزا فاروق علی صاحب صفوی ، اکبرالدین صدیقی صاحب ، عارف الدین حسن صاحب ، عنایت علی صاحب غازی ، مولانا حافظ محمد حامد صدیقی صاحب ، یوسف علی اشرف صاحب

نصیر الدین صاحب ہاشمی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ اردو کے مستقبل اور رسم الخط کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا گیا۔

**منگل۔ ۲۰ر ڈسمبر**

شام کے پانچ بجے ڈاکٹر بابو رام سکسینہ صاحب پروفیسر سنسکرت الٰہ آباد یونیورسٹی و معتمد ہندی پرچارنی سبھا کو ادارے میں چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر آرنیدر شرما، پروفیسر سروری، سید محمد صاحب، محمود بن عمر صاحب، اکبر الدین صدیقی صاحب، بھال چندر کھالیکر صاحب، شام لال صاحب، شری ایا دھیا، زینت ساجدہ صاحبہ وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**چہارشنبہ۔ ۲۱ر ڈسمبر**

ادارے کی مجلس اردو انسائیکلوپیڈیا کے معتمد مولوی فیض محمد صاحب صدیقی نے صبح نو بجے وفات پائی۔ ان کی متعدد کتابیں ادارے کی طرف سے شائع ہوئی ہیں اور وہ ادارے کے ابتدائی طرح اندازوں میں سے تھے۔

**اتوار۔ ۲۵ر ڈسمبر**

ادارے کے امتحانات اردو دانی و اردو زبان‌دانی حیدرآباد کے زنانہ و مردانہ مرکزوں کے علاوہ مرکز ویراج پیٹ جنوبی کورگ میں ایک ساتھ منعقد ہوئے۔

---

# ادارے کی کتابیں

## معاصرین کی نظر میں

**راہ رو اور کارواں** ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے ۲۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنا جشن نقرئی منایا۔ یہ ادارہ ربع صدی سے دکن میں اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ اس کا ولولۂ کار ہنوز روز اول کی طرح جوان ہے۔ زیر نظر کتاب ڈاکٹر عبد الحفیظ قتیل ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی پروفیسر اردو نظام کالج نے جشن نقرئی کی تقریب پر مرتب کی ہے۔ اس میں چونسٹھ ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات جمع کئے گئے ہیں جنھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے لئے گزشتہ ربع صدی میں نظم و نثر لکھی۔ ان میں سے بعض برعظیم میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اردو میں ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ اگر برعظیم پاکستان و ہندوستان کے تمام ان علاقوں میں جہاں اردو کے اچھے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اپنے اپنے حلقے کے موجودہ و گذشتہ اکابر ادب کے حالات شائع کرنے کا شوق پیدا ہو جائے تو جلد ہی اردو کے ادبا و مصنفین کا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار ہو سکتا ہے۔ "راہ رو اور کارواں" دلچسپ بھی ہے اور پر از معلومات بھی۔
(الحمرا لاہور بابتہ جولائی ۱۹۵۵ء)

**گنج طلسم** حضرت شاہ نعیم الدین نعمت اللہ ولی گولکنڈہ (دکن) کے ایک مشہور عالم اور صاحب معرفت بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی فارسی مثنوی "گنج طلسم" کو ڈاکٹر حفیظ سید صاحب نے صرف ایڈٹ ہی نہیں کیا بلکہ سلیس اردو میں ترجمہ بھی فرما دیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے اور صاحب مثنوی کے مختصر حالات فاضل مرتب اور مترجم نے قلمبند کئے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈیٹر صاحب کی علمی تحقیقات پر رشید قریشی (ایم۔ اے) کا ایک مختصر سا تعارف بھی ہے۔ مثنوی گنج طلسم میں بڑی روانی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔
(جون۔ دسمبر ۱۹۵۵ء)

# علمی و ادبی تعاون

۱۹۵۵ء میں بھی ادارۂ ادبیات اردو ملک کی دوسری علمی و ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں سے حسب سابق تعاون کرتا رہا اور ان کا تعاون حاصل کرتا رہا۔

حکومت ہند کی ساہتیہ اکاڈیمی نے اردو کے ایسے ادیبوں اور شاعروں کی فہرست طلب کی تھی جو زندہ ہیں یا اکیڈیمی کے قیام یعنی ۱۲؍ مارچ ۱۹۵۴ء تک زندہ تھے۔ اور جن کی قابل لحاظ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ فہرست ساہتیہ اکیڈیمی کی اس کتاب کے لئے درکار تھی جو ہندوستان کی جملہ زبانوں کے مشاہیر ادب کے بارے میں وہ مرتب کرکے شائع کر رہی ہیں۔ چنانچہ ادارے نے تقریباً (۱۲۵) ادیبوں اور شعرا کے نام اور پتے حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب کرکے روانہ کئے۔

○

ساہتیہ اکاڈیمی نے محکمۂ تعلیم ہند کی خواہش پر اوائل ۱۹۵۶ء میں ہندوستانی زبانوں کی مطبوعات کی نمائش کرنے کا ذمہ لیا ہے اور ادارے سے خواہش کی کہ ادارے کے نوادر بھی اس کے لئے روانہ کئے جائیں چنانچہ ادارہ نے تعاون کا وعدہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں مراسلت جاری ہے۔

○

ساہتیہ اکاڈیمی کی خواہش پر ادارے نے جملہ علوم و فنون کی مستند اردو کتابوں کی ایک مکمل فن وار فہرست بھی مرتب کرکے روانہ کی

○

ادارے کے معتمد اعزازی ساہتیہ اکاڈیمی کی مجلس مشاورت کے رکن ہیں اور اس کے لئے اردو شاعری کا انتخاب بھی مرتب کر رہے ہیں۔

○

ساہتیہ اکاڈیمی نے خواہش کی ہے کہ اردو کے ادب اطفال کی فہرست مرتب کرکے ارسال کی جائے۔ یہ کام اب ہو رہا ہے۔

○

حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا کے ساتھ دکنی اردو کتابوں کو ناگری رسم الخط میں شائع کرنے کے کام میں

علمی و ادبی اور رسمی تعاون جاری رہا۔ چنانچہ چند کتابیں مثلاً سب رس از ملا وجہی، سیف الملوک و بدیع الجمال از غواصی اور قطب مشتری از ملا وجہی ناگری رسم الخط میں شائع ہو چکی ہیں اور چند اور کتابیں مثلاً کلیات محمد قلی قطب شاہ، کلیات بحری وغیرہ زیر طبع ہیں۔

○

جاپان کے پروفیسر اردو آرگا سو صاحب کی خواہش پر ٹوکیو میں اردو کتب خانہ قائم کرنے کے لئے ادارے کی طرف سے (۱۵۰) کتابیں ارسال کی گئیں۔

○

چیکوسلواکیہ سے جان مارک صاحب نے پراگ میں اردو کتب خانہ قائم کرنے کے لئے ادارے سے مدد کی خواہش کی ہے جس کے بارے میں کارروائی جاری ہے۔

○

ہالینڈ اور اسرائیل میں اردو کتب خانوں کے قیام کی کارروائی بھی جاری ہے۔

○

حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو، ہندی پرچار سبھا، تلگو ساہتیہ پریشد اور دیگر لسانی اداروں کے ساتھ مل کر ماہ اگسٹ میں یوم ٹیگور کا اہتمام کیا۔

○

انجمن ترقی اردو کے اردو ہال میں دوسری کلچرل اور آرٹ انجمنوں کے ساتھ ازبکستان کے کلچرل وفد کی یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو استقبالیہ تقریب میں حصہ لیا۔

○

اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی کے ساتھ علمی و ادبی تعاون میں شرکت کی۔

---

# تاثرات

(ادارے کے کاموں سے متعلق مختلف اصحاب علم وفضل نے ۱۹۵۵ء میں جو تاثرات شائع کئے یا
معتمد صاحب اعزازی کے نام روانہ کئے ان میں سے چند کا انتخاب۔)

## پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (ڈائرکٹر اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی)

یہ سہ ماہی ہمارے ہی لئے مبارک ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ اسی میں حیدرآباد دکن کے ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی (۲۵) سالہ نقرئی جوبلی کا جشن (۵) دنوں تک بڑی شان اور ادبی اہمیت کے ساتھ منایا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ادارہ دراصل اس خواب کی تعبیر ہے جو اہل دکن نے عرصہ ہوا ایک مرتبہ پھر اردو زبان وادب کو ہندوستان کے لئے مستند اور کارآمد بنانے کے لئے دیکھا تھا۔ اس ادارے کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اگر ایک شخص بھی خلوص و ایثار سے عزم و استقلال کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہو جائے تو پھر نہ رفتار کی کمی رہتی ہے اور نہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ...ے نے اپنی ربع صدی کی زندگی میں جتنی بھی کتابیں شائع کیں اور تعلیم بالغان و توسیع اردو کے سلسلہ میں جو خدمات ...م دیں وہ کسی بھی ادارے کے لئے قابل صد فخر ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ادارہ نے حضرت امجد حیدرآبادی کی ...نڈ جوبلی بھی منائی جو بہت کامیاب رہی۔

اس جشن کی دو ممتاز خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس میں ہر قوم اور جماعت کے نمائندوں نے دل ...کر حصہ لیا اور دوسری یہ کہ یہ تقریروں کا ہنگامہ نہ تھا بلکہ اس میں جو مقالات پڑھے گئے وہ بڑی حد تک اردو ...اریخ کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ خدا کرے ادارہ روز بروز یوں ہی ترقی کرتا رہے۔

(مطبوعہ "نوائے ادب" بابتہ اپریل ۱۹۵۵ء)

## ...وفیسر ہارون خان شروانی (حیدرآباد)

سب رس جشن سیمیں نمبر نے پرانے سب رس کی یاد تازہ کر دی۔ اس پچھلے چھ مہینے میں مختلف اداروں نے اپنے اپنے جشن منعقد کئے ہیں ان کا گویا حرف آخری ادارے کا جشن سیمیں تھا۔ یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ آپ نے ...ک کے تمام اردو پریمیوں کی توجہ ازسرنو حیدرآباد کی طرف منعطف کرا دی جو اردو زبان کا ایک دور میں نہیں بلکہ ... دوروں میں گہوارہ رہا ہے۔ مجھے جشن سیمیں کے جلسوں میں حاضری کا موقع ملا اور میرا یہ تجربہ بہت سے اعتبار ...کا اور سبق آموز تھا۔ اللہ تعالیٰ ادارے کو اس سے بھی زیادہ استحکام بخشے اور آپ کو مدت دراز تک ...زبان کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

سب رس بھی "ایک نئے موڑ" سے گذر رہا ہے۔ اس کے لئے بھی میری نیک تمنائیں قبول کیجئے۔ پچھلے ...ل سے بعض اعتبارات سے اس میں ذرا سی کمی محسوس ہوتی تھی وہ اب پوری ہوتی نظر آتی ہے اور پہلی

قسط کے طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اس شمارے کی کتابت، طباعت اور کاغذ سب۔
میں ہر اعتبار سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

## پروفیسر بھگوت دیال ورما (پونہ)

گذشتہ ماہ میں جب آپ کے ادارہ کو دیکھنے کا شرف آپ نے عطا فرمایا تھا اس وقت آنجناب نے اور آپ کے رفقاء کار نے خاکسار اور میری شاگرد کی جو ذرہ نوازی کی اس کے لئے میں اور میری شاگرد مسنز آشا اتھاپے نہایت ممنون ہیں۔

آپ کا بھیجا ہوا انگریزی کا دیجزہ بھی ملا۔ اردو کے وجیزے تو آپ نے اسی وقت مرحمت فرمائے تھے۔ ان سب کو پڑھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ صاحبان بڑی جانفشانی سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ آپ سب کی عمر دراز کرے اور علم دوستی میں ترقی دے تاکہ ہم جیسے دور افتادہ بھی آپ کی تصنیفات سے فائدہ اٹھاسکیں۔ آمین۔

زمانۂ قدیم میں ایک شاعر نے کہا تھا ؎

"دیدن روئے سلاطین دیدہ روشن می کند"

لیکن حقیر کا خیال ہے کہ ــــ

"دیدن روئے ادیباں دیدہ روشن می کند"

اور آپ کے ادارے کے معزز و ممتاز اراکین صاحبان کے درشن کر کے مجھے جو سرور قلبی حاصل ہوا وہ میں ظاہر نہیں کرسکتا۔ یہ خوشی اور احسان کی یاد کبھی دل سے نہ جائے گی۔ آپ صاحبان کے لئے یہی عرض کرسکتا ہوں کہ۔

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

قادر مطلق آپ سب کو ہمیشہ علم کی خدمت میں ہی قیمتی زندگی گذارنے کا موقع دے۔

مسز آشا اتھاپے نے آپ کی خدمت میں ادارے کا ایک فوٹو بھیجا ہے ملا ہوگا۔ وہ بھی آپ کی درازئی عمر کے دعا کرتی ہیں اور بہت احسان مند ہیں۔

# دو ساتھی بچھڑ گئے

۱۹۵۵ء اردو دنیا کے لئے اتنا منحوس ثابت ہوا ہے کہ اہل اردو عرصہ تک اس کو یاد رکھیں گے۔ ادارہ ادبیات اردو کے دو قدیم ساتھی بھی اسی سال اس سے بچھڑ گئے۔

(۱)

مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے نام سے اردو دنیا عرصہ سے واقف تھی۔ ان کی نظمیں ساقی، ہمایوں وغیرہ میں گذشتہ ربع صدی میں پابندی سے چھپتی رہی ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "نمود زندگی" ادارے نے آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۴۰ء میں چھپوایا تھا اور دوسرا مجموعہ "ترجمان زندگی" گذشتہ سال ہی شائع کیا تھا۔ وہ ایک وضع دار اور فقیر منش انسان تھے اور اپنے کلام میں زیادہ تر عوامی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان کی شاعری حقیقت کا آئینہ ہوتی تھی۔ وہ تکلف اور آورد اور فرضی مضامین کی طرف کبھی دھیان نہ دیتے تھے۔ اسی لئے مشاعروں اور محفلوں سے گھبراتے تھے۔ ان کی گوشہ نشینی اور محفل آرائی سے نفرت ان کی وضعداری کے باعث تھی۔ موجودہ سوسائٹی جو ایک عبوری دور کے انتشار اور مختلف و متضاد نقاط نظر کے ٹکراؤ کا شکار ہو رہی ہے ان کی افتاد طبع کو بہت کم بھاتی تھی۔

وہ اگرچہ آخر وقت تک اپنی وضع نہ چھوڑ سکے لیکن زمانے کے جدید رجحانات سے غیر محفوظ بھی نہ رہے اور کوشش کرتے رہے کہ کچھ دور اس کے ساتھ بھی چلیں — جیسا کہ ان کی بعض نظموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے رنگ کے ایک ایسے باکمال شاعر تھے اور اپنے کلام میں اپنی وضع کو اس خوبی سے بھاتے تھے کہ اس میں ایک انفرادی اور استادانہ شان پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ عہد حاضر کا کوئی شاعر ان کی اس آن بان میں ان کا مقلد نہ بن سکا۔

ان کے کلام کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور نثر کی کتابوں کے مسودے مجھے دکھائے بھی تھے اور ادارے کی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے۔ نقد سخن اور فن شعر پر بھی ایک ایک کتاب لکھی تھی۔ افسوس ہے کہ اچانک دو چار روز کی علالت میں ۹ر نومبر کو سر شام انتقال کر گئے۔ اور جب کالج میں مجھے اس کی اطلاع ملی تو میں فوراً چند احباب کے ساتھ ان کے مکان پر پہنچا۔ وفات کے بعد بھی ان کے چہرے پر وہی لاابالی پن اور معصوم مسکراہٹ نمایاں تھی جو ان کی ہر ملاقات میں ملنے والوں کا دل بھایا کرتی تھی۔

انھوں نے اپنے شہر در محلہ اور گلی میں بھی گمنام زندگی ہی گذار دی۔ چنانچہ ان کی گلی میں جب ان کے ہمسایوں سے ان کا نام بتا اور مکان دریافت کیا تو انھوں نے نہ صرف ان کی وفات سے لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ

ان کے نام سے بھی ان کو نہ پہچان سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موت کے بعد بھی محفل آرائی اور مجمع اور شور و شغب نہیں چاہتے تھا۔ چنانچہ سوائے حضرت امجد کے کوئی اور قابل ذکر ہستی ان کی میت میں شریک نہ رہی۔

(۲)

ابوالمکارم مولوی فیض محمد صدیقی صاحب ادارہ ادبیات اردو کے ابتدائی رفیقوں اور اس کی طرح اندرونہ میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مجھے تقریباً تیس سال سے ان سے تعلق خاطر رہا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے ایک اقامت خانہ مسرت منزل میں میرے کمرے سے متصل مقیم تھے اور اپنے عجب ڈھب، سادگی اور بے تکلفی اور اپنی گفتگو کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بہت ممتاز اور ملاقاتیوں اور دوستوں کے محبوب تھے۔ تصنیف و تالیف یا ادبیہ علمی کا ذوق نہ تھا۔ ان کو اس سے شوق تھا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ لیکن محض اسی کے ہو کر نہ رہے۔ محفل آرائی اور دوستوں اور کھیل تماشوں کے بھی ہمیشہ دلدادہ رہے۔ دوستوں کے ساتھ آخر وقت تک نبھایا۔ ان کے قریب ترین احباب میں بعض بڑے عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور اب تک ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ہمیشہ فیض محمد کی دوستی پر ناز کرتا رہا حالانکہ وہ اپنی اعلیٰ لیاقت اور مسلسل محنت کے باوجود مرتے دم تک مدرسہ کی مدرسی ہی پر کارگذار رہے۔ مولوی میر مظہر حسین صاحب ناظم بندوبست اور مولوی غلام حیدر صاحب رکن بورڈ آف ریونیو کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات رہے۔ اور اول الذکر کے یہاں تو وہ رات میں دیر تک بے تکلف اور خوش و خرم وقت گذار کر گھر آئے تھے اور جب صبح اٹھے اور مدرسہ کو جانے کی تیاری کرنے لگے تو اچانک فوت ہو گئے۔ وہ زندگی میں جس طرح ہر مشکل سے ایک خاص بے پروائی کے ساتھ لاابالی انداز میں نبھٹتے تھے موت سے بھی وہی سلوک گوارا رکھا۔ کوئی کشمکش، زحمت اور علالت سے دوچار نہیں ہوئے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے تقریباً ہر کام اور ہر شعبہ سے ان کا تعلق رہا کسی وقت بھی کسی کام سے منہ نہیں موڑا۔ جب ادارے نے اردو انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کا تہیہ کیا تو فیض محمد صاحب سے بڑھ کر ہمہ جہتی معلومات رکھنے اور بے تحاشا کام کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اور انہی کو اس شعبہ کا معتمد مقرر کیا گیا۔ چنانچہ وہ اس کام میں ایسے گتھ گئے کہ گھربار، بیوی بچوں اور ملازمت کی بھی فکر نہ رہی۔ مجبور کر کے رخصت کی درخواست دلائی اور محکمہ سے نصف تنخواہ پر رخصت منظور کرائی اور عرصہ تک ادارے سے اس کا تکملہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ کئی سال اس طرح انھوں نے ادارے میں گذار دیئے اور معتمد سے لے کر اہلکار اور چپراسی تک کا کام کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ وہ دھن کے بڑے پکے تھے لیکن بعض اوقات جب کبھی کام سے جی اچاٹ ہو جاتا تو اپنے مذکورہ بالا دوستوں کے یہاں پہنچ جاتے اور دو دو تین تین دن اپنے کام اور ادارے سے غائب ہو جاتے۔

افسوس ہے کہ حیدرآباد میں ۱۹۴۸ء سے جو سیاسی طوفان شروع ہوا وہ جیسے جیسے بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا گیا اردو انسائیکلو پیڈیا کا کام پیچھے پڑتا گیا۔ اس وقت کے عہدہ دار اس کی اہمیت سے واقف تھے مگر ہمدرد نہیں ہو سکتے تھے۔ امداد اور بہت افزائی کے فقدان سے فیض محمد صاحب اور ارباب ادارہ کا دل ٹوٹ گیا۔ آخرکار فیض محمد صاحب سرکاری ملازمت میں رجوع ہو گئے اور تعلیمات کی مدرسی سے ترقی کر کے اپنی وفات کے وقت تعلیم کے پرسنل مددگار بن گئے۔

قدیم خدمت مدرسی پر بڑھا دیئے گئے یہاں تک کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۵ء میں صبح ۹ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔

فیض محمد صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوئیں۔ وہ ایم۔ایڈ تھے اور تعلیم و تدریس کے اصولوں پر ماہرانہ دست رس رکھتے تھے۔ ایک کتاب مصلحان تعلیم لکھی تھی جو تقریباً چھتیس سال قبل شائع ہوئی۔ مسولینی اور ابن سعود کے حالات زندگی پر بھی دو کتابیں شائع کیں۔ ادارے نے جب بالغوں کے لئے معلوماتی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا تو فیض محمد صاحب نے "آبدوز اور سرنگ" "پانی کی کہانی" "نظام الملک" "دادا بھائی نوروز جی" اور دیگر متعدد کتابیں اس کے لئے لکھ دیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کے لئے بھی متعدد مضامین قلمبند کئے۔ نصابی کتابوں اور ان کی شرحوں کا سلسلہ الگ جاری رہا۔ غرض لکھنے اور چھپوانے سے کبھی نہیں گھبراتے اور ہر وقت ایک نیا کام اور نیا سلسلہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ زندگی کو رجائی انداز میں دیکھتے اور برتتے تھے۔ ناامیدی اور یاس پر بھی اگر وہ مضمون لکھتے تو امید اور خوشی و خرمی سے معمور ہو جاتا۔

افسوس ہے کہ ادارہ ایک ایسے باہمت اور شگفتہ ساتھی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

---

## آہ! حضرت منظور

خورشید جنیدی

فرد کے ہوش و حواس گم ہیں ذرا جنوں کو پکار لینا  
وفات منظور کی خبر اے ندیم پھر اس کے بعد دینا

نہیں ہے تاب فغاں نہیں ہے نہیں ہے یارائے غم نہیں ہے  
خبر نہیں تجھ کو دوست یہ موت اک قیامت سے کم نہیں ہے

یہ کیا کہا یہ اسی کی میت ہے سامنے جو رکھی ہوئی ہے  
وہ کیسی تکلیف تھی نہ جانے کہ جان لے کر ہی جو ٹلی ہے

اٹھا کے چادر کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہو رہا ہے  
کشاکش زندگی سے تھک کر ابھی ابھی جیسے سو گیا ہے

وہی ہے عالم شگفتگی کا اسی طرح رخ پہ تازگی ہے  
سکون چہرے سے ہے نمایاں لبوں پہ اب بھی وہی ہنسی ہے

یہ کیا ستم ہے یہ کیا غضب ہے یہ کیسا غم ہے غم مسلسل  
وہ آج خاموش ہوگیا جس پہ خود تکلم کو ناز تھا کل

وہ پیکر مہر جس نے میری خلوص کے ساتھ رہبری کی  
وہ شاعر باکمال جس نے کمال کی رہ مجھے دکھائی

زباں کا مالک بیاں پہ قادر شعر محاکات کیا نہیں تھا  
انیس کی یاد تازہ کر دی نظیر کی طرز کو نکھارا

نشست ہر لفظ سے ہے ظاہر کمال اس کے کمال فن کا  
اسی کے حصے کی چیز تھی انتخاب الفاظ کا سلیقہ

کہیں تو نازک خیالیاں ہیں کہیں خیال آفرینیاں ہیں  
کہیں نظر دوربیں ہی ہے کہیں تو باریک بینیاں ہیں

بچشم خائر کیا تھا برسوں مشاہدہ جس نے زندگی کا  
کیا یہ اندازہ تو یہ تو پیش تذکرہ جس نے زندگی کا

وہ مرد عارف چلا گیا زندگی سے منہ موڑ کر اچانک  
نہ جانے کیا مصلحت تھی اس میں کسی کو ہونے نہ دی خبر تک

# جدید تنظیم کتب خانہ مطبوعات

## ادارۂ ادبیات اردو کا افتتاح

ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ اردو دنیا میں غیر متعارف نہیں ہے۔ اس کے مخطوطات کے دو تفصیلی تذکرے شائع ہو چکے ہیں اور انھوں نے اردو کے تحقیقی کام کرنے والوں میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ پہلی جلد تو اب کمیاب ہو گئی ہے۔

مخطوطات کے ساتھ ادارے کے کتب خانہ میں مطبوعات کا بھی رفتہ رفتہ کافی اہم ذخیرہ جمع ہونے لگا اور بعض کتابیں جو آجکل اردو دنیا میں نادر اور نایاب سمجھی جاتی ہیں وہ بھی حسن اتفاق سے اس میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

اس کتب خانے کی تنظیم اور نگرانی کا کام ابتداء میں ایک علم دوست نواب مرزا آصف علی خان صاحب جاگیردار نے اعزازی طور پر انجام دیا اور سالہا سال تک وہ یہ خدمت محض اپنے علمی و ادبی ذوق کی بناء پر انجام دیتے رہے جس کیلئے ادارہ ان کا ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔ انھوں نے ادارہ کے کتب خانے کو واقعی ایک کتب خانہ بنا دیا اور فہرست کتب کے نہ صرف رجسٹر کے رجسٹر اپنے قلم سے لکھے بلکہ کارڈس بھی مرتب کئے۔ دوست و احباب کے کتب خانوں سے کتابیں حاصل کیں اور جو عطیے دینے پر راضی نہ ہوئے ان کو فروخت کر دینے پر مجبور کیا۔ افسوس ہے حیدرآباد کے سیاسی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کی خانگی ضروریات اور حالات میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی اور اس کے بعد وہ ادارے کو اپنا قیمتی وقت نہ دے سکے۔

اس اثناء میں کتابیں برابر جمع ہوتی رہیں اور جب ان کی تعداد دس ہزار سے بڑھ گئی اور ملک کے سیاسی حالات میں اعتدال پیدا ہو گیا تو پھر سنہ ۱۹۵۲ء میں ادارے کی تنظیم جدید کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس تنظیم میں سب سے پہلے کتب خانہ کی طرف توجہ کی گئی۔ اس سلسلہ میں مقامی ماہرین کتب خانہ کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ڈاکٹر محمد راحت اللہ خان صاحب کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ، مولوی مسعود یزدانی صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، مولوی سید محمد صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ، جناب راجندر پرشاد صاحب لکچرار چادر گھاٹ کالج وغیرہ شامل ہیں۔ اس کمیٹی کے معتمد مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرار اردو سٹی کالج مقرر ہوئے۔

اس کمیٹی نے کتب خانوں کے جدید ترین طریقۂ تنظیم اور ادارہ کے کتب خانے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر فہرست اور تقسیم کا ایک خاکہ مرتب کیا اور اس کے مطابق کتب خانے کی تنظیم اور فہرست کی تیاری کا کام مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی اور مولوی غلام رسول صاحب مرتب فہرست کتب خانہ سٹی کالج کے سپرد کیا۔ ان دونوں اصحاب نے ایک سال کے عرصے

میں کتب خانے کی جملہ کتابوں کو پہلے زبانوں (یعنی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی) کے لحاظ سے الگ الگ کیا اور پھر ارد کتابوں اور رسائل و جرائد کی فن وار تنظیم کر کے علیحدہ علیحدہ الماریوں میں رکھا اور فہرست کی پہلی جلد طباعت کے لئے تیار کی۔

حسن اتفاق سے یہ جلد چھپ کر اوائل جنوری میں مطبع سے آئی اور جب آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر وزارت خارجہ کے ورود حیدرآباد کی اطلاع ملی تو اس موقع کو نعمت غیر مترقبہ جان کر اس جدید تنظیم شدہ کتب خانہ کا افتتاح ان کے دست مبارک سے کرایا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف باوجود کثیر مصروفیات کے از راہ علم دوستی ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء کو شام میں ساڑھے چھ بجے ادارے پر تشریف لائے اور افتتاح کے لئے وقت مرحمت فرمایا۔ اس تقریب میں سو سے زیادہ مہمان شریک ہوئے جن میں ادارے کے مختلف مجلسوں اور کمیٹیوں کے ارکان اور ہمدردوں کے علاوہ حیدرآباد کے علمی و ادبی و کلچرل کارکن بھی شامل ہیں۔

**علمی و ادبی و کلچرل خدمتگار** ڈاکٹر سید عبداللطیف صدر انجمن ہند مشرقی تعلقات۔ جانکی پرشاد صاحب معتمد اردو مجلس۔ مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس و سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ ڈاکٹر ناظر یار جنگ۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ سلیمان اریب صاحب ایڈیٹر صبا۔ رمن راج سکسینہ صاحب ایڈیٹر سب رس۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی معتمد کتب خانہ خواتین دکن ہما دی نقشبندی صاحب۔ سکینہ بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ مہدی نواز جنگ منسٹر طبابت۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال۔ عارف الدین حسن صاحب۔ مرزا ضامن علی صاحب غازی۔ عالم خوندمیری معتمد پریم چند سوسائٹی۔ مولوی محمد سلطان صاحب۔ مولوی حسن الدین احمد صاحب۔ مولوی ضیاء الدین صاحب آرکٹکٹ۔ رشید قریشی صاحب۔ غلام رسول صاحب۔ پلم سنت راؤ صاحب ڈپٹی منسٹر مال۔ حسن نعیم صاحب۔

**یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر اربابِ علم** ڈاکٹر قاری قطب الدین صاحب۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ۔ مولوی مسعود یزدانی صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ۔ مولوی سید محمد صاحب۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل سید ابو الفضل صاحب۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد۔ اکبر الدین صدیقی صاحب۔ مولانا حافظ محمد حامد صاحب صدیقی۔ شام لال صاحب۔ سید معین الدین قادری صاحب۔ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ۔ سید حمید شطاری صاحب۔ رشید الحسن صاحب۔ راجندر پرشاد صاحب۔ منظر احسن گیلانی صاحب۔ مولوی مظہر حسین صاحب۔ احمد اللہ خاں صاحب۔ محمد بن عمر صاحب۔

**دیگر علم دوست اصحاب و خواتین** سری کرشن سہنا صاحب معتمد مالگزاری۔ مولوی محمد حسین خاں صاحب انجنیر۔ کشن داس دلیلہ صاحب۔ مولوی سید رحمت اللہ صاحب سابق ناظم رجسٹریشن۔ مولانا سید علی اصغر صاحب بلگرامی سابق صوبہ دار۔ ملا عبدالباسط صاحب۔ نواب میر باسط علی خاں صاحب سابق ہائیکورٹ جج۔ مسز کملا سہگل۔ رشا جہان بیگم صاحبہ ایم اے ایل ایل بی۔ مولوی عبدالحمید خاں سابق وزیر عدالت۔ بریگیڈیر علی احمد صاحب۔ فلائٹ لفٹننٹ ونود سہگل صاحب۔ میر مظفر علیخاں صاحب۔ مولوی عبدالرحیم صاحب۔ گرو راج پرشاد صاحب۔ ڈاکٹر وحید النساء بیگم۔ قاری داعد علی صاحب۔ لالہ دیوی دیال صاحب۔ سید غلام افضل بیابانی صاحب۔ مولوی سید عبدالعلی صاحب۔ میر اعظم علیخاں صاحب۔ عارف علیخاں صاحب۔ عطا اللہ شاہ بخاری صاحب۔ سوامی ساندرم صاحب۔ سپاہیان سکسینہ صاحب۔ مولوی شہاب الدین صاحب سابق نائب ناظم اطلاعات۔ شری بسوا حیدرا صاحب۔ مولوی محبوب حسین صاحب جگر۔ مولوی سید عبداللہ صاحب۔ مولوی مظہر اللہ صاحب۔ میر رضا علیخاں صاحب۔ مولوی حبیب محمد صاحب سابق صوبہ دار ورنگل۔ راجہ امیت چند صاحب۔ مولوی کریم اللہ خاں صاحب۔

# استقبالیہ تقریر

## از:۔ نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ

میں نہایت مسرت کے ساتھ اپنی اور ارباب وارکان ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے آج شام ادارے میں آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

یہ ادارہ آج سے پچیس ۲۵ سال قبل قائم ہوا تھا اور گذشتہ سال اسی ماہ اس کی سلور جوبلی کی تقریبات منائی گئی تھیں جن کا افتتاح حیدرآباد کے عہد دست چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا اور جن میں شرکت کے لئے حیدرآباد کے باہر سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ حضرت جگر مرادآبادی۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب مولانا عبدالوہاب بخاری۔ جناب جوش ملیح آبادی۔ جناب بالمکند عرش ملسیانی جیسے اصحاب بھی حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

۱۹۵۵ء ادارے کی تاریخ میں اس لئے بھی ایک یادگار سال ثابت ہوا کہ اس سال ماہ نومبر میں اس کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور جو جد وجہد میر اکبر حیدری مرحوم کے زمانے سے شروع ہوئی تھی اور جس کے لئے ادارے نے سالہا سال سے رقم جمع کر رکھی تھی۔ اس سال ایک زمین کے بطور عطیہ حاصل ہونے کی وجہ سے تکمیل کو پہنچی اور جناب اس وقت جہاں تشریف فرما ہیں اس کے قریب ہی یہ زیر تعمیر عمارت جناب کے ملاحظہ سے گذرے گی۔ اس کا جو عمدہ نقشہ ملک کے مشہور آرکٹکٹ مولوی فیاض الدین صاحب نے تیار کیا ہے اس کو بجائے خود آرٹ کا ایک نمونہ سمجھا جا رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر طاہر سیف الدین صاحب نے اس کو ملاحظہ فرما کر اتنا پسند کیا کہ اس کے جلد تکمیل پانے کی دعا فرمائی اور اس کی کمان پر اپنے ہاتھ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر فرمادیا۔

اس ادارہ کا کام جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا مختلف شعبوں اور جلسوں کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے۔ اس کی تقریباً پچاس شاخیں مختلف لسانی علاقوں میں کام کر رہی ہیں جن میں دار المطالعے قائم ہیں اور اردو زبان اور ادب کا ذوق عام کرنے کے لئے ادارے کے اردو امتحانات کے نصاب کی تعلیم دیجاتی ہے۔ یہ امتحانات ۱۹۴۰ء سے لئے جارہے ہیں اور ان کی وجہ سے اب تک ہزاروں ناخواندہ لوگ خواندہ بن گئے کیونکہ ادارے نے مشہور ماہر تعلیم مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی میں ناخواندہ بالغوں کو اردو سکھانے کے لئے بڑے مفید قاعدے مرتب اور شائع کرائے جو بہت مقبول ہوئے۔

اردو کا ذوق بلند کرنے کے لئے اردو عالم اور اردو فاضل جیسے امتحان بھی ادارے نے رائج کئے جن میں شریک ہوکر اب تک سیکڑوں امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ نیو دنہر حیدرآباد میں ادارے کی طرف سے (۵) سونیل ہنر

جن میں اردو کی تعلیم کے علاوہ مختلف متنوع اور مفید سرگرمیاں جاری ہیں۔

ادارے کا ایک شعبہ دکن کی تاریخ اور تہذیب پر تحقیق اور علمی کام انجام دیتا رہا ہے۔ چنانچہ اس کے تحت متعدد تاریخی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور خاص کر حال میں خصوصاً گولکنڈہ، قندھار دکن اور بالکنڈہ کی تاریخوں کے علاوہ دکن کے مشہور تاریخی شخصیتوں کے سوانح حیات بھی یہ شعبہ شائع کر چکا ہے۔

دکن کے قدیم و جدید شعراء و مصنفین کی نسبت بھی اس ادارے نے خاص کام کیا ہے اور نہ صرف ان کے تذکرے اور کلام کے مجموعے اور انتخابات مرتب اور شائع کئے ہیں بلکہ ان کی یادگاروں کی حفاظت کا کام بھی انجام دیتا رہا ہے۔

نوجوان شعراء و مصنفین کی ہمت افزائی اور ان کی نظم و نثر کی اشاعت کی طرف بھی ادارے نے بڑی توجہ کی اور اس کے قیام کے اغراض و مقاصد میں دراصل اس کام کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ تقریباً پچاس شعراء و مصنفین ادارے کی طرف سے اردو دنیا میں روشناس کئے گئے اور ان کا ایک تذکرہ مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل سلور جوبلی کے موقع پر "راہ رو اور کارواں" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اردو میں تحقیقی کام کو جاری رکھنے کے لئے ادارہ پچاس روپے ماہانہ کے دو ریسرچ فیلوشپ بھی کئی سال سے دیتا آیا ہے جس سے اب تک علیگڑھ، آگرہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے طلبا استفادہ کر رہے ہیں۔

ادارے کا ایک شعبہ بچوں کے ادب کے لئے بھی مخصوص ہے اور اس نے تقریباً دو درجن باتصویر اور دیدہ زیب کتابیں بچوں اور ان پڑھ بالغوں کے لئے تیار کر اکے چھپوائیں۔ اس طرح ادارے کے شعبہ نسواں نے عورتوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ایک درجن کتابیں مرتب اور شائع کرائیں۔

اس ادارے نے اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا کام بھی شروع کیا اور پہلی جلد مرتب کر کے ابتدائی ۴۰ صفحات بھی شائع کر دیئے۔ مگر افسوس ہے کہ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام تشنۂ تکمیل رہا ہے۔

گذشتہ سال ادارے کی سلور جوبلی کے ساتھ اردو میں لفظ شماری کے کام کی بنا ڈالی گئی تھی اور مولوی حسن الدین احمد صاحب ایم۔ اے جنہوں نے ترکی میں اس کا عملی تجربہ حاصل کیا اس کے معتمد مقرر ہوئے تھے چنانچہ انھوں نے اس اثناء میں پورے ہندوستان کے ایسے اصحاب سے مراسلت کی جو اس کام میں مدد دے سکتے ہیں اور ان کو تعاون پر راضی کر لیا۔ اس کا ایک لائحہ عمل بھی بن چکا ہے۔ چونکہ اس کام کے لئے کافی رقم کی ضرورت ہے اس لئے وزارت تعلیمات حکومت ہند سے جس نے اپنے منصوبے میں اس [illegible] کو شریک کیا ہے رقمی امداد چاہی گئی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ مولوی حسن الدین احمد صاحب نے گذشتہ سال (۱۲۰۰) بارہ سو اردو کتابیں جاپان کے پروفیسر [illegible] صاحب کو ارسال کی تھیں جن میں ادبیات اردو کی تقریباً (۱۱۵۰) مطبوعات شریک تھیں۔ بیشک دن کی یہ تحریک نہایت کامیاب رہی اور [illegible] ادارے نے اس کام کو بھی آگے بڑھانے کا تہیہ کیا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کو اردو کتابیں روانہ کرنے کا کام [illegible] کے تحت کیا گیا ہے۔ اسی طرح بہت قریب میں اسرائیل میں اردو کی ایک لائبریری قائم ہو جائے گی جو ڈاکٹر سید محمود صاحب کے اسم گرامی سے موسوم ہوگی۔

[illegible] اردو کا ایک مرکزی کتب خانہ قائم کرنے کا خود ہی سے اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ اس میں

اب تک تقریباً بیس ہزار مطبوعہ اور قلمی کتابیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ ادارے کا قلمی کتابوں کا شعبہ تمام اردو دنیا میں اچھے ذخیرے کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکا ہے [illegible] مخطوطات کے [illegible] تذکرہ [illegible]
[illegible] ڈاکٹر [illegible] مرتب [illegible]
مطبوعہ کتابوں کو فنی [illegible] ترتیب [illegible] فہرست مرتب کر کے [illegible] کا کام
شروع ہوا۔ اس کے مقامی ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں [illegible] خواجہ محمد [illegible] صاحب [illegible] اور مولوی
محمد [illegible] اللہ خان صاحب [illegible] صفیہ [illegible] صاحب [illegible] اور مولوی
اکبر الدین صدیقی صاحب [illegible] اردو [illegible] جیسے [illegible]
اور ادارہ کے کتب خانہ کی جزویات کو پیش نظر رکھ کر فن واری تقسیم کا ایک خاکہ مرتب کیا اور اس کے مطابق کتب خانہ
کی تنظیم اور فہرست کی تیاری کا کام مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب اور مولوی غلام رسول صاحب [illegible] فہرست کتب خانہ
[illegible] کیا۔ [illegible] اصحاب نے ایک سال کے عرصے میں کتب خانہ کی جملہ کتابوں کو [illegible]
اور [illegible] کے مطابق تقسیم کیا اور پھر اردو کتابوں اور رسائل [illegible]
میں رکھا اور فہرست کی پہلی جلد مطبوعہ کے لئے تیار کی جس میں پانچ ہزار [illegible] کتابوں اور [illegible] رسالوں کی تفصیلات
[illegible] ایک [illegible] ہے کہ [illegible] کے [illegible] فہرست اب [illegible] کتابی شکل میں آ رہی
ہے اور [illegible] ادارہ [illegible] قابل [illegible] کتب خانہ [illegible] مطبوعات تک [illegible]
ہر کتاب [illegible] کے لئے جملہ [illegible] تلاش کر کے [illegible] کتاب [illegible] کو ایک فائل [illegible]
[illegible] ادارے کی جدید تنظیم [illegible] کتب خانہ [illegible] کے [illegible] کتابیں [illegible] فہرست کا پہلا نسخہ
خانہ کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ ادارے [illegible] کتب خانے میں [illegible] ایسی
[illegible] موجود ہیں جو اب نادر و نایاب ہو چکی ہیں۔ اس میں [illegible] نصیر الدین حیدر [illegible] الامراء اور دہلی اور اودھ کی
کی چھپی ہوئی کتابیں ہیں اور [illegible] سے پہلے کے [illegible] اور [illegible] کے [illegible]
[illegible] اس کام کی تیاری و تکمیل کے لئے [illegible] مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب [illegible] کتب خانہ کا
[illegible] اور [illegible] مطبوعہ کتب کا [illegible] فہرست [illegible] مرتب [illegible] مکمل
[illegible] گے کیونکہ اردو [illegible] اکثر [illegible]
[illegible] نہیں کر سکتے [illegible] اسکالرس [illegible]
[illegible] رہتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ سالوں میں ڈاکٹر [illegible]
[illegible] دہلی [illegible] ڈاکٹر [illegible] ڈاکٹر حفیظ سید الہ آباد۔ پروفیسر [illegible]
[illegible] مقالات [illegible] صاحب کراچی [illegible]
[illegible] دورے [illegible]
ہندوستان کے اکثر [illegible] سید سلیمان ندوی، مولانا [illegible]
ڈاکٹر [illegible] غلام [illegible] خان [illegible] حبیب الرحمن [illegible]

[نی]از فتحپوری۔ خواجہ ناظم الدین۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی۔ سر حسّان سہروردی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ [مو]لانا حفظ الرحمٰن اور اردو کے اکثر و بیشتر پروفیسر اور [...] صاحبان کمال ادارے کے معائنے کے لیے تشریف لا چکے [او]ر اس کی مصروفیات اور خدمات پر اظہار خوشنودی فرما چکے ہیں۔ آج ہم مسرور ہیں کہ جناب نہ صرف یہاں تشریف فرما [ہو]ئے ہیں بلکہ ہمارے کتب خانہ کے شعبہ مطبوعات کا افتتاح بھی فرما رہے ہیں۔ ہم سب جناب کی اس زحمت فرمائی کیلئے شکر گزار ہیں۔

"ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ اردو دنیا میں غیر متعارف نہیں ہے۔ اس کے مخطوطات کے دو تفصیلی تذکرے شائع ہو چکے ہیں اور انھوں نے اردو کے تحقیقی کام کرنے والوں میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ پہلی جلد تو اب کمیاب ہو گئی ہے۔ یہ جلد تذکرہ اردو مخطوطات کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی اور کراؤن سائز کے (۴۰۰) صفحے پر مشتمل تھی۔ دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور ہندی کے (۵۰۰) مخطوطات کا تذکرہ ہے۔ تیسری ابھی زیر ترتیب ہے۔

مخطوطات کے ساتھ ادارے کے کتب خانے میں مطبوعات کا بھی رفتہ رفتہ کافی اہم ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اور بعض کتابیں جو اس وقت اردو دنیا میں نادر اور نایاب سمجھی جاتی ہیں وہ بھی حسن اتفاق سے اس میں محفوظ ہو گئی ہیں۔"

اقتباس از پیش لفظ ڈاکٹر زور
جلد فہرست مطبوعات اردو کتب خانہ
ادارۂ ادبیات اردو

# تقریر افتتاحی

## از۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر وزارت خارجہ حکومت ہند

ڈاکٹر زور صاحب اور ارکان ادارہ!

میں زور صاحب کے نام اور کام سے تو بہت دنوں سے واقف ہوں لیکن آج تک ملا نہیں تھا۔ میں آج جو کچھ تھوڑا بہت آدھے گھنٹے کے اندر دیکھا اس سے مجھے اپنی جہالت پر افسوس ہوا۔ اس سے پہلے جو حاضر نہ ہوسکا اس سے ایک نقصان ہوا۔ میں ابھی حیدرآباد میں آیا تھا۔ سلطان سعودی عرب کے ساتھ اس وقت اگر اس ادارے کے کام سے واقف رہتا تو کافی رقم دلا سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس کو کچھ بھی نہ دلا سکا۔ اب بھی ممکنہ کوشش کروں گا کہ اس کو کچھ رقم دلا سکوں۔ میں نے ہندوستان میں بہت سے مقام اور ادارے دیکھے لیکن میں نے اتنا اچھا کام کہیں نہیں دیکھا۔ ہم شمال کے لوگ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن اتنا کام نہیں کرتے۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں اردو کا جو کام ہو رہا ہے اس کی ہندوستان بھر میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔

یہاں بہت اچھا کام ہوا ہے اور یوں تو دکن میں شروع ہی سے عمدہ خدمات کی گئی ہیں۔ چنانچہ ولی جو اردو کا پہلا شاعر کہا جاتا ہے وہ بھی دکن ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھ پر آج ایک چیز کا بڑا اثر ہوا وہ یہ کہ آپ نے اپنی تحریر یا تقریر میں مصیبت اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مصیبت یا تکلیف سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہاں کے اردو کے کام کرنے والے حالات سے گھبرائے بغیر مردانہ وار آگے بڑھتے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تو ٹنڈن جی نے بھی اپنا نظریہ بدل دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ شاید سمجھ گئے ہیں کہ اردو کی جتنی مخالفت کی جائے گی اتنا ہی کام زیادہ جوش اور ولولہ سے کیا جائے گا جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا تھا اور شاید اسی لئے ٹنڈن جی نے اپنا نظریہ بدل دیا چنانچہ وہ اب کہنے لگے ہیں کہ اردو بھی ہندوستان ہی کی ایک زبان ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیے کہ ٹنڈن جی جو سمجھ رہے تھے کہ اردو غیر ملکی زبان ہے۔ اب وہ اس کو اپنے ملک کی زبان کہہ رہے ہیں اور بابو سمپورنانند نے بھی یہی خیالات اب ظاہر کئے ہیں لیکن اتنا تو نہیں جتنا ٹنڈن جی نے کہا ہے۔ یہ آپ لوگوں کے کام کرتے رہنے کا اثر ہے۔

میں پھر یہاں کہوں گا کہ آپ لوگ گھبرائیے نہیں۔ جو زبان ملک کی بن چکی ہو اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ آپ نے بھولے سے بھی یہ نہیں کہا کہ ان حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ میں کام کرنے کی اتنی زبردست قوت ہے مجھے جو خوشی ہوئی میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ میں پوری کوشش کروں گا اور وزیر تعلیم ہند سے کہوں گا کہ وہ ادارے کو زیادہ سے زیادہ رقم دیں۔ آپ نے ریسرچ کے سلسلے اسکالرشپ بھی دے رکھے ہیں اور ریسرچ کا بہت کام کیا اور کرایا ہے

حکام اس کو [illegible] تقسیم ہند آپ کے کام سے واقف نہیں ہیں۔ جب یہ سب خصوصیات منسٹر صاحب تعلیم کو معلوم ہوں گی تو وہ یقیناً آپ کے ادارے کو ضرور دیں گے۔ اگر یہ کام بند ہو تو یہ ہم سب کے لئے بڑے افسوس کی بات ہو گی۔

آپ نے میری عزت افزائی کی کہ اسرائیل میں میرے نام سے اردو کتب خانہ کھولنے کا ارادہ کیا ہے کہیں عرب میرے دشمن نہ بن جائیں۔ مہربانی فرماکر ان کو میرا دشمن نہ بنائیے۔ میں سلطان سعودی عرب کو لکھنے والا ہوں کہ وہ آپ کو مزید مدد دیں۔ لیکن اسرائیل میں [illegible] خانہ قائم ہو تو وہ میرے مخالف ہو جائیں گے اور یہ رقم نہ مل سکے گی۔

میں آخر میں ڈاکٹر زور اور ادارے کے جملہ ارکان کو اتنے اچھے کام پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے میرے دل کو اس مختصر سے وقت میں جتنا مسخر کر لیا ہے اس کے اظہار کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

آپ نے ایوان عمارت کا ذکر کیا ہے میں دعا کرتا ہوں کہ اس کی جلد تکمیل ہو جائے اور آئندہ میں جب آؤں گا تو آپ کے کتب خانے کو اسی میں جمع ہوا دیکھوں گا جس سے مجھے اور بھی خوشی ہو گی۔

آخر میں آپ سب کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ اس طرح اردو کے کام کو مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھائیں گے۔

## حیدرآباد کے علمی ادارے

حیدرآباد کے موقر روزنامہ "رہنمائے دکن" مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۵۶ء میں حسب ذیل اداریہ اس تقریب سے متعلق شائع ہوا۔

"اس مرتبہ ڈاکٹر سید محمود وزیر وزارت خارجہ نے حیدرآباد کے دورے میں یہاں کے علمی اداروں کی سیر کی اور ان کے بے نظیر اور شہرہ آفاق کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔ ادارہ ادبیات اردو اور دائرۃ المعارف کی علمی خدمات اور ان کی کارکردگی سے ڈاکٹر صاحب بہت متاثر ہوئے اور ان کے متعلق جن قدرین خیالات کا اظہار کر کے ان کی ستائش کی ہے۔ وہ محض رسمی یا محض حوصلہ افزائی کی باتیں نہیں ہیں کہ ان کو کوئی وزن نہ دیا جائے۔ اس دور میں یہ اور ایسے علمی اداروں کو اپنی بقاء و ترقی کے لئے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب اگر ان دشواریوں کو دور کرنے میں ان کی مدد کریں تو یہ ادارے بہت گراں قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اردو انسائیکلوپیڈیا کا کام آغاز ہوا تھا مگر افسوس کہ حیدرآباد کے سیاسی انقلاب نے اس اہم بالشان کام کو تقریباً ناممکن بنا دیا کیونکہ اب تو حکومت ہندی اور علاقہ واری زبان کی ترقی کی دیانتدارانہ [illegible] کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں اردو انسائیکلوپیڈیا کیسے مرتب ہو سکتا ہے کاش ڈاکٹر صاحب کی کوشش سے پھر یہ کام شروع ہو کر انجام کو پہنچ جائے تو ان کے دور کی ایک امتیازی یادگار ہو گا۔

# تاریخ ادبیات عربی

(ادارہ ادبیات اردو کی ایک نئی کتاب)

## معاصرین کی نظر میں

حیدرآباد کا ادارۂ ادبیات اردو اپنی مطبوعات کے لئے کافی مشہور ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کے سلسلہ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔ مولف نے بڑی کاوش، تحقیق اور محنت سے ادبیات عربی کی تاریخ مدون فرمائی ہے جس میں اسلامی ادبیات عربی کا بھی مفصل (لیکن پھر بھی تشنہ) تذکرہ آیا ہے۔ اردو لٹریچر میں یہ کتاب ایک اچھا اضافہ کرتی ہے۔

(تجلی ماہنامہ جنوری ۱۹۵۶ء)

سید ابوالفضل صاحب ایم اے (عثمانیہ) نے یہ کتاب تقریباً بیس سال قبل لکھی تھی مگر اس کے چھپنے کی نوبت اب آئی ہے۔ اس دوران میں جنگ یورپ کی وجہ سے ادب میں بھی ایک انقلاب آیا۔ اس ادبی انقلاب کے بیان کے لئے عصر حاضر کے باب میں انھوں نے ایک ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔ کتاب میں انڈکس بھی شامل ہے اور انڈکس سمیت اس کی ضخامت صرف تین سو صفحات کے قریب ہے۔ اس کے باوجود کتاب بہت جامع ہے اور پر از معلومات ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے۔ سید ابوالفضل صاحب نے قدیم و جدید تاریخی کتابوں پر ایک گہری نظر ڈالی ہے اور عربی ماخذوں کے علاوہ جدید ترین یوروپی ماخذوں سے بھی مدد لی ہے۔ ہماری رائے میں ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ادب کی بہت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس ادارہ کو زندہ رکھنا اردو ادب کے بہی خواہوں کا فرض ہے۔

(الحمرا ماہنامہ دسمبر ۱۹۵۵ء)

عربی ادبیات اور اس کے علوم و فنون کی تاریخ پر اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ عربی میں قدیم و جدید دونوں قسم کی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ انگریزی میں بھی بعض اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف نے ان کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اس کا بڑا حصہ جرجی زیدان کی تاریخ آداب اللغۃ العربیہ سے ماخوذ ہے اس کی تلخیص ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ مصنف کا اضافہ ہے۔ اس کتاب [illegible] تک بیرونی دور جاہلیت، اسلام، خلافت راشدہ، امویہ، عباسی، عثمانی اور [illegible]

[illegible] کی مختصر تاریخ ہے جس میں اس دور کی خصوصیات اور اس کے مشہور مصنفین اور ان کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ عربی علوم و فنون کی وسعت کے مقابلہ میں یہ کتاب بہت مختصر ہے مگر اردو میں اتنے معلومات بھی ایک جگہ نہیں ملتے اس لئے یہ کتاب بھی غنیمت ہے۔ (معارف بابتہ جنوری ۱۹۵۶ء)

مرتبہ سید ابوالفضل ایم اے (عثمانیہ)۔ ضخامت (۲۹۸) صفحات۔ کتاب کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس میں کیا ہوگا۔ اردو ادب میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں ادبیات عرب پر اتنی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے سات ابواب ہیں۔ پہلے باب میں قس بن ساعدہ سے لے کر تابط شراً تک، دوسرے باب میں نابغہ زیادہ سے لے کر فرزدق و طرماح تک۔ تیسرے باب میں الکندی سے لے کر زہیر تک۔ چوتھے باب میں ابن منظور سے لے کر صفی الدین الحلی تک۔ پانچویں باب میں حاجی خلیفہ سے لے کر عائشہ الباعونیہ تک۔ چھٹے باب میں ہارون النقاش لے کر منفلوطی، شوقی اور المطران تک کے مختصر حالات اور ان کی علمی، ادبی اور شاعرانہ خصوصیات درج ہیں۔ آخری باب ہفتم میں عصر جدید کے شعرا کے ساتھ اس دور کی نثر نگاری، افسانوی ادب اور جدید تحریکات کا تذکرہ ہے۔

فاضل مصنف شعر و ادب میں بصیرت رکھتے ہیں اس لئے ان کی تنقید عمیق ہی نہیں وزنی بھی ہے۔ یہ کتاب بلا مبالغہ تاریخ و ادب کے ہزاروں صفحات کا نچوڑ ہے۔ انداز بیان بھی دلچسپ اور باوقار ہے۔ (فاران بابتہ دسمبر ۱۹۵۵ء)

---

(بقیہ سلسلہ صفحہ [illegible])
[illegible] نے ہی عملی شکل اختیار کرتے ہوئے "ادارۂ ادبیات اردو" کی صورت اختیار کر لی۔.........

یہ ہے "ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد (دکن) کی پچیس سالہ مختصر سی سرگذشت۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس ادارے کے اولوالعزم کارکنوں نے بغیر کسی شاہی سرپرستی کے محض اپنے دست و بازو کے سہارے اور قوت [illegible] کے بھروسہ پر ایک عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کی کارہائے نمایاں سر انجام دے کر اردو دنیا میں [illegible] کر دیا کہ ذوق یقین اور خلوص عمل کسی مہم کے سر کرنے میں [illegible] بہترا [illegible] سب سے برتر سہارے ہیں۔

کوئی [illegible] ہو [illegible] ہے گا [illegible] آزمائی کی

[illegible] جنوری [illegible] تک حیدرآباد میں [illegible] عظیم الشان [illegible] اپنی سالگرہ منائی۔ اس شاندار موقع [illegible] جس میں [illegible] نے بڑا [illegible] جوش و خروش سے حصہ لیا۔ برصغیر ہند و پاک [illegible] اردو [illegible] اردو کا جائزہ لیا گیا [illegible] اور بہت سے ارادوں کے نقشے [illegible] خدمت اور ان کی تعلیم و تربیت کو اپنا شعار بنایا گیا۔ [illegible] اپنے عزم و ارادے کو عملی صورت دینے میں پوری [illegible] دنیا کے [illegible] خدمت [illegible]

[illegible]

# ادارۂ ادبیات اردو

(سالنامہ ادب لطیف کے مضمون سے چند سطریں)

ادب لطیف لاہور نے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ایک بسیط اردو نمبر شائع کیا تھا جس میں جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیات اردو پر بھی مضامین لکھوا کر شریک کئے ہیں۔ جناب غلام حسین صاحب نگار نے ادارہ پر ایک طویل مضمون قلمبند کیا ہے۔ اس سے چند سطریں اقتباس کر کے یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے علمی و ادبی سرچشموں سے فیض پانے والوں نے بہت قلیل عرصہ میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت بھی مہیا کرنا شروع کر دیا۔ ادارۂ ادبیات حیدرآباد (دکن) اسی سلسلہ کی ایک عظیم الشان کڑی ہے جسے قائم کرنے، زندہ رکھنے اور اس کے زیر اہتمام اردو زبان اور ادب کے فروغ کا کام انجام دینے میں جامعہ کے فارغ التحصیل فرزندوں نے بڑا اہم حصہ لیا۔

۱۹۳۱ء میں حیدرآباد کے چند اولوالعزم، روشن خیال اور اردو دوست نوجوانوں نے اپنی قوت عمل کے بھروسے پر ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی۔ انھیں کسی حکومت یا حکمران کی سرپرستی حاصل نہ تھی لیکن عوام کی فلاح و بہبود کا جذبہ، علم و ادب کا نور پھیلانے کا شوق اور لگاتار کام کرنے کا جوش انھیں [illegible] سرپرستی سے بے نیاز ہو کر اپنے کمزور لیکن قیمتی بازوؤں کے بھروسے آمادۂ عمل کر رہا تھا۔ اس ادارہ کی تاسیس کا ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے روشن ذہن کی پیداوار سمجھا جاتا ہے [illegible] اپنے بلند مقام پر پہنچایا جہاں ان کے شاندار کارناموں کی ایک [illegible] حیدرآباد کے ان ممتاز فرزندوں میں سے [illegible] میں نمایاں حصہ لیا ہے بلکہ اردو زبان اور ادب [illegible] خدمات انجام دے کر [illegible] مقام پیدا کر لیا ہے ............ ادارۂ ادبیات [illegible] [illegible]

ادارۂ ادبیات اُردو کا ترجمان

# سب رس

## امجد نمبر

جلد (۱۹) شمارہ ۷، ۸

نگران

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد


چندہ سالانہ چھ روپے
ششماہی تین روپے آٹھ آنے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

باہتمام مہتمم ادارۂ ادبیات اردو مطبع ابراہیمیہ میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا

# تصاویر

۱. محفلِ مشاعرہ میں حضرت جگرؔ مرادآبادی غزل سنا رہے ہیں۔

۲. حضرت امجدؔ اور ڈاکٹر محمد عبدالحق مسند پر تشریف رکھتے ہیں۔

۳. شری پی ہنمنت راؤ نائب وزیر مال صدرِ جلسہ کی گل پوشی کر رہے ہیں

۴. ڈاکٹر زورؔ صاحب سپاس نامہ پڑھ رہے ہیں۔

۵. گروپ فوٹو جس میں جوشؔ، جگرؔ، عرشؔ، امجدؔ اور شاہدؔ بیٹھے ہوئے ہیں۔

۶. خواجہ حمیدالدین صاحب شاہدؔ جلسہ کو مخاطب کر رہے ہیں۔

۷. شہ نشین کا ایک منظر۔

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر ادارۂ ادبیاتِ اردو
رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد (دکن)

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

# فہرست

# پیش لفظ

ہندوستان کے صاحب عرفان اور صوفی شاعر حکیم الشعرا حضرت سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کے یادگار جشن الماسی کے مقالات، نظمیں، مشاہیر کے پیامات اور تقریبات کی تفصیلی روداد کو "ارمغانِ امجد" کی صورت میں مرتب کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی ہے۔ میں اپنی اس خوش بختی پر جس قدر بھی فخر کروں کم ہے۔ میں اس بات کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ یہ حقیر کوشش صحیح معنوں میں "ارمغانِ امجد" ثابت ہوگی لیکن اگر حضرت امجد مدظلہ اپنے ایک دیرینہ عقیدت مند کے اس نذرانۂ محبت کو شرفِ قبولیت عطا فرمائیں تو میں بجا طور پر یہ کہنے کے قابل ہوسکوں گا کہ ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ حضرت امجد جیسے باکمال شاعر اور بے مثل ادیب کی خدمات کا اعتراف پرستارانِ زبان اردو کے لئے بہت ضروری تھا۔ یہ زمانہ کی ستم ظریفی ہے کہ ہمیشہ اہل کمال ہستیوں کی خدمات کا اعتراف ان کے گذر جانے پر کیا جاتا ہے۔ بالخصوص یہ رسم ہم ہندوستانیوں کی روایات میں شامل ہوگئی ہے۔ جب میں نے حضرت امجد سے جشن الماسی منعقد کرنے کی ڈرتے ڈرتے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا کہ پرانی روایات کے خلاف ایسا کیوں کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم کو اس پر اصرار ہے تو مجھے بھی انکار نہیں۔ جو تمہارے دل میں آیا کرو۔ لوگ مجھے زندہ کیوں سمجھتے ہیں میں تو کبھی کا مرچکا ہوں۔ جب میں دوسری دفعہ ملا تو یہ قطعہ ارشاد فرمایا۔

بے قدری کی اہل فن کی اکثر ہم نے — پھرتے دیکھا ہے ان کو در در ہم نے
زندوں کو تو اک پھول سے بھی خوش نہ کیا — مردوں پہ چڑھائی گل کی چادر ہم نے

بڑی خوشی کی بات ہے کہ چند سالوں سے اہل ملک نے ان قدیم روایات کو توڑ کر زندہ قوموں کی صف میں خود کو شامل کردیا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی زندگی ہی میں ان کی خدمات کا اعتراف کرکے یہ ثابت کردیا کہ باکمالوں کی قدرشناسی شخصیت پرستی نہیں، بلکہ اعتراف شخصیت و کمال ہے۔

نومبر ۱۹۵۶ء میں جب ادارۂ ادبیات اردو کے ۲۵ سالہ جشن سیمیں کی تقریبات کا پروگرام ترتیب دیا جارہا تھا تو میں نے محترم ڈاکٹر زور صاحب کی خدمت میں یہ تحریک پیش کی کہ حضرت امجد کی خدمات کے اعتراف کے لئے ان کے جشن الماسی کی ایک تقریب منعقد کرکے سارے ملک کی طرف سے حضرت امجد کی خدمت میں سپاسنامہ اور کیسۂ زر پیش کیا جانا چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے میری رائے سے اتفاق فرمایا اور اس تقریب کو سرانجام دینے کی ذمہ داری میرے تفویض فرمائی۔ اس تقریب کو عمدہ طریقے پر منانے کے لئے ایک انتظامی کمیٹی تشکیل دی گئی جو ان علم دوست حضرات پر مشتمل تھی۔

محمد اسد اللہ صاحب انجینیر صدر۔ خواجہ حمید الدین شاہد معتمد۔

ارکان:۔ فیاض الدین صاحب نظامی چیف آرکیٹکٹ۔ ظہیر الدین احمد صاحب اکونٹنٹ جنرل۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ [illegible] داؤد صاحب جذبؔ۔ ضامن علی صاحب غازی۔ محبوب علی صاحب سابق ناظم اسکیم۔ حاجی [illegible] صاحب سابق نائب ناظم اطلاعات۔ ولی الدین حسینی صاحب ایڈوکیٹ۔ محمود حسین صاحب لکچرار۔ سید محمد صاحب ریڈر۔ حسن الدین احمد صاحب مددگار اوقاف۔ سید یوسف صاحب۔ عبدالمنان صاحب مالک انڈین نیوز۔

اُردو شعر و سخن کے پرستاروں کی خدمت میں ایک اپیل بھیجی گئی جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"ملک کے نامور صاحبِ عرفان شاعر حکیم الشعرا حضرت امجد کی خدماتِ شعر و سخن کا اعتراف کرنے کے لئے ادارۂ ادبیاتِ اُردو نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو اعظم ہال سٹی کالج میں جشن الماسی منانے کا تصفیہ کیا ہے۔ حضرت امجد کی خدمت میں سپاسنامہ اور کیسۂ زر بھی پیش کیا جائے گا جو ہم سب کی طرف سے خراجِ عقیدت ہوگا، اسی رات میں ایک خاص محفل شعر و سخن بھی ہوگی۔ علم دوست اصحاب سے استدعا کی جاتی ہے کہ اس مبارک تقریب میں ہمارا تعاون فرمائیں۔ یہ حیدرآباد کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تقریب ہے اس لئے ہمیں شایانِ شان پیمانہ پر مناکر زندہ قوم ہونے کا ثبوت دینا ہے۔"

اس تقریب کی صدارت کے لئے افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن مدراس سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے استدعا کی گئی تھی جسے ڈاکٹر صاحب موصوف نے نہایت خوشی کے ساتھ قبول فرمایا۔ یہ یادگار جشن الماسی ۳۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو شام کے ۵ بجے اعظم ہال سٹی کالج میں منایا گیا۔ شہ نشین پر مسند بچھائی گئی اور پھولوں کی لڑیوں سے اسے آراستہ کیا گیا تھا۔ حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت جگر مرادآبادی اور حضرت عرش ملسیانی کے علاوہ حضرت امجد کے عقیدت گزاروں سے اعظم ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شہ نشین پر حضرت امجد ایک کارچوبی مسند پر تشریف فرما تھے۔

محمد اسد اللہ صاحب نے صدارت کی تحریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"آج کے اجلاس کی صدارت کے لئے ایک ایسی ہستی کو منتخب کیا گیا ہے جس کا شمار ہندوستان کے مشاہیر میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی انتہائی مصروفیت کے باوجود اس کام کے لئے وقت نکال لیا۔ جس کے لئے ہم سب صاحب موصوف

مشکور ہیں میری مراد فضیل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب سے ہے۔ موصوف نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی۔فل کی ڈگری حاصل کی۔ آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ اس وقت آپ مدراس پبلک سروس کمیشن کے ایک ممتاز ممبر ہیں۔ آپ کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ جنوبی ہند میں تعلیم کی اشاعت میں آپ کی مساعی کامیاب ہیں۔ نہ صرف جنوبی ہند بلکہ پورا ہندوستان آپ کا ممنون ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر انقلاب کے بعد میدانِ سیاست میں لیڈر پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد شعبۂ تعلیم میں بھی بہت سے قابل افراد مثلاً پنڈت مدن موہن مالویہ، سرسید وغیرہ جیسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ موجودہ دور میں آپ کی ہستی بھی اسی طرح قابلِ قدر ہے۔ مجھے دوطرفہ مسرت ہورہی ہے۔ ایک طرف تو میں حضرت امجد کو ان کی ڈائمنڈ جوبلی پر مبارکباد دیتا ہوں اور دوسری طرف ڈاکٹر صاحب سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ مسندِ صدارت پر تشریف لاکر جلسہ کی کارروائی کا آغاز فرمائیں۔"

پروفیسر سروری صاحب نے تائید کرتے ہوئے فرمایا:۔

" میں تہہ دل سے اس تجویز کی تائید کرتا ہوں اور صاحب معز سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مسندِ صدارت کو رونق بخشیں۔"

مولوی فیاض الدین صاحب نظامی نے تائید مزید کی۔ معتمد نے ہندوستان کے مشاہیر کے پیامات پڑھ کر سنائے اس کے بعد عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب نے سپاس نامہ پڑھا اور حضرت امجد کی خدمت میں پیش کیا۔ صدر جلسہ سے استدعا کی گئی کہ وہ حضرت امجد کی خدمت میں کیسہ زر پیش کریں۔

حضرت امجد علالت کی وجہ سے سپاس نامہ کا جواب خود نہ پڑھ سکے۔ ان کی طرف سے حمید الدین شاہد نے سپاس نامہ کا جواب پڑھا۔ بعد ازاں حضرت جوش ملیح آبادی، پروفیسر رفیع الدین صاحب (ناگپور)، شریف النساء بیگم علی الدین صاحبہ اور قطب النساء ہاشمی صاحبہ نے حضرت امجد کی زندگی اور شاعری پر مقالے پڑھے۔

زینت ساجدہ صاحبہ نے اپنے تاثرات کا اس طرح اظہار کیا:۔

" میں آج حضرت امجد قبلہ کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہی ہوں۔ سب سے پہلے مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نصیر الدین صاحب ہاشمی کے توسط سے حضرت امجد کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں حضرت امجد کے چند اشعار سے مجھے اختلاف تھا۔ اس لئے حضرت سے نیاز حاصل کرتے ہوئے مجھے ڈر ہوا لیکن جب میں آپ کے پاس حاضر ہوئی تو معلوم ہوا کہ میں سچ مچ ایک حقیقی معنوں میں انسان کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔ انھوں نے اپنے

کلام سے چند اشعار مجھے سنائے جس سے میں بے حد لطف اندوز ہوئی۔ ان کی دو رباعیاں جو بچپن میں مجھے یاد کرائی گئی تھیں وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان میں سے پہلی یہ ہے۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو — منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو — بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

اور دوسری یہ ہے:۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے — مانند حباب ابھر کے آتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس — تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

یہ رباعی تمام نوجوانوں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ایک بہت بڑا درس ہے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے اتنا ہی عرض کروں گی کہ میں بھی حضرتؒ کے عقیدت مندوں میں سے ایک ہوں اور آج ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتی ہوں۔"

حضرت بالمکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" دہلی نے حضرت امجد کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی چند رباعیاں سنائیں۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر، راگھویندر راؤ صاحب جذب، محمد حسین صاحب آزاد، بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے نظمیں پیش کیں۔ اس کے بعد صدر جلسہ افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبد الحق صاحب نے صدارتی تقریر فرمائی۔

حیدرآباد کے نوجوان فن کار اقبال قریشی، عبد الحکیم، رفیق احمد، حمایت اللہ اور علی حیدر نے کلام امجد کو ساز کے ساتھ پیش کر کے شیدائیانِ امجد کو خوب محظوظ کیا۔ اقبال قریشی کو کمیٹی کی طرف سے طلائی تمغہ عطا کیا گیا۔

محمد اسد اللہ صاحب نے بحیثیت صدر استقبالیہ ان الفاظ میں سب کا شکریہ ادا کیا۔

"حضرات میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب میرے لئے کیا کہنا باقی ہے۔ حضرت امجد کے متعلق بہت سی تقریریں ہوئیں۔ افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبد الحق صاحب نے جو تقریر کی میں اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اپنی اور ادارہ کی جانب سے آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں یوں تو مجھے سب ہی کا شکریہ ادا کرنا ہے لیکن جن لوگوں کی بدولت یہ اجلاس کامیاب رہے اُن میں خصوصیت کے ساتھ مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کا شکریہ مجھے ادا کرنا ہے جن کی ان تھک کوششوں سے یہ محفل کامیاب رہی۔ میں ڈاکٹر زور صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ان کی دانشمندی تھی کہ ادارہ کے پروگرام میں حضرت امجد کی ڈائمنڈ جوبلی کو مقدم رکھا۔ میں آخر میں حضرت امجد کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے یہاں تک زحمت فرمائی اور ہماری توقعات کو پورا کیا۔"

آخر میں تقریبات جشن سیمین کے معتمد پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نے جملہ تقریبات میں شرکت کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔

"آج ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی اور حضرت امجد کی ڈائمنڈ جوبلی کی تقریبات کا اختتام ہو رہا ہے۔ میں ان تمام حضرات کا جنھوں نے اس کو کامیاب بنانے میں حصہ لیا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں جناب

پی۔ہنمنت راؤ صاحب نائب وزیر مال کا بھی مشکور رہوں جنھوں نے ہماری مختلف تقریبات میں دلچسپی سے حصہ لیا۔ میں ہماری مختلف تقریبوں کے صدور کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اُن کے تعاون اور ہمدردی کے بغیر ہماری تقریبیں کامیابی سے انجام تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔ میں اُن سارے مقررین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے عالمانہ مقالے لکھے۔ میں اپنے دوست مولوی حمید الدین صاحب شاہد کا ممنون ہوں جنھوں نے کافی دلچسپی اور محنت اس سلسلہ میں کی جناب اسد اللہ صاحب جو آج کی مجلس انتظامی کے صدر ہیں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے بھی آج کے جلسہ کی کامیابی کے لئے بڑی محنت اٹھائی۔ میں ڈاکٹر زور صاحب کا بھی بیحد مشکور ہوں جنھوں نے ان تقریبوں کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں انھوں نے مجھ سے دس گنا بلکہ سو گنا زیادہ کام کیا ہے۔ میں مجموعی طور پر ان تمام اصحاب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہر طرح ہماری مدد کی۔ عطایا کا ذخیرہ کرنے میں جن لوگوں نے محنت فرمائی ان کا بھی میں مشکور ہوں۔

میں انتہائی خلوص کے ساتھ آپ خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ آپ ادارہ ادبیات اردو کے ساتھ ہمیشہ اسی طرح تعاون فرماتے رہیں گے اور اس کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہیں گے۔"

اسی رات کو ۱۰ بجے عالی جناب نواب مہدی نواز جنگ بہادر وزیر طبابت حکومت حیدرآباد کی صدارت میں ایک یادگار محفل شعر و سخن سٹی کالج کے میدان میں منعقد کی گئی جہاں شامیانے لگائے گئے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے قبل ہی اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ شامیانوں کے باہر بھی شطرنجیاں بچھانی پڑیں۔ پورا میدان بھر جانے کے بعد شائقین سڑک پر جمع ہو گئے۔ اس مشاعرہ کے معتمد سید ابوالفضل محمود قادری صاحب ایم اے نے کامیابی کے ساتھ مشاعرہ کے انتظامات کئے۔ مقامی شعراء کے علاوہ بیرونی شاعروں میں حضرت جگر مراد آبادی اور حضرت عرش ملسیانی نے اپنا کلام سنا کر خوب داد حاصل کی۔ رات کے تین بجے یہ مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اتنا بڑا مجمع اور شائقین کا نظم و ضبط دیکھ کر بڑے بڑے اہتمام کرنے والے بھی متحیر تھے کہ پولیس کی مدد کے بغیر ہم نے ایسا نظم اجتماع آج تک نہیں دیکھا۔

خواجہ حمید الدین شاہد

# حضرت امجد کی گھریلو زندگی

حضرت امجد کی گھریلو زندگی یعنی آپ کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے اور ملنے ملانے کی صراحت مجھے کرنی ہے۔ میرا موضوع آسان بھی ہے اور دشوار بھی۔ آسان اس لئے کہ مجھے آپ کے کلام پر تنقید کرنی اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنا نہیں ہے اور مشکل اس لئے ہے کہ مجھے امجد صاحب کی صحیح اور اصلی تصویر الفاظ کے ذریعہ پیش کرنی ہے۔ کیمرہ کے ذریعہ فوٹو لینے یا مو قلم کے ذریعہ امجد کا نقش بنانے سے زیادہ مشکل الفاظ کے ذریعہ تصویر بنانا ہے۔ اب اس کام میں میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں وہ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

اس ضمن میں مجھے اولاً امجد صاحب سے اپنے تعارف اور نیاز مندی کے آغاز اور باہمی تعلقات کا بیان کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں امجد صاحب کی گھریلو زندگی بھی بہت کچھ آجاتی ہے۔ کیونکہ جب تک میں اپنا تعارف اور سلسلۂ روابط کو ظاہر نہ کر دوں اس امر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا ہے میں نے امجد صاحب کی گھریلو زندگی کا دور سے مطالعہ کیا ہے یا قریب سے قریب تر ہو کر دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

آج سے چوالیس ۴۴ سال پہلے ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں پہلی مرتبہ طاعون پھیلا تھا۔ طاعون کی تعطیلات کے بعد مدارس کھلے تھے۔ میں اس وقت مدرسہ دارالعلوم میں جو مشرقی علوم کا کالج بھی تھا۔ چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور امجد صاحب سٹی ہائی اسکول سے اپنی تعلیم ختم کرکے دارالعلوم واپس آئے تھے۔

بعض لڑکے ایسے تھے جو اس سے پہلے امجد صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے۔ ان کے ذریعہ سے جو باتیں مجھے معلوم ہوئیں وہ یہ ہیں:۔

"لڑکوں کو بڑی شفقت اور محبت سے پڑھاتے ہیں۔ موسیٰ ندی کی طغیانی ۱۹۰۸ء میں آپ کی والدہ بی بی بچی ڈوب مرے۔ آپ درگاہ شاہ خاموش صاحب کے سجادہ سید محمد ہاشم حسینی صاحب کے پوتے صابر میاں کو پڑھاتے ہیں۔ شاعر ہیں۔ قوال آپ کا نعتیہ کلام اور نغمیں گاتے ہیں"

یہ تھیں وہ معلومات جو لڑکوں کی زبانی معلوم ہوئیں۔ اس وقت امجد صاحب تیئس ۲۳ بتیس ۳۲ سال کے من کے جوان تھے۔ لمبا قد۔ چھریرا بدن۔ گندمی رنگ۔ ڈاڑھی صاف۔ ہمیشہ سفید شیروانی۔ ترکی ٹوپی۔ حیدرآبادی دوہرا پائجامہ اور سلیم شاہی جوتا پہنتے تھے۔ یہ تھے اس وقت کے امجد صاحب' پانچویں جماعت میں تاریخ اور جغرافیہ دکن کی تعلیم امجد صاحب کے ذمہ تھی۔ جو بات میں نے سنی تھی اس کو اب دیکھنے کا موقع ملا۔ امجد صاحب اس وقت کے عام طریقہ کے خلاف لڑکوں کو مارتے نہیں تھے۔ بلکہ شفقت اور محبت سے تعلیم دیتے تھے۔ البتہ جو لڑکے ذہین اور تعلیم سے رغبت رکھتے تھے ان کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں جغرافیہ دکن اور مختصر تاریخ دکن کتابیں بسم اللہ کی ب سے تمت کی ت تک کتاب بند کرکے سنا سکتا تھا۔ چونکہ تاریخ سے دلچسپی میری خاندانی میراث بھی تھی اس طرح ایک طرف استاد کی شفقت اور دوسری طرف خاندانی اثر

کہا جاسکتا ہے۔

اس زمانے میں امجد صاحب نے ابھی دوسری شادی نہیں کی تھی۔ کوچہ فتح اللہ بیگ میں صابر میاں صاحب کے والد کے مکان کے بیرونی حصہ کے اوپر رہا کرتے تھے، کھانا صابر حسینی صاحب کے ساتھ کھاتے اور ان کو تعلیم دیتے تھے۔ ہر ماہ کی تیرہ کو مدرسہ سے دو پہر میں ایک گھنٹہ پہلے نکل کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قوالی میں شریک رہتے کئی قوال آپ کی نعتیں اور تضمینیں گاتے تھے اور اکثر لوگ خوب وجد میں آتے تھے۔

پانچویں جماعت کے بعد چھٹی جماعت میں تاریخ ہند جغرافیہ عالم۔ ریاضی۔ عربی۔ فارسی یعنی تمام مضامین امجد صاحب پڑھاتے تھے۔ جماعت کے بعض لڑکوں نے صدر مدرس صاحب سے استدعا کرکے یہ انتظام کرایا تھا کہ امجد صاحب اکثر ذہین اور شوقین طلبہ کو کچھ مدرسہ کے وقت کے بعد بلا معاوضہ ریاضی کی مشق کراتے تھے کیونکہ ریاضی کا نصاب زیادہ تھا اور یہ مڈل کی جماعت تھی۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد اور ایک جماعت کا اضافہ کر دیا گیا یعنی بجائے چھٹی کے ساتویں جماعت مڈل یا رشدیہ کی تھی جس کا امتحان سرکاری طور پر ہوتا تھا۔

بہر حال دارالعلوم میں تین چار سال امجد صاحب سے میں نے تعلیم پائی اس کے بعد امجد صاحب صدر محاسبی میں منتقل ہو گئے اور ہم دارالعلوم کالج کی جماعتوں کے ساتھ شہر کے باہر اس مکان میں منتقل ہو گئے جس میں اب حیدرآباد ٹیلیگراف آفس ہے۔ اگرچہ اس طرح یہ تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا مگر جو تعلق استاد اور شاگرد میں شروع ہو چکا تھا وہ ختم نہیں ہوا بلکہ مہینے دو مہینے میں ایک دو مرتبہ امجد صاحب کے پاس میں جایا کرتا اس زمانہ میں امجد صاحب علامہ نادر الدین کی صاحبزادی جمال النساء بیگم سے شادی کر چکے تھے اور کوچہ فتح اللہ بیگ کی مسجد کے خانہ باغ کے مکان اپنی رفیقہ کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے۔ امجد صاحب کے پاس آنے والے کئی اور طلبہ بھی تھے جن میں ایک صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر نظام الدین بھی ہیں اور دوسرے مرحوم سید سراج الدین امین کروڑ گیری کا زمانہ گزر گیا۔ امجد صاحب کی شاعری کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ اور آپ صدر محاسبی میں تھرڈ گریڈ سے سکنڈ گریڈ پر آ گئے تھے۔ اور شاخ تصفیہ مقدمات میں منتظم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ہم بھی اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ملازمت میں شامل ہو کر چند سال اہلکاروں کے زمرہ میں شامل ہو چکے تھے اور ہماری شادی بھی ہو گئی تھی اس طویل مدت میں جو تقریباً چودہ پندرہ سال کا زمانہ ہے۔ میں امجد صاحب کے پاس اسی طرح جاتا رہا جس طرح پہلے جاتا تھا اور گھنٹہ آدھ گھنٹہ آپ کے پاس گزارتا۔ کبھی کوئی رباعی سناتے۔ ہمارے دفتر اور خانگی حالات سنتے اور ہمدردی کرتے مشورہ دیتے۔ آپ کو جو خلوص مجھ سے ہو گیا تھا اس میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا اسی زمانہ میں امجد صاحب حج کو جا کر آئے اور پھر جمال النساء بیگم کا انتقال ہو گیا اور میں ریسرچ کی غرض سے انگلستان اور فرانس گیا وہاں بھی امجد صاحب سے خط و کتابت رہی ایک خط کے چند جملے سننے کے قابل ہیں ایک شفیق استاد اپنے شاگرد کو کس طرح نصیحت کرتے ہیں۔

"تم پر شاباش ہے کہ تھوڑی سی
انگریزی میں بہت کچھ کام کر لیا۔
مخالفوں نے کس کو چھوڑا ہے کہ تم
بچ سکو گے۔ ہم کو اپنے کام سے
کام رکھنا چاہیئے ۔

کامیابی کے نہیں ہم ذمہ دار کام کی حد تک ہمارا کام ہے

بیری کتابیں تم نے گئے تھے انہیں معلوم کیا گیا۔

میاں نصیر کسی سنہرے جال میں اسیر نہ ہو جاؤ خدائے تعالیٰ کے صنائع دیکھو اور خوب دیکھو مگر مہربانی کرکے صنائع میں الجھ کر صناع کو نہ بھول جاؤ تمہارے سفر کا یہی نقطۂ نظر ہونا چاہیئے۔ مشہور مصنف بیری کورنلی کی تصویر مل سکے تو میرے لئے لیتے آنا یا بھیج دینا۔" دسمبر ۱۹۲۸ء

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

عزیزم السلام علیکم۔ آپ کا خط ۱۶/۵/۲۹ء کا وصول ہوا۔ تعجب ہے کہ میں بہ نسبت حیدرآباد کے لندن میں آپ کو ..... زیادہ یاد آ رہا ہوں اور بہ نسبت یہاں کے عقیدت اور محبت کا اظہار وہاں جا کر زیادہ ہو رہا ہے سچ ہے ؎

زندگی ہے کسی پہ مرنے کو
دور ہوں صرف یاد کرنے کو

آپ کے کام اور کامیابیاں دیکھ کر بہت مسرت ہوئی۔ تعجب ہے کہ بغیر انگریزی دانی کے انگریزی ملک میں آپ نے اپنا کام امید سے زیادہ کامیاب کر دکھایا۔ ؏

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

ایک نواب صاحب کا مکان اور اس کا قیمتی فرنیچر اور سامان دیکھ کر ایک رباعی کہی ہے آپ سن لیجئے ؎

ڈیوڑھی نہیں وہ نہیں کہ دربان نہیں
بلبل نہیں گل نہیں کہ بستان نہیں
ہے جمع جہان بھر کا سامان گھر میں
خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

تمہارا دعاگو
امجد ۱۱ جون ۱۹۲۹ء

ایک تیسرے خط کے چند جملے یہ ہیں :-

میاں نصیر نصرکم اللہ۔ السلام علیکم!

تمہارا تفصیلی خط ملا پھر بھی کتابت سے تفصیلی کیفیت کیا معلوم ہو سکتی ہے۔ تم آؤ تو پھر سنیں گے نہیں معلوم تم کیا ہو کر آؤ گے۔ اگر وہاں ایمانی ترقی ممکن نہیں تو مہربانی کر کے تنزل بھی نہ کرو ؎

اونچے محلوں میں لطف تو آتا ہے
ہر ایک قدم پہ نقش اتر آتا ہے
ابھی تو ہے دنیوی ترقی امجد
غم یہ ہے کہ ایمان گھٹا جاتا ہے

دیکھو اس ایمان کے حبل المتین کو ہاتھ سے نہ چھوڑو خدائے تعالیٰ تمہاری تائید کرے۔

تمہارا دعاگو امجد ۲۵ جولائی ۱۹۲۹ء

---

جب میں یورپ سے واپس ہوا تو امجد صاحب سے وہاں کی پوری تفصیل بیان کی تھی۔ امجد صاحب کے ہم شاگرد تھے مگر آپ نے ہم کو ایک دوست کا مرتبہ دے دیا تھا۔ یورپ کی واپسی کے بعد مجھے میرے بڑے بھائی عبدالرؤف صاحب مرحوم نے بتایا تھا کہ امجد صاحب ایک شاعر نہیں رہے ہیں بلکہ صاحب عرفان بن چکے ہیں۔ جمالِ امجد بھی شائع ہو گئی بہرحال یورپ کی واپسی کے بعد امجد صاحب سے سوابط میں اضافہ ہوا۔ ہم گز بلدیہ خدمت پر مامور ہو گئے۔ امجد صاحب موجودہ بیوی سے عقد کر لیا تھا اور موتی گلی میں ایک کرایہ کے مکان میں مقیم تھے پھر مستعد پورہ میں ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ آپ کو فرسٹ گریڈ مل گیا تھا۔ میں تقریباً سات آٹھ سال تک ہر دوسرے دن امجد صاحب کے ہاں

جایا کرتا۔ میری بی بی امجد صاحب کی مرید ہو گئیں۔ امجد صاحب کے یہاں میری بی بی اور بچے ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں قیام کرتے اور امجد صاحب بھی ہمارے یہاں معہ بی بی کے آکر ہفتہ عشرہ قیام فرماتے۔ ہماری موٹر میں بعض دوستوں کی ملاقات کو جاتے۔ اور اپنی بی بی اور ہماری بی بی بچوں کو لے کر پکنک کے لیے عثمان ساگر، حمایت ساگر ...... تفریحاً جاتے تھے۔ اس طرح یگانگت بڑھتی گئی اور زمانہ اس طرح گذرتا رہا۔ اب بھی ہم ہفتہ عشرہ یا دو ہفتہ میں ایک بار ضرور امجد صاحب کے پاس جاتے ہیں اور جو محبت، شفقت، خلوص مجھ سے امجد صاحب کو ہے اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال گذشتہ ۴۴ سال سے اب تک امجد صاحب سے میرے مراسم قائم ہیں۔ ان میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔ یہاں میں وہ تفصیل بیان نہیں کروں گا کہ حضرت امجد سے مجھے کیا کیا حاصل ہوا اور میری زندگی کو سدھارنے میں آپ نے کیا حصہ لیا ہے۔

جو کچھ یہاں بیان کیا گیا اس سے امجد صاحب کی گھریلو زندگی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر اب کسی قدر تفصیل سے میں اس کی صراحت کروں گا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض عنوانات کے تحت اس کی صراحت کی جائے۔ جو یہ ہو سکتے ہیں۔ امجد صاحب کا کھانا پینا، پہننا اوڑھنا، رہنا سہنا۔ دوستوں سے ملنا ملانا۔ بی بی سے سلوک، ملازمین سے برتاؤ وغیرہ۔ امجد صاحب کا ایک مصرعہ ہے ع

جو مل گیا سو کھانا داتا کا نام جپنا

اسی پر آپ کا عمل درآمد ہے۔ آپ کو کسی خاص قسم کی غذا سے رغبت نہیں ہے جو مل جائے اس کو ہنسی خوشی سے کھاتے ہیں۔ تمام دن میں تین وقت۔ کبھی دو وقت۔ کبھی ایک وقت کھاتے ہیں۔ کھانے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں جس وقت مل جائے اور جو بھی مل جائے۔ کسی امیر اور دولت مند کی ضیافت میں شریک ہوتے ہیں تو کبھی غریب کی ضیافت میں زیادہ شوق سے جاتے ہیں۔ آپ صائم الدہر نہیں ہیں اور نہ ہفتہ میں دو چار دن روزہ رکھنے والوں میں شامل ہیں۔ رمضان میں روزہ پابندی سے رکھتے ہیں افطار کا اہتمام نہیں ہوتا۔ جو میسر ہو اسی سے افطار اور سحر کرتے ہیں۔ ہندوستانی کھانوں کے ساتھ مغربی کھانوں سے انکار نہیں۔ دسترخوان کے ساتھ میز پر بھی کھاتے ہیں۔ یہی چیز گھر کے اندر بھی ہے۔ چائے کا شوق ہے۔ گھر پر چائے میں سونٹھ بھی ڈالتے ہیں۔

امجد صاحب کا جو لباس آج سے چالیس سال پہلے تھا اس میں اب تک بہت کم فرق ہوا ہے۔ پہلے ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ حج کے بعد سے ترکی ٹوپی کی بجائے کپڑے کی ٹوپی پہننے لگے ہیں۔ سفید ہرک کی شیروانی کے ساتھ اب خاکستری رنگ کی شیروانی بھی استعمال ہوتی ہے۔ قمیص یا کف دار کرتا زیبِ تن فرماتے ہیں۔ گھر میں لنگ اور باہر جائیں تو پاجامہ ہوتا ہے۔ شوز یا چڑاوا اور چپل استعمال کرتے ہیں۔ آپ گھر میں رہیں تو ہر کس و ناکس سے خواہ وہ امیر، دولت مند، یا اعلیٰ عہدہ دار ہو یا معمولی شخص گھر کے ہی لباس میں ملتے ہیں کسی اعلیٰ شخصیت کے لئے آپ کے لباس میں تغیر نہیں ہوتا۔

امجد صاحب نہایت سادگی پسند ہیں غذا اور لباس بالکل سادہ ہوتا ہے۔ چالیس سال سے اب تک اس میں بہت کم فرق ہوا ہے اگرچہ آپ

زسٹ گریڈ سے ترقی کر کے مددگار بھی ہو چکے تھے
لیکن زندگی کے جو لوازم تھے ان میں فرق نہیں ہوا۔
ایک عرصہ تک سیکل پر سوار ہوتے رہے۔ خرچ
کرنے میں آپ مسرف نہیں ہیں البتہ محتاط ہیں۔

امجد صاحب کی ملازمت کا بڑا حصہ محکمہ مال
کی شاخ تصفیہ مقدمات کی منتقلی پر بسر ہوا۔ یہ زمانہ
اہل معاملات کے لئے ایک بہترین زمانہ تھا کیونکہ
بلا کسی رعایت انصاف کے ساتھ کام ہوتا تھا۔

امجد صاحب کفایت شعار اور کم خرچ رہے
ہیں جس کے باعث مستعد پورہ کے مکان کے علاوہ
اور ایک مکان تعمیر کر لیا ہے آپ کی کتابوں کی
اچھی نکاسی ہوتی رہی ہے جس کی وجہ سے مکان
کی تعمیر ہو سکی۔ امجد صاحب کی آمدنی میں ایک حبہ
بھی ناجائز نہیں ہے اس کو حلفاً بیان کیا جا سکتا ہے۔

آپ بڑے مہمان نواز ہیں ہفتوں اور مہینوں
مہمان آپ کے یہاں رہا کرتے ہیں آپ بڑے
خوددار شخص ہیں کسی کا احسان گوارا نہیں کرتے
خود ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں۔ خاکساری اور فروتنی پیشہ
ہے۔ کبھی صدر بننا اور مسند صدارت پر بیٹھنا گوارا
نہیں کرتے۔ حیدرآباد کی بڑی سے بڑی ہستی مثلاً
سر اکبر حیدری۔ سر امین جنگ۔ مہدی یار جنگ۔ اور
کئی اعلیٰ عہدہ دار آتے رہے ہیں اور غریب آدمی
بھی آتے ہیں آپ دونوں سے ایک ہی طرح ملتے
ہیں ایسا ہی اخلاق ہوتے ہیں ہر شخص یہ تصور کرنے لگتا
ہے کہ وہی آپ کا سب سے عزیز دوست ہے۔
کسی شخص کی توہین آپ کو پسند نہیں آپ عام طور
سے کسی کے یہاں اپنی بی بی کے ساتھ جا کر قیام نہیں
کرتے صرف دو چار ہی ایسے خوش قسمت ہیں جن کو
یہ شرف ملا ہے کہ امجد صاحب کو جن سے خلوص
ہو جاتا ہے پھر اس کو قائم رکھنے کی پوری کوشش
کرتے ہیں۔ اپنی جانب سے اس میں کمی نہیں
کرتے۔ تواضع انکساری آپ کے دو بڑے جوہر
ہیں۔ خندہ پیشانی سے ملنا ہمدردی کرنا۔ دستگیری
کرنا آپ کا معمول ہے۔ ایفائے عہد کا آپ کو بڑا
خیال رہتا ہے۔

نام و نمود کی خواہش نہیں، شیخی نہیں کرتے۔
دنیاوی جاہ و جلال۔ مال و دولت کی کبھی ہوس
نہیں کی۔ ملنساری اور مروت آپ کے خاص کردار
ہیں۔ وقت بے وقت لوگ آتے ہیں اور فضول باتوں
میں آپ کا وقت ضائع کرتے ہیں مگر آپ محض
دل آزاری کے خیال سے اٹھ کر نہیں جاتے۔

امجد صاحب صوفی ہیں۔ خاص خاص لوگوں کو مرید
بھی کرتے ہیں۔ مگر عام طور سے بعض مشائخین طریقت
کا جو انداز نظر آتا ہے۔ وہ امجد صاحب کے پاس
نظر نہیں آتا۔ گویا مرید ایک دوست ہوتا ہے۔

امجد صاحب عورتوں کے بڑے حامی ہیں
وہ آپ کے پاس اپنا درد دکھ بیان کرتی ہیں آپ
ان کی مدد کرتے ہیں۔ ہمدردی سے پیش آتے ہیں نیک مشورہ
دیتے اور میاں بی بی کی رنجشوں کو دور کرنے کی کوشش
کرتے ہیں۔ تعویذ گنڈوں کو میاں بی بی کے ملانے کا
ذریعہ قرار نہیں دیتے۔

اب ہم گھریلو زندگی کے سب سے زیادہ
اہم پہلو کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جس وقت مجھے
امجد صاحب سے تعارف ہوا اس وقت آپ کی
پہلی بیوی دریا برد ہو چکی تھیں ایک عرصہ تک آپ نے
دوسری شادی نہیں کی۔ جب مولانا سید نادر الدین
صاحب کی صاحبزادی جمال النساء بیگم سے عقد
ہوا تو کسی شاگرد کو اس کا علم نہیں ہوا کیونکہ بالکل

خاموشی سے یہ عقد ہو گیا تھا۔ جمال النساء بیگم جب تک زندہ رہیں ہم امجد صاحب کی صوفی مشربی سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے تھے۔ اور نہ مراسم اس قدر وسیع ہوئے تھے، جو زمانۂ مابعد میں ہوئے۔ اس لئے ہم کو امجد صاحب کی گھریلو زندگی کا علم پوری طرح نہیں ہوا۔ یہاں ہم سلسلہ بیان کے لئے "جمالِ امجد" سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے کچھ حال منکشف ہو سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ جمال النساء بیگم اردو کے علاوہ عربی فارسی کی بہت اچھی قابلیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ کوئی علمی ڈگری نہیں ملی تھی مگر قابلیت مسلّمہ تھی۔

امجد صاحب جمالِ امجد میں تحریر فرماتے ہیں:-

"شادی کے پانچ چھ برس بعد ہماری کسی خاص کوشش و محنت کے بغیر ہماری زندگی کا دور بدلنے لگا۔ وقت آ گیا اللہ رحمتِ الٰہی کے دروازے آہستہ آہستہ کھلنے لگے خدا اور رسولؐ کی محبت کے آثار سلمٰی (جمال النساء بیگم کو امجد صاحب نے سلمٰی کا لقب دیا تھا) کے اوضاع و اطوار سے ظاہر ہونے لگے۔ ہماری حیرانی ان کی مسرت کا سبب ہمارا تعجب ان کے انبساط کا موجب ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ لطائف اور نکات جو کبھی اور کسی نیت خود ہمارے وہم و خیال میں بھی نہ آتے تھے، ان کی زبان سے بلا تکلف ادا ہوتے تھے کبھی کبھی ان ہی بحثوں اور مکالموں میں آدھی آدھی رات گذر جاتی تھی۔ اکل و شرب کی تمام لذتیں روحانی اور مذہبی مسرتوں پر قربان تھیں۔ کبھی ادھر سالن چولھے پر چڑھا ہوتا ادھر کوئی بحث چھڑ جاتی۔ سالن اپنے آپ پک پکا کر ٹھنڈا بھی ہو جاتا مگر یہاں سلسلہ گفتگو ختم ہی نہ ہونے پاتا۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ ایک ہی سالن پکا کرتا تھا کبھی کبھی تو ایک ہی سالن دو دو تین تین دن تک برابر کھاتے تھے لذت میں کوئی فرق نہ آتا ہر لقمہ پہلے لقمہ سے لذت میں ترقی کرتا جاتا خانۂ خدا کے زیر سایہ صابر منزل کے چھوٹے اور پرفضا چمن میں ہم دونوں کی پرلطف زندگی بسر ہوتی تھی۔"

جمال النساء بیگم کے انتقال کے چند سال بعد امجد صاحب نے پھر عقد کیا۔ اگرچہ آپ کی شریک زندگی تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور عمر میں بھی چھوٹی ہیں مگر اس کے باوجود دونوں کی زندگی مسرت بخش ہے چونکہ آپ کی زندگی کو گزشتہ بیس اکیس سال سے ہم کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے آپ کی شریک زندگی کا ہم سے پردہ نہیں ہے اس طرح امجد صاحب کی گھریلو زندگی کو بچشم خود دیکھ چکے ہیں اس لئے ہماری صراحت سنی سنائی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میاں بیوی کی زندگی خوش و خرم اور خوش گوار بسر ہوتی ہے بیوی کی سلیقہ شعاری اور شوہر کی طبیعت میں خود کو ضم کر دینے کے باعث دونوں مسرت آمیز زندگی گزارتے ہیں۔ دونوں میں انس و محبت ہے۔ خلوص ہے شوہر بیوی کا خیال اور ناز برداری کرتے ہیں تو بیوی شوہر کی اطاعت اور فرماں برداری کو افضل سمجھتی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے کبھی دونوں میں اختلاف نہیں ہوتا۔ اگر کوئی نامناسب بات ہو جائے تو دونوں چشم پوشی کرتے ہیں امجد صاحب نے

اپنی بی بی کو قانون اسلامی کے مطابق آزادی دے رکھی ہے۔ امجد صاحب کے بعض خاص دوستوں سے وہ پردہ نہیں کرتیں۔۔۔۔۔ ان سے بات چیت کی پوری اجازت ہے۔ ان کو پہننے اوڑھنے اور آرایش میں آزادی ہے کہیں آنے جانے پر پابندی نہیں ہے۔ حسب استطاعت ان کی فرمایش کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی ضروریات کی چیزیں خوشی سے فراہم کی جاتی ہیں۔ نرمی۔ ملائمت سے گفتگو کرتے ہیں خوش مذاقی۔ خوش طبعی بھی ہوتی ہے۔ امجد کا کبھی خانہ داری کے کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں کبھی دونوں مل کر کھانا پکاتے ہیں ضروریات کی اکثر اشیا امجد صاحب خود خرید لاتے ہیں۔ گھر کے کاروبار میں ان کی مدد کرتے ہیں اسی طرح بیوی بھی میاں کی راحت اور آرام و آسایش کا پورا خیال رکھتی ہیں بیجا فرمایش نہیں کرتیں ان کی فرمانبرداری کو مقدم سمجھتی ہیں۔ سکھ چین سے زندگی بسر کرنا دونوں کا معمول ہے۔ دونوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ امجد صاحب خوش قسمت ہیں۔ آپ کی گھریلو زندگی آرام اور آسایش سے بسر ہوتی ہے بلکہ قابلِ رشک معلوم ہوتی ہے۔

اکثر ادیبوں اور شاعروں کو ان کی رفیقۂ حیات کی نامناسبت سے کوفت اور تکلیف ہوتی ہے اور ان کی گھریلو زندگی عذاب جان ہو جاتی ہے۔

امجد صاحب کو پہلی بیوی سے ایک دختر تولد ہوئی تھی جو موسیٰ ندی کی طغیانی میں اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس کے بعد کوئی اور اولاد کسی بیوی سے نہیں ہوئی۔ امجد صاحب نے موجودہ بیوی کی بہن کی لڑکی کو گود لے لیا ہے اور اس کی شادی بھی کر دی ہے۔ آپ بچوں کو بڑی محبت کرتے ہیں خواہ کسی کے بچے ہوں ان کو نہایت عزیز رکھتے اور پیار کرتے ہیں۔

ملازمین سے امجد صاحب کا برتاؤ بہت اچھا ہوتا ہے۔ خود جو کھاتے ہیں وہی ان کو کھلاتے ہیں ان سے نرمی سے گفتگو کرتے ہیں خفگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ ان کے قصور کو معاف کر دیتے ہیں۔ ملازم برسوں آپ کے ہاں رہتے ہیں امجد صاحب خود سے کسی ملازم کو علٰحدہ نہیں کرتے وہ خود ہی اپنی منفعت کی غرض سے جانا چاہے تو روکتے بھی نہیں۔ بہرحال امجد صاحب ملازمین کو اپنا نوکر نہیں سمجھتے بلکہ ایک انسان تصور کرتے ہیں۔

مضمون نامکمل ہوگا اگر امجد صاحب کے مشاغل روز مرہ کا کچھ حال نہ سنایا جائے۔ امجد صاحب ایک صوفی مشرب انسان ہیں۔ حاجت مند اپنی ضرورتوں کے لئے آتے ہیں بیمار اپنی تندرستی کے لئے آتے ہیں۔ عورتیں اپنی اپنی مرادوں کے لئے آتی ہیں۔ اس طرح امجد صاحب ایک مرشد اور مشائخ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر دوسرے مشائخوں اور صاحبان عرفان سے آپ کی حالت جدا نظر آئے گی۔ بیماروں کو آپ صرف پانی دم کر کے دیا کرتے ہیں کبھی کسی کو تعویذ دے دیتے ہیں۔ عملیات نہیں کرتے۔ فلیتے نہیں دیتے۔ مریدوں سے خدمت نہیں لیتے۔ بلکہ مریدوں کی خود خدمت کر دیتے ہیں۔

امجد صاحب سینما بھی دیکھا کرتے ہیں اکثر المیہ اور دردناک فلم دیکھتے اور اس سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔ قوالی کا بھی شوق ہے۔ مجلس سماع سے خاص لگاؤ ہے۔ مجلس سماع میں آپ تڑپتے اور لوٹتے نہیں البتہ رو لیا کرتے ہیں بعض مخصوص گانے والے امجد صاحب کا کلام رات رات بھر سناتے ہیں ایسی

محفل میں جو سماں بندھ جاتا ہے وہ الفاظ کی صورت میں ادا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اگر امجد صاحب کی گھریلو زندگی پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ ایک بلند کردار انسان ہیں آپ کی گھریلو زندگی ایک نمونہ اور مثال بن سکتی ہے جو دوسروں کے لئے قابل تقلید ہے۔

**نصیر الدّین ہاشمی**

---

# تصانیف امجد

**ریاض امجد حصہ اول و دوم** حافظ شیراز کے صوفیانہ کلام کی دلکش تخمیس، ہندی دوہوں کی دردبھری تضمین حمد و نعت کا لطف، دعا و مناجات کا ذوق حاصل کرنا ہو تو ان حصوں کو ضرور ملاحظہ کیجئے۔ قیمت فی حصہ [illegible] علاوہ محصول

---

**رباعیات امجد حصہ اول و دوم** رباعیات کے لئے امجد کا نام ہی کافی ہے۔ قیمت فی حصہ [illegible] علاوہ محصول

---

**خرقۂ امجد سی پیوند** ایمان کی سرد مہری کے وقت اوڑھنے بچھانے کے کام آتا ہے اس کا مطالعہ انسان کو انسان اور مسلمان کو مسلمان بناتا ہے۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول

---

**نذر امجد** ہجرت نبوی کے حالات۔ وصل و فراق کے کیفیات بوڑھوں، عورتوں، بچوں سب کیلئے دلکش و دلچسپ ہے۔ قیمت [illegible]

---

**حج امجد** یہ کتاب حج و زیارت اور حجازی تاثرات کا دلپسند مرقع ہے۔ قیمت ( [illegible] )

---

**جمال امجد** بقول رسالہ معارف اس کتاب سے ذوق ادب کی تشفی اور کاہش دل کی تسکین ہوتی ہے۔ قیمت [illegible]

**میاں بیوی کی کہانی امجد کی زبانی**۔ اس کتاب میں بیوی نے اپنی ہی مثال پیش کر کے اپنے میاں کو عبدیت کا سبق پڑھایا مع اضافہ حکایات قیمت [illegible] علاوہ محصول

---

**حکایات امجد** اس کتاب میں روزمرہ زندگی کے واقعات سے نتیجہ خیز نتائج پیدا کئے گئے ہیں۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول

**گلستان امجد** گلستان حضرت سعدی کا اردو ترجمہ جس میں مناسب حال قطعات اور رباعیات سے حکایت الفردوس کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ قیمت [illegible] علاوہ محصول

**پیام امجد** قرآن کریم اور احادیث نبوی کی روشنی میں طول طویل مباحث سے قطع نظر کر کے مختصر طور پر اہم اور مشکل مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت [illegible]



حکیم الشعرا حضرت امجد اور افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب صدر جشن الماسی
مسند پر تشریف فرما ہیں



شری پی۔ ہنومنت راؤ نائب وزیر مال وصنعت۔ جشن سنہری ادارۂ ادبیات اردو
افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو پھول دے رہے ہیں



بائیں طرف سے بیٹھے ہوئے: خواجہ حمید الدین شاہد ۔ حضرت جگر مرادآبادی ۔ حضرت امجد حیدرآبادی
حضرت جوش ملیح آبادی ۔ حضرت عرش ملسیانی ۔

بائیں طرف سے کھڑے ہوئے: خدا بی ۔ محمد اسد اللہ ۔ ڈاکٹر زور ۔ نصیر الدین ہاشمی ۔ عدالت صدیقی
ڈاکٹر جعفر حسن ۔ فیاض الدین نظامی ۔ مخدوم علی ۔ ڈاکٹر نظام الدین
خورشید ندیم ۔ حبیب الرحمان (درمیان میں پیچھے کی طرف)

# حضرت امجد

خدا کا شکر ہے کہ جناب امجد ان معدودے چند خوش نصیب شعرا میں سے ایک ہیں جن کو بعض جوہر شناس نگاہوں نے بر وقت تو نہیں دیر ہی سے سہی مگر پہچان لیا۔ چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو نے ان کی جوبلی مناتے ہوئے کیسۂ زر گذران کر خراج عقیدت پیش کیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک و قوم کے لوگ... مردہ پرست نہیں ہیں اور مایہ ناز شعرا کو اپنی قدر دانی کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہونے تک صبر کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔

ہر بات خدا کی جانب سے ہے۔ عزت و ذلت کا دینے والا بھی خدا ہی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جو نیک اور خدا پرست بندے ہوتے ہیں وہ ان ہی کو دنیاوی عزت و مسرت نصیب نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات تو زمانہ انھیں ذلیل و خوار کرنے پر تل جاتا ہے۔ اور طرح طرح کی روحانی و جسمانی تکالیف میں مبتلا رکھتا ہے۔ ایسا شاذ ہی ہوا کرتا ہے کہ اس آزمائش گاہ زندگی میں پورے پورے اترنے کے بعد پروردگار کی رحمت سے عاقبت کے علاوہ اس دنیا میں بھی اس رنج و تعب کا صلہ عطا کیا جاتا ہو۔

یوں تو امجد صاحب کی سوانح حیات اٹھا کر دیکھئے تو پیدائش سے اب تک بظاہر ان کی آزمائشیں ہی ہو رہی ہیں اور وہ صبر و رضا کی تصویر سے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ لیکن ایک تازہ واقعہ ابھی چند ماہ ہوئے گزرا ہے، جب ایک معمولی جھگڑے کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر اشرار نے اس گوشہ نشین بزرگ ہستی کی ذلت و توہین میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور وہ بھی صرف اس جرم کی بناء پر کہ وہ بیچ بچاؤ اور مصالحت کرانا چاہتے تھے۔

اس واقعے کا ذکر اخباروں میں اگرچہ بالکل معمولی طریقے سے آیا۔ لیکن بہت سے دلوں کے لئے سخت صدمے اور عبرت کا باعث ہوا تھا۔ سنا کہ جب لوگ اس واقعہ پر اظہار ہمدردی کے لئے جاتے تو بلا کم و کاست امجد صاحب پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے فطری سادگی کے ساتھ امن دشمنوں کی زد و کوب و بدکلامی کا حال بھی سرسری طور پر کہہ گزرتے۔ اس کا خیال نہ ہوتا کہ ان باتوں کے بیان سے سبکی ہوگی۔ اور نہ ہی ان بدسلوکی کرنے والوں کے متعلق زبان سے کچھ برا بھلا نکالتے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کسی اور شخص کا قصہ بیان کر رہے ہوں۔ بعض حضرات نے افسوس ظاہر کیا کہ ان اشرار کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ برخلاف اس کے اخباروں نے تک اس معاملے کو بالکل غیر اہم طریقے سے شائع کیا اور بات جہاں کی وہاں دبا دی گئی۔ جس سے غنڈوں کی اور ہمت افزائی ہوئی۔" تو یہ کہہ کر ٹال جاتے کہ "جو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے وہی پیش آتا ہے۔ اور تقدیر کا لکھا کیا ہے، خدا کا حکم۔ بس پھر اس پر ناراضی کیسی"

انسان کو اپنی عزت بہت عزیز ہوتی ہے بہت سی ناگوار باتیں ہم اور آپ برداشت کر لیتے ہیں لیکن اگر اشارۃً بھی کوئی بے عزتی کرے تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور انتقام کے درپے ہو جاتے ہیں۔ کچھ بس نہ چلے تو برا بھلا کہہ کر ہی دل کی بھڑاس نکال لی جاتی ہے۔ لیکن اپنی ہتک و ذلت کو یوں تیوری پر بل ڈالے بغیر سہہ لینا بڑے دل والوں کا ہی کام ہے۔ امجد صاحب کے صاحب دل ہونے کا یہ معمولی

ثبوت نہیں۔ اور یقین کیجئے آج جو سیکڑوں ہزاروں
لوگ ان کی جوبلی منارہے ہیں اور عزت وتعظیم کرتے ہوئے
خراج تحسین ادا کر رہے ہیں یہ صرف اس امتحان
میں کامیاب اترنے کا صلہ ہے۔

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ

چند ہی ماہ کے الٹ پھیر میں اللہ نے اس ناگوار واقعے
کا انھیں یہ اجر دیا ہے۔ مجھ سے زیادہ واقف کار
اور بہتر لکھنے والوں نے ان کی زندگی کے ہر زاویے
پر روشنی ڈالی ہے۔ دوری کی وجہ سے زیادہ
مواقع ملاقات کے مجھے نہیں ملے لیکن جو چند مرتبہ شرف
نیاز حاصل ہوا تو میں جان گئی کہ سمجھنے والوں کے لئے
ان کی صحبت نعمت غیر مترقبہ ہوگی۔ آنکھ والے ان
میں بہت کچھ دیکھ سکتے ہوں گے اور حاصل کرنے والے
مالامال ہو جاتے ہوں گے۔ مجھ جیسی نااہل اور کج فہم
کے دل نے بھی اقرار کیا کہ واقعی اس نفیس منش گوشہ نشین
علم وعمل کے مخزن کی صحبت میں وقت گزارنے میں سکون
حاصل ہوتا ہے۔

وہ خود بھی ہر ملنے والے کو باریکی سے پرکھتے
اور ٹٹولتے ہیں۔ ان کے بظاہر سیدھے لیکن دراصل
گہرے سوالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت جلد پتہ
لگا لیتے ہیں کہ ان کا مخاطب کتنے پانی میں ہے۔ اور
پھر اس کے معیار سے خود بھی آگے نہیں بڑھتے۔ کسی
مسئلے کو سمجھانا ہوتا ہے تو ایسے الفاظ میں سمجھاتے ہیں
جو پوچھنے والے کی سمجھ میں آسکے۔

اپنی تصنیفوں کا ذکر بغیر دریافت کئے کسی سے
کبھی از خود نہیں کرتے وہ کبھی جتاتے نہیں بلکہ صرف
تذکرۃً ان کی گزشتہ زندگی کے ساتھیوں کا حال
خود انہی کی تصانیف میں پڑھ کر میں تو یہی کہہ سکتی
ہوں کہ کہنے والے نے ہر طرح کسوٹی پر کس لیا ہے۔

* اور اب اس خاکی پنجرے میں ایک نورانی چڑیا ہے
جس کے لئے دعا کیجئے کہ تا دیر مقید رہے تاکہ آپ
ہم کچھ تو اس کے نور سے مستفید ہو سکیں۔ ان کے
کلام و رباعیوں کے متعلق میرا کچھ لکھنا ہیچ ہے کیونکہ
یہ سب جانتے ہیں کہ کلام نہیں بجلی ہے جس کے اثرانداز
ہونے کے لئے اس دل کی ضرورت ہے جس میں کچھ
کشش ہو پھر برق کو ایسی پرکشش شئے میں جذب
ہو جانے سے کون روک سکتا ہے۔

قناعت کے معنی بھی کچھ انھیں اور ان کی
طرز زندگی کو دیکھ کر سمجھ میں آتے ہیں۔

ایک معمولی واقعہ بیان کرتی ہوں جس سے
اندازہ ہو سکے گا کہ اس عظیم شخصیت کی کس تنگ دستی
میں گزر ہو رہی ہے اور باوجود اس کے کسی کے آگے
دست دراز کرنا تو کجا اپنی ضرورتوں کا اظہار بھی
نہیں کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی چند ماہ پیشتر
انھیں لقوے کا اثر ہو گیا تھا۔ عیادت کے لئے
گئی، تکلیف میں بھی حسب عادت شفقت وسادگی
سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

دوا وغذا کے متعلق پوچھا تو حکیم کا نام بتانے
کے بعد غذا کے متعلق کہا ایک دن ایک کبوتر کا شوربہ
اور ایک دن گوشت کی یخنی پیتا ہوں۔ گھر کے درخت
سے جتنے انجیر نکلتے ہیں وہ سب اکیلے میں نے ہی
کھائے۔ میں سمجھ گئی اور دس روپے نذر کئے
جنھیں بیحد اصرار کے بعد قبول کرکے فرمانے لگے

" ایک دم دس روپے تم نے دیدیئے
ہیں اب ان کے جوڑے منگوا کر روز
شوربہ پیا کروں گا۔"

مجھے یہ سن کر رونا آگیا کہ افسوس ایسی بیماری اور
تنگ دستی۔ مگر ان کی لب پر شکایت [illegible]

اظہارِ حقیقت کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

ان کی پوری زندگی ہی قسم قسم کی صعوبتوں میں گذری۔ لیکن خدا کے پاس ان سب آزمائشوں کا صلہ تو محفوظ ہے ہی اس لئے اس دنیا میں بھی انھیں گمنام اور کس مپرسی کی حالت میں رکھنا نہ چاہا۔ جس کے لئے قابلِ مبارک باد ہیں وہ حضرات جنھیں حضرت امجد کی جوبلی مناکر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا خیال آیا۔ خدا اسی طرح ہمیں زندہ رہنے اور زندگیوں کی قدر کرنے کی توفیق دے۔ آمین

مسز سید یٰسین علی خاں

---

# ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ (ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی۔ لندن) کی تصنیفات و تالیفات

**اردو شہ پارے** | اردو کے آغاز سے دلی اور نگ آبادی تک کے ادب کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ نمونے جو یورپ اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کمیاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں۔ قدیم شعرا اور قدردانانِ سخن کی بیش بہا قلمی تصاویر کے عکس بھی دیئے گئے ہیں۔ (جدید ایڈیشن زیرِ طبع)

**روحِ تنقید** | اپنے موضوع پر بقول علامہ عمادی مرحوم اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر حالیہ دور تک تنقید کے ارتقائی مدارج کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ فنِ تنقید پر ایک بیش بہا اور پراز معلومات کتاب ہے۔ (چوتھا ایڈیشن۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے)

**تنقیدی مقالات** | اعلیٰ اصولِ تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے اردو کے بہترین ادیبوں اور کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، میر امنؔ، میر انیسؔ، سوداؔ، غالبؔ، حالیؔ، کیفیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، جوشؔ، عظمت اور سلیم وغیرہ کے کلام اور تصنیفات پر تفصیلی ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرا ایڈیشن صفحات ۲۹۴۔ (تیسرا ایڈیشن زیرِ طبع)

**ادبی تاثرات** | اس کتاب میں مولوی مرزا قدرت اللہ بیگ صاحب ایم۔ اے نے ڈاکٹر صاحب کے چند ایسے مختصر مقدمے اور تبصرے شائع کئے ہیں جن میں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر بصیرت افروز پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اتنی مقبول ہوئی کہ اب اس کی صرف محدود جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

مرتب نے اپنے دیباچے کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کی ان ادبی خدمات (کتابوں، مقالوں) کی تفصیلی فہرست بھی شامل کی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۰ء کی درمیانی مدت میں شائع کی ہیں۔ صفحات ۲۴۴ مجلد۔ قیمت عہ۔

**سلطان محمود غزنوی کی بزمِ ادب** | اس کتاب میں محمود غزنوی کی علمی و ادبی دلچسپیوں کا مرقع اور اس کے دربار کے ادیبوں اور شاعروں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب بالکل ختم ہو چکی ہے۔ دوسرا ایڈیشن زیرِ ترتیب۔

**حیاتِ میر محمد مومن** | عہدِ محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیرِ مطلق تھے۔ دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور رہے۔ اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر بھی تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد رہ چکے تھے۔ تقریباً تین سو صفحات مع متعدد تصاویر۔ قیمت پانچ روپے۔

# حضرت امجد ہماری نظروں میں

یہ حیدرآبادیوں کی خوش نصیبی ہے کہ امجد ان میں موجود ہیں۔ ہم میں کتنے ہی لوگ ہیں جو حضرت امجد کا کلام پڑھ کر ان کے دیکھنے کی تمنا لئے ان کے درِ دولت پر پہنچتے ہیں۔ حضرت امجد ان ہستیوں میں سے ہیں جن کا در کسی کے لئے بند نہیں اور نہ کسی سے ملنے میں انہیں عار ہے۔ امیر و غریب کا ان کی نظروں میں فرق نہیں۔ وہ ان سب کو انسان سمجھتے ہیں اور انسانیت دوستی ان کا شعار ہے۔

حضرت امجد سے میرے والد مولوی عبدالرشید صاحب مرحوم کو جو خلوص عقیدت تھی اور حضرت امجد کو ان کا جس قدر خیال تھا اسے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زندگی میں کتنے ہی موقع ایسے آئے ہیں جب کہ ہمارا اور حضرت امجد اور ان کے متعلقین کا ایک جگہ ساتھ ہوتا رہا ہے۔ والد کے پاس اصلاح پر تشریف آوری سے حضرت امجد کو انکار نہ ہوتا تھا۔ بعض سفر بھی ہمارے ایک ساتھ ہوئے ہیں۔ حضرت امجد کی بزرگانہ شفقت و عنایت مجھے کسی عزیز قریب کی طرح محسوس ہوتی رہی ہے۔ ان کے وہ الفاظ بھی میں نہیں بھلا سکوں گی جو انھوں نے مجھے لکھے تھے۔

"تم ہی جیسوں کی محبت نے مجھے اپنی اولاد کے تمنائی تخیل سے بے نیاز کر دیا ہے"

یوں تو حضرت امجد کو دیکھنے سے پہلے میں اپنے بچپن سے ان کی کتابیں پڑھتی رہی ہوں اور ہمیشہ سے والد کو مداح پائی تھی۔ لیکن ان کو دیکھتے ہوئے بھی بیس سال سے کم عرصہ نہیں گزرا۔ چنانچہ میں کہہ سکتی ہوں کہ ہماری نظروں نے کیا دیکھا اور حضرت امجد ہماری نظروں میں کیا ہیں۔ کیا چیز ہے جو ہم پر اثر انداز ہوتی رہی ہے۔ نہ صرف ان کا کلام ہمارے لئے تعلیم و پیام ہے بلکہ ان کی زندگی بھی مثالی زندگی ہے جس کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

سب سے پہلے ان کی سادگی ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو۔ ہر عمل میں سادگی و خاکساری نمایاں ہوتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہی ہے کہ زندگی اور زندگی کی ہر چیز کو آسان تر ہونا چاہئے۔ اسلام کے ان احکام پر جن سے زندگی میں آسانیاں پیدا ہوں عمل کی ہدایت کرتے اور عمل پیرا ہوتے ہیں۔

ان کے لباس پر نظر کیجئے۔ ناسی رنگ کے چند سادہ کپڑے ان کو زندگی گزارنے کے لئے کافی ہو جاتے ہیں اسی میں خاص و عام سے ملنا ہوتا ہے۔ سر پر سفید کپڑے کی ٹوپی ہوتی ہے جس کے استعمال میں بھی بے نیازی نظر آتی ہے باہر جاتے ہیں شیروانی (یہ ان کے پسندیدہ رنگ کی ہونا ضروری نہیں ہے) کے ساتھ اور کچھ ضروری کپڑوں کا اضافہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور جوں ہی گھر آتے ہیں خاکی رنگ میں آ جاتے ہیں۔ قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انہیں لباس سے کبھی دلچسپی رہی ہو گی۔ اگر رہی ہے تو بقول خود ان کے اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے ہو گی۔ آپ فرماتے ہیں:-

زندگی اپنے لئے نہیں دوسروں

کے لئے ہوتی ہے"

حضرت امجد کے ایک نوجوان عزیز قریب کے
رے میں سنا تھا کہ انھیں اپنے لباس کی آرائش کا
ہت خیال ہے اور جب ان کے سامنے حضرت
مجد کی سادگی کی ترغیب پیش کی گئی تو انھوں نے
ہا کہ وہ امجد نہیں ہیں۔ ان کی اپنی عزت تو لباس
کا سے ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت امجد
ی سادگی اس لئے نہیں کہ وہ "امجد مقام" ہیں۔
بلکہ یہ ان کا فطری وصف ہے اور اسی پر ان کو اطمینا
ناز ہے۔ فرماتے ہیں :-

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی
میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطف خاکساری
تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

ان کی ایک اور رباعی ہے ؎

سینہ و دل مثل دامن چاک ہے
جسم خاکی سر سے پا تک خاک ہے
ہم فقیروں کو نہ سمجھو تم حقیر
کپڑے میلے ہیں مگر دل پاک ہے

خاکساری ان کو پسند۔ سادگی کا اختیار کرنا ان کا
تیاری ہے۔ مگر اس کے ساتھ جو چیز قدرت کی طر
ے ان کے حصے میں آئی ہے اس سے وہ خود لاعلم
ہی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک وقار کی موجود
ہے۔ ایک شان ہے جو ان کی نظر سے پوشیدہ
ہے۔ مگر ہماری نظروں سے نہیں۔ شاید وہ اپنے کو
س قدر کمتر سمجھتے ہیں قدرت ان کو برتر کرنا چاہتی
ہے۔ ان کی ہستی سے بزرگی کا اظہار ہوتا ہے۔
ن کی چال ڈھال بھی خاص ہے۔ جب آپ چلتے

ہیں تو کچھ "الگ تھلگ" سے محسوس ہوتے ہیں جیسے دنیا
سے کوئی سروکار اور دلچسپی نہیں۔ یہ طرز بھی کوئی ان کا
اختیاری نہیں بلکہ یہی ان کا خاص فطری طرز ہے۔ وہ تو
سادگی چاہتے ہیں مگر قدرت جس طرح ان کو برگزیدہ کرتی
ہے اسے کچھ دیکھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

حضرت امجد کے خلوص و تحمل کو بھی اپنا آپ نظیر
کہنا چاہیئے۔ ان کی رباعی ہے ؎

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید یہ ہے
ہر چیز کو اچھا کہو تمہید یہ ہے
مخلوق خدا ہے سب خدا کی مخلوق
سب کو تم ایک سمجھو توحید یہ ہے

یہ صرف ان کا بیان نہیں بلکہ اسی پر ان کا عمل بھی
ہے۔ معلوم نہیں ہر ملنے والے سے وہ خود دل کر
کس قدر خوش ہوتے ہیں لیکن ہر ملنے والا ان سے
مل کر ضرور خوش اور مطمئن ہوتا ہے اور شاید کسی
کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کا اصلی مقام ان کے
پاس کیا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ اس پر
مہربان ہیں۔ ہر ایک کے لئے بے لوث و ہمدردانہ
طرز عمل ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ توجہ برتی جاتی ہے۔
اور جس صبر و تحمل کے ساتھ وہ ملتے ہیں تو ایسا محسوس
ہونے لگتا ہے کہ ان کے پاس ہماری ہی وہی۔ فقط ہے۔
ایک دفعہ میں نے بھی حضرت امجد سے ان کی
اس وسعت قلبی پر اظہار تعجب کیا تھا کہ ان کے دل میں
ہر ملنے والے کے لئے کہاں سے جگہ نکل آتی ہے۔
سب کی سمائی کس طرح ممکن ہوتی ہے۔ ہم اپنے
مختصر حلقۂ احباب کو مسرور و مطمئن نہیں کر سکتے۔
مگر ان کے بے شمار ملنے والے نہ معلوم کس طرح
ان سے خوش رہتے ہیں۔ یقیناً وہ مطمئن اللہ تعالیٰ

کے لئے سب سے ملتے ہیں۔ اسی لئے کسی کو
ان سے شکایت نہیں ہوتی۔ کیا ہم اسے
سنت نبوی کی زندہ تصویر نہیں کہہ سکتے۔ کیا
یہ اخلاق کا انتہائی کمال نہیں ہے؟

ارشاد نبوی ہے کہ اس شخص کو اچھا سمجھنا
چاہیے جو اپنے گھر والوں یا اہل و عیال کے ساتھ
اچھا ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ
ایک ایسا معیار ہے جس سے کسی انسان کا صحیح اندازہ
قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی حضرت امجد
کی زندگی مکمل ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کے لئے
بہترین رفیق۔ سچے ہمدرد۔ نہایت قدردان و
مہربان واقع ہوئے ہیں۔ ان کے جذبات اور ان
کی ضروریات کا انہیں پورا پورا لحاظ و احساس
ہوتا ہے۔ ان کے بغیر نہ سیر و سفر ہوئے ہیں اور نہ
کسی دلچسپی میں وہ تنہا حصہ لیتے ہیں۔ گھر والوں
پر وہ کسی جبر و تقید کو بھی پسند نہیں کرتے۔ ان کو
اپنی طبیعت پر قابو ہے۔ ان کا طرز ان کے خیالات
ان کی پسند کو جاننا مشکل نہیں۔

حضرت امجد کے خیالات و گفتگو بھی خاص
ہے۔ ان کا علم۔ ان کی معلومات و تجربات وسیع
کے علاوہ سنجیدہ فکر کے مالک ہیں۔ بہت سے لوگ
ان کی خدمت میں افکار و الجھنیں لے کر آتے ہیں۔
بعض حال بیان کرتے۔ بعض وقت کہنے کی ضرورت
بھی نہیں ہوتی۔ ان کی گفتگو کچھ ایسی حسب حال
اور حقائق سے پر ہوتی ہے کہ انسان کو تسکین
حاصل ہو جاتی ہے۔ سکون و مسرت کا احساس
ہوتا ہے۔ امجد صاحب کے وہ چھوٹے چھوٹے
انمول جملے ناقابل فراموش ہیں جو ان کی گفتگو کا
جزو ہوتے ہیں۔ اور جنہیں "اقوال امجد" سے
موسوم و محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

ان کا ایقان۔ ان کے تاثرات ان
ملنے والوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے
ان کے خیالات سے اوروں میں بھی کچھ نہ کچھ
بصیرت آ ہی جاتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان
دعائیں بے اثر ہوں گی۔ ان کا کہنا بھی تو یہ ہے

تجھ سے لگائے میرا ملنے والا
عالم کو بھلائے میرا ملنے والا
مولا! مرے ہر دوست کو اپنا کر لے
تجھ سے مل جائے میرا ملنے والا

حضرت امجد کی محنت۔ جفاکشی۔ کمزوروں
مربیانہ سلوک بھی خاص تذکرہ کے لائق ہے۔
تصوف و شاعری سے ہم ناواقف نہیں۔ ان کا
جو مقام ہے ہمارے دل جانتے ہیں مگر ان کے
مزاج میں غرور و تعلی نام کو نہیں۔ حتی الامکان اپنا
کام آپ کرنا۔ گھر والوں کا ہاتھ بٹانا۔ نوکروں پر
حکومت سے پرہیز اور سختی سے بالکل اجتناب ہوتا
ہے۔

امیر و غریب کا لحاظ اور تعصب سے مبرا
ہونا اور نیز ماتحتوں سے مساویانہ سلوک ہر کسی کے
بس کا نہیں ہے۔ یہ تمام اوصاف ہم امجد صاحب
میں بدرجۂ اتم پاتے ہیں۔ نوکروں کو ہم طعامی
کا مرتبہ دینا اپنی غذاؤں میں شریک بنانا، اپنے
اور اپنے مہمانوں کے ساتھ ان کو نہ بھولنا، انسانیت
و مساوات کا برتاؤ روا رکھنا آسان نہیں۔ فی زمانہ
ایسی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔

نیز ان کی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ احکام
دین سے ناواقفیت نہیں رہتی۔ اوقات نماز
وہ اور سب گھر والے کام کاج سے بے فکر ہو کر

ایک ساتھ صحت بتہ مصروف عبادت ہوتے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے لئے بھی نہ صرف نمونہ بلکہ ذوقِ عبادت کا موجب ہوتی ہے۔

مولوی امجد صاحب کو زندگی کے کسی شعبہ میں کسی کی محتاجی نہیں معلوم ہوتی۔ حتیٰ کہ ان کی پکوان کی مہارت کو بھی میں نے تعجب سے دیکھا ہے۔ عرصہ گزرا حضرت امجد نے ایک دفعہ مجھ سے بھی دریافت فرمایا تھا کہ "کیا میں پکانا جانتی ہوں؟" اور اس وقت میں اچھی طرح پکوان نہیں جانتی تھی چنانچہ میں نے کہا تھا کہ طریقوں سے واقف ہوں گر اجزا کا ابھی صحیح اندازہ نہیں ہے۔ اس پر تبسم ہوکر آپ نے فرمایا تھا پھر تمھیں پکانا کیا آیا!! اسی سے ان کی مہارت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی امجد صاحب کو میں نے جب کبھی جس اطمینان۔ صفائی اور سہولت کے ساتھ پکاتا ہوا دیکھا ہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کی دلچسپی اور خوبی کے ساتھ پکوان کی مصروفیت دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ اس میں بھی کس قدر سہولت و دلچسپی ممکن ہے۔ اور جن کو حضرت امجد کے ہاتھ کی پکی ہوئی چیزوں کے کھانے کا اتفاق ہوا ہے میں نہیں سمجھتی کہ وہ ان چیزوں کو بھول سکیں گے۔ ایسے ملنے والوں کی کمی نہیں جن کی خاطر حضرت امجد کو اب بھی منظور ہوتی ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے اسٹو پر قہوہ تیار کرکے تواضع کرتے ہیں۔

وہ مہمانوں کی خاطر کرکے خوش ہوتے ہیں۔ گر یہ حقیقت ہے کہ اسی قدر کھانے پینے سے انھیں بے رغبتی ہے۔ کسی کو اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہوگا۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ محض دوسروں کی خاطر یا گھر والوں کے اصرار اور بھوک و پیاس کی احتیاج سے وہ کھانے پر مجبور ہوتے ہیں ورنہ کھانے پینے کا عمل ان کے نزدیک حقیر تر۔ اور محض زندہ رہنے کے لئے ہے۔ ان کے کلام سے بھی اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اولاً غم ہے ایک روٹی کا
ذائقہ کے لئے ہے چٹنی دو
لعنت اللہ لعنت اللہ
پیٹ پر ایک اور زبان پہ سو

ایک اور قطعہ :-

جچتا ہے ہر ایک کی نظر میں
اچھا کپڑا بھی کیا برا ہے
کھا جاتے ہیں پیٹ سے زیادہ
اچھا کھانا بھی کیا برا ہے

حضرت امجد کو دیکھنا اور جاننا ہے تو ان کی تصانیف کا مطالعہ کافی ہے۔ حضرت امجد کی شخصیت کا تعلق ان کے کلام سے اور کلام کو ان کی ذات سے کچھ ایسی نسبت ہے کہ یہ ایک دوسرے سے کسی طرح جدا نہیں۔ مولوی امجد صاحب ان شاعروں میں نہیں جن کے ہاں صرف رنگین بیانی۔ صرف شاعرانہ تخیلات یا غلو ہو۔ حضرت امجد کا حال اس کے برعکس ہے۔ ان کا کلام ان کے پاکیزہ جذبات و خیالات کی حقیقی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ جب کسی چیز سے متاثر ہوتے ہیں تو فوراً رباعی کی شکل میں ان کے خیالات ڈھل جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی مختلف آیتوں کا مطالعہ ان پر ایک کیفیت طاری کردیتا ہے۔ اور اس کا تاثر الفاظ میں ادا اور منظوم ہوتا رہا ہے۔

مثال کے طور پر "لا تقنطو من رحمۃ اللہ" پر آپ کے
جذبات کس ندرت و جدت کے آئینہ دار ہیں
وہ پیش کئے جاتے ہیں :-

بے کس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب! تری رحمت کے بھروسے امجد
بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے

"فاذکرونی اذکرکم" (تم مجھے یاد کرو میں بھی تم کو یاد کروں) کو یوں بیان کیا ہے:

غم سے ترے اپنا دل نہ کیوں شاد کروں
جب تو سنتا ہے کیوں نہ فریاد کروں
میں یاد کروں تو تو مجھے یاد کرے
تو یاد کرے تو میں نہ کیوں یاد کروں

کلام امجد تمام کا تمام حضرت امجد کے نہ مٹنے والے تاثرات و مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس کا انتخاب آسان نہیں۔ ان کی ہر چیز خاص۔ اور ہر بیان خاص معنے و جذبہ کا حامل ہے جس طرح منظوم کلام ایک خاص تاثر رکھتا ہے اسی طرح نثر کا بھی خاص مقام ہے۔ ہر بات پر مضمون ایک سچائی اور حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر ہر گام پر پیش آنے والی چیزوں کو لیا اور بیان کیا گیا ہے۔ کسی میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات ہیں تو کوئی تفہیم و بصیرت سے پر ہے اور ان کی بعض کتابوں کا احوال کچھ اس قدر پر اثر ہے ہم اس میں غرق معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح "جمال امجد" میں آپ امجد کو اس قدر جلوہ گر دیکھیں گے گویا وہ ہم ہی میں موجود ہیں۔ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے اخلاق اور تصوف کی، بہت ساری معلومات ہمیں حاصل ہو جاتے ہیں۔ حضرت امجد کی کتابوں کا احوال اور کلام کے تاثرات کچھ ایسے سدا بہار ہیں کہ ان کے مطالعہ سے سیری نہیں ہوتی چند روز ہی کے وقفہ سے پھر مطالعہ سے وہی دلچسپی قائم اور سرور حاصل ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں کتنی ہی محفلیں حضرت امجد کے کلام سے رونق پاتی ہیں۔ شاعروں میں ان کا نام آجانا اس کی کامیابی کا ضامن ہوتا ہے اکثر دفعہ ہم حضرت امجد سے نئی چیزیں ان موقعوں پر نہیں سن سکتے کیونکہ وہ فرمائش پر لکھنے کے عادی نہیں مگر جو چیز بھی سنتے ہیں اس قدر با موقع ہوتی ہے کہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو محسوس ہوتی ہے۔ سننے والے متاثر و مسرور ہوئے بغیر نہیں رہتے ان کا بہت سا کلام سامعین پر کچھ اس طرح منطبق ہو جاتا ہے کہ خیال ہوتا ہے انہی کے لئے تو نہیں لکھا گیا۔ جیسے کہ

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

ایک اور رباعی ہے:

نادانی سے پہلے تو خطا کرتے ہیں
ہٹ کرکے اور بھی برا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گناہ ہو توبہ کرو
میلے کپڑے کو دھو لیا کرتے ہیں

دراصل حضرت امجد جس دربار کے شاعر ہیں جس ذات عالی سے ان کو نسبت ہے وہی جذبہ وہی درد ان کے کلام کی اصل شان اور اس کی روح ہے۔ "نذر امجد" اور "رباعیات امجد" اسی

لے سے معمور ہیں۔ یہی جذبۂ دروں دو سرد ں
لیے سراپا تاثیر بنا ہوا ہے۔ وہ خود مجسم عشق
سولؐ ہیں۔ ان کا کلام اس کا مظہر ہے یہاں
وقع پر صرف چند اشعار پر اکتفا کرتی ہوں گو
ہ اس جذبہ کے تحت سارا کلام معیاری،
لند ترین، ایک تڑپ اور سوز دروں کا حامل ہے

باللیل تارے زاں زلف پیچاں والشمس خا ہے روئے درخشاں
جسم خاکی نور مظہر اللہ اکبر اللہ اکبر
لے مہ لقائے شیریں ادا ئے برآب تیغت جانم فدا ئے
کن ذبح بازم گو بار دیگر اللہ اکبر اللہ اکبر

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

ل گیا صوتِ سرمدی میرے شکستہ ساز سے
نغمے کی آتی ہے صدا نوحۂ دل گداز سے

اب تو مری نظر میں ہے حسن ہی حسن ہر طرف
خلعتِ عشق مل گیا بارگہِ حجاز سے

صل عمر مل گیا، قلب فسردہ کھل گیا
گئی زندگی میں جاں ان کی نگاہِ ناز سے

برسوں کے بچھڑے مل گئے داغ دلوں کے دھل گئے
لپٹی ہے ان کی خاک پا میرے سرِ نیاز سے

حالتِ وجد و ذوق میں دل سے یہ کہہ رہا ہے رو
ہم نے ملا دیا تجھے تیرے چارہ ساز سے

امجدِ نیم جاں کی جان رقص نہ کیوں کرے یہاں
ربطِ روح بھر گیا نغمۂ دل نواز سے

اور جب ان کا تعلق اپنے رب سے قائم ہوتا
ہے تو خدا کے سوا کوئی ان کا مقصود معلوم نہیں
ہوتا اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے
ان کے کلام میں دیکھیے۔

مر مر کے لحد میں نے جا پائی ہے
یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے

آ! اے مرے منہ چھپانے والے آجا
خلوت ہے، شبِ تار ہے۔ تنہائی ہے

زنجیرِ درِ عرش ہلاتا ہوں میں
اللہ غنی کہہ کے بلاتا ہوں میں

سجدے کے بہانے دل کی بیتابی سے
قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں

---

اختصار کے خیال سے اب میں صرف
ایک اور غیر مطبوعہ چیز جو کچھ عرصہ ہوا مجھے ملی
تھی پیش کرتی ہوں ؎

مولا کھولو نا کواڑ
میں ہوں ڈیوڑھی پر کھڑی
اللہ دیو نا مراد
میں ہوں چوکھٹ پر پڑی

بدلی آندھی، کڑکا، بجلی، بارش موسلا دھار
چاروں طرف سے مجھ دکھیا پر ہے بپتا کی مار

مولا کھولو نا کواڑ
میں ہوں ڈیوڑھی پر کھڑی
اللہ دیو نا مراد
میں ہوں چوکھٹ پر پڑی

اپنا پرایا کوئی نہیں ہے سب نے چھوڑا ساتھ
اپنی دیا سے جنم جلی کو پاس بلا لو ناتھ

مولا کھولو نا کواڑ
میں ہوں ڈیوڑھی پر کھڑی
اللہ دیو نا مراد
میں ہوں چوکھٹ پہ پڑی

کھول کے پر اس طائرِ جاں کو کردو اب آزاد
قیدِ حیات میں رکھو گے کب تک امجدؔ کو ناشاد
مولا کھولو نا کواڑ
میں ہوں ڈیوڑھی پہ کھڑی
اللہ دیونا مراد
میں ہوں چوکھٹ پہ پڑی

حضرت امجدؔ کے متعلق صرف اس قدر کہنا ہے کہ ہم جس قدر زیادہ ان سے واقف ہوتے ہیں ہم پر زیادہ سے زیادہ ان کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ ہیں پاک باطن، پاک طینت، جذبۂ دروں کے حامل خرافت وانسانیت سے معمور ہی نظر آتے ہیں۔

دعا ہے کہ امجدؔ کی سادہ زندگی بے نیازی، قناعت، انسانیت دوستی اور اپنے رب وہادی برحق سے ان کا تعلق ہم سب کے لئے نمونۂ عمل بنے اور اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے؛ آمین۔

حفیظہ جمال (مسز برہان الدین)

# ادارۂ ادبیات اردو کی چند مطبوعات

**تاریخ گولکنڈہ** از پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ سلاطین قطب شاہیہ کی مستند اور مبسوط تاریخ۔ گولکنڈہ اور آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات۔ دکن کا تمدنی ارتقا۔ بادشاہوں اور امیروں کے حالات۔ علم وفضل کی سرپرستی۔ دوسرا ایڈیشن زیر ترتیب وطبع

**ہندوستانی قومیت کا مسئلہ** از ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا۔ سیاست اور تمدن کی بحثوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بے حد مفید۔ صفحات (۸۲)۔ قیمت ۱۲؎۔

**یورپ جنگ سے پہلے** از پروفیسر ہارون خان شروانی۔ جنگ سے قبل کے یورپ کے پیچیدہ حالات اور رجحانات دلآویز پیرایے میں بالتصویر۔ صفحات ۲۱۸۔ قیمت سے

**اسلامی عدل گستری** از محمد عبدالحفیظ صاحب صدیقی۔ دس ابواب کے تحت اسلامی تصور قانون اور طریقۂ عدل پر نظر ڈالی گئی ہے۔ صفحات (۹۶)۔ قیمت ۸؎

**آریائی زبانیں** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ اردو زبان میں اپنے موضوع پر واحد کتاب۔ قیمت ۸؎

**تذکرہ اردو مخطوطات** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ ادارۂ ادبیات اردو اب تک جو قلمی کتابیں محفوظ ہوچکی ہیں ان میں سے صرف (۲۷۵) مخطوطات کا تفصیلی تذکرہ۔ (۵۰۰) سے زیادہ ارباب علم اور کتب وآثار قدیمہ زیر بحث رہے ہیں۔ قیمت پانچ روپے۔

**تذکرہ مخطوطات جلد دوم** از ڈاکٹر زور۔ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو کے پانچ سو عربی، فارسی، اردو اور ہندی قلمی کتابوں کا تذکرہ۔ صفحات (۱۸۰) قیمت پانچ روپے۔

**رات کا بھولا اور دیگر افسانے** پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کے افسانوں کا مجموعہ۔ (دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

**من کی دنیا** رشید قریشی کے افسانوں کا مجموعہ۔ صفحات (۱۶۰)۔ قیمت مجلد ایک روپیہ۔

**فہرست مطبوعات ادارہ** ادارہ کے کتب خانہ مطبوعات کا فن وار تذکرہ مرتبہ اکبر الدین صدیقی صاحب و غلام رسول صاحب۔ صفحات (۳۰۰)۔ قیمت تین روپے۔

# امجد — اپنے کلام کی روشنی میں

مخلوق خالق کا پرتو ہے تو فن اپنے فنکار کی معراج کمال ہے۔ اس طرح شاعری شاعر کی ایک ایسی زندۂ جاوید تصویر ہے جس میں وہ اپنے خد و خال کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت کے مختلف پہلو اس کے اپنے انداز میں پوری توانائیوں کے ساتھ اشعار کے قالب میں ڈھل کر ایک لازوال زندگی کا روپ دھارتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور شاعری ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔ ہر بڑا شاعر، ادیب اور فنکار ازلی اور فطری ہوتا ہے۔ اس کا شعور اور احساسات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ زندگی اور اس کے تمام لوازمات کا بہت قریب سے مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے تاثرات کو جن سے وہ متاثر ہوتا ہے اپنے اندر اس شدت کے ساتھ سمو لیتا ہے کہ جب ان کو اشعار کے قالب میں الفاظ کا جامہ پہناتا ہے تو ان میں زندگی کی تڑپ آجاتی ہے اور یہ تڑپ دوسروں کو تڑپا دیتی ہے۔ یہی دراصل شعر کی قدر و قیمت ہے۔

دکن کی مردم خیز سرزمین شروع ہی سے اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے جس میں ولی اور سراج جیسے باکمال شاعروں نے جنم لیا اور آسمان شاعری کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئے۔ امجد نے دکن کے صوفی شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی دنیا میں ایک انفرادی اور نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ تصوف کے پیچیدہ مسائل کو رباعی کے ذریعہ سے اس طرح زود فہم اور آسان بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا عرش کی باتیں زمین والوں کے گوش گزار کی جا رہی ہیں۔ یہی ان کے کمال کی خوبی ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیات میں قرآن و حدیث کی روح کو اس طرح جذب کیا ہے کہ ہر رباعی قرآن و حدیث کے مطالب کی شاعرانہ تفسیر بن جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض رباعیات انسانی زندگی کے جیتے جاگتے مرقع معلوم ہوتے ہیں جن میں زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ادب کا کمال یہی ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیال کو سلیس انداز میں بے ساختہ پن کے ساتھ ادا کریں۔ یہ ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ وہی تصنیف زیادہ مقبولیت حاصل کرتی ہے جس میں بلند خیالی کے ساتھ ساتھ بے ساختگی بھی ہو۔ حضرت امجد کی رباعیات کے متعلق ارباب قلم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس کا نچوڑ یہ ہے کہ انھوں نے شعر اسی وقت کہا ہے جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔

وہ اپنے دل کی وجدانی کیفیت سے بے قابو ہو کر بغیر
کسی تصنع اور مبالغہ کے شعر کہہ دیتے ہیں جس کا اعتراف
وہ خود کرتے ہیں ؎

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبار فن خوب کہا
لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

ان کے کلام میں جابجا بجلی سی کوندتی نظر آتی ہے جو اہل بصیرت کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ کسی نے آپ کے کلام کے متعلق لکھا ہے "گویا کہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے" آپ کی طبیعت کی استقامت کا اس سے اظہار ہوتا ہے کہ آپ نے ہمیشہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہا ہے۔ کبھی آپ نے زہر ہلاہل کو قند نہیں کہا صرف وہی کہتے جس کو حق سمجھتے ہیں۔ تصنع اور مبالغہ اشعار میں جادو کی تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ لیکن بغیر بناوٹ کے شعر کہنا جتنا مشکل ہے اس سے زیادہ مشکل اس کو پر اثر بنانا ہے لیکن امجد کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ نے سادگی کے ساتھ پرکاری کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی کمال فن ہے۔

حضرت امجد کی شاعری مراقبہ ہے جس کی ہر فکر میں باب معرفت کھلتا ہے۔ تصوف کے مرحلے طے کرتے ہوئے وہ حقیقت میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔ راہ سلوک کے مختلف مدارج، ان کے مسائل اور راہ کی دشواریاں کا آپ نے اپنی شاعری میں پرچار کیا ہے ؎

ہر مرتبہ آئینۂ دل دھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر فکر میں باب معرفت کھلتا ہے

حضرت امجد چاہتے ہیں کہ ان کے اشعار سامعین صرف خوش ہی نہ ہوں بلکہ تڑپ جائیں۔ اس لحاظ سے آپ کی شاعری سودا کی طرح "واہ" نہیں بلکہ میر کی طرح "آہ" ہے ؎

لازم ہے کہ آہ بھی دل سے نکلے
اک واہ ہی شاعری کا مقصود نہیں

امجد کے کلام میں کہیں تصوف کا رنگ ہے تو کہیں فلسفہ کی جھلک ہے۔ کہیں درد و غم ہے کہیں پند و نصائح۔ درد کے کلام میں جس طرح خا
تصوف ملتا ہے اسی طرح امجد کو بھی ہم خالص صوفی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کا یہی جذبہ نظم و نثر، قطعہ اور رباعیات میں کارفرما ہے۔ وہ درد کے ہم جانشین کہے جا سکتے ہیں۔

کلام میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے درد کی ہے اور ایک مسلسل تڑپ کی۔ امجد کو خدا نے در کی نعمت بڑی فیاضی سے دی ہے۔ طغیانی کا حاد جس میں ان کے اہل و عیال کی تباہی ہوئی ان زندگی کا سانحۂ عظیم ہے جس کی وجہ سے ان کی روح ہمیشہ کے لئے نیم بسمل ہو گئی جو خود تڑپ کر دوسروں کو بھی تڑپا گئی۔ اسی تڑپ نے ان کے فن کو نکھار دیا جو آج ہزاروں دواؤں کا درماں بن کر حقیقت کے راہ رووں کی رہنمائی کر رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ خدا انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور خصوصیت سے دل کو "خانۂ خدا" کہا جاتا ہے۔ امجد نے اپنی نازک بیانی اور معنی آفرینی کا ایسا بہترین مرقع پیش کیا ہے کہ بے اختیار تعریف نکل جاتی ہے۔ چونکہ انسان اشرف المخلوقات اور نائب خ

ہے۔ اس لئے شاعر کہتا ہے کہ خالق کی جھلک مخلوق میں ہویدا ہے۔ وہ بڑے ہی انوکھے انداز میں کہتے ہیں کہ خدا نے بندے کو اپنا ٹھیک پتہ تو نہیں بتایا۔ دل جو ہر وقت دھڑکتا ہے اس کی دھڑکن آہٹ سے بہت مشابہ ہے۔ اس آہٹ سے چونک کر وہ شاعرانہ تجاہل عارفانہ سے پکار اٹھتا ہے ؎

کچھ اپنا پتہ اس نے بتایا تو نہیں
اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہوئی ہے دل کی دھڑکن آہٹ سے
دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں

قائم چاند پوری نے بھی ایسے ہی خیال کا اظہار کیا ہے ؎

کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اسی کی تشریح ہم کو "دل بدست آور کہ حج اکبر است" میں ملتی ہے۔ اسی لئے تصوف کے مسلک میں دل کو خانۂ خدا کہا جاتا ہے۔

امجد جبر و قدر، تسلیم و رضا کے مسئلے کے بڑے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر شئے کی ابتداء اور انتہا خدا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی کشتی کا ناخدا خدا ہے۔ وہ چاہے تو ساحل مراد پر بھی پہنچا دیتا ہے اور چاہے تو بھنور میں غرقاب بھی کر دیتا ہے۔ اس استدلال کے تحت وہ خدا کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کر پکار اٹھتے ہیں ؎

طوفان میں ہے کشتیٔ امید مری
لے تو ہی سنبھال ہاتھ اٹھایا میں نے

دوسرے الفاظ میں امجد کا یہی مطلب ہے ؎

کشتی کو خدا پر چھوڑ بھی دے کشتی کا خدا خود حافظ ہے
ممکن تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آ جائے

امجد وحدت الوجود کے مسئلے کو بھی بڑی سلاست و روانی کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔ کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ چشم بصیرت رکھنے والوں کے لئے خدا کا جلوہ ہر شئے میں موجود ہے اور تمام اشیاء اسی کے وجود کی غمازی کرتی ہیں۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک اور قطرہ سے لے کر دریا تک خدائے بزرگ کی وحدت کا ثبوت دیتے ہیں۔ امجد کے نزدیک دنیا کی ہر شئے معرفت کردگار کا ایک دفتر ہے۔ اسی ایقان پر وہ کہتے ہیں ؎

ذرہ، ذرہ میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں ہے شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

اگر کسی انسان میں آنکھوں کی بینائی ہے لیکن دل کی بینائی نہیں ہے تو وہ کسی شئے کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے گا۔ صرف سطحی اور ظاہری نمود و نمائش کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا۔ دیدۂ بینا، ذرہ میں آفتاب اور قطرہ میں دریا دیکھ لیتا ہے لیکن کور دیدہ آفتاب کو بھی دیکھ کر کچھ نہیں سمجھ سکتا ؎

ہر قطرہ میں بحر معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشم بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

امجد کے پاس ہم کو اکبر الہ آبادی کی طرح طنز بھی ملتا ہے۔ وہ کم ظرفوں پر چوٹ کر کے کہتے ہیں۔ جب

ان لوگوں کو دنیوی دولت مل جاتی ہے تو اترانے لگتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ سمجھنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں کہ دنیوی دولت و اقبال مندی تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ انسان کو کبھی اس پر مغرور نہیں ہونا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ صرف اس کے ظرف کے امتحان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو عارضی طور پر دیا ہے جو چند روزہ ہے۔ انسان نہ تو دنیا میں آتے وقت کچھ ساتھ لاتا ہے اور نہ جاتے وقت ..... ....... کچھ لے جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کے نظام کا دار و مدار ہی تغیر پر ہے۔ ہر غم کے بعد خوشی اور ہر خوشی کے بعد غم، ہر شام کے بعد سحر اور ہر سحر کے بعد شام ہونا لازمی اور اٹل ہے جس کی زندہ شہادت تاریخ ہے جو ہر ایک کے عروج کے ساتھ زوال کی بھی روئیداد پیش کرتی ہے جو اہل بصیرت اور اعلیٰ ظرف والوں کے لئے چشم عبرت ثابت ہوتی ہے کیونکہ قادر مطلق کو نہ تو کچھ دینے کے لئے دیر ہے اور نہ کچھ چھیننے کے لئے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے وتعز من تشاء و تذل من تشاء۔ خدا خود فرماتا ہے کہ انسان کچھ سوچتا ہے اور خدا کچھ۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوشش نہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ سعی مسلسل کو جاری رکھیں۔ اس کے بعد جس کو خدا جو مناسب سمجھتا ہے دیتا ہے۔ امجد انسان کو وسیع النظری سے کام لینے کی تلقین کرتے ہیں ؎

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے

کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

انسان کی آزادی، بے بسی، مختاری اور مجبوری کو جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ امجد ہی کا حصہ ہے ؎

پابند کیا قید نفس میں رکھ کر
بے بس کیا مجھ کو اپنے بس میں رکھ کر
صیاد کی صید پروری تو دیکھو
گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ کر

میر نے بھی اس بارے میں خدا سے احتجاج کیا ہے اور جبر و قدر کے مسئلہ کو واضح کیا ہے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

غالب نے اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کیا ہے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

امجد اقبال کے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کی طرح خدا سے سوال کر کے اس کا جواب بھی خود ہی دیتے ہیں۔ خدا سے وہ شکایت کرتے ہیں کہ اے خدا کیا بات ہے تو انسان سے اتنا قریب رہتے ہوئے بھی اس سے دور رہتا ہے۔ اس پر خدا جواب دیتا ہے خدا تو انسان کے ساتھ ہے لیکن انسان خدا کے ساتھ نہیں ہے۔ امجد سوال کرتے ہیں ؎

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں
باہم کوئی گفتگو نہیں بات نہیں
تو مجھ سے قریب تر میں تجھ سے نزدیک
کیا بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں

اس کا جواب خدائے بزرگ و برتر کی جانب سے

یوں لگتا ہے۔ جس طرح دن کے وقت تارے تو آسمان پر موجود ہوتے ہیں لیکن سورج کی چکا چوند کر دینے والی روشنی میں مدھم پڑ جاتے ہیں جن کو انسان کی کمزور آنکھیں دیکھ نہیں پاتی ہیں۔ یہ قصور انسان کی بینائی کا ہے تاروں کا نہیں۔ خدا اس طرح جواب دیتا ہے ؎

بدلی چھائی ہوئی ہے برسات نہیں
تارے نکلے تو ہیں مگر رات نہیں
کچھ اس کا سبب بھی تو نے سمجھا امجد
میں ہوں ترے ساتھ تو مرے ساتھ نہیں

امجد کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی جستجوئے مقصود ہے ؎

کیا تم کو بتاؤں زندگی کا مقصد
مقصد زیست جستجوئے مقصود

صوفی امجد کے نزدیک زندگی کا مقصد خدا کو پا جانا ہے وہ خدا رس اور صاحب باطن ہیں۔ ان کو خدا کے مقابلے میں اپنی کمتری کا احساس ہے۔ وہ منصور رح کی طرح "انا الحق" نہ کہہ سکے۔ امجد کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مخلوق کو خالق کا ایک جز سمجھتے ہیں اور ان کو اس بات کا ایقان ہے کہ ہر جز کا ایک نہ ایک دن اپنے کل میں مل جانا ضروری ہے۔ وہ خدا میں گم ہو جانا چاہتے ہیں۔ شاید ان کا مطمح نظر یہی ہے ؎

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

سالک کو راہ سلوک میں بڑی بڑی صبر آزما اور کٹھن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ طالب کو مطلوب تک اور ساجد کو مسجود تک پہنچنے کے لئے کبھی تو اس کو صبر ایوب کرنا پڑتا تو کبھی گریۂ یعقوب سے کام لینا پڑتا ہے مختصر یہ کہ خدا تک پہنچنا آسان کام نہیں۔ وہ ہر طرح سے بندہ کا امتحان لیتا ہے کہ وہ کہاں تک صادق ہے۔ دنیا میں اپنے عزیز بندہ کو خدا تکالیف میں مبتلا کرتا ہے اور آزماتا ہے۔ اس کڑی منزل میں وہ ثابت قدم ہے تو پھر خود آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اظہار امجد نے نہایت لطیف پیرائے میں کیا ہے ؎

جی اس کا بھی بھر آیا رلا کر مجھ کو
ٹھنڈا نہ رہا خود بھی جلا کر مجھ کو

امجد کو اس وقت خدا مل جاتا ہے جبکہ وہ پے در پے اپنے معبود حقیقی کے راستہ میں ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے گامزن رہتے ہیں اور پائے استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تب بندہ کو مٹا کر، اس کو جلا کر مختلف طریقوں سے اذیتیں دینے کے بعد تب اپنے عبد پر مہربان ہو جاتا ہے۔
یہی ہے ہر صوفی، زاہد و عابد کی فتح حقیقی۔

فضیلت انسان کے موضوع پر اکثر شعراء نے طبع آزمائی کی ہے لیکن حضرت امجد نے اس کے اظہار کیلئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے ؎

اس سینے میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

شاعر نے انسان کو تمام مخلوقات سے ممیز کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت صرف انسان ہی کو عطا ہوئی ہے۔ اسی لئے وہ اشرف المخلوقات ہے اور نائب خدا کہا گیا ہے۔ ایک کامل اور اکمل انسان کا ظرف اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے بھید دل کو چھپائے رکھتا ہے اور اس طرح اپنے دل کی دنیا میں خدا کی پوری کائنات کو پوشیدہ رکھتا ہے۔ اس طرح وہ

خدا پر اپنا احسان جتا رہا ہے۔ کیونکہ بندہ کو پیدا کر کے معبود خود آشکار ہو گیا۔

اقبال نے بھی بنی نوع انسان کی اس بزرگی کا اعتراف کیا ہے ؎

اے یہ تو نے کیا کیا، مجھ کو ہی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

امجد کے کلام میں یوں تو عام طور پر تصوفانہ رنگ چھایا ہوا ہے لیکن بعض مقامات پر انھوں نے اولوالعزمی اور بلند پردازی کی تلقین کی ہے اور وہ انسان کو زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ ان کا رنگ اقبال کے پیام عمل سے بہت مشابہ معلوم ہوتا ہے ؎

اے قطرۂ آب بے بہا دریا ہو جا
اے طائر روح مرغ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر
اے تودۂ خاک اٹھ بگولا ہو جا

بہر حال امجد کا کلام بہ حیثیت مجموعی ایک طرف تو راہ سلوک کے رہروؤں کی رہنمائی کرتا ہے تو دوسری طرف زبان و ادب کی سنجیدہ اور بے لوث خدمت! امجد کی انفرادیت و خصوصیت ان کا صوفیانہ انداز ہے جو ان کے پورے کلام میں ہر جگہ کسی نہ کسی روپ میں جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری کے پر اثر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی فطری صلاحیت و مذاق کے مطابق دریائے معرفت کی پہنائیوں کو اپنی حقیقت پسندانہ شاعری کے کوزہ میں بند کیا ہے جو سب کیلئے تازیانۂ عبرت ہے! لیکن راہِ حق کے رہرووں کے لئے گنجینۂ حقیقت ہے! بہر حال اس قحط الرجال زمانے میں حقیقت کے میر کارواں بن کر امجد نے دکن کے شعرا کی لاج رکھ لی!!!

خالدہ یوسف

# حضرت امجد کی تصنیفات

ریاض امجد حصہ اول و دوم قیمت فی حصہ ایک روپیہ
خرقۂ امجد ایک روپیہ چار آنے
حج امجد تین روپے
میاں بیوی کی کہانی آٹھ آنے
حکایات امجد ایک روپیہ چار آنے
پیام امجد دو روپے آٹھ آنے

رباعیات امجد حصہ اول و دوم قیمت فی حصہ عہر
نذرِ امجد چھ آنے
جمالِ امجد چار روپے
ایوب کی کہانی آٹھ آنے
گلستان امجد تین روپے

یہ کتابیں راست حضرت امجد آغا پورہ قریب چار قندیل سے حاصل کی جاسکتی ہیں یا سب رس کتاب گھر کو آرڈر بھیج سکتے ہیں۔



مشاعرہ جشن الماسی میں حضرت جگر مرادآبادی غزل پڑھ رہے ہیں



ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور معتمد ادارہ ادبیات اردو سپاسنامہ پڑھ رہے ہیں



افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق ۔ حضرت امجد ۔ حضرت شاہد ۔ پروفیسر سروری ۔
حضرت حکیم آزاد انصاری ۔ نقابت راکھو الد ر را و حد ب



راجہ محمد الدین صاحب شاہد جلسہ کو مخاطب کر رہے ہیں ۔ شہ نشین پر صغرا ہمایوں مرزا ۔ حضرت
وس محمد اسد اللہ ۔ ڈاکٹر داطر یار جنگ ۔ بی ۔ ہلمدت را وق لای بدستو ۔ پروفیسر ہدلب الوحد
اور حضرت ع۔ س ملسدانی

# امجد بحیثیت رباعی گو شاعر

تاریخ ادب اردو کا یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو شاعری کی ہر صنف کا سنگ بنیاد دکن کی سرزمین پر رکھا گیا اور پھر ع

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے

کے مصداق چمنستانِ ادب کے خوشہ چینوں نے ان کو اپنا کر ترقی و عروج کی آخری منزلوں تک پہنچایا اور سرزمین دکن کے لئے یہ امر باعث افتخار ہے کہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اسی خطۂ ارض پر آنکھیں کھولیں۔ صدیوں سے اسی جادۂ منزل پر گامزن اردو ادب آج اپنی معراج پر نظر آرہا ہے۔ صنف رباعی کے ایک بڑے فن کار کو دکن ہی نے جنم دیا۔ جن سے کائناتِ ادب سید احمد حسین امجد کے نام سے متعارف ہے۔ دیدۂ نرگس کے صدہا سال کے گریہ نے جس اہل بصیرت کی تخلیق کی اس کے متعلق مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ یوں رقمطراز ہیں: "حضرت امجد ہندوستان کے ان شعراء میں ہیں جن کو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے"

فارسی ادب میں خواجہ عبداللہ انصاری، خیام، ابوسعید ابوالخیر اور سرمد کا نام جریدۂ عالم پر رباعی گو شعراء کی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو چکا ہے لیکن اردو ادب باوجود کوشش و کاوش کے ان کا ہمسر پیدا کرنے سے قاصر تھا مگر آج بقول حضرت غلام قادر گرامی مرحوم حضرت امجد نے اس کمی کا ازالہ اپنے خامۂ گوہربار سے کر دیا ہے؎

امجد بہ رباعی است فرد امجد
کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز
روح سرمد بگفت امجد امجد

زندگی کے چالیس دن گزرنے نہ پائے تھے کہ حضرت امجد محبت پدری سے محروم ہو گئے۔ بے کس، بے سہارا ماں نے موصوف کو پروان چڑھایا۔ انتہائی عسرت میں بسر ہوتی تھی۔ دوسری شخصیت ہوتی تو شاید بغاوت بھی ساتھ ساتھ پرورش پاتی مگر حضرت امجد کا ماحول رضائے الٰہی سے ایک انچ ہٹنے اور مجال دم زدن کو گناہ تصور کرتا تھا۔ ان کی زندگی اس ورثہ کو سنبھالے رواں دواں تھی پھر وہ دور بھی آیا کہ حضرت امجد کے دوش پر گراں بار ذمہ داریاں عائد ہوئیں۔ طوق سنت پیمبری زیب گلو ہو گیا اور چند دنوں بعد رفیقۂ حیات کی پیشانی تخلیق کے نور سے جگمگانے لگی۔ زندگی کے ان ہنگاموں میں بھی مشق سخن جاری رہی جس سے آج ہم محروم ہیں۔ کیونکہ بڑا ہوا استداد زمانہ کا کہ طغیانی کی محشر آفرینی نے حضرت امجد سے نہ صرف تمام افراد خاندان کو چھین لیا

بلکہ ان کا سارا سرمایۂ سخن بھی دریا برد ہو گیا۔ اس حادثۂ جانکاہ نے انھیں ایک زبردست دھکا پہنچایا۔ اس کے بعد وہ چھ سال تک تجرد کی زندگی گزارتے رہے اور عقد ثانی سے زندگی کا نیا باب شروع کیا۔ "غم جاناں" ختم ہوا تو "غم روزگار" کی گرفت تنگ ہونے لگی اور آخر کار یہ رفیقۂ حیات بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ زندگی کے ان مسلسل حادثات کا اس مادی دنیا، اس کے علایق سے گریز اور مذہب اور اس کائنات ماوراء کی طرف متوجہ کرنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ اس رباعی میں حضرت امجد اعتراف کرتے نظر آتے ہیں ؎

ٹوٹا ہوا دل یادِ خدا کرتا ہے
عاشق ہی ادائے ناز پر مرتا ہے
رہتا ہے دل شکستہ میں عرش نشیں
یہ جام عجب ہے ٹوٹ کر بھرتا ہے

ان واقعات کی وجہ سے ان کی طبیعت میں رچا ہوا تصوف اور بھی گہرا ہو گیا۔ اس رنگ کو اور گہرا ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ انسانی زندگی ہو یا قوموں کی حیات، زوال و کمزور لمحات کے وقت تصوف ہی دھیر بندھتا ہے۔ اور تصوف کا عروج دورِ انحطاط ہی کی یادگار ہے جب کہ خلافت عباسیہ سسک سسک کر دم توڑ رہی تھی اور ایرانی علوم کے احیاء کو کفر سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔ اس وقت صوفیوں نے افلاطون کی منطق کو اپنایا جس نے زندگی کو حرکت سے عاری بتلایا ہے۔ پھر ترکوں کے حملے نے تو زندگی کے اعتماد کو بالکل ہی چھین لیا چنانچہ اس دور کے شعراء نے ان ہی خارجی قدروں کے پس منظر میں تصوف کی داخلی قدروں اور الٰہیات کے مابعد الطبیعیاتی نظریات کے ساتھ اپنی شخصیتوں کو متوازی کر کے حقیقت کے ادراک کا آلۂ کار فہم و شعور کے بجائے وجدان کو بنایا اور وجدان نے حقیقت کے پردے میں مجاز کی باتیں منظر عام پر لانا شروع کر دیں اس لئے کہ انسانی شعور کے لئے مجاز کا محاسبہ کرنا زیادہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے اور بقول ممتاز حسین "یہ ہماری شاعری کا ابتدائی فریب ہے جس سے اور بھی فریب کی اور بھی راہیں پھوٹتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس حقیقت کو ایک ایسے خواب کی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے جو شعور کی حدوں پہ کچھ دھوؤں کی طرح اڑتا ہوا نظر آئے اور یہ وہ برتر شعور تھا جو مجاز کی گردن میں اخلاقیات کا طوق بنا رہا۔ ماورائی شعور ایک آدھ صوفی شاعر میں ضرور رہا ہے لیکن زیادہ شعراء کے یہاں تصوف اسلام اور شریعت سے بغاوت کرنے کا ایک بہت ہی آسان نسخہ بن گیا اور وہ بغاوت کا جذبہ جو اسلامی معاشرت اور جاگیردارانہ نظام کے ماتحت رہا تھا۔ کسی نہ کسی شکل میں ہماری شاعری کا بہت بڑا استون بنا رہا اور جس طرح ہمارا جاگیردارانہ نظام مختلف نشیب و فراز سے گزرتا رہا ہے۔ یہ جذباتی انقلاب بھی تخریب، آرزوئے موت یا فریب زندگی کے راستوں پر چلتا رہا ہے۔ ممکن ہے یہ ردعمل کسی زبردست انقلابی سماج کے موقع پر کوئی نئی شکل اختیار کر لیتا۔ اگر تصوف نے اس انتشار اور تخریب کو فلسفۂ الٰہیات میں اس طرح حل نہ کر لیا ہوتا کہ وہ اسلام کا جزو بن سکیں۔"[1]

یہ تو مسلم ہے کہ اردو ادب ایرانی ادب سے متاثر ہوا اور اس کی ساری روایات اردو ادب میں منتقل ہوئیں اور جتنے رباعی گو شاعر گزرے ہیں۔ ان میں بجز خیام کے سب کے سب صوفی مشرب تھے۔ ایک تو افتاد طبع،

---

[1] نقد حیات از ممتاز حسین صفحہ ۱۳۳

دوسرے حیدرآباد کے جاگیردارانہ ماحول کا اثر اور اس پر روایاتی تقلید نے حضرت امجد کے افکار کو صوفیانہ رنگ کا بہترین مظہر بنادیا ہے اور آج ہم ان کی رباعیات کے بیشتر حصے کو سرتاپا تصوف سے لبریز پاتے ہیں۔ اس کے سوائے اخلاق و مذہب اور کچھ لطیف سی شوخی بھی ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تصوف کے نظریات میں "عشق" اور "ہمہ اوست" کے نظریے نے ایشیا کے ادب میں انسان دوستی کی روایات کو تازہ کیا۔ اور مذہبی تفریق کو دور کرکے دیر و حرم کے تنازعات کو مٹادیا گو کہ برہمنیت کے دعویدار' شریعت کے ناخدا' برابر اس پر حملے کرتے رہے۔ اسی اثر کے تحت غالب کہتے ہیں ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

عشق، ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے مسائل کو حضرت امجد نے جس خوبی سے بیان کیا ہے اس کی توضیح کے لئے چند رباعیات ہدیۂ قارئین کی جارہی ہیں ؎

ذرہ ذرہ میں ہے خدائی دیکھو
ہر بت میں ہے شان کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

---

حسن مطلق مقید طور نہیں
خورشید کا عالم میں کہاں نور نہیں
مخلوق سے کچھ الگ نہیں ہے خالق
معنی کا وجود لفظ سے دور نہیں

اس جذبۂ عشق کو جو اردو اور فارسی ادب کا سرمایہ ہے اور جسے صوفی شعراء وجہ تخلیق کائنات کہتے ہیں حضرت امجد نے اس ایک رباعی میں سمونے کی کوشش کی ہے ؎

دریائے محبت ہے سفینہ میرا
ہے حسن کی خاتم پہ نگینہ میرا
روشن ہے چراغ عشق سے کعبۂ دل
معمور ہے نور سے مدینہ میرا

اسی عشق کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ شاعر کو اصنام کی پرستش بھی اپنے ہی معبود کا کرشمہ نظر آیا ہے اور وہ اس کی مذمت کے بجائے اس تک رسائی کا ذریعہ سمجھ کر کہہ اٹھتے ہیں ؎

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے
اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

مظاہر قدرت سے شان خداوندی کے اظہار کا ذکر ہر شاعر کے ہاں ملتا ہے۔ کسی کو "برگ درختان سبز" میں "دفتر معرفت کردگار" نظر آیا۔ کسی کو ذرہ ذرہ میں "جمال کبریا" کی جھلک دکھائی دی لیکن حضرت امجد کہتے ہیں صحرا و چمن، ارض و سما دیکھنے سے کیا حاصل، مخلوق کا مطالعہ خالق کی صفت کی معراج کو ثابت کرے گا۔ مظاہر کو دیکھنا جلد کو دیکھنے کے مماثل ہے۔ قرآن کے عمق میں غواصی کرو تو خالق کی نیرنگی خود ناظر کو "وجود خالق" کا قائل کردیگی ؎

ہر وقت فضائے دلکشا دیکھتے ہو
صحرا و چمن، ارض و سما دیکھتے ہو
مخلوق میں نیرنگیٔ خالق دیکھو
قرآن پڑھو جلد کو کیا دیکھتے ہو

منصور کو "دعوئے اناالحق" تھا۔ مدعیانِ معرفت

کے لئے یہ "نعرۂ حق" جہالت کی دلیل سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس منزل پر پہنچنے کی ضرورت ہے کہنے کی نہیں۔ اظہارِ پختگی بطلان ہوتا ہے ؎

ہے نام کے ساتھ ساتھ بدنامی بھی
ہے کام کے ہمرکاب ناکامی بھی
عرفان کا دعویٰ ہے جہالت کی دلیل
اظہار میں پختگی کے ہے خامی بھی

لیکن مسائلِ تصوف کا دوسرا پہلو "ہمہ از اوست" اور "بیخودی" ہے جو ارتقاء اور زندگی کی ابھرتی ہوئی قدروں کی نفی کرتا ہے۔ جہاں "ہمہ اوست" کے تحت ایک صوفی مشرب شاعر دنیا کو بلا لحاظ مذہب و ملت انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ وہیں "ہمہ از اوست" کے زیر اثر انسانی ذہن کو "نفیٔ حیات" بے ثباتی دنیا اور فریب زندگی کی طرف متوجہ کرتا ہے اور جب زوال پسند نظام کی دشمنی خود اپنے آپ کو مٹا دینے پر اصرار کرتی ہے تو یہ جذبہ اپنی پوری قوت سے ابھر آتا ہے۔ چنانچہ غالب نے اس مسئلہ کی توجیہہ اپنے اس شعر میں کی ہے ؎

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

حضرت آمجد دنیا کو بے ثبات قرار دے کر ہمارے ذہن کو مابعد الطبعیات کی طرف اس طریقہ سے متوجہ کرتے ہیں ؎

دنیا والو! ثبات دنیا میں نہیں
یک لحظہ قرار موج دریا میں نہیں
عالم کا وجود صورت "لا" سمجھو
لفظاً موجود اور معنی میں نہیں

دنیاست ہمہ سراب آثار غلط
ایں نقش و نگار ہست صد بار غلط
مطلب مطلب زکار گاہِ عالم
کایں نسخۂ خوش خط است بسیار غلط

مسئلہ جبر و قدر کی نازک گتھیوں کو میر نے ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

کہہ کر ادق بنا دیا تھا اور حضرت آمجد اس پر یوں صاد فرماتے ہیں ؎

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا ہوا خدا کی مرضی
آمجد اسرار میں کہاں تک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

"ہمہ از اوست" کے نظریہ کے تحت تخلیق ہونے والا ادب زندگی کے ساتھ نہیں چلتا بلکہ دور آسمانوں کے قریب ہی نہیں عرش کے اوپر پرواز کرتا ہے۔ اس لئے بعض ناقدین اس پر ان الفاظ میں کڑا احتساب کرتے ہیں: "اب آپ ہی بتلائیے جب ادب میں دنیا، زندگی، خالق، واقعات، ماحول اور انسان کی انسانیت سے بے تعلقی برتی جائے، اس کی انفرادیت کو نظر انداز کر دیا جائے اور کسی نامعلوم حقیقت و پراسرار کیفیت کی سرگردانی ہی کو حاصلِ شعر و ادب متصور کیا جائے تو اس میں لاکھ جلالت اور ایمانیت ہی کیوں نہ ہو کر ے وہ نہ تو تخلیق ہوگا اور نہ افادی، نہ اس میں انسان کے احساسات و جذبات کی ترجمانی ہو سکے گی اور نہ اس کی تمناؤں کی چمک اور نہ بہتر مستقبل کی دمک۔ جب یہ نہ ہوگا تو وہ ادب نہیں کچھ اور ہوگا۔ پھر اسے ادب کیوں کہا جائے"[1]

---

[1] نیا زمانہ بابتہ جنوری ۱۹۶۶ء صـ ۱۲۲۔

ن کے اتنے عظیم شاعر حضرت امجد اگر اپنے ذوق عشق کے
بو یہ پہلو زندگی کی رواں رواں حقائق و عوامی مسائل
ترجمانی بھی کرنے لگتے" تو مستقبل کی معمار نسلیں اس کو
شعل راہ بنا کر اپنی حیات کی ان الجھی راہوں کو سنوارتیں
و ابھی منت کش شانہ ہی ہیں کیونکہ ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

اگر میں حضرت امجد کی رباعیات کے اسی ایک
رخ پر روشنی ڈالوں اور دوسری خصوصیات کو رقم نہ کروں
اخلاق کے ساتھ ساتھ شوخی و بے باکی سے مملو ہیں تو یقیناً
احترام کے منافی ہوگا اور میں مضمون کی تکمیل سے قاصر
رہوں گی۔

حافظ کی طرح حضرت امجد کی اخلاقی قدریں بھی
مولویوں کی قدامت پرستی کا شکار نہیں ہیں۔ وہ کعبہ
ڈھانے کو گناہ نہیں بلکہ کعبۂ دل کی شکست کو جرم سمجھتے ہیں ؎

مغموم کے قلب مضمحل کو توڑا
یا منزل فیض متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے
افسوس یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

باعی میں "تحقیر دیر" کو بھی فعل شنیع گردانا
"با دشمنان مدارا" کے قائل نظر آ رہے ہیں ؎

اگر ہے منظور عزِ کعبہ
کبھی نہ تحقیر دیر کیجئے
بروں کے حق میں بھی حتی الامکاں
دعائے توفیق خیر کیجئے

دگیتی" کے حصول کے لئے "ہمدردیٔ غیر"
لکھتے ہیں ؎

ہمراہ کرم حسن عمل تلتا ہے
احسان سے باب معرفت کھلتا ہے
ہمدردیٔ غیر میں ہے اپنا بھی بھلا
کپڑا دھونے سے ہاتھ بھی دھلتا ہے

نخوت و غرور کی تباہ کاری کو بڑی اچھی تمثیل کے پیرایہ
میں پیش کیا ہے ؎

سمجھو کہ زمانہ تمہیں سمجھاتا ہے
آغاز میں انجام نظر آتا ہے
ہے نخوت و سرکشی تباہی کا پیام
دیکھو شعلہ بھڑک کے بجھ جاتا ہے

انسانی فطرت کا یہ کمزور پہلو ہے کہ گمراہی کے وقت رہبر
کو یاد کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ہلکے طنز کے ساتھ یوں
رقمطراز ہیں ؎

گمراہ ہوئے تو رہنما یاد آیا
جب آ گئی پیری تو عصا یاد آیا
فرعون بھی وقت غرق لایا ایمان
جب چل نہ سکی خودی خدا یاد آیا

دوسرا کمزور پہلو "کم مائگی ظرف" ہے جس کی وجہ سے انھوں
کے قدم بعض وقت ڈگمگا جاتے ہیں۔ اس کی توضیح تمثیل کے
انداز میں فرماتے ہیں ؎

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

ہر ایماندار اور پر خلوص اہل قلم نے مذہب کے نام نہاد
ٹھیکے داروں کا مذاق اڑایا ہے اور رباعیات امجد میں اکثر
جگہ ہمیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ "داغ سجود" کا

خاکہ یوں اڑایا ہے ؎

بر داشت نہ کی تو نے کما ہی دل کی
دیکھی نہ کبھی ذرا تباہی دل کی
اے زاہد خود بیں! یہ نہیں داغ سجود
پیشانی سے ظاہر ہے سیاہی دل کی

متوسط طبقہ کا ہر آدمی طبقاتی تفریق سے متاثر ہوتا ہے، وہ بندہ اور بندہ نواز کے فرق کو نظاہر مٹا کر محمود و ایاز کو ایک صف میں دیکھنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ اس سے آگے عمل کے لئے آمادہ ہو کہ نہ ہو۔ حضرت امجد بھی متوسط طبقہ کی پیداوار ہیں اور لوٹنے والے طبقہ کے نظام سے متاثر ہو کر ایک دفعہ ان کے قلم نے اس طبقہ کے خلاف زہر اگل ہی دیا ہے ؎

دنیا میں یہ بد نصیب جیتے کیوں ہیں
مردود ور معیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پہ کپڑا
معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

امیر سے تحقیر غریب کا اظہار کافی موثر ہوا ہے لیکن فقیر کے جواب میں "کاخ امراء" کو لرزا دینے والی گھن گرج نہیں ہے بلکہ اس رباعی میں احساس کمتری نے جذبۂ یاس کا اظہار تجاہل عارفانہ کی شکل میں کیا ہے ؎

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں
سر چڑھ کے زمیں میں اترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں
معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

شوخی اور بایں ہمہ سادگی و پرکاری اکثر رباعیات میں جھلک رہی ہے جس سے کلام امجد بے حد دلچسپ ہو گیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے ؎

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت
مرے کریم بتا دے حساب کر کے مجھے

اور حضرت امجد اپنے رب کریم کے آگے اعتراف گناہ پوری شوخی و عجز سے کرتے ہیں ؎

میں گنہگار تو ہے رب کریم
کوہ سے کس طرح ہو کاہ بڑا
گو بڑا ہی گنہگار ہوں میں
تو بڑا یا مرا گناہ بڑا

---

تو ہے کہ ہمیشہ رحم فرماتا ہے
امجد ہے کہ راہ پر نہیں آتا ہے
میں خوگر جرم تو کرم کا عادی
ہم دونوں میں دیکھیں کون بڑھ جاتا ہے

حضرت امجد کی جراءت و شوخی سکندر علی وجد کی نظم "جبین آستان" کا یہ شعر یاد دلاتی ہے ؎

مقدس ہے زیادہ کون یا رب
جبیں میری کہ تیرا آستانہ

کلام امجد کی شوخی مندرجہ ذیل رباعی میں اپنی معراج پر پہنچ گئی ہے ؎

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے
کیا ذکر صفات، ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی، جاہل سہی، نادان سہی
سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

غالب کے ہاں "اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہو جاتے ہیں تو کثرت حیرانی سے مشاہدہ شمار میں نہیں رہتا زبان بند ہو جاتی ہے لیکن حضرت امجد اپنے شاہد کے آگے پوری بے باکی سے اعتراف کرتے ہیں ؎

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی
ہیں مدعیٔ نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں
ممکن نہیں دو وجود تو بھی میں بھی

ی کی جراءت رندانہ کو اس رباعی میں غیرت دلائی ہے

پھر خود میں نہ آتے گر کبھی پی لیتے
ہر ساغر کی بچی کچی پی لیتے
کرتے کس منہ سے پھر مذمت مے کی
اک مرتبہ کاش شیخ جی پی لیتے

رگاہ حبیب میں اپنی کم مائیگی کا اعتراف اس سادگی صومیت سے کرتے ہیں کہ اسے بھی بے ساختہ پیار سا ہوگا ـــ

مفلس ہوں، نہ دولت ہے، نہ سرمایہ ہے
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یارب تری رحمت کے بھروسے امجد
بند آنکھ کئے یوں ہی چلا آیا ہے

---

اے دونوں جہاں کے شاہنشہ
برباد ہوں میں تاراج ہوں میں
جتنا ہے تو مجھ سے مستغنی
اتنا ہی ترا محتاج ہوں میں

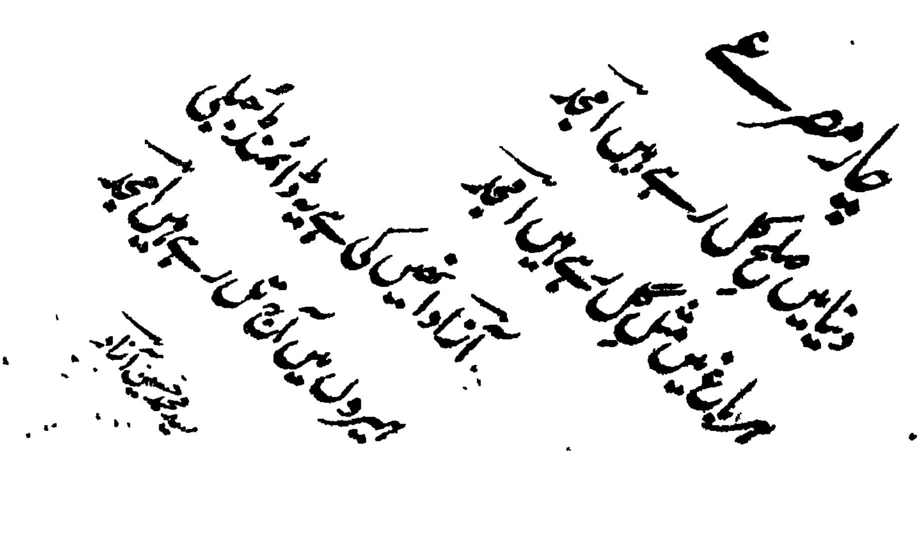
---

خالق نے جنھیں دیا ہے زر دیتے ہیں
زر کیا ہے خدا کی رہ گھر میں دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ
ساماں نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

حاصلِ کلام اگر کسی شاعر، ادیب یا فنکار کی دنیوی جنت یہی ہے کہ اس کے کلام، افکار، شہ پاروں اور شہ کاروں کی اس کی حیات ہی میں قدر ہو اور قبول عام کی خلعت ملے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امجد اپنے حصول مقصد میں بدرجۂ احسن کامیاب ہوئے ہیں۔

شریف النساء معین الدین

---



# عورت حضرت آمجد کے زاویۂ نظر سے

آج عورت کا جو مقام ہے وہ ایسا نہیں کہ اس پر صبر و سکون سے خاموشی اختیار کی جائے۔ اس کے پیچیدہ مسائل، اس کی بڑھتی ہوئی صلاحیتیں، معاشرہ کی الجھنیں اور سب سے بڑھ کر سماج میں اس کی اہمیت اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ اس کے بارے میں کامل غور و خوض نہ کیا جائے۔ کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ اس چلتی پھرتی دنیا میں اب عورت ایک صنف نحیف بن کر رہ سکتی ہے یا اسے مرد کی ہستی کا ایک جزو سمجھ کر نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے؟ دنیا کی اس مشین میں اگر کسی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے تو اسی صنف نازک کو۔ یہ کوئی معمولی خیال نہیں بلکہ یہ وہ چنگاری ہے جس نے جہالت و غفلت کے خرمنوں میں آگ لگائی اور اقوام عالم کی ترقیوں کے راستہ کو صاف کیا۔ قوموں اور ملکوں نے اسی وقت صحیح معنوں میں ترقی پائی ہے جب ان کی عورتیں علم و عمل میں تیار ہو کر میدان میں اتر آئیں۔ صحیح تعلیم نے عورتوں کو بہترین مائیں اور مردوں کا دست و بازو بنا دیا۔ پھر ان ماؤں کی آغوش میں پلنے والے بچے دنیا کی ہنگامہ خیز ہستیاں بن کر نکلے۔ نپولین بوناپارٹ کہتا تھا کہ "میری انتہائی ترقی محض ماں کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔ میں کہتا ہوں اور پکار کر کہتا ہوں کہ فرانس کی عظمت اس کی ماؤں کی قابلیت و صلاحیت پر منحصر ہے۔ میں نے اپنا تمام استقلال و حوصلہ مندیاں ماں ہی کی گود میں سیکھی ہیں۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج معاشرہ میں عورت کی حیثیت بحرانی کیوں ہے؟ اس کا جواب اگر خلوص سے تلاش کیا جائے تو حقیقت کے دروازے یوں کھلتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار سماج ہے۔ وہ مرد ہیں جن کی پوری زندگی کا دار و مدار عورت کی رفاقت پر ہے اور سب سے بڑھ کر اس کی ذمہ داری خود عورت ہی پر عاید ہوتی ہے۔ جو خود کو نہ پہچانا اسے کوئی اور کیا جان سکتا ہے۔ جو اپنی اہمیت کو نظر انداز کر کے اپنی کشتیٔ حیات کو زمانہ کے ظالم ہاتھوں اور سماج کے بے پناہ بھنوروں میں چھوڑ دے اس کا ساحل کبھی اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں آ سکتا۔ یہی وہ بحرانی حالت اور غیر متزلزل کیفیت ہے جو کسی بھی قیمت پر نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ یوں بھی عورت ایک پیچیدہ پہیلی ہے کیونکہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اور شاید آگے بھی زمانے کے معماروں نے اپنے اپنے مقاصد کے تحت اس کے ہزاروں روپ بدلے۔ ہم پر کتنی مصیبتیں ٹوٹیں، کتنی آندھیاں آئیں، کتنے طوفان اٹھے اس کی بحث یہاں لا حاصل ہے۔

البتہ دور اسلامی میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ اس میں عورت مساویانہ حقوق کے ساتھ ابھر چکی تھی یہی سبب تھا کہ ولید و ہشام کے وقت کی بیبیاں نہ صرف علم ہیئت و حدیث میں بلکہ عروض و ادب میں اور منطق و فلسفہ میں بھی ید طولیٰ

رکھتی تھیں۔ زمانہ کو اس کی دلفریبیاں پسند نہ آئیں اور اس کی نظران کو کھا گئی۔ ...۔ امام حافظ ابن عساکر مورخ دمشق نے ایک وقت میں اسّی خواتین کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا۔ علامہ جلال الدین سیوطی کے اساتذہ میں کئی خواتین شامل تھیں۔ ان عالم خواتین کی ایک جھلک حضرت آجد کی بانوئے محترمہ جمال سلمیٰ مرحومہ میں ملتی ہے۔ حضرت آجد کی شاعری عرفان کا وجدان آپ کی نیک اور قابل بیوی سلمیٰ کا زیر احسان ہے۔ جس کا اعتراف آپ نے ایک کتاب کی صورت میں کیا جس کا نام جمال آجد ہے۔ قدرت نے مرد کی تکمیل کے لئے عورت کی پیدائش کی تھی اس کا زندہ ثبوت آپ کی زندگی کے وہ قیمتی لمحات ہیں جو بی بی سلمیٰ کے ساتھ آپ نے گزارے اور جو کچھ آپ نے حاصل کیا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے قدرت کی یہ تکمیل انسان کو انسانیت کی تکمیل کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کی مثالیں گزرے ہوئے زمانہ میں بہت ساری مل جاتی ہیں جہاں عورت نے وقت سے انحراف کر کے سچائی کو تھاما اور اکثر و بیشتر ایسے نازک لمحات میں مرد کی بھی رفیق ثابت ہوئی کر بجھڑی بن کے رہ گئی۔ آپ کا کہنا ہے کہ اکثر ایسا ہوا کہ ہم نے لیل و نہار کو بھلا دیا۔ نہ وقت کا احساس تھا نہ کھانے پینے کی پرواہ۔ دو ساتھی ایک نئے راستہ کی تلاش میں اس قدر محو تھے کہ صرف آگے بڑھنا جانتے تھے اور گرد و پیش کی انھیں خبر نہ تھی۔ راستہ کے نشیب و فراز سے بے نیاز ہو کر صرف ان رموز و نکات کی طرف ان دونوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ جس کا رستہ عرفان کی سرحد پہ پہنچتا ہے۔ یہاں عرفان وجدان کا ممنون احسان ہو گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں عورت میں فخر و ناز کی ادا آجاتی ہے اور اسے اپنی اہمیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور اس پر اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ اگر دو مخلص دل ایک ساتھ دھڑکتے ہوں تو کسی عظیم مقصد کو پالینا بھی کتنا آسان ہے۔ اس طرح دونوں مل کر بچے موتی رول رہے تھے اور حالت یہ تھی ؂

کچھ دور سے لہریں تو نظر آتی ہیں  یہ آب ہیں یا سراب معلوم نہیں

پھر یہ لہریں طوفان بن کر اٹھیں اور طوفان نے موجوں کا سہارا لیا جس کا ساحل یقینی تھا۔ ان حالات کے معمولی مشاہدات، چھوٹے چھوٹے واقعات، موزوں اور ناموزوں حالات پر غور و فکر اور اس کے صحیح تجزیہ نے بی بی سلمیٰ کو ایک دن حضرت آجد کا رہبر بنا دیا۔ اس نازک رہنما نے ایسے ایسے نازک نکات و پیچیدہ گتھیاں انسانیت کی روشنی میں حل کر کے رکھ دیں کہ اس کا جواب ملنا مشکل ہو گیا۔ آپ جابجا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک دو واقعات سن لیجئے۔

ایک دفعہ بی بی سلمیٰ نے حضرت قبلہ سے زبان کی تعریف دریافت کی۔

آپ نے فرمایا "زبان دل کی ترجمان ہے"۔
سلمیٰ نے کہا "یہ اس کی جامع تعریف نہیں۔ اگر زبان کی یہی تعریف ہے تو پھر دنیا میں جھوٹ کا وجود نہ ہونا چاہیے کیونکہ جھوٹ ضمیر کے خلاف آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں اور سچ ضمیر کی ہمزبانی کا نام ہے۔ میری رائے میں زبان دل و دماغ کی ترجمان ہوتی ہے۔ دو ملاّ میں مرغی مردار۔ جس کا اثر غالب دیکھتی ہے اسی کی ہم داستان ہو جاتی ہے"۔ آپ نے جواباً فرمایا کہ "یہ امر مسلم ہے کہ دل و دماغ میں دل کا مرتبہ بلند ہے۔ اور دماغ اس کے مقابلہ میں کم درجہ ہے۔ پھر تعجب کا مقام ہے کہ زبان اعلیٰ کو چھوڑ کر ادنیٰ کی پیروی کرے"۔ بی بی سلمیٰ نے فرمایا "میری رائے میں اگر اس کے خلاف ہوتا تو تعجب خیز تھا کیونکہ زبان کا مقام دماغ سے قریب ہے۔ اور سگ حضور بہ از برادر دور"۔
ایک اور مرتبہ بی بی سلمیٰ نے آپ کے کلام میں ڈوب کر پوچھا کہ "آپ کی شاعری پہ جتنی رائیں دی گئی ہیں ان

پڑھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ اس سے آپ کے کلام پر کوئی حد و غنی نہیں پڑتی اور آپ کی شاعری کا نقطۂ نظر واضح نہیں۔ میری رائے ان سب سے الگ ہے۔ وہ یہ کہ سلاست الفاظ اور نثر نما ترکیبوں کی وجہ سے اہم سے اہم مسئلہ بھی آپ کی رباعی کے قالب میں ڈھل کر پایۂ اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ کثیر التعداد عوام کے فائدے کے لئے ہونا بھی یہی چاہئے کہ کلام کا راستہ پیچیدہ، عالمانہ اور صوفیانہ اصطلاحات کے روڑوں سے پاک صاف ہو کر شارعِ عام بن جائے جس پر ادنیٰ و اعلیٰ مبتدی و منتہی بآسانی گزر سکے:

کہو شعر ایسا جو ہو تیز خنجر — ادھر منہ سے نکلا ادھر دل میں اترا

پھر ایک مرتبہ بی بی سلمیٰ نے حقیقت محبت کو یوں سمجھا ؎

محبت کا عالم ہے سب سے نرالا — جہاں اک جگہ ہے اندھیرا اجالا
طلسم محبت میں ہر اک ہے حیران — گنواری کو ارماں بیاہی پشیماں

یعنی پریم کا کانٹا جس کو چبھتا ہے اس کی جان ہی لے کے چھوڑتا ہے۔ اور جو اس کانٹے کی لذت سے نا آشنا ہو اس کے لئے تو دائمی موت ہے۔

ایسے بہت سے رموز و نکات کو دو مخلص ساتھی ایک ساتھ حل کئے جا رہے تھے اور دنیا میں جنت کے مزے لے رہے تھے۔ تب ہی تو ایک دن حضرت امجد کہہ اٹھے ؎

میں ہوں کہ مرے پردہ میں ہے اور کوئی — صورت ہوں کہ تصویر ہوں معلوم نہیں

آج دنیا ایسے سانچوں میں ڈھل رہی ہے جہاں انسان ابھر رہا ہے، بڑھتا جا رہا ہے یا کم از کم بڑھنے کی طرف اس کا رجحان یقینی اور قوی ہے۔ ایسے وقت میں عورت قابل احترام ہے۔ آج کی بیٹیاں، کل کی بیبیاں، پرسوں کی مائیں یہی وہ مثلث ہے جس پر اس کائنات کے پورے ڈھانچے کا دار و مدار ہے اور یہی وہ ستون ہے جس پر معاشرہ اور سماج کھڑا ہوا ہے۔ اس نقطۂ نظر کا ماخذ معاشرہ اور لڑکی، اعنی کہ حضرت امجد نے چند اشاروں میں اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

"فاطمہ اور ابراہیم بہن بھائی ہیں جو اپنی بہن عائشہ کی شادی کی بات چیت میں مصروف ہیں۔ تکرار اس بات پر ہوتی ہے کہ عائشہ کو بغیر جہیز کے گھر سے کس طرح روانہ کر دیا جا سکتا ہے۔ اپنی بیٹی بغیر کچھ ساتھ لئے گھر سے خالی ہاتھ کیونکر چلی جائے۔ عائشہ اس گفتگو کو پس پردہ سن لیتی ہے۔ نہایت بے باکی اور پورے اطمینان کے ساتھ بہن بھائی کے سامنے آ جاتی ہے اور ایک بھرپور جرأت سے کہہ اٹھتی ہے ؎

جامۂ اصلی ہی میں میں جاؤں گی — ہاتھ خالی جا کے واں کچھ پاؤں گی
پیارے ابا تم مجھے زیور نہ دو

یہ وہ گہرے احساسات ہیں اور ایسی غیر معمولی جسارت جو حق و انصاف کی مانگ پر مبنی ہے کہ اس پر سب لاجواب ہو جاتے ہیں اس میں نہ صرف یہ احساس چھپا ہوا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے خالی ہاتھ جا رہی ہے بلکہ اسے اس بات کا بھی یقین ہے کہ وہ اپنے شریک زندگی کے گھر جا کر کچھ حاصل کرے گی جو سب کچھ کے برابر ہے۔ اسے اپنی ذات پر بھروسہ اور خود اعتمادی ہے۔ وہ سماج کے ان کھوکھلے بند ھنوں کو توڑنا مقصود ہے جو محض نمائش کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہیں

لے یہ ہوتا ہے کہ عائشہ شادی کے بعد مسرور ہی نہیں مغرور بھی ہو جاتی ہے۔ حضرت امجد نے اس قوی احساس کا اقرار ایک
الی میں کتنے نازک پیرایہ میں کیا ہے ؎

ساری دنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو — جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے — اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

عزت نفس اور یہ خودداری، یہ جذبۂ محبت و اعتراف سپردگی کوئی بات نہیں۔ عورت کی زندگی کا ایک بڑا سانحہ ہے۔ یہ چنگاری
ب مشتعل ہو جاتی ہے تو دنیا کے نقشے اور وقت کے دھارے بدل جاتے ہیں۔ زندگی میں انقلاب اور انقلاب میں طوفان آجاتا ہے۔

محبت مادری میں حضرت امجد ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔ قصہ یہ کہ رمضان کا مہینہ تھا۔ محترم کا لڑکپن کا زمانہ۔ ایک رات
ب دوستوں کے ساتھ رات کا بڑا حصہ گزار کر ایک دوست کے گھر میں آرام فرما ہوئے۔ گہری نیند میں دروازہ کھٹکھٹانے کی
واز کان میں آئی۔ آپ ہی نے جا کر دروازہ کھولا۔ آواز آئی "بیٹا تمہارے لئے سحری لائی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے سحری کے
روزہ رکھ لو۔ رات اندھیری تھی۔ دو بجے کا وقت تھا۔ ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلہ پر گھر تھا جہاں سے آپ کی والدہ محترمہ
نے ممتا کے جوش میں آپ کے لئے کھانا لایا تھا۔ یہ ایسا واقعہ تھا کہ امجد قبلہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ گھبرا کر ماں کے قدموں پر سر رکھ دیا۔
ں نے سینے سے لگا لیا اور دونوں مل کر خوب روئے۔ پھر آپ کبھی سحری پر گھر سے باہر نہ رہے۔ فرماتے ہیں ؎

عداوت سے سب مارنا جانتے ہیں — مجھے تو کسی کی محبت نے مارا

ور پھر کہنے لگے

"اگر کہوں کہ خدا تجھ پر رحمت نازل کرے تو تو نور مظہر رحمت ہے
اگر کہوں کہ خدا تجھے جنت نصیب کرے تو جنت تو تیرے قدموں میں ہے

خدا کی قسم اس مادی دنیا میں تیری آغوش محبت، رحمت رب العزت کا بہترین نمونہ ہے اور تیرا دامن عاطفت
تمام مسرتوں اور راحتوں کا خزینہ"

تو ہی ہے میری مادر مہرباں میں تیرا امجد — مجھے پھر گلے لگا کر کبھی کر لے پیار اماں

اسی طرح اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں جگہ جگہ اپنی والدہ محترمہ کے ایثار اور جذبۂ محبت کی کئی مثالیں آپ نے دی ہیں
جن سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ عورت خدمت کر کسی کو بنانا اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتی ہے۔

حضرت قبلہ نے اپنی تحریروں میں جا بجا عارفانہ اشاروں اور اہم نکات کو واضح کیا ہے کہ طبیعتوں میں اضداد اور
جیسے مرد عورت کے ساتھ نباہ کرنے سے کہیں لاکھ درجہ یہ بہتر ہے کہ اسے آزاد کر کے اپنی قسمت آزمانے کا موقع دیا جائے۔
لا جو کسی نے کہا ہے کہ ظلم کی اصلی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی غلط جگہ پر رکھ دینا بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔ ہر چیز کی ٹھیک جگہ اور
ایک ترتیب ہوتا ہے۔ یہ ایک اہم اور انصاف پسند نکتہ ہے۔ جو لوگ عورت کو کمزور سمجھ کر اسے مظلوم بنا تا جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ
س کا بھی دل ہے۔ یہاں ایک لمحہ غور کریں۔

اس مختصر سی تحریر میں میں نے کوشش کی ہے کہ عورت کو آپ کے زاویۂ نظر کے قریب لا کر دیکھوں۔ لیکن یہ پھر بھی
تشنہ ہی رہا کیونکہ ہمیں تو زندگی کے معنوی اور کھوکھلی قدروں سے رد ہو کر انسانی شرافتوں کے لئے ایک بھرپور احتجاج
کی ضرورت ہے۔ اس لئے آپ ہی کی رباعی کے ایک شعر پر اس کو ختم کرتی ہوں ؎

تسکین قریب آکے پلٹ جاتی ہے — دل ہے کہ تڑپ تڑپ کے رہ جاتا ہے

قطب النساء ہاشمی

# رباعیات امجد

حضرت امجد موجودہ زمانے کے شاعروں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا شمار ہندوستان کے بلند پایہ اور حقیقت نگار شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کا کلام چار اصناف پر مشتمل ہے۔ نظمیں، تضمینیں، غزلیں اور رباعیات۔ ہر صنف میں آپ کو ایک خاص مہارت حاصل ہے اور کلام میں ہر جگہ ان کی اپنی انفرادیت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ فارسی ادب میں عمر خیام، سلطان ابوسعید ابوالخیر، سحابی نجفی رباعی گو شعرا کی حیثیت سے اپنے کلام کو معراج کمال کو پہنچایا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان میں سرمد نے اپنے آپ کو اقلیم رباعی کا سرتاج ثابت کر دکھایا۔ لیکن آج حضرت امجد بقول گرامی مرحوم جواب سرمد ہیں۔

امجد بہ رباعی است فرد امجد — کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز — روح سرمد بگفت امجد امجد

رباعی فن شاعری کی ایک ایسی صنف ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ خیالات اختصار کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت امجد کی رباعیات پر نظر غائر ڈالنے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ زندگی کے اہم سے اہم مسائل کو آپ نے چار مصرعوں میں بیان کر دیا ہے اور باتوں باتوں میں حیات کی گتھیوں کو سلجھانے میں پوری کامیابی حاصل کی ہے اور پھر حقیقت نگاری کا یہ عالم کہ ہر شعر پڑھنے والے کے دل پر نقش ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کی زبان سلیس، پیرایہ بیان سادہ، الفاظ نپے تلے ہوتے ہیں، لیکن ان میں خیالات کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ کی لاثانی رباعیوں سے متعلق اہل ذوق اصحاب نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جن میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم فرماتے ہیں کہ "ہر رباعی قابل داد ہے۔ ان کے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے"۔ مرحوم حیدر یار جنگ نظم طباطبائی نے کہا ہے کہ "رباعیات امجد کی داد دینا سخن شناسی کا مقتضا ہے"۔ عظمت اللہ خاں مرحوم "رباعیات امجد زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کی تفسیر ہے" کہہ کر خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت امجد تفریح طبع کے لئے شعر نہیں کہتے بلکہ خیال خود انھیں اظہار پر مجبور کرتا ہے۔

حضرت امجد نے اپنی رباعیوں میں زندگی کی سینکڑوں گتھیوں کو سلجھایا ہے۔ کیا اخلاقی، کیا معاشرتی اور کیا اصلاحی، ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر رباعیات میں فلسفیانہ، حکیمانہ اور عاشقانہ خیالات کا بھی اظہار کیا ہے اور کہیں ظرافت اور طنز کا پہلو اختیار کر کے اور بھی دلکشی پیدا کر دی ہے۔ روزمرہ کی زندگی سے متعلق سیدھی سادی

اور معمولی باتوں کو عالمانہ، شاعرانہ بلکہ عارفانہ پیرائے میں بیان کرنا حضرت امجد کے طرز بیان کی خصوصیت ہے۔ آپ کے قلم نے ہر معمولی بات سے ایک نکتہ پیدا کر کے ایسی ندرت دکھائی ہے کہ ہر رباعی مفید نتائج اور ہدایات سے مملو نظر آتی ہے۔ جن خیالات کا وہ اظہار کرتے ہیں وہ ان کے دل کی ترجمانی ہوتی ہے۔ گو پیرایۂ بیان نہایت سادہ، الفاظ سلیس اور عام فہم ہوتے ہیں تاہم جوش کا وہ عالم ہوتا ہے کہ ایک بجلی سی کوندتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو اہل بصیرت کے لئے ذہنی اور روحانی تفریح کا باعث بنتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امجد کا درد آشنا دل حقیقت حال سے واقف ہے اور آپ کی دور بین آنکھیں ہر تغیر کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حد درجہ کی تاثیر ہے۔ حضرت امجد کی رباعیات ان کی بہترین صلاحیتوں کا بے بہا نمونہ ہے۔ ان کے دل خراش نالے دل پر اثر کرتے ہیں۔ ان کے واردات قلبی حقیقی جذبات پر مشتمل ہیں۔

حضرت امجد ۱۹۱۴ء کی قیامت خیز طغیانی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہ زخم لگنے کے بعد واردات و کیفیات قلبی اور دروں قلب ہنگاموں نے حضرت امجد کے نظریہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا اور ان کے کلام میں درد و سوز کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن ان کی نالہ و زاری میں توکل علی اللہ اور راضی بہ رضا کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ کا کلام تعقید، تکلف اور تصنع سے مبرا نظر آتا ہے۔ اشعار میں بندش کا حسن، روانی کا زور اور زبان کی شستگی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اور پھر سادگی اور سلاست ان تمام محاسن پر پورے پورے طور پر مسلط نظر آتی ہے۔ آپ کی رباعیات میں کہیں سکون پایا جاتا ہے تو کہیں جوش۔ الغرض اعلٰی سے اعلٰی اور نادر سے نادر خیالات کو سلیس اور سادہ پیرائے میں پیش کرنا گویا حضرت امجد کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ کی اکثر رباعیاں، حقائق، معارف، تصوف اور فلسفۂ کائنات پر مشتمل ہیں۔ رباعیات امجد میں آپ کی سیکڑوں رباعیاں اسی رنگ میں پیش کی گئی ہیں اور جمال امجد اور ریاض امجد میں بھی متعدد جگہ ان کی رباعیوں کے بیش بہا نمونے نظر آتے ہیں جو نازک خیالی، تشبیہات اور استعاروں سے مملو ہیں۔ اب حضرت امجد کی رباعیوں سے چند بطور "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں آپ نے حیات انسانی کے اکثر مسائل سے بحث کی ہے۔ دنیا کی ناپائیداری کو کس خوبی سے ایک رباعی میں پیش کیا ہے۔ انسان اپنی غفلت کے باعث دنیا کو اپنا ٹھکانہ سمجھا ہوا ہے لیکن موت کی آمد حقیقت حال کا انکشاف کر دیتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر محفل سے بحال خستہ نکلا      ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کے لئے      سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

اللہ تعالٰی خالق کائنات، قادر مطلق اور قوت و شوکت میں لاثانی ہے۔ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ اس کی رضا اٹل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے      اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں      وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

انسان کا دل خانۂ خدا ہے۔ اس لئے کسی کے دل کو توڑنا اللہ کے گھر کو ڈھانا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ دل شکستہ کا بھی بدل ہو ؎

مغموم نے قلب مضطر کو توڑا      یا منزل فیض منعم کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے      افسوس یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

انسان پر جب اپنے گناہ عیاں ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے تزکیۂ نفس کی خاطر بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہو کر اور اسے غفور و رحیم تصور کر کے مغفرت کا خواہاں ہوتا ہے تاکہ قیامت کے روز اسے نادم نہ ہونا پڑے۔ اس خیال کا نقشہ ملاحظہ ہو ؎

ضائع نہ زمانہ سرفروشی کو مری      مٹی میں ملا نہ گرم جوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے ربِ غفور      دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری

مالکِ حقیقی تک رسائی ہر ایک کا حصہ نہیں۔ انسان اپنے آپ کو کھو کر ہی اپنے رب کو پاتا ہے۔ اللہ کا وجود ایک ایسے پردہ میں مستور ہے کہ اہلِ باطن ہی اس سے نظریں ملانے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ اسرارِ الٰہی سے متعلق فرماتے ہیں ؎

ہے شاہدِ حسن ہر جگہ پردے میں      ملتی ہی نہیں کسی کو راہ پردے میں
اس کا ہر ایک راز کعبہ کی طرح      پردے میں ہے اور وہ بھی کئی پردے میں

جب محبوب دلنشیں ہو جاتا ہے تو اس کا ٹھکانا معلوم کرنے کی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور جب اس کا سراغ لگ جاتا ہے تو تسکین ہو جاتی ہے کہ کبھی نہ کبھی ملاقات تو ہو ہی جائے گی۔ خانۂ کعبہ کی زیارت کے بعد حضرت امجد پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ ان چار مصرعوں میں کس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ رباعی میں سرتاسر معرفت کی جھلک نمایاں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

رستہ ترا سہرے طے کیا ہے ہم نے      سب کچھ تری راہ میں دیدیا ہے ہم نے
مل لیں گے کبھی تجھ سے بھی انشاءاللہ      گھر تو ترا دیکھ ہی لیا ہے ہم نے

خدا نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر ایک امانت اس کے سپرد کی لیکن دنیا میں بہت کم انسان ایسے ہیں جو اس بارِ امانت کے متحمل ہو سکے ہیں۔ حضرت امجد نے اسی مضمون کو کیا نفیس پیرایہ میں پیش کیا ہے ؎

ہر گام پہ ٹھکرا کے گرا جاتا ہوں      نقشِ کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو بھی تو سنبھال میرے دینے والے      میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

عاشق کسی نہ کسی حیلہ سے معشوق کا وصال چاہتا ہے۔ جب اس کا ذوق منتہا کو پہنچ جاتا ہے تو وہ قصور کے ارتکاب پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے تاکہ معشوق سے بخشوانے کا موقع ملے۔ رباعی معرفت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

حیلہ ملتا ہے رنگ لانے کے لئے      ہو کچھ تو سبب ان کو منانے کے لئے
موقع ملتا ہے پاؤں پر گرنے کا      کرتا ہوں قصور بخشوانے کے لئے

خدائے تعالیٰ مستجاب الدعوات ہے۔ تاہم انسان کو یہ گلہ شکوہ ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ حضرت امجد نے کس خوش اسلوبی سے بتایا ہے کہ دعا اگر قبول نہیں ہوتی تو کیوں نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں ؎

لے لے کے خدا کا نام چلّاتے ہیں      پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز      کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

نیکیوں سے غافل رہنا اور دعا کی قبولیت کی توقع رکھنا کیسے ممکن ہے۔

کم ظرفی انسان کا بدترین عیب ہے۔ تنکے کی مثال پیش کر کے حضرت امجد نے مطلب کو کس خوبی سے واضح کر دیا۔

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے ۔۔۔ مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر جیسی ۔۔۔ تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

انسان کے اعمال بھی کبھی ابلیس خبیث سے کم نہیں ہوتے۔ اسی مضمون کا پیرایۂ بیان ملاحظہ ہو۔

اک ایک کی تاک میں لگا رہتا ہے ۔۔۔ خون ایک کا اک کے ہاتھ سے بہتا ہے
انسان کے خبث باطنی کے آگے ۔۔۔ شیطان بھی لاحول ولا کہتا ہے

انسان کے لئے زیبا نہیں کہ انسان کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ خدا ہی وہ ہستی ہے جس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اجب ہے۔ ارشاد ہے۔

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو ۔۔۔ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو ۔۔۔ بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

انسان کی باتوں میں تاثیر اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اس کا خیال و عمل ایک ہو۔ اگر اس کے ظاہر و ن میں اختلاف ہے تو اس کا کہنا بے اثر ہوگا۔

تقریر تو سن چکے اثر بھی دیکھو ۔۔۔ باتیں تو بہت ہوئیں ہنر بھی دیکھو
ہوتا نہیں ظاہر پہ قیاس باطن ۔۔۔ دلق اطلس کا استر بھی دیکھو

دنیا میں پیری مریدی کا طریقہ عام ہے۔ لیکن سیکڑوں لوگ ایسے ہیں جو اس کے پردہ میں دنیا والوں کو گمراہ تے ہیں۔ اس سے متعلق حضرت امجد کا طنز ملاحظہ ہو ؎

دنیا کو کیا خراب اچھا بن کر ۔۔۔ لی جان ہزاروں کی مسیحا بن کر
شیخ نجدی! خدا ہی سمجھے تجھ کو ۔۔۔ ڈھایا کعبہ کو تو نے قبلہ بن کر

دنیا میں جاہ و دولت آرام و آسائش کا باعث تو ہوتی ہے لیکن اس کی فراوانی سے ایمان جو لطف زندگی ہ گھٹتا چلا جاتا ہے۔

اونچے محلوں میں لطف تو آتا ہے ۔۔۔ ہر ایک قدم پہ نفس اتراتا ہے
اچھی تو ہے دنیوی ترقی امجد ۔۔۔ غم یہ ہے کہ ایمان گھٹا جاتا ہے

اس مضمون کو ایک اور انوکھے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

ڈیوڑھی نہیں، در نہیں کہ دربان نہیں ۔۔۔ بلبل نہیں، گل نہیں کہ بستان نہیں
ہے جمع جہان بھر کا ساماں گھر میں ۔۔۔ خاطر جمعی کا کوئی سامان نہیں

جہاں غالب نے اپنے دامن کو دریائے معاصی میں خشک پایا تھا وہاں حضرت امجد نے نار سقر کو عرق انفعال ے بجھا دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پیاسوں پہ کرے گا مہربانی پانی ۔۔۔ آتش پہ کرے گا حکمرانی پانی
کیا نار سقر جلا سکے گی واعظ ۔۔۔ خود مجرم سے ہو رہا ہوا پانی پانی

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی تفسیر ملاحظہ ہو۔ کس شان بے نیازی سے حضرت امجد بارگہ ایزدی میں چلے آ رہے ہیں۔

بیکس ہوں نہ مال ہے نہ سرمایہ ہے ۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لایا ہے
یا رب تری رحمت کے بھروسے امجد ۔ بند آنکھ کئے یونہی چلا آیا ہے

یہ خیال کہ دولت باعثِ مسرت ہے ہمیشہ غلط ہے۔ ذیل کی رباعی میں حضرت امجد نے ایک حکیمانہ استدلال پیش کر کے افلاس کو دولتمندی پر ترجیح دی ہے ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ۔ بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی ۔ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

"مردِ ناداں" سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر ۔ مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

حضرت امجد نے جو ظریفانہ پہلو اس مضمون کے اظہار کے لئے اختیار کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا ۔ نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی ۔ نادان کو اُٹھا بھی تو نادان رہا

"من او ہستم" کی تفسیر ملاحظہ ہو:۔

میں قلزمِ ذخّار ہوں منبع تو ہے ۔ میں مہرِ جہاں تاب ہوں مطلع تو ہے
ہے فرق بہت لطیف ہم دونوں میں ۔ مانندِ ضمیر میں ہوں مرجع تو ہے

بصارت تو ہر دیکھنے والی آنکھ میں موجود ہے۔ لیکن بصیرت پیدا ہو جائے تو اکثر اسرارِ حقیقت نمایاں ہو جاتے ہیں ؎

ہر قطرہ میں بحرِ معرفت مضمر ہے ۔ ہر اک ذرہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی ۔ گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

انسان اپنے آپ کو کھو کر ہی اپنے رب کو پاتا ہے۔ جب تک اس میں ذرہ بھر بھی احساسِ خودی موجود ہے رب کا وصال ممکن نہیں ؎

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے ۔ اس پردہ میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں ۔ میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

اللہ اللہ کے نعرے تو ہر جگہ بلند کئے جاتے ہیں لیکن ایسے کتنے ہیں جنہوں نے اس کے ہو کر مسرتِ حقیقی کا لطف اٹھایا

کیا پھل ملتا ہے بیج بو کر دیکھو ۔ پانے کی اگر ہوس ہے کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے ۔ اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

غرض حضرت امجد کی رباعیات زندگی کے کئی پہلوؤں پر محیط نظر آتی ہیں۔ جو رباعیات پیش کی گئی ہیں وہ بحرِ زخار کے چند قطرات سے زیادہ نہیں۔ ان جواہر ریزوں کو جو حیات کے اکثر مسائل پر حاوی ہیں، چند صفحات میں ظاہر کر دینا آسان نہیں۔ جہاں حضرت امجد کی رباعیات سوز و گداز، درد و الم سے مملو نظر آتی ہیں۔ وہاں جگہ جگہ اخلاق، معرفت اور تصوف کے نادر مسائل کا حل بھی پیش کرتی ہیں۔ ایک حقیقی و فطری شاعر کا کلام اس کی اپنی

دا آئینہ ہوتا ہے۔ آپ کے کلام سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک صوفی منش، خدا ترس اور پاک باطن انسان ہیں۔ شاعری کا کمال نازک خیالی، سلاست و سادگی اور تاثیر پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ تمام محاسن حضرت امجد کے ہاں موجود ہیں۔ آپ نے اپنے ایک قطعہ میں شاعری سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کی اپنی شاعری پر صادق آتا ہے ؎

کلام ایسا اگر سنا ہوگا تم نے — سنا آج اور کل اثر دل میں اترا
کہو شعر ایسا جو ہو تیز خنجر — ادھر منہ سے نکلا ادھر دل میں اترا

حضرت امجد ان خاموش کام کرنے والوں میں سے ہیں جنہیں نہ شہرت کی خواہش ہے نہ جاہ و مال کی تمنا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے قول کے مطابق آپ سے زیادہ مشہور آپ کی رباعیات ہیں۔

منیزہ بانو کاؤس جی

---

# در مدح حضرت امجد حیدر آبادی

آفتابِ کمال ہے امجد — اور سراپا جمال ہے امجد
باعمل آج ایک دنیا میں — بندۂ ذوالجلال ہے امجد
نکتہ داں اور ہے معانی سنج — مرد عالی خیال ہے امجد
آج بزم سخن میں تجربہ کار — پیر دیرینہ سال ہے امجد
قابلِ فخر حیدر آبادی — شاعر خوش مقال ہے امجد
ہے بلند اس کے فضل کا پایہ — عالم بے مثال ہے امجد
شمعِ روئے نبی کا پروانہ — مثل حضرت بلال ہے امجد
اس کو لالچ نہیں ہے دنیا کی — فقر میں ہی نہال ہے امجد
اک ستودہ صفات انساں ہے — اور خجستہ خصال ہے امجد

اس کی تعریف کیا کرے واثق
مرد روشن خیال ہے امجد

---

محمد حامد علی واثق

# حکیم الشعرا حضرت آمجد حیدرآبادی

اور

## فقیر گیلانی غفراللہ

(کسے خبر تھی کہ مولانا مناظر احسن گیلانی رح اس قدر جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔)

تقریباً تیس سال سے بھی زیادہ زمانہ گزرا جام باغ (ترپ بازار) میں ہمارے بزرگ کرم فرما الحاج سید محی الدین صاحب سابق معتمد تعلیمات سرکار عالی کے در دولت پر اچانک ایک سیدھے سادے آدمی پر نظر پڑی۔ معمولی دو پلے کی سر پہ منڈھی ہوئی ٹوپی۔ شیروانی نہیں بلکہ معمولی کپڑے کا اچکن، چہرے پر خاص کیفیت طاری تھی۔ ڈاڑھی اور مونچھ سے عمر کا اندازہ کرنا تو مشکل تھا لیکن سنجیدگی جو فکر و نظر کی عادت قدرتاً پیدا کر دیتی ہے، اسی میں سراپا غرق۔ میں نے ان کو دیکھا۔ انھوں نے مجھے دیکھا۔ میری نظر میں وہ اور ان کی نظر میں ہم شاید کھپ گئے، اور یوں باہم ایک دوسرے میں گویا ہمیشہ کے لئے کھپ گئے۔ یہ حضرت آمجد اور ان کا قدیم نیاز مند خاکسار مناظر احسن گیلانی کی ابتدائی ملاقات کا خاموش افسانہ ہے۔ ایک کی دوسرے سے شناسائی اسی طریقہ سے ہوئی۔ دنوں پر دن، مہینوں پر مہینے اور سالوں پہ سال گذرتے چلے گئے، زمانہ جو تغیر اور انقلاب ہی کی ایک اَن جانی سی مجہول تعبیر ہے نئے حالات اور نئے مظاہر و کیفیات کے ساتھ سامنے آتا چلا جاتا تھا اور گذرتا چلا جاتا تھا۔ اونچے نیچے اور نیچے اونچے ہوتے تھے۔ روز کا یہی قصہ تھا۔ لیکن ایک آمجد تھے جس سطح پر پہلے دن ملے تھے اسی سطح پر برقرار تھے۔ نہ اونچے ہوتے تھے اور نہ نیچے۔ ایک پختہ رنگ تھا جو اُن پر چڑھا ہوا تھا۔ گھنٹوں ان کی صحبت میں میری گذرتی تھی۔ محلہ کالی کمان کے ایک خاص قسم کے شاعرانہ مستعار مکان میں وہ مقیم تھے جو ہمارے عنایت فرمائے خاص مولانا سید شاہ صابر میاں سجادہ نشین مسند خاموشی کے مسکن عالی کے پاس ہی تھا۔ اسی میں اپنی عالمہ، فاضلہ، حاجیہ، اہلیہ سلمیٰ قدس اللہ سرہا و نور ضریحہا کے ساتھ امجد صاحب اسی زمین پر بہشتی زندگی گزار رہے تھے۔ جہاں بہشت سے نکالے جانے کے بعد آدم اور آدم کی اولاد آباد کی گئی ہے [1]

---

[1] کہتے ہیں کہ سزا بھگتنے کے لئے حضرت آدم ماں حوا کے ساتھ زمین پر بھیجے گئے تھے لیکن قرآن ہی میں جب "فتاب علیہ" کا اعلان کیا گیا ہے یعنی حضرت آدم کی توبہ خدا نے قبول کی تو قبول توبہ کے بعد بھی سزا دینے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بھی تو سوچنے کہ اکل شجرہ کی غلطی حضرت آدم سے سرزد ہوئی تھی۔ اس غلطی کی سزا ان کی اولاد کیوں بھگتے۔ یہ تو اسی قسم کی بات ہوئی کہ کوتاہیاں جیسا کہ کہتے ہیں مسلمانوں کے حکمرانوں سے ہوئی تھیں ان کوتاہیوں کی تلافی کے لئے اس زمانے کے مسلمانوں کو "جو ستارہے ہیں" دق کئے جا رہے ہیں ان کو سوچنا چاہیے کہ آخر کرے کوئی بھرے کوئی کی اس ظالمانہ کار روائی پر کیا ان کا دل بھی ان کو نہیں ٹوکتا۔ بہر حال شیخ ابن عربی کا خیال ہے کہ اس آدم اور آدم کی اولاد کی آبادی سزا کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ انسانی وجود کی پوشیدہ صلاحیتوں کے ظہور کا یہ میدان ہے۔ یہ تکریمی آبادی ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر کی قرآنی آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

امجد صاحب کی یہ رفیقۂ محترمہ وقت کے ایک جلیل و عزیز فاضل حضرت مولانا نادرالدین مرحوم کی صاحبزادی تھیں۔ مولانا نادرالدین خصوصیت کے ساتھ معقولات (یعنی مسلمانوں کی قدیم منطق و فلسفہ و کلام وغیرہ) میں خیرآبادی خاندان کے گوہرِ شب چراغ تھے۔ خاکسار کے استاد علامہ مولینا حکیم سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ جو خیرآبادی علماء کے قائم تھے انھوں نے خیرآبادی مکتبِ تعلیم کے اساتذہ عظام کا تذکرہ ایک عربی رسالہ میں فرمایا ہے۔ اس رسالے میں ان علوم کے چار ارکان خاص میں ایک اہم رکن مولانا نادرالدین صاحب کو بھی قرار دیا ہے[۵] اللہ اللہ کالی کمان والے محلے کے اس شاعرانہ مکان کی باتیں کیا ہیں۔ کبھی کبھی حضرت امجد اپنے احباب خاص کے ساتھ خاص محفلیں منعقد فرمایا کرتے تھے۔ احباب کے اس حلقہ میں ایک طرف ہندی اردو بھوں کے معالجہ کرانے والے مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم جہاں شریک ہوتے تھے وہیں کسی گوشے میں گیلانی کا یہ فقیر بھی پڑا ہوتا۔ اہل مجلس پہ کیا کیا گذرتی تھی آج بھی اس کی یاد روح و قلب کے لئے سرمایۂ نشاط اور وجہ سرور ہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم جو ٹھوس سا بھی، کوٹ پتلون میں لوگوں کے سامنے آتے تھے لیکن اندر سے وہ کیا تھے اس کا پتہ انہی امجدی محافل الفت میں چلتا تھا مرنے والے جب مرتے ہیں تو کہتے ہیں پتلیاں آنکھوں کی بجائے سیاہ کے سفید ہو جاتی ہیں۔

ع اے قدمت بچشم من خانہ سپید کردہ ام

کے موضوع پر سینوں سے بے چین ہو ہو کر نکلنے والے نعروں سے مجلس جس وقت گونج رہی تھی اب تک اس کی بازگشت حافظہ کے ساحل سے ٹکراتی رہتی ہے۔ چند ہی دنوں کے بعد عظمت اللہ واقعی مرحوم ہو کر رحمت کی دنیا میں منتقل ہو گئے۔ حضرت امجد نے ان کا مرثیہ لکھا۔

ع ای ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

اسی مشہور زبان زد عام مصرعہ پر جو اضافے اول و آخر میں کئے گئے ہیں اب بھی بہنے والے آنسوؤں کے بغیر ان کو پڑھ نہیں سکتے۔ اسی زمانے میں حضرت امجد کی اسی مجلس کا یہ گوشہ پرور رکن بھی ایک خطرناک مرض کا شکار ہو گیا تھا۔ زیست کی امید مرحوم ہو چکی تھی۔ لیکن "اجل مسمی" کی مہلت باقی تھی۔ مرتے مرتے جی اٹھا۔ امجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پھوٹ پڑے۔ فرماتے جاتے تھے "پریشان تھا ایک ہی وہلہ میں دو دو مرثیوں کی فکر میں غلطاں پیچاں تھا۔ شکر ہے کہ تم نے بار ہلکا کر دیا۔" ...... کالی کمان والے اسی شاعرانہ کاشانہ کے قیام کے زمانے کی بات ہے۔ حضرت امجد کے باورچی خانے میں ضروری نہ تھا کہ خشکہ یا گیہوں کی روٹی ضرور پکے۔ بسا اوقات جواری پر بھی بات آجاتی تھی۔ اپنی سائیکل کی ناشتہ دانی میں جوار کی انہی روٹیوں کے ساتھ کسی قسم کے سالن کو شریک کرکے حمام باغ (فقیر جس محلہ میں فروکش تھا) علی الصباح ناشتہ سے پہلے لے آتے۔ اس دن ہمارے یہاں کا ناشتہ بس جوار کی یہی امجدی روٹیاں ہوتی تھیں۔ اب بھی ان کی حلاوت و لذت کی یاد کام و دہن میں شورش پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مرحومہ بلی جب تک زندہ رہیں حضرت امجد کے گھر کے گویا ایک رکن ہی کی حیثیت فقیر کی ہو گئی تھی۔ مجھ سے تو مہ پردہ کرتی تھیں لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے دعاؤں کی مشہور کتاب "حصن حصین" جس میں علامہ جزری نے نبوی دعاؤں

---

۵ معقولات کے مسائل کو سلجھی ہوئی صاف اردو زبان میں مولانا نادرالدین نے شاید پہلی دفعہ قلم بند کیا۔ ٹونک میں جب ہم پہنچے تھے تو ان اردو رسالوں کو ہمارے حلقۂ علم میں غیر معمولی قدر و قیمت کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ یاد آتا ہے کہ بعض طالب علموں کو مطبوعہ نسخے ان رسالوں کے نہ مل سکے تو انھوں نے قلم سے ان کو نقل بھی کیا تھا۔ مولینا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ خلاف دستور اردو زبان کی ان کتابوں کی بڑی تعریف فرماتے تھے۔

کو حدیث کی معتبر کتابوں سے انتخاب کر کے جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب کی باضابطہ اجازت فقیر سے حاصل کی بعض اہم علمی مسئلوں پر گفتگو
فرمائیں۔ خصوصاً تصوف کے بعض نظریاتی مسائل پر جن کے متعلق مرحوم کی معلومات بھی کافی وسیع تھیں۔ ان علمی مباحث میں سفارت
کا کام حضرت امجد انجام دیا کرتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ امجد صاحب نے باضابطہ طور پر عربی کی نظامیہ نصاب کی تعلیم مختلف
مدارس مثلاً نظامیہ وغیرہ ہی میں حاصل نہیں کی تھی بلکہ حیدرآباد میں جس علم اور جس فن کے ماہران کی طالب علمی کے زمانے میں
مشہور رہے۔ ان سے بھی کافی علمی فائدہ ان کو حاصل ہوئے۔ علی الخصوص بہار کے مشہور منطقی مولانا عبدالوہاب بہاری سے بھی منطق کی متعدد کتابیں
امجد صاحب نے پڑھیں۔ استاد الملک علامہ شوشتری کے حلقۂ درس میں فارسی زبان کے ذوق کی تکمیل کا موقع بھی ان کو ملا تھا۔ اسی سے ان
کے ہم کو سیکڑوں شاگردوں میں اپنی عالمہ، فاضلہ صاحبزادی کی رفاقت ازدواجی کے لئے مولانا نادر الدین مرحوم کی نظر ا
حضرت امجد پر بلا وجہ نہیں پڑی تھی۔ بجز علمی و ذہنی خصوصیات کے بیچارے امجد صاحب کے پاس اور کیا تھا جسے مولانا کے اس ا
کی وجہ ہم قرار دے سکتے ہیں اور سچ پوچھئے تو شاعر امجد کو حکیم امجد بن جانے کا موقع شاعری کی تاریخ میں حکیم سنائی کے بعد جو
تو اس میں ان کی جبلی اور اکتسابی ملکات فائقہ کے ساتھ ساتھ بہت کچھ دخل مرحومہ سلمیٰ کی رفاقت کو بھی تھا۔ بجائے "فی کل
یہیمون" کے اول سے آخر تک حضرت امجد کی شاعری صرف "حقائق صادقہ و معارف حقہ" کے ارد گرد گھومتی رہی تو قسام ا
کی قسمت کے ساتھ ساتھ اسباب بھی کچھ ایسے ہی مہیا ہوتے رہے جو "الغاوون"[1] یعنی بھٹکے ہوئے لوگوں سے حضرت امجد کا
چھڑاتے رہے۔ مدت شعر گوئی کے جو حصہ ان کو ارزانی ہوا تھا غلط راہوں پر ان کی یہی شہرت اگر پڑ جاتی تو خدا ہی جانتا ہے ان
توانائیوں سے کتنے بھرے بھرے ویگن (wagon) اسی طرح دریا برد ہوتے جاتے جیسے حال میں آیرندی کے کوہستانی قصبہ
نے ریل کے ڈبوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ شعر کی واقعی اگر مختصر تعریف وہی ہے جو "ایساغوجی" کی منطق کی ابتدائی کتاب
میں عہد طفولیت میں پڑھائی گئی تھی یعنی "انبساط و انقباض کی کیفیت نفس میں جس سے پیدا ہوتی ہو"۔ انبساطیہ یا طربیہ ا
یا حزنیہ (کامیڈی اور ٹریجڈی) نظم کی ان دونوں قسموں کے لحاظ سے امجد کے شعر کی تاثیری کیفیت کا اندازہ آپ کو
ذیل دو مشاہدات سے ہو سکتا ہے۔

حضرت مولانا حکیم برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولانا حکیم سید محمد احمد مرحوم جن کی شادی حیدرآباد
سید مختار احمد مرحوم مشہور مصنف کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ یہی مولانا حکیم سید محمد احمد حیدرآباد ایک دفعہ اپنے بال بچوں کے
آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ان سے حضرت امجد کی نظموں کا وہ مجموعہ پڑھنے کے لئے لے گئے جس میں قیامت صغریٰ والی مشہور
بھی شریک تھی۔ حیدرآباد کا مشہور تاریخی طوفان جس میں دوسروں کے ساتھ حضرت امجد کا بھی سارا خاندان نذر آب ہو گیا
ایک وہی کسی نہ کسی طرح اس طوفانی تہلکہ سے بچ نکلے تھے۔ اس نظم کو مولانا سید محمد احمد مرحوم کہتے تھے کہ قیام گاہ پر پہنچ
پڑھنے لگا۔ رات کا وقت تھا پڑھتے پڑھتے اچانک مجھ پر یہ حالت طاری ہوئی کہ گویا طوفان کا وہی سماں میرے سامنے قائم
بھاگ دوڑ مچی ہوئی ہے۔ اسی اثنا میں مجھ پر ایسی بدحواسی چھائی کہ پلنگ سے بے تحاشا اٹھ کر اس چارپائی کی طرف دوڑ پڑا
میری بچی فاطمہ سلائی ہوئی تھی۔ وہ سو رہی تھی اور میں بار بار اس کے چہرے کو یہ سوچتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ خدا نے بڑا
کیا۔ طوفان کے ریلے میں بہہ جانے سے بچی بچ گئی۔

---

[1] قرآن کی سورۃ الشعراء کی ان آیتوں کی طرف اشارہ ہے یعنی "الشعراء یتبعهم الغاوون الم تر انهم فی کل واد یهیمون"
کے پیچھے بھٹکے ہوئے لوگ ہو جاتے ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شعرا ہر وادی میں سرگرداں پھرتے رہتے ہیں؟

... مولانا حکیم محمد احمد صاحب ایک صاحب فضل و کمال بزرگ تھے۔ نواب صاحب ٹونک کے طبیب خاص تھے مگر امجد کی شاعری کا یہ اثر تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے ہوش و حواس کو حکیم صاحب مرحوم جیسے آدمی بھی گویا کھو بیٹھے تھے۔ نظم کے اقتباس حصہ کی یہ ایک تاثیری مثال تھی۔ اسی طرح ایک صاحب جو اس وقت بحمد اللہ زندہ ہیں فقیر سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ حیدرآباد میں ان کو ایک معقول ملازمت بھی مل گئی تھی۔ ایک دن حضرت امجد کی نظم

ع مفت بیچاری ضرورت ہر جگہ بدنام ہے

پر ان کی تقریظ یا ترتیب اسی ضرورت کے ہتوڑوں کے مجروحوں میں تھے۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ـــــ

کلی والو روتے ہو کیوں دو شالے کیلئے     یہی جو کچھ ہے بہت ہے مرنے والے کے لئے

تو یہ واقعہ ہے کہ اسی وقت اپنی نوکری سے دست بردار ہو کر تقریباً تیس سال سے ایک ایسی زندگی گذار رہے ہیں جس میں "جو کچھ" بھی ان کو میسر آ جاتا ہے۔ سمجھتے ہی نہیں بلکہ سمجھتے بھی ہیں کہ مرنے والے کے لئے وہی بہت ہے اور یوں ایک خاص قسم کی انبساطی زندگی کے حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔

اور یہی بات تو یہ ہے کہ دوسروں سے زیادہ اپنی شاعری سے خود حضرت امجد جتنا متاثر ہوئے شاید شاعروں کی دنیا میں اس کی نظیر مشکل ہی سے ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ اسی لئے "انہم یقولون ما لا یفعلون" (شعراء ایسی باتیں بتاتے ہیں جس پر خود عمل نہیں کرتے ہیں) کی تیسری قرآنی خصوصیت جو شاعروں کی بیان کی گئی ہے اس سے بھی ان کا دامن پاک رہا۔ دوسروں کے ساتھ جس کا ایک زندہ گواہ خود یہ فقیر بھی ہے۔ تقرر، ترقی، بقایا، بنگلے اور گھوڑے والے مرحوم پرانے حیدرآباد میں یہ واقعہ ہے کہ بالائی طبقات ہوں یا نشیبی درکات جو جہاں تھا عموماً انہی چند الفاظ کی رٹ اسے لگی رہتی تھی جب تک ملازمت انہیں ملی تھی۔ تقرر، تقرر کے بعد ترقی، ترقی کے بعد بقایا کے وصول کرنے کا ایک چکر تھا جو جاری تھا۔ اس "چکر" سے وصول کر کے لانے والے جو کچھ لاتے تھے زیادہ تر وہ بنگلوں اور ان ہی بنگلوں کے گملوں کے نذر ہو جاتا تھا۔

لیکن اس کا میں گواہ ہوں کہ امجد جب محاسبی کے محکمہ میں غالباً پچاس، ساٹھ روپے ماہوار کے عملوں میں شریک تھے۔ حالانکہ اس وقت بھی ان کی ملاقاتیں بڑی بڑی اونچی کرسیوں والوں سے ہوتی تھیں۔ بسا اوقات فقیر بھی ہم رکابی میں ہوتا لیکن یاد نہیں آتا کہ اس زمانے میں جو لے رہے تھے دے رہے تھے ان میں سے کسی کے سامنے امجد کی زبان سے کبھی ترقی یا بقایا کے الفاظ اشارتاً یا کنایتاً بھی نکلے ہوں۔ "می گذرد" کا شاعر صرف "می گذرد" کا شاعر ہی نہ تھا قوال سے زیادہ کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کے اس "گر" کا وہ فعال بھی تھا۔ دوسروں سے نہ سہی خود مجھ جیسے نیاز مندوں سے جیسی بے تکلفی تھی بہ آسانی وہ اپنا ہوس کا تذکرہ اسی طرح کر سکتے تھے جیسے بوالہوسوں کا یہ ریوڑ صبح و شام اپنی قصیدوں میں غلطاں و پیچاں رہتا تھا۔ مگر بولتا تھا کہ

"از ہوسہا بگذر یا گذری گذرد"

اسی وعدے پر میں گواہ ہوں وہ اپنی زندگی کو واقعتاً بہتے بہتے چلاتا ہی جاتا تھا۔ برس دو برس نہیں، کہہ سکتا ہوں کہ پاؤ صدی قریب قریب عہدہ پرستی کی اسی کیفیت میں گذرتی ہی چلی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ سنتا ہے اور کچھ نہیں سنتا۔ سب کچھ دیکھتا ہے اور کچھ نہیں دیکھتا۔ اس زمانے میں ایسوں کو بھی میں نے دیکھا کہ "آمدن نامہ" پڑھ کر منصفی اور ججی کے عہدوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن امجد جو باضابطہ تعلیم گاہوں کی سندیں اپنے پاس رکھتا تھا اردو، فارسی، عربی زبانوں کی کتابیں بھی بہ آسانی پڑھا سکتا تھا وہ پچاس ساٹھ روپے پر محاسبی کے غیر شاعرانہ دفتروں کا غذوں کی خانہ پری کا کام برسوں

کستا رہا۔ "کاخ و خاک" کو برابر سمجھتے کے اس سلسلے میں یہ میرا چشم دید مشاہدہ ہے کہ کچھ دن عاریت کے دیئے ہوئے مکان سے منتقل ہو کر حضرت امجد نے سرکاری "بیت المعذورین" سے متصل ایک چھوٹا سا مکان بھی حاصل کیا تھا۔ اور کافی مدت "بیت المعذورین" کے اس مکان میں گذاری۔ نیاز مندوں کو مجبوراً ملنے کے لئے اسی مکان میں حاضری پر مجبور رہنا پڑتا تھا۔ کچھ دن یوں بھی گذرے تھے کہ سر سالار جنگ کی ڈیوڑھی کے پاس ایک کہنہ قدیم فرسودہ کوٹھری تھی۔ حضرت امجد نے اس کو بھی اپنے مسکن بننے کا شرف کچھ دنوں کے لئے عطا فرمایا تھا۔ اس زمانے کا پروگرام یہ تھا کہ دفتر سے آنے کے بعد (امنو) چولھے پر کھچڑی چڑھا دی جاتی تھی اور خود لنگی باندھ سامنے کے ایک حوض میں شغل شناوری فرماتے۔ کھچڑی اس عرصے میں تیار ہو جاتی اور مٹی کا ایک لوٹا جو اس کوٹھری میں پڑا رہتا اس میں پانی بھر کر لایا جاتا۔ کھچڑی نوش جاں فرمائی جاتی اور مٹی کے اس بدھنے میں پانی پی فطری تقاضوں کا جواب دے کر یہ کہتے ہوئے ایک شطرنجی پر دراز ہو جاتے کہ :—

گر امیروں کی باقبال گذر جاتی ہے  بیکسوں کی بھی بہر حال گذر جاتی ہے

نیند آ جاتی۔

وقت گذرتا رہا۔ اس عرصے میں ان کے علم کے بغیر کچھ کارروائیاں بطور خود اس فقیر نے کیں جو ناکام پر ختم ہوئیں۔ آخر ایک دن توپ کے سانچے کے ایک مکان میں فقیر فرد کش تھا دیکھا کہ موٹر وقت کے صدر اعظم نواب حیدر نواز جنگ مرحوم کی کھڑی ہوئی ہے۔ لانے والے نے ایک خط جو فقیر کے نام موسوم تھا حوالے کیا جس میں لکھا تھا کہ "کچھ تحائف آپ کے دوست حضرت امجد کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ آپ ان کو ان کی خدمت میں پہنچا دیجئے اور ان سے درخواست دیجئے کہ فقیر کے گھر تک قدم رنجہ فرمانے کی زحمت کیا گوارا کر سکتے ہیں؟"

یکفی باللہ شہیدا" کہ اس سلسلے میں کسی قسم کی سلسلہ جنبانی اس فقیر کی طرف سے نہیں ہوئی تھی قطعاً ایک غیبی لطیفہ تھا جو سامنے آیا تھا۔ اسی موٹر پر بیٹھ کر مستعد پورہ پہنچا۔ جہاں اس زمانے میں حضرت امجد نے ایک مکان مول لیا تھا۔ خدا جانے کن لوگوں کا یہ مکان تھا۔ ان کی قبریں بھی اسی مکان کے ایک حصے میں تھیں۔ آمنے سامنے دو تختیاں حضرت امجد نے اس مکان کے کمروں میں لگا رکھی تھیں۔ ایک تختی پر لکھا ہوا تھا "ہذا قبورہم" اور دوسری تختی جو ان کمروں کے سامنے آویزاں تھی جن میں لوگ رہتے تھے اس پر لکھا تھا "ہذا قصورہم"۔ مستعد پورہ کی جو سڑک گولکنڈے کی طرف سیدھی چلی جاتی ہے۔ اس کے شمالی پہلوؤں کی گذرگاہوں میں ایک گذرگاہ حضرت امجد کے اس عجیب و غریب قبور و قصور والے مسکن تک آدمی کو مختلف پیچ دار گلیوں سے گذرنے کے بعد پہنچاتی تھی۔ اسی مکان میں پہنچا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔ لاحول ولا قوۃ یہ کیا قصہ ہے؟ کچھ اسی قسم کے الفاظ میں ان کے رد عمل کا ظہور ہوا۔ جو خلاف توقع نہ تھا۔ بڑی مشکل سے تحائف کے قبول کرنے اور معاوضہ ان کا یہی صدر اعظم بہادر کے در دولت کی حاضری کی صورت میں ادا کرنے پر راضی کرنے میں کامیاب ہوا۔

## عجیب بات

پھر وہی ترقی وہی تھا یا اور خدا جانے کیا کیا جن کے لئے سرمارنے والے برسوں سے حیدر آباد کی گلیوں اور کوچوں میں یوں پھرتے تھے اچانک دیکھا گیا کہ حضرت امجد کے قدموں پر یہ سب کچھ لوٹ رہا ہے۔ ان کو ترقی بھی مل گئی۔ بقایا کی شکل میں بہت رقم بھی گو تند پہچانے والوں نے پہنچا دیا۔ عزت کے ساتھ وظیفہ یاب بھی ہوئے۔ جس نے کبھی بس بھر پڑا بھی نہ تھا اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ ایک نہیں وہ دو نئے مکانوں کا مالک آبادی کے اس حصے میں بنا دیا گیا ہے جہاں رہنے کے لئے اور مکان حاصل کرنے کے لئے

آسمانوں کے قلابے زمین سے ملانے والے اس زمانے میں ملایا کرتے تھے۔

| | |
|---|---|
| ما یفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لہا وما یمسک فلا مرسل لہ من بعدہ وہو العزیز الحکیم | لوگوں کے لئے اللہ اپنی رحمت سے کچھ کھول دے تو اس کا روکنے والا کوئی نہیں اور جسے اللہ روک دے تو اس کے بعد کوئی نہیں اس رحمت کا بھیجنے والا۔ وہی عزت والا اور حکمت والا ہے۔ |

کی قرآنی آیت کی تفسیر حضرت امجد کی زندگی میں پڑھ کر خاکسار حیدرآباد کی اس زندگی سے الگ ہو گیا اور آنے والی موت کے انتظار میں لکھوکھا آبادیوں سے دور ایک ایسے دور افتادہ کوزہ گاؤں میں گذار رہا ہے جہاں سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی مردہ لاش کو سپرد خاک کرنے والے میسر بھی آسکیں گے یا نہیں۔ واللہ علیٰ ما یشاء قدیر۔

فالحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل وکبرہ تکبیرا تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بیدک الخیر انک علیٰ کل شیء قدیر۔

مناظر احسن گیلانی

---

# شاعر قوم سے

اے کہ ترا وجود ہے باعثِ فخر روزگار
علم و ادب کے باغ میں تجھ سے ہے سرمدی بہار

خامۂ زرنگار پر شعر و سخن کو فخر ہے
فیض کلام سے ترے حسن کا ہے اوج اعتبار

شعر ہے تیرے جلوہ گر نور حقیقت و مجاز
لعل و گہر ہیں ضوفشاں ہے یہ وہ سلک آبدار

شاہد معنوی پہ تھا پردۂ تعینات
تو نے ادائے خاص سے کر دیا اس کو آشکار

سوز و گداز عشق سے لفظ ترے کلام کے
روکش اخگر تپاں غیرت کوہ شعلہ بار

تیرے دل تپاں سے ہے ابر میں برق کی تڑپ
قوم سکون دوست کو پھر سے بنا دے بیقرار

روح و نظر میں ہے تری قوت ہمت و اثر
سب کو سمیٹ ایک جا پھر انہیں لا بروئے کار

اے کہ ہے ترجمان قوم کا ہاتھ تھام لے
تیری دہائی دیتے ہیں دل جلے اور جگر فگار

محمد عبد السلام ذکی

---

# حضرت امجد کا شرف و مجد

ادب اس دنیا کے طاق کی شمع طور اور اس زندگی کے تاج کا کوہ نور ہے لیکن اس غیر حساس دنیا میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ مبذول فرمائی جاتی ہے وہ یہی بدبخت ادب ہے اور خصوصیت کے ساتھ آج کل جبکہ پیرزن سیاست تمام انسانی عظمتوں کے موتیوں کو نقد گنگے کے ہر گرفتے سے چن چن کر اپنے ہار میں گوندھ چکی ہے اور ارباب اقتدار کی کرسیوں کے طواف کی خاطر تمام انسانی کارواں در کارواں چلے آ رہے ہیں۔ کسی کو اس بات کی فرصت نکالنے کا وقت نہیں مل رہا ہے کہ وہ بارگاہ ادب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے اور ان آفاق شکار حضرات کی خلوتوں میں دو زانوں ہو کر بیٹھے جو اپنے انفاس کی ترانوں میں آفاق کو تولتے اور اپنی پلکوں کی لرزشوں سے کائنات کے عقدے کھولتے ہیں۔ سماعتیں ابھی تک اس قدر سوتی اور کھوئی ہیں کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے دلوں کی ان دھڑکنوں کو سن نہیں سکتیں جن میں شعریت کی موسیقی جو لاجولتی اور اپنی تانوں پر کائنات کی روح کو رقص پر مجبور کر دیتی ہے۔

سیاست کے منبر و محراب کی تقریریں بڑے شوق سے سنی جاتی ہیں۔ حالانکہ وہ تمام تقریریں مرے ہوئے جانوروں کی ہڈیوں کی طرح سخت اور تپتے ہوئے شیشم کے برادے کے مانند خشک ہوتی ہیں لیکن ایک کان بھی ایسا نہیں تھا جو اس پر آمادہ ہو کہ اپنے پیالے میں شعر و موسیقی کا شہد گھولے اور اس سے اپنی بصیرت کی آنکھیں کھولے کس سے کہا جائے کہ اس کرۂ ارض پر اگر کوئی حقیقی اور پائیدار عظمت پائی جا سکتی ہے تو وہ صرف عظمت شاعرانہ ہے اور یہ وہ عظمت ہے کہ دنیا کی تمام عظمتیں اس کے قدموں پہ سربسجود نظر آتی ہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ شاعر اپنی موت کے بعد اپنی زندگی کا آغاز کیا کرتا ہے اور

شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

کے سہارے اپنی درماندہ زندگی کی شام امید کے چراغ جلاتا رہتا ہے پھر بھی اپنی زندگی کی درماندگی کے باوجود جب وہ یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

تو اس زمین کے تمام ذرے اور اس آسمان کے تمام تارے اس دعوے کی تصدیق کرتے اور یہ بانگ دہل کہتے ہیں کہ اس آواز پر جو ایمان نہیں لاتا کافر ہے۔

مجھے کامل یقین ہے کہ بہت ہی کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ شاعری ایک نہایت دردناک عمل کا نام ہے اور یہ عمل اس قدر صعوبت انگیز ہے کہ اگر پہاڑوں اور آسمانوں پر اسے نازل کیا جائے تو ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر رہ جائے گی۔ تخلیق ادب و شعر کے کرب کو بیان کے سانچے میں ڈھالا نہیں جا سکتا اور اگر اسے بیان کرنے کی سعی کی جائے گی تو

الفاظ سے خون ٹپکنے لگے گا۔

ہر سانس میں ہوتے ہیں دل و جاں غربال　　ہر آن میں بھنتے ہیں لاکھوں سر و مال
اس کرب کی شرح غیر ممکن ہے ندیم　　جس کرب کے ساتھ حرف بنتا ہے خیال

اور

یہ اپنے ہی خوں میں نہانے والے　　یہ تاب زباں سخن کے لانے والے
واللہ کہ ہیں چشم و چراغ آفاق　　یہ فکر کو آواز بنانے والے

فکر کو آواز بنانا ہنسی کھیل نہیں۔ یہ ملکوں کے زیر و زبر اور شمس و قمر کے مسخر کر لینے سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر دنیا کے تمام فاتحوں، موجدوں، عالموں اور سائنسدانوں میں کسی پر تخلیق شعر کا ایک لمحہ بھی طاری کر دیا جائے تو یہ میرا دعویٰ ہے کہ وہ ایک پل کے اندر خون تھوک کر مر جائے گا۔ لیکن یہ صنف اس قدر ازلی بدبخت ہے کہ اس کے سمجھنے اور اس کے پرکھنے والے کہیں صدیوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے عظمت سخنداں کے چہرے پر ناقدری کی گرد پڑی رہتی ہے اور ؂

تا قبر یہی ناقداں گل پھول چڑھائیں　　خوبان صدف عذار موتی برسائیں
کہتا ہے مرا وطن کہ از راہ کرم　　حضرت اب انتقال فرما جائیں

چنانچہ اس ناقدری اور سرد بازاری کے دور میں جب میں نے یہ سنا کہ میرے دوست حضرت امجدؔ کی حیدرآباد میں جوبلی منائی جا رہی ہے تو میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور ؂

پس از مدت گزر افتاد بر ما کارواں را

گنگنانے لگا۔ حضرت امجد کا شوق و وجد دراصل اس کا مقتضی تھا کہ ان کی قدرشناسی کی جاتی۔ میں آپ تمام حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے امجد کی جوبلی منا کر اپنے ذوق کی صحت اور اپنے ذہن کی شرافت کا کتنا بڑا ثبوت دیا ہے جس کا ذکر ناممکنات سے ہے۔

حضرت امجد میرے پرانے دوست ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے بھولے پن کی بنا پر ایک ایسے جادہ پر گامزن ہیں جس کے دونوں طرف بوڑھی عورتوں کی سی عقیدت رکھنے والے درویشوں کے خیمے نصب ہیں لیکن اس اختلاف مسلک کے باوجود جب میں امجد کی رباعیاں پڑھتا ہوں اور سنتا ہوں تو جھوم جھوم جاتا ہوں یہ امجد کی شاعرانہ عظمت کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ میں بھی ان کے اشعار پر وجد کرتا ہوں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ میں اپنے کو خدانخواستہ کوئی بڑا آدمی سمجھتا ہوں میرا مقصد اس سے یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان کے اشعار کی معنویت سے غیر متفق ہونے کے باوجود میں ان کے اشعار پر سر دھنتا ہوں اور وہ شاعر جو منکر و مخالف کو بھی داد دینے اور قدر کرنے پر بھی مجبور کر دے کوئی معمولی شاعر نہیں ہو سکتا۔ اختلاف مسلک کی بنا پر میں نے اکثر یہ چاہا کہ میں ان کے اشعار سے لطف اندوز ہونا ترک کر دوں مگر شباب والا جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں اس پر قادر نہ ہو سکا اور کیسے ہو سکتا ؂

ہم نے برسات کے موسم میں جو چاہی توبہ　　ابر اس زور سے گرجا کہ الٰہی توبہ

ایک اچھے شاعر کے دوش بدوش امجد صاحب ایک اچھے اور بہت اچھے انسان بھی ہیں اور ان کی ذات میرے اس قول کی بانگ دہل تصدیق کرتی ہے ............ یہ میرا دعویٰ ہے کہ اچھا شاعر کبھی برا آدمی نہیں ہو سکتا اور میں جب امجد کی طرف نظر اٹھاتا ہوں تو اپنے

دعوے کی تصدیق کو زندہ و مجسم دیکھ لیتا ہوں ۔ امجد شاعر ہیں ۔ انسان ہیں ۔ نیک نفس اور رقیق القلب انسان ہیں ۔ یہ رقیق القلبی ان کی خوش قسمتی بھی ہے اور بدبختی بھی ۔ خوش قسمتی اس لحاظ سے ہے ۔

ع آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

کے دور میں بھی وہ انسان ہیں ۔ صحیح معنی میں انسان ـــ اور بدبختی اس لحاظ سے ہے کہ وہ بے چارے افسانہ و فسوں میں مبتلا ہو کر وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں یہ دردناک آواز گونجا کرتی ہے ۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی　　کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس کے علاوہ امجد میں ایک آن بھی ہے ۔ ایک ایسی آن کہ اس سن و سال میں بھی ان میں معشوقیت پائی جاتی ہے اور شاید حافظ نے انہی کے لئے کہا تھا ۔

بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

یہ بندۂ خاکسار اور یہ رندِ جہاں اگرچہ کہ ازلی بت پرست ہے پھر بھی امجد کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے ۔

آرے آرے می کنم با خلق عالم کار نیست

امجد جس ادا سے آنکھ اٹھاتے اور جس شیرینی سے مسکراتے ہیں اس پر ہزاروں پری زادوں کو قربان کیا جا سکتا ہے اور اس وقت جب کہ وہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں میں حاضرین کو چیلنج دیتا ہوں کہ

اینست کہ دل بردہ و خوں کردہ بسے را　　بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

جوش برلسبتر ہوشی

---

# کلامِ امجد

یہ خورشید و قمر کیا دیکھتے ہو

فضائے بحر و بر کیا دیکھتے ہو

کسی کے حکم سے سب ہو رہا ہے

اُدھر دیکھو ۔ اِدھر کیا دیکھتے ہو

# گلستانِ امجد

تاروں بھری رات میں آسمان پر چمکتا ہوا تارہ حسین نظر آتا ہے۔ مگر چاند کی چمک دمک کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ حضرت امجد آسمان رباعی کے چاند ہیں۔ آپ نے نہ صرف اردو رباعی میں بقائے دوام کا خلعت اعلیٰ حاصل کیا بلکہ نثر میں بھی کافی خامہ فرسائی کی ہے۔ جس طرح کہ فارسی ادب میں سعدی علیہ الرحمہ نے نہ صرف شاعری میں نام پیدا کیا بلکہ چھوٹے چھوٹے فقروں والی نثر کی پایوں میں قند و نبات کو گھولا ہے۔ اسی طرح حضرت امجد نے بھی اردو ادب میں نظم و نثر کو ترکیب دے کر شراب دو آتشہ تیار کی ہے اور سعدیؒ کی طرح مجاز کو حقیقت کا پردہ بھی بنایا ہے۔ بقول مولانا سلیمان ندوی اس مماثلت نے وحدتِ اتحاد کی صورت اختیار کی اور "گلستان امجد" اپنا نام رکھا۔

کہنے کو تو یہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ مگر حقیقت میں امجد کی تصنیف ہے۔ اس میں امجد نے سعدیؒ کے خزانۂ خیال پر اس طرح قبضہ کیا ہے کہ وہ قابض کی ملک ہوگیا ہے۔ سعدی کی نظم و نثر دونوں کا ترجمہ مترجم نے نثر میں کر دیا ہے اور سعدی کی نظم کی جگہ اپنی ہم معنی فرد، قطعہ یا رباعی درج کی ہے اور اس طرح گلستان سعدی گلستانِ امجد بن گئی ہے۔

سعدی کی گلستاں کی طرح گلستان امجد بھی آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور ابواب کی یہ تعداد "ہشت بابِ بہشت" کی مماثلت سے رکھی گئی ہے۔ پہلے باب میں بادشاہوں کے واقعات اور دوسرے باب میں فقیروں کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرا باب قناعت کی فضیلت میں لکھا گیا ہے۔ چوتھے باب میں خاموشی کے فوائد بتائے گئے ہیں۔ پانچویں باب میں عشق و جوانی کی کیفیات کا ذکر ہے۔ چھٹا، ساتواں اور آٹھواں باب علی الترتیب ضعف پیری، تربیت اور آداب صحبت سے متعلق ہے۔

گلستان امجد کے ان آٹھ ابواب میں امجد نے نہ تو اپنی بلند پروازی یا نازک خیالی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے نہ ہی عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل لبھانے اور عجائبات کا طلسم باندھ کر انھیں محو حیرت بنانے کی سعی کی ہے۔

ہر حکایت کے ختم پر امجد نے حکایت سے سبق دینے کی کامیاب کوشش کی ہے اور حکایتوں کے سبق آموز نتائج اس قدر موزوں جملوں میں رقم کیا ہے کہ جگر کے ٹکڑے الفاظ کے سانچوں میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حکایت ملاحظہ ہو۔ جس میں امجد نے سادہ و بامحاورہ اردو استعمال کر کے ترجمہ کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

حکایت :- ایک مرتبہ قزاقوں کی ایک ٹولی کو گرفتار کر کے کسی بادشاہ کے آگے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے سب کے قتل کا حکم دیا۔ ان چوروں میں ایک نوعمر لڑکا بھی تھا جس کی مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ اس کی کمسنی پر کسی وزیر کو رحم آگیا۔ دست بستہ بادشاہ سے عرض کی۔ حضور اس لڑکے نے ابھی اپنی جوانی کی بہار نہیں دیکھی ہے۔ اگر اس کی جاں بخشی کی جائے تو

مجھ پر بڑا ہی احسان ہوگا۔ بادشاہ نے وزیر کی اس سفارش سے ناراض ہو کر فرمایا۔ بدفطرت انسان نیکوں کے فیض صحبت سے کبھی نیک نہیں ہو سکتا۔ ان کی جڑ ہی کاٹ دینی چاہیے۔ آگ بجھا کر چنگاری رکھ چھوڑنا سانپ کو مار کر سانپ کے بچے کی نگہداشت کرنا عقل مندی کی دلیل نہیں۔ ابر سے آب حیات ہی کیوں نہ برسے مگر شاخ بید کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔ بدفطرتوں کی تعلیم پر اپنا وقت خراب نہ کرو۔ یہ دلائل سن کر وزیر نے بادشاہ کی دوراندیشی کی تعریف کی لیکن مکرر کہا کہ حضور نے جو کچھ بھی ارشاد فرمایا ہے نہایت بجا اور درست ہے۔ لیکن یہ صورت اس وقت پیش آسکتی ہے جب کہ وہ بری صحبت سے متاثر ہو کر ان کی عادتیں بھی اختیار کر لیتا۔ ابھی تو وہ نوعمر ہے اور بروں کی صحبت سے متاثر نہیں ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو شریفوں کی صحبت میں رکھ کر تربیت دیجائے کیونکہ ہر شخص سادہ فطرت لئے ہوئے پیدا ہوتا ہے۔

اور وزراء نے بھی اس وزیر کی تائید کی، بادشاہ نے کہا گو خلافِ مصلحت ہے۔ مگر خیر تمہارے کہنے سے معاف کئے دیتا ہوں۔ بالآخر اس چور بچہ کو ناز و نعمت سے پالا گیا۔ بڑے بڑے لائق اساتذہ اس کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے۔ تقریر، تحریر اور آداب دربار شاہی وغیرہ کی تعلیم دی گئی۔ اس کے چال چلن اور حسن قابلیت وغیرہ کو سب نے پسند کیا۔ ایک دفعہ اسی وزیر نے بادشاہ سے بھی کہہ دیا کہ اب تو وہ لڑکا بہت کچھ سنبھل گیا ہے اور تعلیم کی وجہ سے اس کی اخلاقی حالت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ بھیڑیئے کا بچہ آدمی کی صحبت میں رہ کر کبھی آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکا دو ایک سال کے بعد غنڈوں کی صحبت کی وجہ سے پھر اپنی اصلیت پر آگیا اور ایک دن موقع پاکر اپنے محسن وزیر اور اس کے دو لڑکوں کو قتل کر کے نقد جنس لے کر نکل گیا۔ بادشاہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

" خراب لوہے سے اچھی تلوار نہیں بن سکتی۔ برسات اگرچہ لطیف شئے ہے لیکن اسی برسات سے باغ میں پھول اگتے ہیں اور جنگل میں گھاس پیدا ہوتی ہے۔ خراب زمین میں سنبل نہیں اگا کرتی۔ تم ایسی زمین میں تخم ریزی کر کے اپنا وقت ضائع نہ کرو۔"

ایک دوسری حکایت سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ بروں سے بھلائی حقیقت میں نیکوں کے ساتھ برائی ہے اور پھر اس حکایت کے اس سبق آموز نتیجہ کا ماحصل اپنی ایک رباعی میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

ہم صحبتِ بے خرد پریشان رہا | نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی | نادان کو اتنا بھی تو نادان رہا

گلستانِ امجد کی خصوصیت یہ ہے جس طرح گلستانِ سعدی میں سعدی کے کئی اشعار جو حکایتوں کے درمیان میں لکھے گئے ہیں۔ اپنی جدت، شوخی، ظرافت اور سادگی کے باعث زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں۔ اسی طرح گلستانِ امجد میں حکایتوں کے دوران میں یا عموماً ان کے اختتام پر حضرت امجد نے جو رباعیاں لکھی ہیں وہ اپنی ظرافت، شوخی اور سادگی کی وجہ سے قبول عام کا درجہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

تو ہے کہ ہمیشہ رحم فرماتا ہے | امجد ہے کہ راہ پر نہیں آتا ہے
میں خوگر جرم تو کرم کا عادی | ہم دونوں میں دیکھیں کون تھک جاتا ہے

پہلے باب میں اکتالیسویں حکایت سب سے چھوٹی اور سب سے آخری حکایت ہے۔ کسی نے سکندر سے پوچھا کہ آپ ساری دنیا کے بادشاہ کس طرح ہو گئے۔ حالانکہ شاہان سلف کو آپ سے زیادہ دولت وقوت حاصل تھی مگر ان کو بھی ایسی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ سکندر نے کہا کہ خدائے تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے جس ملک کو فتح کیا وہاں کی رعایا کو کبھی تکلیف نہیں دی اور اسلاف کی نیک یادگاروں کو اسی طرح قائم رکھا اور نیکوں کی کبھی برائی نہیں کی۔ کیونکہ نیکوں کو برا کہنے والا کبھی نیک نہیں ہو سکتا ؎

خیر و شر کا جب ایک مرکز ہے		حق سے باطل کو بھی جدا نہ کرو
چاہتے ہو بھلائی گر اپنی		تم کسی بد کو بھی برا نہ کہو

باب اول کے خاتمے پر "خلاصہ مافی الباب" کے عنوان سے ایک رباعی لکھی ہے جس میں اخلاق نوازی کا پہلو اپنے عروج پر ہے ؎

اگر ہے منظورِ عزِّ کعبہ		کبھی نہ تحقیر دیر کیجئے
بدوں کے حق میں بھی حتی الامکاں		دعائے توفیق خیر کیجئے

دوسرے باب میں جملہ (۸۴) حکایتیں ہیں لیکن اس باب میں جگہ جگہ رباعیوں اور مناسب و موزوں اشعار کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ اس دوسرے باب کی ایک حکایت "غریب جیتے کیوں ہیں؟ امیر مرتے کیوں ہیں؟" بڑی خاص اور دلچسپ ہے۔ اس حکایت میں کسی امیر اور فقیر کے مکالمے کو دو رباعیات کی شکل میں پیش کیا گیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ امیر کسی غریب کو حقارت سے دیکھ کر کہتا ہے ؎

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں		مردود در حبیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا		معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

فقیر جواب دیتا ہے ؎

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں		سر چڑھ کے زمین میں اترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں		معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

دوسرے باب کی کئی حکایتوں میں امجد کی نثر نگاری کا پہلو ظریفانہ ہو گیا ہے۔ بالخصوص ان حکایتوں کے دوران میں یا اختتام پر جو رباعیات یا اشعار لکھے گئے ہیں ان میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مثلاً

الفت میں عجب دردِ سری ہوتی ہے		دل جلتا ہے آنکھوں میں تری ہوتی ہے
فولاد سے سخت دل پگھل جاتے ہیں		اچھی صورت بھی کیا بری ہوتی ہے

ایک حکایت میں لکھتے ہیں کہ "حضرت ناصح اگر کبھی ہم رندوں کی محفل میں آ جائیں تو وہ بھی ساغر کی طرح شراب پر ٹوٹ پڑیں۔ جب منع کرنے والا ہی جام پر جام اڑائے تو ایسے بدمستوں کو کون روک سکتا ہے ؎

پھر خود میں نہ آتے گر کبھی پی لیتے		ہر ساغر کی بھی پی پی کے لیتے
کرتے کس منہ سے پھر مذمت مے کی		اک مرتبہ کاش! شیخ جی پی لیتے

اسی طرح اس دوسرے باب کی ایک حکایت کے اختتام پر ایک اور ظریفانہ رباعی اس طرح پیش کرتے ہیں

کھانا نہ ملے تو رنج و غم کھاتے ہیں　　باہر آپے سے ہم ہوئے جاتے ہیں
بھوکے سے تو نثر بھی نہیں بن سکتی　　جب پیٹ بھرے تو شعر یاد آتے ہیں

تیسرا باب قناعت کی فضیلت سے متعلق ہے۔ ابتداء ہی میں "وجہ سوال" کے زیر عنوان باب کا ماحصل بیان کیا گیا ہے

کوئی عالم ہو یا ولی زادہ　　گر شرافت نہیں تو کیا حاصل
لاکھ ہو کوئی لکھ پتی امجد　　جب قناعت نہیں تو کیا حاصل

یہ باب صرف (۲۷) حکایتوں پر مشتمل ہے۔ پہلی حکایت میں علم و دولت کا مقابلہ بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ حکایت یہ ہے کہ" ملک مصر میں دو امیر زادے تھے جن میں ایک تو علم حاصل کرتا تھا اور دوسرا دولت جمع کرتا تھا ایک مدت کے بعد علم سیکھنے والا علامہ ہو گیا اور دولت جمع کرنے والا عزیز مصر بن گیا۔

ایک دفعہ دولت مند عزیز مصر نے اپنے مفلس علامہ بھائی سے کہا کہ دیکھو میں نے دولت جمع کر کے سلطنت حاصل کر لی تم اس طرح فلاکت میں پڑے رہے۔ بھائی نے کہا پھر بھی میں تم سے اچھا ہوں کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے پیغمبروں کی میراث عطا کی یعنی علم اور تم کو فرعون و ہامان کی وراثت سے حصہ ملا یعنی ملک مصر۔ اب تم ہی کہو کہ تم اچھے ہوئے یا میں اچھا ہوں۔ شکر ہے کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے مورِ ضعیف بنایا جس کو چلنے والے کچل دیتے ہیں زنبور تو نہیں بنایا جس کی ڈنک سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ حسین کی طرح مظلوم ہیں یزید کی طرح ظالم نہیں "۔ خاتمے پر جو رباعی لکھی ہے وہ ملاحظہ فرمائیے

سید ہوں رسول پاک کی اولاد ہوں میں　　تیروں سے ستمگروں کے قرباں ہوں میں
کانٹوں کی طرح کھٹک نہیں ہے مجھ میں　　سبزے کی طرح جہاں میں پامال ہوں میں

دوسری حکایت میں بھی ایک رباعی اور ایک شعر کو اس خوبی سے پیوست کیا گیا ہے کہ حکایت میں جان آگئی ہے۔" ایک فقیر سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے پاس جاؤ جس کی فیاضی سارے شہر میں مشہور ہے۔ فقیر جواباً کہتا ہے بھکاری بن کر کسی کے گھر جانے سے تو خاموشی کے ساتھ مر جانا اچھا ہے۔ کسی کے پاس سفارشی کاغذ کا ٹکڑا لے جانے سے تو ٹکڑے ٹکڑے جوڑ کر پہننا ہزار درجہ بہتر ہے "

بھیک کی زندگی سے موت اچھی　　ایسی شرمندگی سے موت اچھی

آگے لکھتے ہیں" خدا کی قسم ہمسایہ کی سفارش سے جنت میں جانا عذاب جہنم کے برابر ہے "

اس سے خواہش کروں کہ اس سے مانگوں　　کچھ بھی حاصل نہیں ہے جس سے مانگوں
پہلے مجھے حق کیا ہے؟ اگر کچھ ہے بھی　　حق اپنا سوائے حق کے کس سے مانگوں

چوتھا باب" خاموشی کے فوائد" میں لکھا گیا ہے۔ اس باب کی دوسری حکایت دوسری مصیبت کے زیر عنوان لکھی گئی ہے۔ اس حکایت کو پیش کرنے سے قبل اصل فارسی کی حکایت کا جائزہ لیا جاتا ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کس حد تک ترجمہ میں کس قدر روانی ہے۔

" بازرگانی را ہزار دینار خسارت افتاد پسر را گفت بناید کہ با کسی این سخن در میان نہی گفت ای پدر فرمان تراست نگویم ولیکن باید کہ مرا بر فائدۂ این مطلع گردانی مصلحت در نہان داشتن چیست۔ گفت تا زحمت دو نشود یکی نقصان مایہ دوم شماتت ہمسایہ شعر

گمو اندوہِ خویش با دشمنان — کہ لاحول گویند شادی کنان

ترجمہ:۔ کسی سوداگر کا ہزار دینار کا نقصان ہوگیا، اس سوداگر نے اپنے لڑکے سے کہا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر مگر میں بھی تو سمجھوں کہ اس نقصان کے بیان کرنے میں کیا نقصان ہے۔ باپ نے کہا بیان کرنے میں مصیبت دوہری ہوجاتی ہے۔ نقصان مال کی ایک مصیبت دشمنوں کی ہنسی کی دوسری اذیت، دشمنوں سے اپنی مصیبت بیان مصیبت پر مصیبت مول لینا ہے۔

غم کا ہے یہی علاج امجد — خاموشی کے ساتھ رنج سہیے
گر ضبط سے دل ہو ٹکڑے ٹکڑے — بیدرد سے دردِ دل نہ کہیے

اس باب میں صرف (۱۲) حکایتیں ہیں لیکن چوتھی، دسویں اور پندرھویں اور بیسویں حکایتوں میں چند رباعیات اور بعض جملے بڑے دلچسپ ہیں۔ کون اس سے واقف نہیں اور کون یہ نہیں جانتا کہ عشق کی راہ آسان نہیں ہے۔ عراقی نے تو عشق کے متعلق یہاں تک کہا ؎

ہر عالم ہر کجا کہ درد و غم بود — بہم کردند و عشقش نام کردند

ایک اور فارسی شاعر کہتا ہے ؎

عاشقی چیست بگو بندۂ جانان بودن — دل بدست دگرے دادن و حیران بودن

امجد بھی یہی کہتے ہیں کہ راحت طلب الشان عشق کی مصیبتیں نہیں اٹھا سکتا ؎

جور و جفائے یار کی کیجے کیا شکایتیں — عاشق عافیت طلب اس کی گلی میں جائے کیوں
سیکھو طریقۂ وصال سیدنا حسین سے — ہم نہ اگر گلا کٹائیں کوئی گلے لگائے کیوں

پھر کہتے ہیں اگر ہم اس کی حریم خاص میں جا نہیں سکتے تو اس کے آستان پر سر تو پھوڑ سکتے ہیں ؎

در یار میں گر بار نہیں در ہی سہی — مجھ کو ترے آستاں کا پتھر ہی سہی
مقصد یہ ہے کہ تجھ سے مَس ہو جاؤں — دستِ شفقت نہیں تو ٹھوکر ہی سہی

اسی طرح علم محبت کے زیر عنوان پانچویں باب کی حکایت کے دوران میں ایک رباعی میں لکھتے ہیں ؎

دل شاد اگر نہیں تو ناشاد سہی — لب پر نغمہ نہیں تو فریاد سہی
مجھ سے دامن چھڑا کے جانے والے — جا جا، گر تو نہیں، تری یاد سہی

اسی طرح تجدید محبت کے زیر عنوان پندرھویں باب میں لکھتے ہیں یہ سب سے ٹوٹ کر تمہارا ہو گیا تھا مگر نہیں معلوم تھا کہ تم بھی مجھے چھوڑ دو گے ؎

تجھ سے تو بڑی آس تھی دلداری کی — تو ہی دل توڑ دے تو پھر کیا ہوگا
تیرے لئے میں نے دو جہاں کو چھوڑا — تو بھی مجھے چھوڑ دے تو پھر کیا ہوگا

آگے چل کر لکھتے ہیں اگر تم پھر ملنا چاہتے ہو تو آؤ مجھے بھی انکار نہیں پہلے تم آنکھوں میں تھے تو اب دل میں رکھوں گا ؎

اس کے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہے — اپنے آپ کو ہم نے تجھ سے کب جدا پایا
حیلہ ہاتھ آتا ہے خوب پائے بوسی کا — رکھ دیا قدم پہ سر جب انھیں خفا پایا

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس پانچویں باب کی حکایتوں میں اور خصوصاً اس کے اختتام پر لکھی ہوئی رباعیوں میں امجد نے جو فلسفۂ محبت پیش کیا ہے اور جس انداز سے پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

چھٹا باب بھی نہایت مختصر ہے۔ اس میں تو صرف (۸) حکایتیں ہیں۔ اس باب میں تیسری حکایت "ناخلف اولاد" بڑی دلچسپ ہے۔ بالخصوص اس ضمن میں جو رباعی لکھی گئی ہے اس کا ظریفانہ پہلو بہت خاص ہے ؎

باوا کے پھٹے کپڑے ہیں حال ابتر ہے — بیٹا ہے کہ سو پچاس کا افسر ہے
باوا کہتے ہیں باپ ہوں میں اس کا — بیٹا کہتا ہے یہ مرا نوکر ہے

ساتواں باب تاثیر تربیت میں لکھا گیا ہے۔ اس باب کی چوتھی حکایت میں "جورِ استاد بہ زمہر پدر" کے مضمون کو ایک رباعی میں یوں ادا کیا گیا ہے ؎

تکلیف اچھی ہے، رنج و غم اچھا ہے — جس طرح بھی ہو تیرا کرم اچھا ہے
یہ میری خوشی ہے اور وہ تیری خوشی — رحمت سے تری تیرا ستم اچھا ہے

پانچویں حکایت میں ایک مرشد زادے کے متعلق لکھتے ہیں کہ "مست کو بدمستی میں تنگدستی کا خیال نہیں آتا"۔

اب بھی ہے زبان پہ پدرم سلطان بود — فاقوں میں بھی شان کج کلاہی نہ گئی
اب بھی پھرتے ہیں بن کے شاہ جی دنیا میں — کیا خوب! تباہی میں بھی شاہی نہ گئی

ساتویں باب میں حکایتیں بہت کم ہیں۔ آٹھویں باب میں تو حکایتیں ہیں ہی نہیں۔ صرف حکمت، نصیحت اور اشعار ہیں۔ لیکن اس باب کی اکثر حکمتیں، نصیحتیں اور رباعیات زریں حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ بطور حکمت صبر کے تعلق سے لکھتے ہیں۔ ہر کام صبر سے ٹھیک ہوتا ہے۔ جلد باز ٹھوکر کھاتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ جنگل میں اپنی آنکھ [illegible] دیکھا کہ تیز رفتار گھوڑا تھک کر رہ گیا اور اونٹ آہستہ آہستہ چلتا ہوا منزل پہ پہنچ گیا۔ اس کے بعد امجد [illegible] ناکامیوں سے دوچار ہونے والوں کے لئے نہ صرف ڈھارس کا باعث ہے یا وجہ تسکین [illegible] بلکہ امید کی کرن ہے ؎

کچھ وقت میں ایک بیج شجر ہوتا ہے — کچھ دیر میں اک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام — کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

ایک اور حکمت میں لکھتے ہیں۔ سب کے دانت کھٹائی سے کھٹے ہوتے ہیں لیکن حاکموں کے دانت مٹھائی سے کھٹے ہوتے ہیں جو حاکم کہ فریق سے ایک روپیہ لے لیتا ہے پھر اس کو (۱۰۰) روپیے کی ڈگری دے دیتا ہے۔ اس حکمت کے بعد جو رباعی لکھی گئی ہے وہ رشوت خواروں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے ؎

چیز اپنی ہو یا پرائی منہ میں رکھ لی — افیون ہو یا مٹھائی منہ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اب بھی — جو چیز ملی اٹھائی منہ میں رکھ لی

اسی سلسلے کی ایک اور کڑی اس رباعی میں ملتی ہے ؎

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں پھر بھی اثر دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

پیچ تو یہ ہے کہ اخلاقی کتابوں میں اردو ادب میں گلستانِ امجد اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ فارسی نہ جاننے والوں کے لئے تو یہ ایک انمول سرمایہ ہے۔ حضرت امجد نے گلستانِ سعدی کا ترجمہ کرکے واقعی اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔ انھوں نے اپنی گلستاں میں جگہ جگہ اپنی رباعی، فرد، قطعہ وغیرہ کو اس خوبی سے جگہ دی ہے کہ جس کی وجہ ان کی حیثیت بڑی حد تک مترجم سے زیادہ مصنف کی ہو گئی ہے۔ حق تو یہ ہے گلستان امجد پڑھنے کے بعد بقول نذیر جنگ یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے ؎

ترا دیدہ و سعدی را شنیدہ شنیدہ کے بود مانند دیدہ

محمد ہاشم علی

---

# شاعرِ بے مثال

جانِ عشقِ بلال ہے امجد عاشقِ خستہ حال ہے امجد
روحِ حسنِ جمال ہے امجد سر سے پا تک جلال ہے امجد
تو وہ مشکل سوال ہے امجد تیرا حل تو محال ہے امجد
ماضیوں کا تو حال ہے امجد سب بزرگوں کی چال ہے امجد
کیوں نہ کیکو خصال ہے امجد کیوں نہو کس کی آل ہے امجد
وہ تری قیل و قال ہے امجد صوفی خوش مقال ہے امجد
یہ نہ سمجھو کہ قال ہے امجد قال کے ساتھ حال ہے امجد
کیا ہی صاحب کمال ہے امجد بندۂ لایزال ہے امجد
ہاں تو اک دبال ہے امجد تجھ کو حاصل کمال ہے امجد
شاعری لازوال ہے امجد شاعرِ بے مثال ہے امجد
کون تیری مثال ہے امجد کس کی ایسی مجال ہے امجد
آدمی باکمال ہے امجد قدر گو خال خال ہے امجد
سب کو اس کا ملال ہے امجد چونکہ دکنی ہے وال ہے امجد
واہ کیا نیک فال ہے امجد بدر ہوگا ہلال ہے امجد
تیرا ہم سن و سال ہے امجد ہم وطن ہم خیال ہے امجد
تو محمدؐ ہے اور وہ احمدؐ تو ہے آزاد اور وہ امجد
محمد حسین آزاد — احمد حسین امجد

سید محمد حسین آزاد

# امجد بہ حیثیت شاعرِ انسان

حضرت امجدؔ ہندوستان اور پاکستان کے اردو شعراء میں نہ صرف ممتاز بلکہ دورِ حاضر میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جب میں بچہ تھا اس وقت سے مولانا سے واقف ہوں۔ لیکن مجھے ان سے شرفِ شاگردی آج سے (۳۲) سال پہلے ۱۳۳۳ف میں حاصل ہوا۔ ان کے فیضِ صحبت سے متاثر ہو کر شعر کہنا شروع کیا۔ اس وقت جب میری نظر محدود تھی، حضرت امجدؔ کو میں ہندوستان کا واحد رباعی گو شاعر سمجھتا تھا۔ آج (۳۲) سال کے بعد بھی ان کی نسبت میری قطعی رائے یہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مستقبل میں بھی امجدؔ کی ٹکر کا رباعی گو شاعر پیدا نہیں ہوگا۔

مولانا حالؔی کے دوست پروفیسر وحید الدین سلیم اپنی علمی صحبتوں میں حضرت امجدؔ کا اکثر ذکر کیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ رباعی گوئی میں جنوب محض امجدؔ کی بدولت شمال پر سبقت لے گیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ پروفیسر وحید الدین سلیم نے حضرت امجدؔ کی رباعی گوئی پر ایک مقالہ منشی دیا نرائن نگم کے رسالہ "زمانہ" کانپور میں چھپوایا تھا۔ وہ ایک سند تھی جو شمال کے نامور اہلِ زبان، مستند اہلِ قلم اور گراں مایہ شاعر نے جنوب کی ایک فقید المثال ہستی کو عطا کی تھی۔

امجدؔ کی رباعی گوئی کی دھاگ آج سے چالیسؔ سال پہلے بھی ہمالیہ سے راس کماری تک بیٹھی ہوئی تھی۔ علامہ اقبالؔ کے استاد اور فارسی کے ملک الشعراء غلام قادر گرامی نے بھی حضرت امجدؔ کی قادر الکلامی پر ایک قطعہ لکھا تھا۔ اس سے حضرت امجدؔ کے مقام کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گزشتہ دور میں بھی اتنے معروف تھے کہ شمال کے کسی شاعر کے کلام کو سوائے علامہ اقبالؔ اتنی قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

اب سے تیسؔ سال پہلے ۱۹۲۵ء میں جب حضرت امجدؔ صدر محاسبی کی شاخ تصفیہ مقدمات کے سیکنڈ گریڈ کلرک اور میں امیدوار تھا اور دفتر بنگلہ پر تھا میں روز دیکھا کرتا تھا کہ وہ اپنی سیکل کندھے پر لے کر بنگلے پر جایا کرتے تھے کبھی انھوں نے چپراسی کو سیکل اٹھانے کی زحمت نہ دی۔ اس سے حضرت امجدؔ کی فروتنی اور کسرِ نفسی کا اظہار ہوتا ہے۔

امجد ایک روشن دل اور صوفی منش بزرگ ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی سے حد درجہ متاثر ہیں۔ ان کے دل میں تڑپ اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۰۸ء کی طغیانی موسیٰ میں ان کا سارا خاندان نذرِ سیلاب ہو گیا۔ امجدؔ کے کلام کا میں نے بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ ان کے کلام میں بے حد سوز و گداز اور حقیقت

حضرت امجد کو یاد ہوگا کہ اکثر ان سے میں کہا کرتا تھا کہ ان کا کلام عالم رویا میں بھی میرے ورد زبان رہتا ہے
یہ مصرعہ ہمیشہ میں نیند میں گنگنایا کرتا تھا۔

ہر اک کی ایک ہی رفتار ہو نہیں سکتی　　تجلیات میں تکرار ہو نہیں سکتی

بہر حال مجھے اس مادی دنیا میں اپنے وطن، اپنے باپ اور اپنے استاد حضرت امجد سے انتہا درجہ عقیدت ہے۔ ربع صدی کی بات ہے کہ میں حضرت امجد کی خدمت میں ایک قطعہ اور ایک نظم احتراماً پیش کی تھی۔ اظہار محبت سے مجھے انھوں نے گلے لگا لیا۔ وہ قطعہ اور نظم جو میرے خلوص و عقیدت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ یہ ہیں :-

ایشیاء کی خاک نے پیدا کئے دو نامور　　ایک کو مشہور خیام اک کو سرمد کر دیا
بعد مدت کے دکن سے اک اٹھا ایسا بشر　　حق نے خاتم کر کے اس کو ان پہ امجد کر دیا

---

رکھی بنیاد ایسی شاعری کی آج امجد نے　　کہ جس کے کہنے والے سو گئے تھے ایک مدت سے
بنایا اس نے وہ کعبہ قلم سے وحدت حق کا　　کہ ممکن ہی نہ تھا کوئی بنا لے زور و قوت سے
تعجب ہے کہ بے صورت کی صورت کھینچ دی اس نے　　بھرا قرآن کا رنگ اس میں اپنی خاص صنعت سے
زباں اس کی کلید گنج اسرار معانی ہے　　تخیل کو ملی ہے اس کے رفعت کلک قدرت سے

ہمیشہ تر زباں رہتا ہے اس کی حمد باری میں
نہیں احمد کوئی امجد کا ثانی حق نگاری میں

سید احمد اللہ قادری

---

(بقیہ سلسلہ صا ۷) نام و نمود اور دنیاوی خواہشات انسان کی تباہی کا باعث ہیں۔ امجد نے اسی مفہوم کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے ؎

دین و دنیا سے کھو دیا مجھ کو　　ہوس خام تو کہیں گرد بھی
نام نے کام ہی تباہ کیا　　شاخ کے ساتھ کھنچ گئی جڑ بھی

حضرت امجد کا مسلک صلح کل ہے۔ ظاہری رسوم و قیود کی پابندی سے کہیں زیادہ وہ مذہب کی روح کو سمجھنے کی تلقین فرماتے ہیں ؎

میاں امجد تمہاری جیسی مرضی　　ہو کافر کہ یا اسلام لاؤ
مگر کہہ دیتے ہیں اک کام کی بات　　جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

لوگ دنیوی ترقی کے لئے کیا کیا نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اپنی جان و ایمان کو تک بیچ دیتے ہیں۔ اور اگر ترقی نہ ملے تو عمر بھر روتے رہتے ہیں۔ حضرت امجد نے اس الجھن سے نجات دلانے کے لئے حکیمانہ درس دیا ہے ؎

دست صیاد و پنجۂ گلچیں سے بچ گیا　　اچھا ہوا کہ غنچۂ دل گل نہیں ہوا
اوروں کو رنج ہے کہ ترقی نہیں ملی　　میں خوش اسی میں ہوں کہ تنزل نہیں ہوا

غرض حضرت امجد کا کلام ان کے قلبی واردات اور انکشافات کا آئینہ دار ہے اور ہر شخص بہ قدر ظرف ان کے کلام سے مستفید ہو سکتا ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

# دکن کا نامور شاعر

حضرت امجد جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے انسان بھی ہیں اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ان کو ملنے والا ان کی عظمت اور بزرگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی شخصیت اور انداز گفتگو میں ایسی مقناطیسی کشش ہوتی ہے کہ جو بھی ایک بار ان سے ملتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ان کا ہو جاتا ہے اور یہ کہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم    کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

میں صحیح طور پر یہ تو نہیں بتا سکتا کہ میں حضرت امجد سے پہلی بار کب ملا تھا۔ حافظہ پر بار ڈالنے کے بعد بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ کیسے، کب اور کہاں ملا تھا۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی میں ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا بلکہ گھنٹوں ان کے مکان "چمن" میں اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ کھیل کود میں ہمارا سارا دن گذارتا۔ حضرت امجد کی اہلیہ محترمہ جمال سلمیٰ مرحومہ میرے چھوٹے بھائی کو بہت چاہتی تھیں اور ان کو اپنے گھر رکھ لیا تھا۔ اسی بہانے مجھے بھی وہاں جانے کا موقع ملتا۔ حضرت امجد دفتر صدر محاسبی میں منتظم تھے اور میرے والد بزرگوار حاجی خواجہ شجاع الدین صاحب ان کے تحت کام کرتے تھے۔ اس تعلق سے بھی اکثر والد کے ساتھ ان کے دفتر کو بھی جانے کا موقع ملتا۔ نہ جانے کیوں حضرت امجد کی میز کے پاس جا کر بیٹھ جاتا اور گھنٹوں حضرت امجد کی صحبت میں گذارتا۔ شروع ہی سے وہ مجھ پر بہت مہربان تھے اور ایسی شفقت و عنایت کی نظر فرماتے کہ میں روز بروز ان سے قریب ہوتا گیا۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ اپنی کتاب "جمال امجد" پر اپنے قلم سے یہ عبارت تحریر فرما کر مجھے عطا کی۔

"بہ صلہ کامیابی امتحان میٹرک خواجہ حمید الدین کو یہ کتاب دی گئی"

اب تک تو میں حضرت امجد کے کلام کو صرف پڑھتا تھا اور سمجھنے کی منزل سے بہت دور تھا۔ لیکن جب سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو ان کی رباعیوں کو پڑھ کر جھوم جھوم اٹھتا اور بقدر ظرف معنی و مطلب کو سمجھ کر حضرت امجد سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتا۔

اب حضرت امجد سے زندگی کے مختلف مسائل پر گفتگو کرنے کا موقع مل گیا وہ مشکل سے مشکل مسئلہ کو بڑی آسانی سے سمجھا دیتے ہیں اور انداز تفہیم ایسا معقول ہوتا ہے کہ ان کا منکر بھی قائل ہو جاتا ہے۔ میں نے حضرت امجد کے فیض صحبت سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ میری زندگی، اخلاق و عادات اور ذہنی و فکری صلاحیتوں کے سنوارنے میں آپ نے بطور خاص دلچسپی لے کر مجھ پر وہ احسان فرمایا ہے جو میں ہرگز فراموش نہیں کر سکتا۔ جب بھی ان کی خدمت میں

حاضر ہوتا ہوں تو کچھ نہ کچھ حاصل کر کے لوٹتا ہوں۔ وہ باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ کانوں کی راہ سے دل میں اتر جاتی اور اپنا دیرپا اثر رکھتی ہے۔

مجھے حضرت امجد کے ساتھ سفر کرنے کے بھی موقع نصیب ہوئے۔ بہت دنوں کی بات ہے اورنگ آباد کالج کی طرف سے سر اکبر حیدری (جو اس زمانے میں صدر المہام فینانس تھے) کی صدارت میں حالی کا جشن صد سالہ منایا گیا۔ سید محی الدین صاحب پرنسپل نے بطور خاص حضرت امجد سے شرکت کی استدعا کی تھی۔ حضرت امجد مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ تیسرے درجے کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ غریب لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر اسٹیشن پر مسافر چڑھتے اور اترتے جاتے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت امجد بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ سنو ابھی میں نے دو رباعیاں کہی ہیں۔ ایک غریب کی زبانی اور دوسری امیر کی زبانی۔ امیر غریب کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

دنیا میں یہ بدنصیب جیتے کیوں ہیں  مردود در حبیب جیتے کیوں ہیں
ہے پیٹ کو ٹکڑا نہ بدن پر کپڑا  معلوم نہیں غریب جیتے کیوں ہیں

غریب یہ سن کر امیر کو جواب دیتا ہے کہ آپ کو ہمارے جینے پر تعجب ہوتا ہے اور ہم کو آپ کے مرنے پر حیرت ہوتی ہے ؎

پیمانۂ زندگی کو بھرتے کیوں ہیں  سر چڑھ کے زمیں میں اترتے کیوں ہیں
رکھ کر بھی تمام زندگی کے ساماں  معلوم نہیں امیر مرتے کیوں ہیں

حضرت امجد اردو کے ان چند باکمال اور صاحب دل شاعروں میں سے ہیں جنھیں زمانہ صدیوں بعد پیدا کرتا ہے۔ دکن کی سرزمین شروع ہی سے اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے جس میں محمد قلی قطب شاہ، ولی، سراج اور فیض جیسے باکمال شاعروں نے جنم لیا اور آسمان شاعری میں چار چاند لگا دیئے۔ موجودہ دور کے شاعروں میں حضرت امجد کی ایک نمایاں حیثیت ہے اور وہ ہے ان کی حقیقت نگاری۔ ان کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات نے اردو شاعری کی دنیا ہی بدل ڈالی ہے۔ بالخصوص آج کی مادہ پرست دنیا میں جہاں روحانیت اور خداپرستی کا مفہوم محض خیال بن کر رہ گیا ہے۔ حضرت امجد کا روحانی کلام مشعل ہدایت بن کر بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کی شاعری کا محور اخلاقیات اور روحانی تعلیم ہے۔ یہی انفرادی خصوصیت ہے جو اردو دنیا میں حضرت امجد کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنی۔ ان کی رباعیاں ایسی بلند پایہ ہیں کہ اردو ادب میں شاید ہی ان کا جواب مل سکے۔ امجد ہی سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان کی رباعیوں میں سرمد کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسی لئے ان کو "زندۂ سرمد" بھی کہا جاتا ہے۔ بقول غلام قادر گرامی مرحوم امجد "جواب سرمد" ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

امجد برباعی است فرد امجد  کلک امجد کلید گنج سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز  روح سرمد بگفت امجد امجد

پروفیسر سلیم مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں جو "دکن میں ایک رباعی گو شاعر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا آپ کے علم فضل اور کمال شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"یہ ان شاعروں میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہل بصیرت کے لئے ہوش ربا ہے۔ وہ شعر اسی وقت

کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی پروا نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کر لیتا ہے اور اسی کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قدرتی شاعر کی یہی پہچان ہے۔ ان کی رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی۔"

غرض حضرت امجد میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہیں۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ شاعرانہ جذبات ان کی فطرت میں ودیعت کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حقیقت اور فطرت سے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک شعر نہیں کہتے جب تک کوئی کیفیت ان کے دل پر طاری نہیں ہوتی اور اسی کیف و مستی کے عالم میں دلی جذبات شعر کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں اور پڑھنے والا ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تاثیر کلام کے متعلق وہ فرماتے ہیں ؎

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے ۔۔۔ مضمونِ بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبار فن خوب کہا ۔۔۔ لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے
کلام ایسا اکثر سنا ہوگا تم نے ۔۔۔ سنا آج اور کل اثر دل میں اترا
کہو شعر ایسا کہ ہو تیر جیجر ۔۔۔ ادھر منہ سے نکلا اُدھر دل میں اترا

امجد کا کلام پر اثر ہونے کے علاوہ نہایت سلیس، عام فہم اور وجد آفریں ہوتا ہے اور لطف تو یہ ہے کہ لفظی اور معنوی خوبیاں بھی بدرجۂ اتم موجود رہتی ہیں۔ سادگی اور روانی کا یہ عالم کہ نظم نثر معلوم ہوتی ہے۔ تشبیہات اور استعاروں کو بڑی چابکدستی سے اپنے کلام میں لاتے ہیں لیکن یہ قوانین فطرت سے متجاوز نہیں ہونے پاتے۔ ان کے کلام میں کہیں فلسفہ کی جھلک ہے تو کہیں تصوف کا رنگ، کہیں درد و غم کا سوز ہے تو کہیں پند و نصائح کا بیان۔ عام شاعروں کی طرح وہ صرف قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ ان کا ہر شعر دنیا کے لئے ایک پیغام عمل اور درس ہدایت ہوتا ہے۔ امجد نہ صرف بلند پایہ شاعر ہیں بلکہ ایک خدا رس اور صاحب باطن صوفی بھی ہیں لیکن ایسے صوفی نہیں کہ خدائی کا دعوی کر بیٹھیں۔ ایک قطعہ میں "ذکر صوفیا در حدیث دیگراں" کی اس طرح تشریح کرتے ہیں۔

آیا ہے زمانۂ ترقی ۔۔۔ گندہ بندہ خدا ہوا ہے
ایمان کو دل سے صاف کرکے ۔۔۔ امجد صوفی بنا ہوا ہے

سلوک و معرفت کے رموز پر ان کی گہری نظر ہے۔ تصوف کے مشکل سے مشکل مسئلہ کو رباعی کے ذریعہ سے اس طرح آسان بنا کر پیش کرتے ہیں کہ ہر شخص کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو اپنی شاعری میں اس طرح سمویا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر معلوم ہوتی ہے اور واقعی یہی ہے کہ وہ قرآن اور حدیث سے ہٹ کر کوئی بات نہیں کہتے۔ ان کی ہر رباعی کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث کی تشریح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی رباعیات انسانی زندگی کے حقائق کے مرقعے ہیں جس میں کی ہر تصویر زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کو پیش کرتی ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ محفل عیش میں انسان خوش و خرم رہتا ہے اور جب وہ ختم ہو جاتی ہے تو اس کے ردعمل کے طور پر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اسی مضمون کو ایک رباعی میں پیش کیا گیا ہے ؎

ہر محفل سے بہ حال خستہ نکلا ۔۔۔ ہر بزم طرب سے دل شکستہ نکلا
منزل ہی نہیں یہاں مسافر کے لئے ۔۔۔ سمجھا تھا جسے مقام رستہ نکلا

دل خانۂ خدا ہے اسی لئے کسی کے دل کو توڑنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اسی مفہوم کو ایک رباعی میں ملاحظہ فرمائیے ؎

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا — یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے — افسوس یہ ہے کہ تو نے دل کو توڑا

انسان کی آزادی اور بے بسی کو جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ حضرت امجد ہی کا حصہ ہے ؎

پابند کیا قیدِ نفس میں رکھ کر — بے بس کیا مجھ کو اپنے بس میں کہہ کر
صیاد کی صید پروری تو دیکھو — گلزار دکھاتا ہے قفس میں رکھ کر

حضرت امجد کی قادر الکلامی کے ثبوت میں یہ رباعی پیش کی جا سکتی ہے ؎

گیسو میں ہے بل کہ میرے خم کو دیکھو — رخ ہنستا ہے کہ اس ستم کو دیکھو
اظہارِ کمال میں ہر اک کامل ہے — سب کی یہی خواہش ہے کہ ہم کو دیکھو

انسان کی فطرت ہے کہ کسی واقعہ کے گزر جانے کے بعد وہ اس کے اسباب اور وجوہ پر سوچتا رہتا ہے لیکن اس کے غور و فکر سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس کو کس خوبی سے سمجھایا ہے ؎

اسباب و علل کا دور کرتے رہیے — اپنی فطرت پہ جور کرتے رہیے
جو کچھ ہونا تھا ہو چکا رک نہ سکا — اب کیوں ہوا اس پہ غور کرتے رہیے

امجد کسی بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو ان کا حکیمانہ استدلال قابلِ غور ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے — بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی — دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

تخلیقِ عالم کے موضوع پر اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے اور یہ مضمون کوئی نیا نہیں ہے۔ لیکن حضرت امجد نے اس کے اظہار کے لئے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے وہ نہایت ہی اچھوتا ہے ؎

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے — کیا ذکرِ صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم سہی جاہل سہی نادان سہی — سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی میں نے

اولوالعزمی اور بلند پروازی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے ؎

اے قطرۂ آب پھیل دریا ہو جا — اے طائرِ روح مرغِ سدرہ ہو جا
اپنی ہستی کو خاک میں دفن نہ کر — اے تودۂ خاک اٹھ بگولا ہو جا

اللہ پاک فرماتا ہے کہ میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں لیکن غافل انسان کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا اور وہ اس طرح استفسار کرتا ہے ؎

دونوں یکجا مگر ملاقات نہیں — باہم کوئی گفتگو نہیں بات نہیں
تو مجھ سے قریب تر میں تجھ سے نزدیک — کیا بات ہے ہم دونوں میں کیوں بات نہیں

اس کا جواب مولیٰ تعالیٰ کی جانب سے یہ ملتا ہے ؎

بدلی چھائی ہوئی ہے برسات نہیں — تارے نکلے تو ہیں مگر رات نہیں
کچھ اس کا سبب بھی تو نے سمجھا امجد — میں ہوں ترے ساتھ تو مرے ساتھ نہیں

(بقیہ ص ۹۷ پر)

# سپاس نامہ

(یہ سپاس نامہ حضرت امجد کی خدمت میں ان کی ڈائمنڈ جوبلی کے منانے کے لئے منعقد کئے ہوئے جلسہ میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے تمام معتقدین کی جانب سے پیش کیا۔)

حکیم الشعراء سرمد ثانی حضرت امجد!

ہم سب آج اپنی اس خوش بختی پر نازاں ہیں کہ آپ جیسے فخر زمانہ اور فرد یگانہ سے کے اعتراف خدمات کیلئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی خوش قسمتی ہے کہ اس میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ سے لے کر آج تک ساڑھے پانچسو سال کے طویل عرصے میں اردو کے ان بلند نظر شاعروں کا سلسلہ برابر قائم ہے۔ جو صحیح معنوں میں تلامیذ الرحمٰن ثابت ہوئے اور جنھوں نے اپنی شاعری میں تصوف و عرفان کے مضامین کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی عوامی زندگی کی نہایت ہی کامیاب ترجمانی کی۔ میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جانم، امین الدین اعلیٰ، میرانجی خدانما، قاضی محمود بحری، وجہہ الدین وجدی، محمد باقر آگاہ، سراج، فیض، وطن، شایق، حمزہ اور توفیق اس سلسلے کے دانشور اساتذۂ سخن ہیں جنھوں نے دکن کی اردو شاعری کی مخصوص روایات قائم کیں اور فن شعر کو محض غزل گوئی اور غم جاناں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ایسے ایسے موضوعات پر فنکارانہ کمال دکھائے کہ آج بھی اردو ادب کی تاریخ ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ان صاحب کمالوں کے لکھے ہوئے چکی کے گیتوں اور بچوں کی لوریوں سے لے کر غزلوں اور متصوفانہ اور مابعد الطبیعاتی طویل نظموں میں بھی عام انسانوں کے جذبات اور غم دوراں کی کیفیات اس خوبی سے جلوہ گر ہیں کہ جب بھی ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے ان کے زمانے کے انسان اس طرح چلتے پھرتے نظر آنے لگتے ہیں کہ ان کے دلوں کی دھڑکنیں تک سنائی دیتی ہیں۔

حضرت امجد! آپ اسی چمنستان بے خزاں کے گل سرسبد ہیں۔ آپ کے کلام میں انسانی فطرت کی بوقلمونیاں، جبر واختیار کی چیرہ دستیاں اور حقائق و معارف کی موشگافیاں اس لطافت سے جھلکتی رہتی ہیں کہ پڑھنے والا زندگی سے گریز کرنے کی بجائے ایک ایسی اونچی سطح پر پہنچ کر اس سے نبٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد زندگی کے نشیب و فراز اس کے لئے نشیب و فراز ہی باقی نہیں رہتے اور پھر خوبی یہ ہے کہ آپ کے کلام کے مطالعہ کے بعد خود اعتمادی تو پیدا ہوتی ہے لیکن وہ جارحانہ تیور نہیں ابھرنے پاتے جن کو بعض جدید شعراء کا کلام ابھارتا ہے۔

آپ ہندوستان میں عام طور پر رباعی گو شاعر مشہور ہیں اور اسی لئے آپ کو سرمد ثانی کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے مگر یہ آپ کی صاحب کمالی کا صرف ایک ہی رخ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے غزلیں اور نظمیں بھی اسی رنگ میں نہایت اعلیٰ پایہ کی لکھی ہیں اور اردو نثر میں بھی آپ کی کئی پاکیزہ کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جو سب کی سب آپ کے مخصوص نظریۂ زندگی اور دل زندہ کی ترجمان ہیں اور اسی لطیف اسلوب میں لکھی گئی ہیں جس میں آپ کی رباعیوں کی مقبولیت کا راز پنہاں ہے

آپ کی ذات سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ آپ کے وطن کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں مدتوں بسنے والی نسلیں ہمیشہ ناز کرتی رہیں گی۔ ہمارے دلوں میں آپ سے عقیدت صرف اس لئے جاگزیں نہیں ہے کہ آپ ہماری زبان کے ایک ایسے صاحب کمال فن کار ہیں جن کی نظیر اس زبان میں موجود نہیں بلکہ اس لئے بھی کہ آپ کی خدمات کے باعث وطن عزیز کی عزت و عظمت میں مستقل اضافہ ہوا اور اس پر ہم جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

اسی فخر و مباہات کے جذبہ سے مجبور ہو کر ادارۂ ادبیات اردو نے جو سرزمین دکن کے شیدائیان علم و ادب کی ایک دیرینہ تنظیم ہے، مولوی خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کی تحریک پر اہل ملک کو دعوت دی کہ وہ آپ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرنے میں ان کے ساتھ تعاون کریں اور خوشی کی بات ہے کہ بلا تفریق مذہب و ملت جملہ علم دوستوں نے اس تحریک میں اس کا ہاتھ بٹایا اور ہم اس قابل ہوئے کہ آپ کو اس جلسے میں تشریف فرما ہونے کی زحمت گوارا کرنے پر راضی کر سکیں۔

ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اپنی افتاد طبع کے خلاف اس میں شرکت فرمائی اور ہم کو سراپا رہین منت بنالیا۔
ہم سب کی دعا ہے کہ آپ عرصۂ دراز تک صحت و عافیت کے ساتھ ہماری زبان کے ادب و شاعری میں اضافہ کرتے اور ملک کا وقار بڑھاتے رہیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

## ہم ہیں آپ کے عقیدت گزار

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، بالمکند عرش ملسیانی، پی ہنمنت راؤ، عبد القادر سروری، محمد اسد اللہ انجنیئر، خواجہ حمید الدین شاہد، سید محمد، رگھوناتھ نتھو لال جی، ہری دلبھ پارک، ست نارائن، بالارام، لکشمی نرسو، مہادیو جی، سردار لبھ سنگھ، حفیظ قتیل، ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ، ڈاکٹر اشندر راج سکسینہ، ڈاکٹر ستیش راج، خان بہادر احمد محی الدین، راجہ بہوتی لال جی، محبوب علی، فیاض الدین نظامی آرکٹکٹ، ضامن علی غازی کنٹراکٹر، بشیر النساء بیگم بشیر، ڈاکٹر محمد نظام الدین، اکبر الدین صدیقی، ذکی الدین، محمود حسین، ابو الفضل، راجندر پرشاد، راگھویندر راؤ جذب، شوکت علی خاں، محمود علی، سراج الدین، افضال احمد، نعیم الدین، محبوب علی، عبد الرشید، ڈاکٹر عبد السلام، آغا حیدر حسن، پروفیسر محمد علی خاں، احمد حسین خاں، غلام دستگیر رشید، ابو الفضل محمود قادری، باقر فریدی، معین الدین حسن، غلام محمد، واجد علی، بلیغ الدین، جعفر نظام، اقبال جاوید، سید علی برتر، فدا علی محمد علی، ایچ ایم حسینی، جانکی پرشاد، ایس ایس نایک، ڈاکٹر عبد الحق (مدراس)، عبد المجید، مسز اپادلے، سیٹھ محمد ایوب، عبد الکریم، یاور حسین، مظہر احسن گیلانی، کشیشور راؤ، ڈاکٹر عبد المنان، مظہر حسین، محمود احمد صدیقی، سید عبد الحمید، اچیوت راؤ، حافظ علی صدیقی، سید سراج الدین، حامد صدیقی، دھرمندر پرشاد، عبد الرزاق، انعام اللہ، صغیر احمد، لیاقت حسین قادری، دانیال، محمد ساجد حسین، درگیا، شرافت حسین، گنیش گیر جی، سید رحیم الدین، غلام جیلانی، راجگوپال، راشد موتی، افتخار الدین، زاہد علی کامل، یادگیر راؤ، یونس سلیم، مصطفیٰ حسین، جمال چندر کھاپیکر، سمیع الدین صدیقی، فاروق علی صوفی، حامد علی صوفی، عبد القادر، غلام محمد حسن، اسد ممتاز، سید معین الدین، سید یحییٰ، محسن احمد شطاری کامل، کلیم اللہ قادری، خالد کشمیری، عبد القدوس، عبد القادر خاں، قاضی عبد الرشید، محمد محسن الدین، ڈاکٹر غلام رسول، میر بہادر علی، میر بشیر الدین، عبد الحمید، سید علی، محمد یوسف علی، خواجہ عبد العلی، سید بہادر علی، محمد عبد المعز،

سلطان محی الدین، سید محمد صابر حسینی، عزیز الدین، محمد حسین آزاد، حسن الدین، بشیر احمد، سید محمد، سید عبد الواحد، حسن،
محمد معین الدین، محمد عثمان علی، واحد علی، عبد الرحمٰن، مومن علی، عبد القادر، احمد عبد اللہ، عظیم الدین، اعظم الدین، غلام
رکن الدین، ممتاز سید احمد، سید صادق حسینی، سید احمد، محمد جہانگیر علی قاسم علی، محمد عبد القادر، فخر الحسن، فصیح الدین،
خواجہ منیر الدین، ڈاکٹر ولی الدین، لطیف احمد فاروقی، قاری قطب الدین، قاری سید کلیم اللہ حسینی، شفیق الحسین ہاشمی،
ضیاء الدین خاں، محمد صلاح الدین، ڈاکٹر سید وجیہ الدین، سید حسین قادری شور، رام نرنجن پانڈے، رام کمار کھنڈیل وال،
سید احمد، سیدہ جعفر، ڈاکٹر جعفر حسن، سکندر علی وجد، مرزا مصطفیٰ بیگ، حبیب الدین، ریاض الدین، دلریس بانو، ضیاء الحق الدین،
نجمہ بانو فیاض الدین، عزیز النساء بیگم فیاض الدین، سیف الدین، فیاض الدین، حیدرآباد ووڈ ورکس، سید شرف الدین
نقوی، سیدہ خلیق النساء بیگم، سیدہ حنیف النساء بیگم، سیدہ خورشید اختر، سیدہ صابر النساء بیگم، سید شریف الحسن ہاشمی،
یوسف مرزا، عاقل علی، محل عاشق علی، محمود پاشاہ، سید محمد صادق، ماسٹر لکاری، سید علیم الدین، سید ظہور الدین،
ممتاز احمد، عبد الرسول بیگ، سید احتشام الدین، امبیکا پرشاد سنگھی، ہاشم علی، مقبول احمد، محمد قاسم، محمد عبد اللہ،
علی بن احمد، سید حبیب الرحمٰن، سیدہ نصیر الزماں، غوث الدین منہاج، عبد الہادی، صالح بکران، شیخ علی، کے راما سوامی،
خواجہ عبد الواسع، سید محمد یونس، حسن علی، محمد عثمان، غلام حیدر، احسن لطیف، چمن لال، محی الدین حامد، نواب احمد جنگ،
مرزا اسد علی، سید چاند، ڈاکٹر ابو الحسن، شہید یار جنگ، ناظر یار جنگ، علی حیدری، مسز لیلین علی خاں، مسز سعد الدین خاں،
نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر سید حسین، الیاس برنی، ڈاکٹر شاہنواز، ڈاکٹر راجندر، مرزا علی حسین خاں، ولایت النساء بیگم،
سید علی اکبر، احمد محی الدین، بیجر ہری کشن داس، بشیر احمد، احمد اللہ ممتاز، رفیعہ سلطانہ، زینت ساجدہ، سید محمد حسنی،
خالدہ بیگم، فریدہ، فرزانہ، رفیع الدین، سید مخدوم محی الدین، کمال سلطانہ، عبد الکریم، سردار علی، عبد القیوم، روشن خاتون،
فرید الدین، محمد سلطان الدین، ڈی عبد الحفیظ، محمد عبد الحق، عظمت عبد القیوم خاں، ست گرو پرشاد ایڈوکیٹ،
پروفیسر نعیم الدین امراوتی، رمیش راج، رمن راج ایڈوکیٹ، عبد الرحیم، عبد الغفور، معین الدین خاں، نواب کاظم جنگ،
سید سراج الدین، صادق مدنی، مظفر بیگ، بابا میاں، عبد الکریم، معین الدین، بدام سنگھ، فاضل شریف، انور علی،
گوبند راؤ، ڈگمبر راؤ، میر اسد اللہ حسینی، سید شرف الدین، جگناتھ راؤ، مرزا جمیل احمد بیگ ایڈوکیٹ، مرزا حمید بیگ،
حبیب الرحمٰن خاں، بشیر احمد ایڈوکیٹ، مرزا احمد علی ایڈوکیٹ، رنگا راؤ ایڈوکیٹ، سید احمد، کیشو پرشاد ایڈوکیٹ،
ریاض الحسن ایڈوکیٹ، شنکر راؤ ایڈوکیٹ، میر ولایت علی وفا ایڈوکیٹ، سید عبد السلام، ضیاء الدین، محمد عبد الرؤف،
مرزا سراج الحسن، ڈاکٹر عبد الصمد فاضل، کملا بائی، محمد عمر، قاضی محمد شرف الدین خاں، مرزا انور بیگ نحوا، محمد اصغر
امجد صدیقی، خواجہ معین الدین، مرزا محمود بیگ تحصیلدار، داؤد خاں واچ کمپنی، یوسف طاہر اکش کمپنی، خیر الدین وکسیلی،
چراغ علی، سید حمید شطاری، ڈاکٹر وحید النساء، عبد الکریم خاں، سید ابو الفضل، سراج محمد، قمر النساء بیگم، جہاں بانو نقوی
مجتبیٰ حسن نقوی، عباس سلطانہ، سیف علی خاں، کاظم علی خاں، دلدار علی، عظمت اللہ، غلام نبی، محمد صدیقی، ہدایت علی،
احمد الدین، تاج الدین، محمد صالح انصاری، سلطان عبد الحسین، مرزا احمد علی بیگ، محمد یونس اینڈ سنس، نواب لیاقت جنگ،
اسمٰعیل صاحب، پروفیسر رفیع الدین ناگپور، علی بن عبد السلام عماد پریس، محمد وحید اللہ، جگن موہن ریڈی ہائیکورٹ جج، ڈاکٹر
سیادت علی خاں ہائیکورٹ جج، جسٹس قمر حسن، جسٹس تقی بلگرامی، لیاقت النساء بیگم یوسف مرزا، مسٹری ابراہیم سلیمانی، رحیم دستشمی

(بقیہ صفحہ ۷۶)

# جوابِ سپاس نامہ

(سپاس نامہ کا یہ جواب حضرت امجدؔ کی طرف سے خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے پڑھ کر سنایا)

بسم اللہ توکلت علی اللہ والحمد للہ علیٰ کل حال

میں اپنے قدر دانوں، دوستوں، عزیزوں، محسنوں کا شکر گزار ہوں اور ان کی اس جدت کا معترف ہوں کہ عام دستور کے خلاف میری قبر پر پھول ڈالنے سے پہلے میری زندگی ہی میں پھولوں کے ہار گلے میں ڈال دیئے اور میری قبر پر شاندار گنبد بنانے سے پہلے مجھ تودۂ خاک کو عالم پاک تک پہنچا دیا۔ لیکن پھر بھی یہی کہوں گا ؎

ممکن نہیں کہ فطرت اصلی بدل سکے　　امجدؔ ہزار پاک ہوا پھر بھی خاک ہے

آپ بزرگوں، دوستوں، قدر دانوں نے میری حیثیت اور استحقاق سے زیادہ ذرہ نوازی فرما کر مجھ ذرۂ بے مقدار کو آفتاب بنا دیا۔ میں پہلے ہی سے آفتاب ہوں مگر کیسا آفتاب جو لب بام ہے اب ڈوبا کہ جب ڈوبا، اب چھپا کہ جب چھپا۔ میں بہت دنوں سے مونواقبل ان تموتوا کے تحت اپنی ایک رباعی کا مصداق بن چکا ہوں۔ وہ رباعی یہ ہے ؎

تو کان کا کچا ہے تو بہرا ہو جا　　بدبیں ہے اگر آنکھ تو اندھا ہو جا

گالی، غیبت، دروغ گوئی کب تک　　امجدؔ کیوں بولتا ہے گونگا ہو جا

کانوں سے کم سنتا ہوں۔ آپریشن کے بعد آنکھوں سے کم دیکھتا ہوں۔ لقوے کے بعد زبان سے اچھی طرح بول نہیں سکتا۔

الحمد للہ علیٰ کل حال

ان اعتبارات سے بہت حد تک تو مر چکا ہوں۔ صرف گڑنا باقی ہے۔ دیکھئے کب وقت آتا ہے۔

دیکھئے کب آئے کس جا آئے کس پردے میں کئے

خستہ جاں امجدؔ کی اک مدت سے بھوکی موت ہے

میں شروع ہی سے نام و نمود اور شہرت سے دور رہا ہوں۔ پروپگنڈے سے تو واقف ہی نہیں ہوں اور انشاء اللہ آئندہ بھی میرا یہی حال رہے گا۔ یہ تقریب بھی میرے عزیز شاہد صاحب کے بے حد اصرار پر منعقد کئے جانے پر میں نے صرف یہی کہا تھا کہ مجھے اختلاف نہیں۔ الحمد للہ پہلو اچھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سنہ ۱۳۲۶ء کی طغیانی میں امجد اور اس کا خاندان جس جگہ غرق ہوا تھا آج اسی جگہ اور اسی مقام پر امجدؔ کی جوبلی منائی

قصہ مختصر میں اپنے محسنوں کے لئے درگاہ باری تعالیٰ میں دعا کرتا ہوں اور جب تک سانس لے رہا ہوں دعا کرتا رہوں گا اور پرانی زندگی ختم ہو کر نئی زندگی ملنے کے بعد بھی یہی کہتا رہوں گا ؎

تو تجھ سے لگائے میرا ملنے والا — اپنے کو بھلائے میرا ملنے والا
مولا مرے ہر دوست کو اپنا کر لے — تجھ سے مل جائے میرا ملنے والا

آمین، آمین، آمین خدا حافظ
واللہ معکم اینما کنتم

۳۱ر جنوری ۱۹۵۵ء
آغا پورہ حیدرآباد دکن

سید احمد حسین امجد (حیدرآبادی)

---

# جشنِ الماسی حضرت امجد حیدرآبادی

لائی باد صبا نوید بہار — ہے زمین و زماں پہ آج نکھار
طاہرہ دل میں موجزن ہے خوشی — زندگی گیت بن گئی اک بار
کیسی ہلچل ہے یہ فضاؤں میں — بلبلیں گا رہی ہیں قصۂ یار
بہر نذرانۂ مبارک باد — حیدرآباد نے کیا ہے سنگار
کونسا دل ہے جو کہ شاد نہ ہو — کون ہے جو کرے نہ ان سے پیار
یوم خدمات حضرتِ امجد — اہل علم و ادب کا ہے تہوار
اے خدا تیرا فضل ان پہ رہے — جن سے آباد ہے ہمارا دیار
فیضِ روحانیت سے حضرت کے — بیقراروں کو آگیا ہے قرار
نوجوانوں کے مشفق و رہبر — صاحبِ دل ادیبِ گوہر بار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

بانو طاہرہ سعید (مشرقی پنجاب)

---

(بقیہ نام سلسلہ صـ۷۵ـ) مسز فنشر، تورج احمد خاں، قمر طیب جی، مسز قمر طیب جی، سیتا رام راؤ، ایس۔ ایم ہاشم و بیم، ہادی بلگرامی، مسز ہادی بلگرامی، مس طیبہ بلگرامی، غلام محی الدین، امیر علی رحمت اللہ، محمد معین الدین، خطیب حیدر حسن، سکینہ بیگم رحمت اللہ

# صدارتی تقریر

## عالیجناب افضل العلماء ڈاکٹر محمد عبدالحق صاحب ممبر پبلک سرویس کمیشن مدراس

حضرت امجد محترم — خواتین و حضرات!

آج سے تقریباً ۴۴ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مدرسہ دار العلوم میں سیرت کا جلسہ تھا۔ غالباً اس جلسے کی صدارت نواب ناظر یار جنگ فرما رہے تھے۔ میں بھی ایک نوجوان سامع کی حیثیت میں اس میں شریک تھا۔ دوران جلسہ میں ایک دبلے پتلے منش اور دیوانہ صفت شخص اسٹیج پر آیا۔ اس نے اپنی کچھ نظمیں اور رباعیاں پڑھیں۔ میں نے سب سے پہلی دفعہ اس شخص کے لاابالی انداز کو وہاں دیکھا۔ اس وقت یہ سمجھا کہ یہ کوئی دیوانہ صفت آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بازو بیٹھے ہوئے ایک صاحب مولوی مخدوم حسینی صاحب جو میرے والد کے شاگرد تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں۔ انھوں نے مختصر طور پر شاعر کی زندگی کے واقعات طغیانی سے پہلے کے اور طغیانی کے بعد کے سنائے۔ اس وقت میرا عنفوان شباب تھا۔ دل پر کچھ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اثر ہوا تو اتنا ہی کہ ان کی دیوانگی ذرا زیادہ معلوم ہوئی۔

اس کے آٹھ سال بعد پھر مدراس میں ایک دفعہ اسی شاعر سے مدبھیڑ ہوئی۔ اتفاق سے اردو سوسائٹی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ یہ وہاں تشریف فرما تھے۔ اپنے کلام سے انھوں نے وہاں کے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اس وقت میری زندگی ایک نئے موڑ پر تھی۔ دل کے تاروں میں جھنجھناہٹ پیدا ہونے لگی تھی۔ ایک احساس قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ اس دیوانگی میں بھی فرزانگی کا اثر ہے۔

اس کے تقریباً پندرہ یا بیس سال بعد یعنی ۴۴ء میں رائچور میں "یوم اقبال" منایا جا رہا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت مجھ خاکسار کے تفویض کی گئی تھی۔ اتفاق کی بات کہ اسی روز حضرت امجد کی صدارت میں مشاعرہ بھی تھا۔ میں اپنی دیگر مصروفیات کی بنا پر واپس جانا چاہتا تھا لیکن امجد نے مجھ سے فرمایا کہ بعض باتیں آپ کے لئے بھی ہیں۔ آپ تشریف رکھیں۔ میں بیٹھ گیا۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا

اک ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

صبح کی اذاں تک میں بیٹھ کر سنتا رہا، سنتا رہا اور لطف اٹھاتا رہا۔ بہت قریب سے میں نے ان کے کلام کا لطف اٹھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب نہ میری جوانی باقی تھی اور نہ وہ عنفوان شباب۔ اس وقت یہ احساس ہونے لگا کہ یہ دیوانگی ہے جس پر ہزاروں فرزانگیاں قربان ہیں۔ یہ وہ بیہوشی ہے جس پر ہوشمندوں کی ہوشمندیاں نثار ہیں۔ جس طرح خاقانی نے کہا ہے ؎

پس از سی سال روشن گشت ایں معنی بہ خاقانی ‌ ‌ ‌ ‌ کہ سلطانی ست درویشی و درویشی ست سلطانی

بتیس سال بعد چشم بینا نے ان چیزوں کو دیکھا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان اسرار حقیقت کے متعلق جو شاعر پیش کرتا ہے اور پھر جسے آجد نے اپنے کلام اور خاص کر رباعیات میں پیش کیا' اس پر تنقید کرتا میں نہیں سمجھتا کہ یہ میرے بس کی بات ہے۔ میں نے آج کے جلسہ کی صدارت کو اس لئے قبول کیا کہ میری نذر عقیدت بھی ہو جائے اور میں اپنی اور اپنے ملک کی جانب سے حضرت آجد کی خدمت میں خراج عقیدت بھی پیش کر دوں۔

شاعر کا متاع گراں مایہ چند چیزیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز دل درد آشنا ہے' دوسری چیز دیدۂ بینا اور پھر زبان خوش نوا۔ یہ تینوں اگر اک جا جمع ہو جائیں تو پھر کیا کہنا۔ جو کیفیت شاعر کے دل پر گذرتی ہے وہی کیفیت دوسروں کے دلوں پر بھی گذرتی ہے۔ وہ شاعر جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تلامذۂ رحمان ہوتے ہیں۔ جن کی شاعری سے ایک ٹھیس لگتی ہے۔ دل میں ایک کسک پیدا ہوتی ہے وہ چیز ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ان کا دل درد سے آشنا نہیں ہوتا۔ شاعر کو جو دل بھی نصیب ہوتا ہے وہ بہت ہی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ میر کہتے ہیں ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے

میر نے کیا سچ کہا ہے۔ شاعر کے دل میں دنیا بھر کا درد جمع ہو جاتا ہے اور وہ دوسروں کو بھی اسی طرح درد آشنا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

یہ دل کے چمن میں شاعری کرنے والے۔ درد کی لذت سے لطف اٹھانے والے۔ رنج و الم سے اپنے خانۂ دل کو آراستہ کرنے والے جو شاعر ہوتے ہیں وہ اپنی زندگی کا بہتر حصہ درد و الم برداشت کرنے میں صرف کرتے ہیں اور ان کیفیات کے اظہار کے ذریعہ دوسروں کو مسرتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ شاعری کی ان خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر حضرت آجد کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدا نے ان کو بہت ہی رقیق' سریع التاثیر اور حساس دل عطا فرمایا تھا۔ اس ارشاد

انا عند المنکسرۃ قلوبھم

کے بموجب ان کو جو دل عطا ہوا تھا وہ بہت ہی حساس تھا۔ ایسا حساس کہ جب ایک مرتبہ وہ ٹوٹ جائے تو کیفیات کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جب تک دل ٹوٹ نہ جائے اس میں وہ کیفیات پیدا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ان کا دل توڑنے کے لئے کیا اتنے بڑے طوفان کی ضرورت تھی (اشارہ رود موسیٰ کی طغیانی کی طرف ہے) سیلاب میں ہزاروں گھر اجڑ گئے لیکن دل ٹوٹا تو اسی کا ٹوٹا جس نے بعد میں اپنی دلی کیفیات کے اظہار سے ہزاروں دلوں میں گرمی پیدا کر دی۔

دیدۂ بینا کے متعلق میں کیا عرض کروں کہ وہ کیا چیز ہوتی ہے۔ حضرت آجد نے یہ تو سچ فرمایا ہے کہ اب ان کی قوتوں میں کمی ہو رہی ہے۔ کان سن نہیں سکتے۔ آنکھ برابر دیکھ نہیں سکتی۔ زبان گفتگو نہیں کر سکتی۔ یہ سچ ہے۔ لیکن دیدۂ بینا سے مراد قلب کے وہ تاثرات ہیں جو عمر رواں کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ وہ روشنی جو قلب کی گہرائیوں میں پیدا ہوتی اور بڑھتی جاتی ہے۔ اس دیدۂ بینا کے طفیل ہی وہ دوسروں کو بھی روشنی بتاتے ہیں۔

حضرت آجد کے کلام کی خوبیوں کے متعلق ان کے خصائص کے متعلق کچھ کہنا میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ میرا یہ منصب نہیں ہے کہ ان کے کلام کی حقیقی خوبیوں کا اظہار کروں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ان کی بعض نظمیں اور رباعیاں کانوں

کی تنہائیوں میں اور مقدس مقامات پر پڑھیں۔ لیکن میں کیا عرض کردوں دو تین سطریں پڑھنے کے بعد آگے نہ پڑھ سکا۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے جو بیان سے باہر ہے۔ ان کا کلام سب کے دلوں کو موہ لیتا ہے۔ بعض لوگ جوان کے عقاید اور خیالات اور مسلک سے اختلاف رکھتے ہیں وہ بھی اس امر سے اتفاق رائے کرتے ہیں کہ حضرت امجد کی شاعری سب کے لئے بے پایاں مسرت کا باعث ہے۔ میں صدر جلسہ کی حیثیت سے تو کیا البتہ ذاتی حیثیت سے اور بعد اس کے ان شاعری پسند حضرات اور کلام کی خوبیوں کو سمجھنے والوں کے نمائندے کی حیثیت سے حضرت امجد کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

میری زندگی میں یہ ایک بڑی عزت کا موقع ہے کہ میں اس اجلاس کی صدارت کر رہا ہوں۔ میں اپنی اس قدر افزائی پر بہت خوش ہوں۔ یہ ایک ایسی خوشی ہے جسے میں ضبط نہیں کرسکتا۔ میں بغیر کسی شک وشبہ کے اس کا اظہار کرتا ہوں کہ میں آج بے حد خوش ہوں۔ بے حد مسرور ہوں کہ مجھے یہ عزت عطا فرمائی گئی ہے۔ میں اپنے دوست پروفیسر زور کا ممنون ہوں کہ انھوں نے حضرت امجد کی ڈائمنڈ جوبلی کے سلسلے میں بلایا۔ اگر وہ مجھے ادارۂ ادبیات اردو کے جلسے میں شرکت کے لئے بلاتے تو ممکن ہے میں ٹال جاتا۔ جو نام لیا گیا اس کی کشش مجھے یہاں تک کھینچ لائی۔ میں ان کی دور اندیشی کا قائل ہوں۔

میں آخر میں آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ حضرت امجد ہمارے سروں پر قائم رہیں اور ان کے کلام کا فائدہ دکن اور ہندوستان کے تمام لوگ اٹھاتے رہیں۔

ڈاکٹر محمد عبدالحق

---

## حرفے چند تحفۂ درویش

سید احمد حسین امجد

شاعر، عارف، صاحب دل

ان کی نظمیں جگر کے پارے    حادثے بھی عجب ہمارے

درد دل ہی دل کا ارماں    میں دردہی اپنا درماں

گو بظاہر ملنا کم تھا    لیکن میل ملاپ اتم تھا

برنیؔ، امجدؔ دو دیوانے

ایک دوسرے کو پہچانے

محمد الیاس برنی

# تقریر شکریہ

خواتین و حضرات

میں خاص طور پر افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق صاحب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کی نہایت عالمانہ اور والہانہ تقریر آپ نے ابھی سنی۔ میں ان سب حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے تعاون اور ہمدردی کے بغیر ہماری تقریبیں کامیابی سے انجام تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ میں ان سارے معززین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے عالمانہ مقالے لکھے۔ مجھے افسوس ہے کہ تنگیٔ وقت کے باعث بعض مقالے نہ پڑھے جا سکے۔ اس کے علاوہ میں ان تمام فنکاروں کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے ہماری تقریبات میں حصہ لیا۔ میں اپنے دوست مولوی حمیدالدین صاحب شاہد کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے کافی دلچسپی اور محنت سے ساری تقریبوں اور خاص طور پر حضرت امجد کے یادگاری جلسے کے سارے انتظامات کئے۔ میں جناب رام لال صاحب پرنسپل سٹی کالج کا بھی بے حد مشکور ہوں کہ انھوں نے اپنے کالج کی عمارت، فرنیچر اور متعلقہ چیزوں کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ میں اکبرالدین صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے ذمے بہت سارے کام تھے۔ انھوں نے سب انتظامات بہت خیر و خوبی سے انجام دیئے۔ جناب اسداللہ صاحب جو آج کی مجلس انتظامی کے صدر ہیں ان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے بھی آج کے جلسے کی کامیابی کے لئے بڑی محنت اٹھائی ہے۔ ڈاکٹر زور کا بھی بے حد مشکور ہوں جو در اصل ان ساری تقریبوں کے بانی اور روح رواں تھے اور ان کی مدد کے بغیر ہمارا کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ بہ حیثیت معتمد مجلس استقبالیہ کے میں نے جتنا کام کیا اس سے دس گنا، بیس گنا بلکہ سو گنا زیادہ کام خود ڈاکٹر صاحب نے کیا۔ میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کے ڈائرکٹر شری مراٹھے کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے اپنے فنکاروں کو بعض تقریبوں میں حصے لینے کی اجازت دی۔ شعبہ نشر و اشاعت کے معتمد محمود بیگ ایڈیٹر دکن نیوز نے سلور جوبلی کی خبروں کی اشاعت میں ہماری بیش بہا مدد فرمائی۔ میں جلال الدین صاحب منتظم ادارہ، محاسب ادارہ اور سارے اسٹاف کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں اور ہمارے نوجوان دوست والنٹیرز اور چیف والنٹیر محمود حسین صاحب کا بھی مشکور ہوں۔ میں جناب عبدالوہاب صاحب معتمد اسٹیٹ سالار جنگ کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے کئی طرح سے ہماری تقریبوں کے انتظامات میں مدد دی۔ یہ فہرست طویل ہو گئی تاہم اعتراف ہے کہ ابھی بہت سے اصحاب ایسے ہیں جن کا شکریہ ادا نہ ہوا۔ وقت تنگ ہے اور شکریہ بے حد۔ اس لئے میں مجموعی طور پر ان تمام اصحاب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہر طرح ہماری مدد کی۔ خاص کر مولوی ضامن علی صاحب غازی خازن مجلس استقبالیہ کے شکریہ کے لئے تو مجھے الفاظ ہی نہیں ملتے۔

عبدالقادر سروری

# نذرِ امجد

جشنِ الماسی دکن میں حضرت امجد کا ہے
معترف سارا زمانہ عظمتِ امجد کا ہے

ہے دکن کی سرزمیں کا نام ہیروں کی زمیں
جس کی ہے تنویر کو ہ نور سے روشن جبیں

کیسے کیسے کو ہ نور ابھرے یہاں ہر دور میں
نت نئے ہستے رہے جوہر عیاں ہر دور میں

جوہرِ امجد بھی چمکا ہے دکن کی خاک سے
قلب پر جن کے اترتا ہے کلام افلاک سے

سرمدی ہے راگ جن کا جاودانی ساز ہے
جن کی فیضانی نوائیں، زندگی کا راز ہے!

شعرِ امجد درحقیقت مظہرِ الہام ہے
جس میں سوز و درد ہے تاثیر ہے پیغام ہے

جوبلی اہلِ دکن نے ہے منائی دھوم کی
سچ ہوئی پیشین گوئی میکشِ مرحوم کی

"بے خودوں کی خود فراموشی کا بدلے گا مزاج!
تجھ کو مل جائے گا اک دن اپنی عظمت کا خراج!"
(میکش)

(۲)

سرمۂ چشمِ بصیرت بن گئی مرگِ صفی
جگمگا اٹھے ہیں احساساتِ قدرِ زندگی

شکر ہے اللہ کا، دل کو ہوئی تسکین آج
اٹھ رہا ہے ملک سے مردہ پرستی کا رواج

زندگی فنکار کی ہے اک امانت قوم کی
اہلِ فن کے دم سے ہے وابستہ قسمت قوم کی

پیشکش دینار کا پیشِ سخنور ہیچ ہے
باکمالوں کی نظر میں کیسۂ زر ہیچ ہے

فطرتِ خوددار، سیم و زر میں گھر جاتی نہیں
"من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں"

دے کے نذرانہ، نہ سمجھو ہو چکا ہے حق ادا
زندگی بھر قدر و عظمت ہے فریضہ قوم کا

نے نوازی کی حقیقی قدردانی چاہیے
نغمۂ امید پہ بال و پر فشانی چاہیے

بشیر النساء بیگم بشیر

---

وتعز من تشاء

ہر ذرے پہ فضلِ کبریا ہوتا ہے
اک شیشۂ دل میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام کی زباں سے یہ سنتے ہیں
وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

امجد

# حضرت امجد سے

(حیدر آباد کے جوانا مرگ شاعر میکش مرحوم کے مجموعۂ گریہ و تبسم سے)

جائے گی بے کار بے دردوں میں تیری گفتگو
آہ، اے امجد! تری قسمت دکن والا ہے تو

وہ دکن جس کو ہے بیگانہ نوازی کا خیال
جس کی آنکھوں میں نہیں جچتا کبھی اپنا کمال

ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں لوگ
آنکھ کے پانی کو بھی ردنا سمجھ لیتے ہیں لوگ

باغ تازہ کہتے ہیں، باہر کے ریگستان کو
بت سمجھ کر پوجتے ہیں دور کے شیطان کو

دل کو کر دیتے ہیں گھائل، تلخیٔ گفتار سے
پیرہن گل کا پھٹا جاتا ہے نوکِ خار سے

---

ناشناسوں کے جہاں میں تجھ کو پہچانے گا کون؟
جستجو ناآشناؤں میں تجھے جانے گا کون؟

باعثِ عزت نہیں ہوگا یہاں تیرا وجود
عیب یہ ہے تو نہیں ہے اہلِ نام و نمود

ضو فگن اندھوں کی محفل میں ہے تیری شمعِ نور
عیب یہ ہے تیری فطرت میں نہیں کبر و غرور

زہر بھی جائے گی تیری شرابِ آتشیں
عیب یہ ہے جھوٹ کہنے کی تجھے عادت نہیں

آج کل روشن خیالی دہریت کا نام ہے • عیب یہ ہے تیرا دل وارفتۂ اسلام ہے

دیکھنے والا نہیں کوئی ترے سینے کے داغ
بے حسی کی آندھیوں میں ہے ترے دل کا چراغ

شاعرِ فطرت ہے جس دم شعر فرماتا ہے تو — بزم میں اک نغمۂ داؤد بن جاتا ہے تو
دیکھتا ہوں موجِ مے میں میکدہ کی وسعتیں — جب شرابِ شاعری کا کیف برساتا ہے تو
چھیڑتا ہے بربطِ دل کو نفس کے تار سے — اشک بن کر دیدۂ ہستی میں لہراتا ہے تو
پردۂ خود ناشناسی چاک کرنے کے لئے — رازِ پنہاں ہے مگر افسانہ بن جاتا ہے تو
حافظ و جامی کے میخانوں میں جو ڈھلتی رہی — وہ شرابِ کہنہ پیمانوں میں چھلکاتا ہے تو
طور کی چنگاریوں کو کر کے آتش آفریں — آتشِ قلبِ عبودیت کو بھڑکاتا ہے تو
خلدزارِ زندگی کو دامنِ تقدیس میں — کوثر و تسنیم کی موجوں سے نہلاتا ہے تو

تیرے دل میں کروٹیں لیتی ہے طوفانی تڑپ
اضطرابِ زندگانی میں سکوں پاتا ہے تو

دہر میں سیلابِ حق، باطل سے رک سکتا نہیں — تیرا سر دہلیز پر دنیا کی جھک سکتا نہیں
بے خودوں کی خود فراموشی کا بدلے گا مزاج — تجھ کو مل جائے گا اک دن اپنی عظمت کا خراج

درد کی دنیا تو تڑپے گی یونہی بے تاب ہو
ہاں اسی انداز سے آتش زنِ مضراب ہو

---

صاحبزادہ محمد علیخاں میکش مرحوم

# نذرِ امجد مدظلہٗ

ساحل پہ بھی ہوں اور سفینوں میں ہوں
محفل میں بھی ہوں، گوشہ نشینوں میں ہوں
دنیا مجھے کہتی ہے رباعی گو کیوں
میں بھی امجد کے خوشہ چینوں میں ہوں

(۲)

ہے قابل اسباق حیاتِ امجد
حق یہ ہی رہی ہے التفاتِ امجد
در اصل ہیں تجربات کا گنجینہ
اے جذب جو ہیں رباعیاتِ امجد

(۳)

جو قال ہے بس وہی ہے حالِ امجد
تخئیلِ بلند ہے کمالِ امجد
ہر شخص کے ہے مطالعہ کے قابل
تصویرِ حیات ہے "جمالِ امجد"

(۴)

افضل ہے سخنوری میں شانِ امجد
آسان سے آسان ہے زبانِ امجد
امجد ہیں عکسِ سعدیؒ شیرازی
ہے اس کا ثبوت "گلستانِ امجد"

(۵)

امجد کا کلام ہے کلام امجد | ہر شعر میں ہے ایک پیام امجد
امجد کو جو کہتے ہیں جواب سرمدؔ | ارفع و بلند ہے مقام امجد

(۶)

امجد صاحب کی سرمدی بھی دیکھی | ہر حال میں دل ان کی سرخوشی بھی دیکھی
خوش بخت ہوں اے جذبؔ انہیں اس میں شک | ان کی ڈائمنڈ جوبلی بھی دیکھی

(۷)

اس جشن سے ہر اہل دکن ہے بشاش
بزم[1] ادبیات کی کوشش اشاباش
گو جذبؔ ہوئی قدر حکیم الشعراء
ہر حال میں وہ شاد ہیں اور ہیں بشاش

---

راگھوینیدر راؤ جذبؔ عالمپوری

1. ادارۂ ادبیات اردو

# پیامات

(معتمد نے مشاہیر کے پیامات جلسے میں پڑھ کر سنائے)

**مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ایڈیٹر صدق (ہفتہ وار)۔ دریاباد۔ بارہ بنکی**

"امجد" نامور و ذی شان کے باب میں "ماجد" گمنام و بے نشان کا کچھ عرض کرنا

سورج کو چراغ سے دکھانا

شہد کو اور کونسی مٹھاس ڈال کر میٹھا کیا جائے اور نمک میں اور کونسی نمکینی ملا کر نمکین بنایا جائے۔ وہ میرے افضل التفضیل برائے نام ہی نہیں زندگی کے ہر صیغہ میں مجھ سے افضل، اکمل، اشرف، اکرم ہیں۔

اللہ ان کی عمر میں، کمالات میں، کرامات میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔

عبدالماجد دریابادی

**منشی تلوک چند محروم دہلی**

اے نازشِ جوہرِ رباعی امجد — لعلِ سرِ افسرِ رباعی امجد
ہے چار سوئے ہند میں شہرت تیری — اے خسروِ کشورِ رباعی امجد

مجھے یہ سن کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ حیدرآباد میں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے امجد صاحب کی ڈائمنڈ جوبلی منائی جا رہی ہے۔ امجد صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی میں نہایت موزوں اور برمحل ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے اس اقدام پر بہی خواہانِ اردو کی خوشی میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔

تلوک چند محروم

**پروفیسر سید احتشام حسین۔ لکھنؤ یونیورسٹی**

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی کی ڈائمنڈ جوبلی منانی مبارک ہو۔ حضرت امجد ایک بلند پایہ اور حقیقی شاعر ہیں۔ انھوں نے فلسفیانہ بصیرت سے اسرارِ حیات کے فاش کرنے اور جذباتی انداز سے زندگی کے گہرے نقوش کو ابھارنے کی جو سعی کی ہے اس سے اردو ادب کا دامن وسیع ہوا ہے۔ زبان و بیان پر قدرت اور پاکیزگیٔ خیال نے ان کی رباعیات میں کلاسکی عظمت پیدا کی ہے اور جذبات کی گرمی نے ایک خاص قسم کی روحانیت کو جنم دیا ہے۔ موصوف کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اپنے ان فنکاروں کی طرف متوجہ ہو رہے

میں جن کی خاموش کاوشوں سے ادب کے خزانے میں لازوال اضافے ہوتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ موصوف بہت دنوں تک اردو زبان و ادب کی آبیاری کے لئے زندہ اور تندرست رہیں۔

سید احتشام حسین

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی (پروفیسر اردو دہلی یونیورسٹی)

برادرم شاہد صاحب

آپ نے حضرت امجد کی خدمات کا مناسب اعتراف کر کے اردو کو سربلند کیا۔ انھوں نے اس زبان کی بڑی خدمت کی ہے اور ان کا تاریخ شعر میں ایک مقام ہے جو انھیں پہچاننا چاہیے۔

حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی کی رباعیاں میں نے بچپن سے پڑھی ہیں۔ والد مرحوم کو ان کی یہ رباعیاں بہت پسند تھیں اور وہ اسی وجہ سے مجھے یاد ہو گئی تھیں۔

اس سینہ میں کائنات رکھ لی میں نے　　کیا ذکر صفات ذات رکھ لی میں نے
ظالم ہی، جاہل ہی، نادان سہی　　سب کچھ ہی تیری بات رکھ لی میں نے

---

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی　　طاعت میں نہیں ہے خود نمائی اچھی
اک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو　　حضرت تم سے دیا سلائی اچھی

حضرت امجد کی رباعیاں زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کو پیش کرتی ہیں اور شعری آرٹ کا نہایت حسین نمونہ ہیں۔ انھوں نے عرفان نفس اور کائنات کے روحانی پہلوؤں کو جس خوبی کے ساتھ لباس شعر میں جلوہ گر کیا ہے، اس کی دوسری مثال عصر حاضر میں نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے اوپر تادیر قائم رکھے اور یہ جشن ہر طرح مبارک ہو۔

خواجہ احمد فاروقی

پنڈت مدن موہن کالیہ۔ بمبئی

برادر محترم!

تسلیم — آپ کا ۲۲ر جنوری ۱۹۵۵ء کا خط نامکمل پتہ کی وجہ سے بہت دیر سے ملا۔ چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے جناب حضرت امجد صاحب کی اردو علم و ادب کی خدمات کے اعتراف کے لئے جو تقریب منعقد کی گئی تھی اس کے لئے میری نیک خواہشات کے یہ الفاظ دیر سے ملیں گے۔

حضرت موصوف جیسی بلند مرتبہ ہستیاں ادب اردو کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ رہتی دنیا تک جہاں اردو اپنے پرستاروں کی آنکھوں کا نور بنی رہے گی وہاں امجد صاحب جیسی شخصیتیں اپنے عمدہ کلام کی بدولت اپنے شیدائیوں کے دلوں میں یاد کی شمع روشن رکھیں گی — خدا کرے یہ شاعر بلند پایہ صاحب کمال شخصیت ہمارے لئے برسوں سالوں تک مشعل راہ کے طور پر زندہ و تابندہ رہے اور ہم کئی ایسی جوبلیاں منا سکیں۔

نیاز مند — پنڈت مدن موہن کالیہ

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

# سب رس

سالگرہ نمبر ۱۹۵۶ء

جلد ۲۰ شمارہ نمبر (۱ - ۲)

جنوری و فروری

## نگراں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

## مجلس ادارت

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد

قیمت
ایک روپیہ سکۂ ہند

ندہ سالانہ چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی تین روپے آٹھ آنے سکۂ ہند

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے اعجاز پرنٹنگ پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

# فہرست



چیف منسٹر ڈاکٹر بی۔رام کرشن راؤ ادارے میں تقریر فرما رہے ہیں



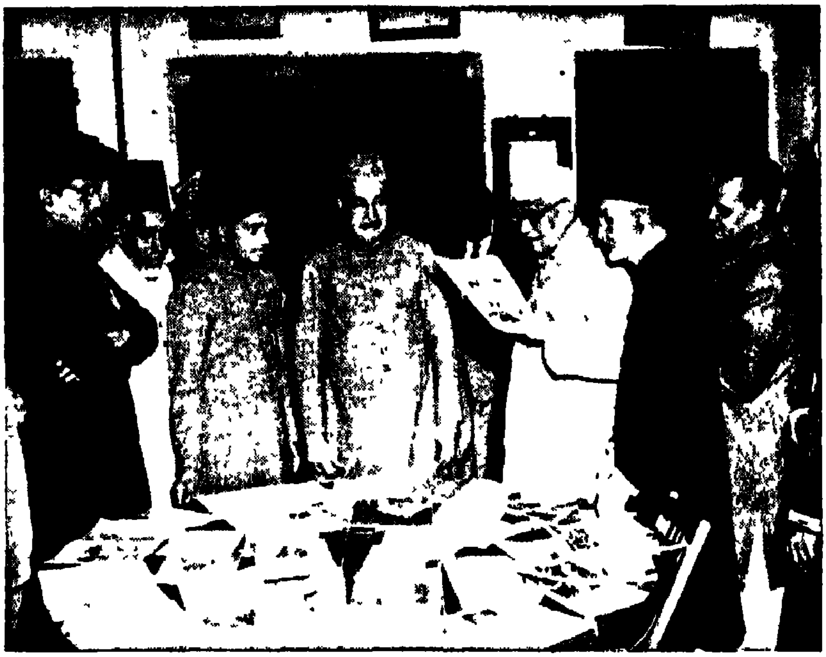
نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ عمارت ادارہ ادبیات اردو کا سنگ بنیاد رکھنے کی استدعائی تقریر کر رہے ہیں۔ ان کی بائیں طرف :— ڈاکٹر بی۔ رام کرشنا راؤ ڈاکٹر زور — ایل۔ این گپتا — جانکی پرشاد — قاضی عبدالرشید وغیرہ بیٹھے ہیں

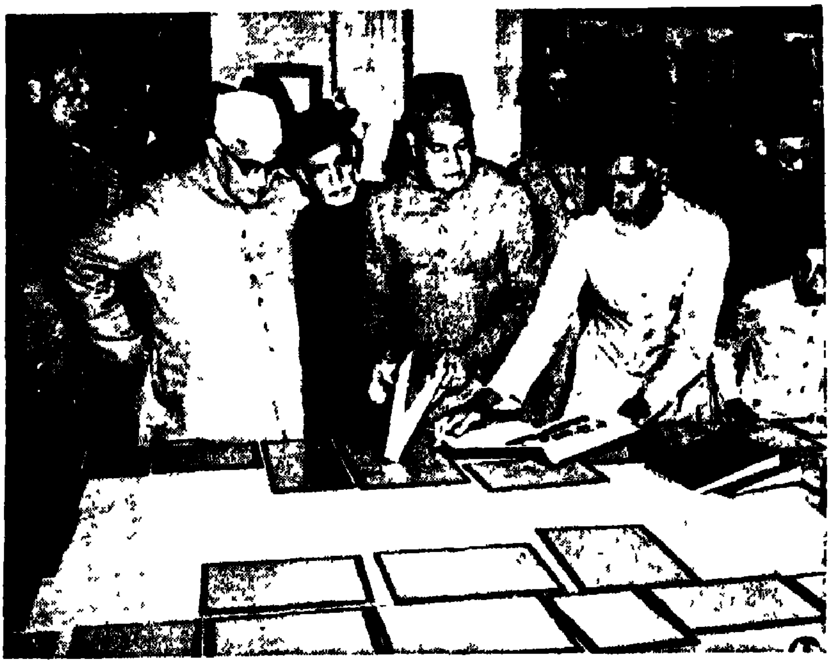


ڈاکٹر سید محمود ادارے میں تقریر فرما رہے ہیں

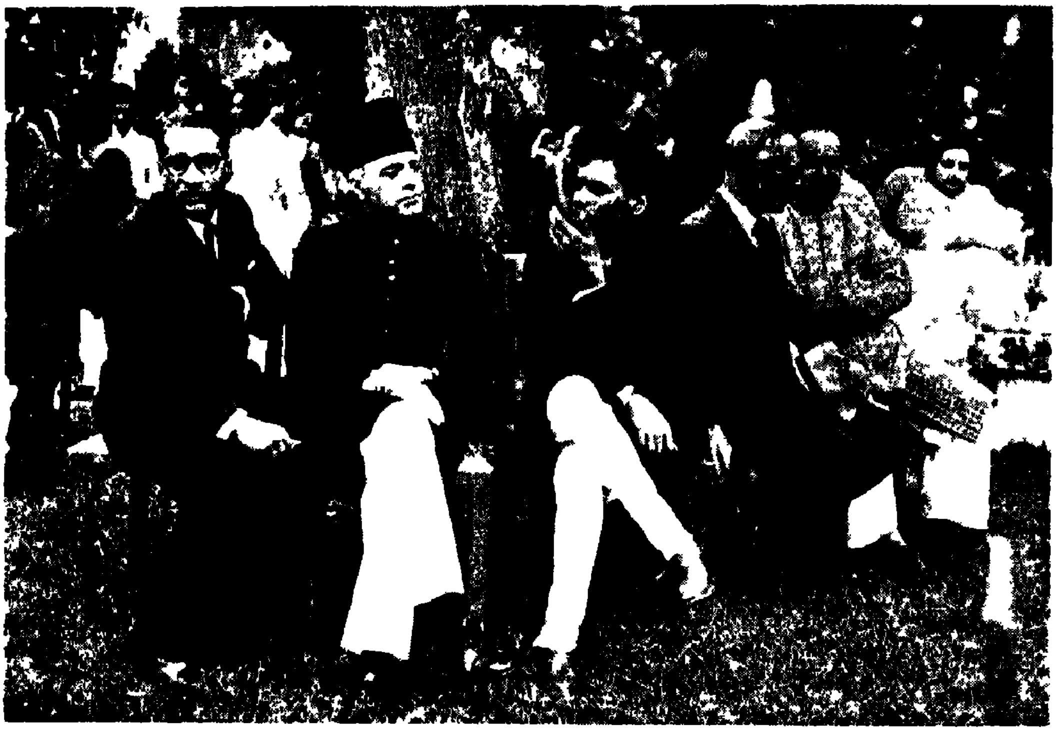


ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ادارے میں





ڈاکٹر سید محمود ادارے کے مختلف شعبوں کا
معائنہ فرما رہے ہیں



ایل۔این گپتا ـــ حبیب الرحمن ـــ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ـــ سید علی اکبر
اور ڈاکٹر زور ادارے کی ایک محفل میں



پروفیسر بھگوت دیال ورما اور مسز اوشا ادارے میں

ادارے کے دو ساتھی جو بچھڑ گئے



سید علی منظور مرحوم



ابوالمکارم فیض محمد صدیقی مرحوم

# قاضی عبد الغفارؒ

از :- جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

قاضی عبد الغفا اردو کے ایک روشن خیال اور صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی تحریریں بھی ایک خاص شائستگی اور آزادی دبے باکی سے معمور ہوتی تھیں۔ صحیح معنوں میں وہ اردو کے ترقی پسند ادب کے ابتدائی معمار تھے۔ وہ ان چند صاحب نظر ادیبوں میں سے تھے جنھوں نے اردو کے مصنفوں اور انشاء پردازوں کی قدیم ڈگر سے ہٹ کر ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ ایک ایسا راستہ جو آگے چل کر ترقی پسندوں کی شاہراہ بن گیا اور اس زبان کی تاریخ میں ایک مستقل باب کے اضافے کا باعث بنا۔

وہ جس وقت حیدرآباد میں سکونت پذیر ہوئے ادارۂ ادبیات اردو کو قائم ہوکر پانچ سال گذر چکے تھے اور یہ ادارہ علم وفضل اور سیاست و ثروت کے صاحبانِ اقتدار کی نظروں میں اپنی روز افزوں سرگرمیات اور عوامی خدمات کے باعث کھٹکنے لگا تھا اور دونوں قسم کے اصحاب اس کے کاموں میں طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالنے میں منہمک تھے۔ قاضی صاحب نے بغیر کسی تعارف یا تعلق کے اس کو بھانپ لیا اور اپنے اخبار پیام میں ادارے کے ہر کام اور ہر تحریک کی تائید میں ہمت افزا اداریے لکھنے شروع کئے۔ اس کے بعد قاضی صاحب کو ادارے کے شعبۂ زبان کی رکنیت قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے اس کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے ہر اجلاس میں پابندی سے شرکت فرماتے رہے۔ انہی کی تحریک پر اس شعبہ نے دکن کی کہاوتیں اور ضرب الامثال جمع کرنے کا کام شروع کیا اور نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم اعزازی کتب خانہ ادارہ اس کے کنوینر مقرر ہوئے اور سینکڑوں کہاوتیں اور ضرب الامثال جمع کئے۔ اس کام میں جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی اور اضلاع کے شاخوں کے متعدد ارباب کار نے بھی اس شعبہ کی مدد کی۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں جب ادارے نے ایک کل ہند اردو کانگریس کے انعقاد کے لئے اعلیٰ پیمانہ پر انتظامات شروع کئے تو قاضی صاحب نے ادارے کے ساتھ نہ صرف بھرپور تعاون کیا بلکہ ارباب ادارہ کے دوش بدوش مولوی عبدالحق اور ان کے بعض ساتھیوں کا جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس

کانفرنس کے مخالف تھے اور اس کو ناکام کرنا چاہتے تھے اس طرح مقابلہ کیا کہ مولوی صاحب یہ سمجھے گئے تھے کہ یہ سارا تماشہ قاضی صاحب ہی کا کھیلا ہوا ہے اور ادارے کو انھوں نے اپنی ذاتی مخالفت کی خاطر آلۂ کار بنایا ہے۔ چنانچہ سید ہاشمی صاحب فریدآبادی نے انجمن ترقی اردو کی جو تاریخ چھپوائی ہے اس میں نہایت غیر مہذب انداز میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حالانکہ اس اردو کانگریس کے انتظامات میں قاضی صاحب بہت بعد شامل ہوئے تھے اور محض اپنی آزاد خیالی اور اردو دوستی کی بناء پر اس کے کارکنوں کی تائید کر رہے تھے۔

اس کل ہند اردو کانگریس کے بعد سے قاضی صاحب ادارے سے بہت قریب ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس کے ہر کام میں مدد کرتے رہے اور بالمشافہ اور اخبار پیام کے ذریعہ سے اس کے کاموں کو آگے بڑھانے اور ہمت افزائی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی گذرا کہ قاضی صاحب کی اس تائید اور تعاون کے باعث بعض لوگ اور اخبار ادارے سے بدظن بھی رہے اور اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔

تقسیم ہند کے بعد جب وہ خود انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے تو ادارۂ ادبیات اردو کو بھولے نہیں بلکہ جب کبھی حیدرآباد آتے ضرور اس میں تشریف لاتے اور اپنے مشوروں سے مستفید کرتے۔ جب حیدرآباد میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کا احیاء کرنے کا خیال ہوا تو سب سے پہلے راقم الحروف سے آکر مشورہ کیا۔ ادارے کے موجود ہوتے ہوئے انجمن کی شاخ قائم کرنے کی مصلحت اور ضرورت پر گفتگو کی اور کافی دیر تک ٹھہر کر کسی مناسب معتمد کے انتخاب کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔

۱۹۵۵ء کے آخر میں جب ساہتیہ اکاڈیمی کی مجلس مشاورت کے سلسلہ میں قاضی صاحب سے دلی میں ملاقات ہوئی اور میں نے ادارۂ ادبیات اردو کی سلور جوبلی منانے کے سلسلے میں ان سے مشورہ لیا تو انھوں نے پروگرام وغیرہ کی ترتیب میں بڑی مدد کی اور خود ایک اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے حیدرآباد تشریف لانے پر رضامندی ظاہر کی چنانچہ حسب قاعدہ وہ بر وقت حیدرآباد آگئے۔

دو ماہ قبل جب ادارۂ ادبیات اردو کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کا رقعہ ان کے یہاں بھیجا گیا تو انھوں نے حسب عادت ایک تفصیلی خط لکھا جس میں ادارے کے کاموں کی افادیت اور اس کے عمارت کے جلد بن جانے پر خوشی کا اظہار کیا۔ اس خط کا اقتباس سب رس بابتہ ڈسمبر ۱۹۵۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

قاضی صاحب کی وفات سے ہندوستان میں اردو کا ایک بڑا ستون گر گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) ایک ایسے وقت اپنے ناخدا سے محروم ہو گئی جب کہ اس کی کشتی ہندوستان کے لسانی طوفان کے تھپیڑوں میں سرگرداں ہے۔ اس کو کوئی نہ کوئی معتمد مل ہی جائے گا لیکن قاضی صاحب جیسے نغز گفتار ادیب اور زبان و سیاست کے نبض شناس اور تجربہ کار صحیفہ نگار کی ضرورت اردو دنیا میں بری طرح محسوس کی جائے گی۔

---

# تائی چھتّی

از:۔ جناب کرتار سنگھ دگل صاحب

یہاں ڈیوڑھی میں چرخہ لئے بیٹھی رہتی ہوں۔ اس وقت تک جب تک تو گذر نہ جائے۔ آج دس سال ہو چکے ہیں۔"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ مجھے انیس ۱۹ سال سے محبت کر رہی ہے۔ میرے جنم لینے سے تین گھنٹے بعد جب اس نے مجھے اپنی گود میں اٹھایا تو میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور میری انگلیاں اس کی چھاتی سے جا ٹکرائی تھیں اور ایکا ایکی اس کے دل کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔

"اسی دن سے تیری طرف تکتے تکتے میں لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ تجھ میں کیا ہے۔ کیا ہے تجھ میں؟" اور وہ میرے کپڑے نوچتی رہی۔

جس وقت میں پیدا ہوا وہ پانچ بچوں کی ماں تھی۔ اس کا خاوند تنومند اور گرانڈیل جوان تھا۔ وہ ایک سال میں دو بچے جنتی۔ اس کی اپنی جوانی رنگیلی پھٹی پڑتی تھی۔ "نیک بخت تیرے پاس سے کوئی گذرے تو بچہ جن دیتی ہے" اس کا خاوند کہتا۔ لیکن اس دن کے بعد وہ پھر کبھی ماں نہ بن سکی۔

اس کے بازو از خود بے خیالی کے عالم میں پھیلے رہتے۔ اس کی پلکیں اٹھی اٹھی سی رہتیں اور اس کی نظریں جیسے راہ تکتی تکتی سی ہوں۔ اس کا سینہ جوانی میں جس قدر ابھرا ہوا تھا ادھیڑ عمر میں اسی قدر ڈھلک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک خلا سا تھا جو آنکھوں کے نیچے سے شروع ہو کر تھوڑی تک جاتا تھا جیسے کوئی ساری عمر آنکھیں پھاڑے ہوئے ایک ہی طرف دیکھتا رہا ہو۔ اس کے چیکٹ اور سفید بالوں میں وحشت سی بکھری ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر پھیلا ہوا تبسم ابھی تک تازہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ابھی تک نئی تھی اور اچھوتی۔ اس کے بازوؤں میں نہ جانے اتنی توانائی کہاں سے آ گئی۔ اس نے وارفتگی کے ساتھ مجھے جکڑا ہوا تھا۔ ایک کٹی ہوئی فاختہ کی طرح میں اس کے پلنگ پر پڑا تھا۔ انیس ۱۹ سال کا ایک جوان مرد۔

اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح میرے انگ انگ کی نشو و نما اس کے دیکھتے دیکھتے ہوئی۔ وہ میری ماں کی چوری سے میرا [illegible] کیا کرتی —"تیرے گال چوم چوم کے چاٹ چاٹ کے گیلے کر دیا کرتی تھی۔ میں نے تیرے بازوؤں میں، تیری رانوں میں چھٹانک چھٹانک بھر تیل جذب کر دیا۔ لڑکیوں کی طرح تیرے بالوں میں بیل بوٹے، طوطے اور مور بنایا کرتی۔ تیری آنکھوں میں سرمہ ڈال کر تیری طرف تکتے تکتے میں دیوانی ہو جایا کرتی تھی۔"

ایک دفعہ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ ایک دن مجھے لاڈ کر رہی تھی تو میں نے اس کی قمیص میں پیشاب کر دیا تھا۔

اور جب میں نے ہوش سنبھالی تو جس قدر وہ مجھے چاہتی تھی میں اسی قدر اس سے کنی کترایا کرتا تھا اور میری ماں کو شکایت تھی کہ تائی چھتی نے مجھے بگاڑ دیا تھا۔

ایک مرتبہ نہ جانے کیا ہوا۔ تائی چھتی نے کنجکوں[1] کا تہوار منایا۔ اڑوس پڑوس کی میری عمر کی اور مجھ سے دو دو سال بڑی لڑکیاں اس نے بلوائیں۔ تائی چھتی نے انھیں نہلایا۔

[1] ... کنواری لڑکیوں کو جمع کر کے کھانا کھلایا جاتا ہے۔

اجلے کپڑے پہنائے۔ ایک ایک کر کے سب کی زلفیں سلجھائیں۔
اور پھر انھیں میٹھے چاول کھلائے اور سات سات پیسے سب کے دوپٹوں کے پلّوؤں کے ساتھ باندھ دیئے۔ ہم سارا دن حویلی میں کھیلتے رہتے۔ کبھی لڑکوں اور کبھی لڑکیوں والے کھیل۔ کبھی میں ان کے کندھوں پر سوار ہو جاتا تو کبھی وہ میری آنکھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیتیں۔ آنکھ مچولی کے وقت تائی چھتی مجھے چھپاتی رہتی۔ اڈی ترپا[1] کھیلتے وقت تائی چھتی میری پھرتی دیکھ کر جی ہی جی میں مسکراتی۔ کبھی مجھے وہ لڑکیوں کے پیچھے دوڑا دیتی اور کبھی کبھی لڑکیاں آ کر مجھے اپنی بازوؤں میں لپیٹ لیتیں۔
اور کبھی ہم گھر بسانے کا کھیل کھیلتے۔ میں مرد بنتا۔ گھر کا مالک زمیندار۔ ایک لڑکی میری بیوی بنتی۔ مجھ سے گھونگھٹ نکالتی اور میرے سامنے سر جھکائے رہتی۔ باقی لڑکیاں نوکرانیاں، دوکاندار اور نہ جانے کیا کیا بنتیں۔ میں اپنے جھوٹ موٹ کے کھیتوں کو جاتا۔ نوکروں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر خواہ مخواہ برس پڑتا۔ یونہی بناوٹی طور پر تھک کر چور ہو کر گھر واپس آتا۔ پتوں کی تھالی میں ٹھیکرے رکھ کر روٹی کھاتا۔ پھر جھوٹ موٹ یوں ہی رات ہو جاتی اور پھر میری مصنوعی بیوی اور میں سچ مچ سو جاتے۔ تائی چھتی آ کر ہمیں چادر اوڑھا دیتی۔
"تیری ماں تو نری گدھی ہے۔ اسے کوئی بات بھی آتی ہے؟ اپنی طرف دیکھ اور اپنے بہن بھائیوں کی طرف۔ اگر میں نہ ہوتی تو کبھی خراب ہو جاتا۔ ایک دن شام کو میں کیا دیکھتی ہوں کہ تو کوڑے میں لتھڑا ہوا اپنے دروازے پر کھیل رہا ہے۔ مکھیاں کہہ رہی تھیں کہ ہم آج کے دن ہی آئیں۔ بُرا حال تھا۔ تیری ماں کو تیرا کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ میں نے گرم پانی سے تجھے نہلایا دھلایا۔ تجھے لپیٹ لپٹ کر تری پھوپھی ماں کی گود میں جا لٹایا۔"
اس نے اس قسم کی میرے بچپن کی ہزاروں باتیں مجھے بتائیں۔

اگر میرا جسم گرم ہوتا تو اس کے پسینے چھوٹ جاتے۔
اگر مجھے چھینک آتی تو وہ منتیں مانتی۔ میرے سر میں درد ہوتا تو خانقاہ پر دیا جلاتی۔ ایک دفعہ جب مجھے چوتھے کا بخار چڑھا تو اس نے اماوس کی کالی اندھیری رات میں گاؤں سے دور جا کر چوراہے پر ٹونا کیا۔ جاڑے کے دن میں مٹی کے کورے گھڑے کے برف ایسے سرد پانی سے چوراہے میں جا کر نہائی اور خود کو نمونیہ کر لیا۔ میں تو چوتھے روز شفایاب ہو گیا لیکن وہ مرتے مرتے بچی اور جب مجھے چیچک نکل آئی ڈاکٹروں اور حکیموں نے جواب دے دیا۔ گھر والے جب مجھے رو پیٹ چکے جب میری نبضیں چھوٹ گئیں۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ رشتہ داروں میں کہرام بپا ہو گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ شام کے دھندلکے میں دروازے میں کنڈی چڑھا کر بیٹھ گئی۔ دیوتا کی مورتی کے سامنے گھی کا دیا جلایا۔ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو اپنی جھولی میں ڈال کر اس نے پرماتما کے ساتھ سودا کر لیا۔ اسی دن چیچک یعنی دیوی ماتا مجھے چھوڑ کر اس کے چھوٹے بیٹے سے لپٹ گئی اور تین دنوں کے اندر اندر اسے جلا کر راکھ کر دیا۔
آہستہ آہستہ میں بڑا ہو رہا تھا۔ اسکول کی جماعتوں کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ سائیکل چلانی سیکھا تو ہر وقت اسی پہ اکھاڑ رہتا۔ شام کو ہاکی کھیلنے کے لئے کھیتوں پر دور گراؤنڈ میں چلا جاتا۔ نئے نئے دوست بنتے۔ کتابوں اور استادوں کے ساتھ میرا پیار بڑھتا جا رہا تھا۔ میں عمر میں جس قدر بڑھتا جاتا اسی قدر تائی چھتی کے حلقۂ اثر سے اور اس کی رسائی سے دور نکلتا جاتا۔ مجھے وہ چھپ چھپ کے دیکھتی۔ ٹیلوں پر چڑھ کر جھانکتی۔ گلی میں یا کسی گھر میں اگر مل لیتی تو مجھ سے (؟) آ جاتا تو وہ مجھے چھو کے چھونے کا کام بتاتی۔ مجھ سے کچھ جھجکتی اور کچھ شرمائی شرمائی سی رہتی۔ ایک دن میں سائیکل پر اس کا دیوڑھی کے قریب سے گزر رہا تھا کہ میں تیز تیز سے نیچا پر گر پڑا۔ اس نے گوبی کا ٹھیک ہاتھ کے مجھ سائیکل کے نیچے سے

[1] پنجاب کے دیہاتی بچوں کا ایک کھیل۔

اماں اور اپنی آغوش میں لے لیا۔ "خدا غارت کرے ان بری نظروں کو۔" جب میں اٹھا تو میں نے اسے اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

جب اسکول جاتے ہوئے میں اس کے گھر کے قریب سے گزرتا تو وہ کچھ نہ کچھ چپکے سے میری ہتھیلی پر آکر رکھ دیتی۔ یہ میری ہتھیلی پر رکھ کر مجھ سے کوئی کام کرنے کو کہہ دیتی۔ میرے لئے یہ لے آنا وہ لے آنا اور جب میں اس کے کام کر دیتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو۔ کاٹھ کے الو۔ مٹی کے مادھو۔ کبھی تو یہ چیزیں لانا بھول بھی جایا کر۔ اچھا اگر اب تو لے آیا ہے تو یہاں رکھ دے۔ اور وہ میری لائی ہوئی چیز کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھاتی۔ وہ مجھے دیکھتی رہتی۔ دیکھتی رہتی۔ میں گلی کا موڑ مڑ جاتا۔

میں اور بڑا ہو رہا تھا۔

گاؤں کے اسکول کے تمام امتحانات پاس کرنے کے بعد میں نزدیکی شہر کے اسکول میں داخل ہو گیا۔ صبح سویرے سائیکل پر سوار ہو کر میں گاؤں سے نکل جاتا۔ رات گئے کھیل کر اور پڑھ کر، نئے شہر کے دوستوں سے مل ملا کر واپس آتا۔ گرمیوں میں ہر سال میں پہاڑ چلا جاتا۔ سردیوں کے چھوٹے دن شہر میں تمام ہو جاتے۔ گاؤں والوں کے لئے میں روز بروز بیگانہ سا ہوتا جا رہا تھا۔

ان دنوں میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے۔ میری بہن کا بیاہ تھا آٹھ دس دن پہلے ہی ہم نے "گیت بٹھا" دیئے تھے۔ رات کو ہر روز گاؤں کی لڑکیاں، عورتیں اور بوڑھیاں ہمارے گھر میں آکر مل کر ہنسی ٹھٹھول کرتیں۔ گاتیں اور نقاریاں مارتیں۔ تائی بھیتی کو سب سے زیادہ گیت آتے تھے۔ آدھی رات تک رونق سی لگی رہتی۔ میں بھی عورتوں میں سکڑا ہوا بیٹھا رہتا۔ ایک رات کو تائی بھیتی نے بالکل نیا گیت سنانے کا وعدہ کیا۔ روز کی طرح اس رات کو بھی میں وہاں بیٹھا تھا۔ اس دس میں پڑوس کے اور لڑکے بھی وہیں تھے۔

گیت شروع کرنے سے پہلے تائی بھیتی نے اپنے دوپٹے کی گیڑی سی بنائی اور سر پر رکھ لی۔ اپنے لمبے لمبے بالوں کو اس میں اڑس لیا۔ کسی اور لڑکی کا دوپٹہ لے کر کندھے پر رکھ لیا اور اس دوپٹے کا کچھ حصہ کمر میں لپیٹ لیا۔ ہماری رسوئی میں سے دوڑ کر سونٹا اور کھرل اٹھا لائی۔ کھرل کو اس نے دالان کے بیچ میں رکھ دیا اور سونٹا اٹھا کر گانا شروع کر دیا۔

مردوں کے بھرے بھلے پہناوے میں اس نے مرد کی سی آواز میں گانا شروع کر دیا۔ گاتے گاتے جیسے اسے نشہ سا چڑھ رہا تھا۔ اس کی ہیئت سے وحشت سی برس رہی تھی۔ ہاتھوں سے، بازوؤں اور آنکھوں سے وہ اشارے کرتی ہوئی ایک بھنگ پینے والے کی ہو بہو تصویر بنا رہی تھی۔

وہ گا رہی تھی۔

دے بھنگیا توں نے گڑاں ناداں اے بھنگی!
دے بھنگ گھوٹنے گرو کا نام لے
اور بھنگ گھوٹے جا۔

اس نے سونٹا کھرل میں گھمانا شروع کر دیا۔ ڈھولک کی تال کے ساتھ وہ ایک لے میں ایک سر میں گائے جا رہی تھی۔ "بھنگ گھوٹ۔ بھنگ گھوٹنے"۔ اور وہ کھرل میں سونٹا گھمائے جا رہی تھی۔

یہ بھنگ کا گیت تھا کہ کس طرح بھنگ پینے والے نشے کی ٹوٹ محسوس کرتا ہے۔ اس کے بازوؤں میں اور اس کے بدن میں کس طرح سستی سی آ جاتی ہے۔ آخر میں چھپتے چھپاتے بازار سے بھنگ لاتا ہے۔ خدا کا نام لے کر بھنگ گھوٹنا شروع کر دیتا ہے۔ رگڑتے ہوئے پانی ڈالتا ہے اور بھنگ پیئے جاتا ہے۔ پھر پیالا بھر لیتا ہے۔ خوش ہوتا ہے اور خدا کا نام لے کر ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیتا ہے۔

تائی بھیتی اس طرح گائے بھی جاتی اور ساتھ ہی ساتھ اداکاری کے جوہر بھی دکھاتی جاتی۔ حاضرین ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ ڈھولک کی تال تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تائی بھیتی پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

دے بجنگیا لے گراں داناں اے بجنگی
گُرو کا نام لے بجنگ چھیڑ دیگا
بجنگ چڑھ گئی۔

س نے ناچنا اور جھومنا بھی شروع کر دیا۔ اس کا ایک ایک
نامیہ، اس کا ایک ایک اشارہ اس کی ایک ایک حرکت بدمست
بجنگی کی حالت کا اظہار کر رہی تھی۔ ہم سب جیسے نشے میں چور
وئے جا رہے تھے۔ ناچتے ناچتے تائی چھتی کا بندھا ہوا دوپٹہ
ھل گیا۔ اس کے بال دیوانوں کی طرح بکھر گئے۔ اس کے
ندھے پر سے دوپٹہ ڈھلک کر اس کی کمر کے ساتھ لٹکنے لگا
ب وہ گھومتی اس کی شلوار اور اس کی قمیص لہرا اٹھتی۔ ڈھولک
، تال اس گھڑی اور بھی تیز ہو جاتی۔ اس کے پاؤں جیسے
یں پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس کی باہیں لہرا رہی تھیں۔ اس
ا سر گھوم رہا تھا۔ ڈھولک بلند اور تیز ہوتی جا رہی تھی
ئے میں ایک جنونی کیفیت میں تائی چھتی مجھ پر آ گری۔
لڑکیوں نے ہنس ہنس کر قہقاریاں مار مار کر
سمان سر پر اٹھا لیا۔ میں شرما کر دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں
چلا گیا۔

اس دن سے تائی چھتی سے مجھے شرم سی آنے لگی میں
ن سے خفا نہیں تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر اب میں کالج
، آ چکا تھا۔ سائیکل چھوڑ کر میں نے موٹر سائیکل لے لی تھی۔
اؤں والے گھر سے میں صبح سویرے نکل پڑتا اور شہر سے کافی
یر کے بعد واپس آتا۔ تائی چھتی کا گھر ہمارے سے پہلے آتا تھا۔

• کبھی اس کے گھر کا دروازہ بند ہوتا اور کبھی کھلا ہوتا۔
جس رات کو تائی چھتی نے بجنگ والا گیت سنایا تھا
اس رات کے بعد میں نے تائی چھتی سے نہ تو کوئی بات کی تھی
نہ کبھی اس کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کے چرخے کی گھوں
گھوں اکثر میرے کانوں میں پڑتی تھی۔ کالج میں ہمارے
امتحان ہو رہے تھے اور میں اپنے کمرے میں امتحان کی تیاری
کر رہا تھا کہ ایک دن میری ماں مجھ سے آ کر کہنے لگی —"بیٹا
اگر فرصت ملے تو تائی چھتی کے ہاں ذرا سی دیر کے لئے ہو آنا۔
بیچاری کا برا حال ہے۔ غش آ گیا تھا اور وہ تمہیں پوچھ رہی تھی۔"
ایک دو دن کے بعد میری ماں نے مجھ سے پھر کہا —
"تائی چھتی کے گھر گئے تھے بیٹا؟ ضرور ہو آنا بیچاری تمہیں آج
یاد کر رہی تھی۔"
اگلے روز میں دوپہر کو تائی چھتی کی ڈیوڑھی پار کر کے
سنسان دالان میں سے گزرتا ہوا اس کے کمرے میں جا پہنچا۔
وہ تنہا لیٹی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر سرخی
دوڑ گئی۔ اس کے لبوں پر تبسم آیا اور وہ آن کی آن میں اٹھ کر
بیٹھ گئی — "مجھے معلوم تھا کہ آج تم ضرور آؤ گے۔ آج تم ضرور
آؤ گے۔" اتنا کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔
میں فرطِ حیرت سے سمٌ بکمٌ ایک بت کی طرح جم کر
رہ گیا اور پھر مجھے یاد نہیں کہ کب میں اس کے پلنگ پر دھم
سے گر پڑا۔

# مسدس حالی کے چند نقاد

از: پروفیسر سید احتشام حسین صاحب (لکھنؤ یونیورسٹی)

مسدس حالی ان کتابوں میں سے ہے جن کے متعلق نہ صرف مختلف بلکہ متضاد رائیں ملتی ہیں اور ظاہر کرتی ہیں کہ شعر و ادب کی دنیا میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے معیار اب بھی زیادہ تر انفرادی ذوق کے نقطہ نظر سے قائم کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ دورِ جدید میں اصول تنقید کو بڑی حد تک سائنٹفک بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالی نے اپنا مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے سرسید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں لکھا۔ سرسید ہی نے موضوع کا انتخاب کیا تھا اور سب سے پہلے سرسید ہی نے اس کی داد بھی دی۔ مسدس کو پڑھ کر حالی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے ــــ میں اس کا محرک ہوا اور اس کو اپنے ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں ــــ" یہی نہیں ان کی تو خواہش تھی کہ اس نظم کو لڑکے گلیوں میں پڑھتے پھریں، رنڈیاں جلسوں میں گائیں اور قوال محفلوں میں سنائیں۔ خود حالی نے اس کے متعلق کہا کہ "اس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ہے، نہ مبالغہ کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے ــــ گویا اہل دہلی اور لکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دسترخوان چُنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی ہے بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے واسطے کی گئی ہے اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو ان کا احسان ہے ورنہ کوئی شکایت نہیں۔" مولانا عبدالحق نے کہا ہے کہ "مسدس حالی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے۔ اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کئے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بیبہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔" سر راس مسعود کا خیال ہے کہ "مسدس میں چند بند ایسے ہیں جن سے بہتر یورپ کی کسی قوم کے ادب میں آج تک کوئی چیز نہیں لکھی گئی ہے۔"

ان اقوال میں خود حالی کے قول کے سوا ہر جملہ مسدس کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے لیکن جب مسدس شائع ہوا تو صرف قصیدے ہی نہیں لکھے گئے بلکہ ہجویں بھی لکھی گئیں۔ ایک واقف کار کے الفاظ سنئے۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں ــــ "مجھ کو وہ وقت خوب یاد ہے جب یہ مشہور مسدس پہلی بار شائع ہوا تھا۔ مدح و ذم کا ایک طوفان اٹھا۔ مداحین میں مرحوم سرسید بھی تھے۔ مخالف دو گروہ تھے۔ ایک قدامت کے شیدائی جن میں مذہبی خیال والے بھی شامل تھے۔ دوسرے لکیر کے فقیر خرابہ…

میں جس بے باکی سے معاصر مذہبی و معاشرتی طبقات پر جرح کی گئی تھی، اس نے احساس مخالفت کو مشتعل کر دیا تھا۔ خصوصاً مذہبی احساس کو۔ شعرا کو شکوہ تھا کہ مسدس کے قوافی وغیرہ نامانوس ہیں...... اس میں شاعری کی اہانت کی گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی زبان سے یہی خیال یوں ادا ہوا: "آج سے پچاس، ساٹھ سال ادھر جب پہلی بار حالی کی لے (یہ ابتدا) نکلی تو بس ایک آگ لگ گئی اور آگ بھی کہاں؟ راونوں کی لنکائیں، عفریتوں اور راکششوں سے بھری اور پٹی پڑی ہوئی لنکائیں، بڑے بڑے پیل تن یلغار کر کے ٹوٹ پڑے۔ جواب کیجئے، تردید کیجئے۔ تضحیک کے لئے کوئی صاحب حالی کے جواب میں قالی کے قالی بن کر آئے۔ کسی صاحب نے معنی سے تہیدست ہو کر صرف لفظی بلکہ حرفی مناسبت سے خالی کا چہرہ لگا لیا اور کسی نے خیالی کا روپ بھرا اور پنچ اخبارات کی تو پوچھئے نہ۔ ان بچاروں کا تو آذوقہ کھل گیا۔" حالی کا حال، اور "میدان پانی پت کی طرح پائمالی" یہ تھا ان کی تک بندیوں کا حاصل اور ان کی مسخرگی کی کمائی! دوسروں کو بنانے سے پیشتر مسخرے خود ہی بن کر رہ گئے۔"
گو ان جملوں کی تنقیدی نوعیت عقیدت مندی کے دور میں نمایاں نہیں ہوتی۔ تاہم ان سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ مسدس کی اہمیت کو موافقین اور مخالفین دونوں نے تسلیم کیا۔ رایوں میں اختلاف ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہے لیکن جب یہ اختلاف موضوع، مواد، اسلوب اور فن ہر پہلو سے متعلق ہو اس وقت ایک نئے جائزے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، کوئی اہم کتاب جس وقت شائع ہوتی ہے اس کے اثرات کچھ اور ہوتے ہیں اور کچھ دن گذر جانے کے بعد اور ـــــ اگر موضوع ہنگامی اور عارضی ہے تو شہرت اور اثر کی آگ بھڑک کر بجھ جاتی ہے۔ اگر اس میں گہرائی اور قوت ہے تو اکثر اس کا اثر آہستہ آہستہ پھیلتا اور بڑھتا رہتا ہے۔ مسدس شائع ہوا تو وقتی مخالفت کا ہنگامہ ختم جانے کے بعد اس کا اثر شروع ہوا اور جو کامیابی حاصل ہوئی اس کا ذکر چھ برس بعد حالی نے خود کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے کوئی معتدبہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت یا شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے۔ نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے۔ قوم کی خرابیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سنان کا کام لیا گیا تھا۔ ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ارباب اختیار مذہبی سوء ظن رکھتے تھے۔ تعصب عموماً کلمۂ حق سننے سے مانع تھا۔ باایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ اڈیشن اب سے پہلے چھپ چکے ہیں۔ بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔ مولود شریف کی مجلسوں میں جابجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری ہیں، کہیں کہیں قومی ناٹکوں میں اس کے مضامین ایکٹ کئے جاتے ہیں۔" مولانا عبدالحق نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ پنجاب کے کسی ضلع میں انھوں نے مسدس کے بند ایک محفل نشاط میں کسی طوائف کی زبان سے سنے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ بعض لوگ وجد میں آ کر جھوم رہے تھے اور بعض آبدیدہ تھے۔

بعض نقادوں نے حالی کو قوم کا "مرثیہ خواں" کہا ہے۔ غالباً یہ خطاب اس مسدس کے لکھنے کے بعد ہی ملا ہوگا کیونکہ شروع میں جب مسدس شائع ہوا تو اس میں مد کے بعد جزر ہی کا یعنی مسلمانوں کی ترقی کے بعد تنزل ہی کا ذکر تھا اور مسدس ایک مایوسانہ آہنگ پر ختم ہوتا تھا۔ اس میں امید کی کوئی کرن نہ تھی۔ لیکن جب لوگوں نے اس کی طرف حالی کو متوجہ کیا اور زمانہ کے حالات بھی بدلتے ہوئے معلوم ہوئے تو حالی نے ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جس میں دوبارہ زندہ ہونے اور ترقی کرنے پھر اکسایا گیا ہے۔ اس طرح اس نظم میں جو مقصدی خامی تھی وہ دور ہو گئی۔ لیکن پھر بھی سوال ہے کہ مسدس اپنے موضوع کے

اعتبار سے کتنی اہمیت رکھتا ہے؛ اس کی شاعرانہ اور فنی حیثیت کیا ہے اور اس کے متعلق موجودہ نقادوں کے تاثرات کیا ہیں۔

جہاں تک سماجی زندگی کا تعلق ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غدر کے بعد سرسید اور ان کے ہمنواؤں نے طے کر لیا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے۔ حکومت ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ وقت کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ چنانچہ حالی نے اپنے دور کی اپنی نظم و نثر میں اس کا تقاضہ کیا ہے۔

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا ۔ کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا ۔ مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس وقت قومی تصور بڑی حد تک مذہبی تصورات سے وابستہ تھا اور کوئی رہنما ایسا نہیں تھا جو متحدہ قومیت کے نقطۂ نظر سے کوئی پیام پیش کرتا ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس محدود قومی تصور میں تعصب یا کٹرپن کا شائبہ تک نہ تھا۔ سرسید اس تحریک کے لیڈر تھے۔ انھیں کے اشارہ پر مسدس لکھا گیا۔ اس کا اعتراف خود حالی نے کیا۔ لیکن بعض نقادوں نے اس تحریک کو بھی مسدس کے عیوب میں شمار کیا ہے۔ کلیم الدین احمد ان میں پیش پیش ہیں۔ انھوں نے مسدس پر شاعرانہ اور فنی نقطۂ نظر سے بھی زبردست اعتراضات کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقرر کردہ موضوع پر نظمیں طلب کی جاتی ہیں اور بہترین نظم انعام کی مستحق ہوتی ہے۔ اس قسم کی نظموں میں اہم ترین نقص یہ ہوتا ہے کہ اصلیت کہیں نظر نہیں آتی۔ شاعر کسی زبردست جذبے سے مجبور ہو کر آمادۂ شاعری نہیں ہوتا۔ بلکہ قصداً انعام کی خاطر مخصوص موضوع پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ اس لئے اصلیت کی تمنا ہی خیال خام ہے۔ مسدس میں یہی نقص ہے کہ نظم قصداً لکھی گئی ہے۔ اس لئے اس میں ہر جگہ آورد کی جلوہ گری ہے۔" اب اس خیال کو مولانا عبدالحق کے اس خیال سے ملائیے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہ کہتے ہیں۔۔۔

"اس کی روانی حیرت انگیز ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا امڈا چلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحہ کے لئے بھی رکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ ابل رہا ہے اور ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد صداقت پر ہے"

کلیم الدین احمد کو اس نظم میں تسلسل بھی نظر نہیں آتا وہ اس نظم کو بے لطف، طبیعت کو مکدر کر دینے والی اور خشک سامان کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں "مسدس مثل ایک ریگستان کے ہے جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سا سرسبز شاداب جگہ نظر آ جاتی ہے۔ اس نظم میں شاعری مفقود ہے۔ ادھر تقاد کے خیالات فطری نہیں بلکہ ارادی ہیں۔ مضامین پھول کی طرح کھلتے نظر نہیں آتے بلکہ ایک اینٹ پر دوسری اینٹ رکھی گئی ہے اور یہ اینٹیں ایک دوسرے میں پیوست نہیں۔ دیواریں کج ہیں اور بے ڈھنگی، مینار و سقف میں بھی تناسب موجود نہیں۔ لب و لہجہ نثر کا سا ہے اور سارے مسدس میں یکرنگی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ حالی میں مصلح قوم بننے کی قوت خواہ ہو (حالانکہ وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے) لیکن شاعر ہونے کی صلاحیت بالکل نہ تھی۔ قوت حاسہ مفقود، تخیل معدوم، ذہن واد راک ادنیٰ، جذبات معمولی، طرز ادا خشک و بے رنگ۔۔۔"

یہ سارے الفاظ کلیم الدین احمد کے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کسی استاد نے کسی طالب علم کی نظم پر بھی اتنے سخت اعتراضات

نہ کئے ہوں گے ظاہر ہے کہ یہ تنقید انتہا پسندانہ ہے کیونکہ جو نظم صداقت اور حقیقت سے مرا ہوا شاعری کی افسوں ہے خالی ہو لیکن جو مقبول ہوئی ہو، پچھتر سال تک عزت و عظمت کی چیز نہیں بنی رہ سکتی۔ محض سرسید کی تحریک کی وجہ سے حالی کے جذبات اور خیالات کو یکسر نظر انداز کر کے یہ کہنا کہ یہ فرمائشی نظم ہے بڑا سطحی خیال ہے۔ جس جذبہ نے سرسید کے لئے اس موضوع کو اہم بنایا تھا وہ جذبہ حالی میں بے حد قوی تھا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض حیثیتوں سے وہ آگ حالی کے سینہ میں اس سے زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک رہی تھی جتنی کہ سرسید کے سینے میں۔ مجنوں گورکھپوری نے حالی کی شاعری پر تبصرہ لکھا ہے کہ "مسدس تبلیغی ادب کے عنوان کی چیز ہے یعنی وہ خاص دور کی چیز ہے اور اس دور میں بھی ملک کی ایک محدود جماعت کے لئے مخصوص ہے لیکن وہ شاعری بھی ہے اور صحیح معنوں میں شاعری۔ خود حالی نے مسدس کو ابالی کھچڑی سے تشبیہ دی جو مزے لے کر نہیں کھائی جا سکتی۔ شمس العلماء مولانا امداد امام اثر نے بھی اس رائے سے اتفاق کر کے کہا ہے کہ "ہر بریانی اور مرغ مسلم پکانے والا ایسی کھچڑی تیار نہیں کر سکتا ہے"۔ مجنوں نے موافق اور مخالف رایوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مسدس جہاں تک پیغام ہے وہاں تک شاعری نہیں۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ مسدس اپنے موضوع پر اپنے نوعیت کی اردو میں بلکہ شاید دنیا کی اور زبانوں میں بھی سب سے زیادہ طویل نظم ہے اور اس پر بھی ملک میں اس قدر مقبول ہوئی کہ گھر گھر پڑھی گئی اور کسی زمانے میں بار بار پڑھی گئی۔ ایسی طویل نظمیں عموماً پڑھنے والے کو تھکا دیتی ہیں لیکن مسدس حالی کی مقبولیت کا سب سے بڑا سبب اس کا تسلسل اور اس کی زبان کی سنجیدہ سادگی ہے جو اس کی تاثیر کے وزن کو اول سے آخر تک یکساں قائم رکھے ہوئے ہے۔ تاریخ اسلام کے ایک خاص رخ کو اس سے زیادہ دلکش اور پر تاثیر پیرایہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اگر ہم کو غم دنیا سے سر اٹھانے کی مہلت مل سکی کہ شعر و ادب سے لطف اٹھا سکیں تو آئندہ وہ یقیناً زیادہ پڑھی جائے گی جتنی کہ اس وقت پڑھی جاتی ہے۔ اپنے وقت میں وہ شاعری سے زیادہ پیغام بھی گئی۔ اب وہ زمانہ آ رہا ہے کہ اس کو شاعری میں شمار کیا جائیگا۔

مجنوں کی رائے متوازن اور فکر انگیز ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں کوئی فلسفہ تمدن نہیں، ورنہ کوئی واضح اور مرکزی تخیل ہے لیکن پھر بھی وہ اردو شاعری میں ایک اہم اور عہد آفریں نظم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسدس حالی میں بعض جگہ نثریت اور پھیکا پن پایا جاتا ہے۔ بندش میں چستی کی کمی بھی ہے لیکن ایک طویل مقصدی نظم میں ان عناصر کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ جس وقت حالی نے یہ نظم لکھی اس وقت ادب کی تاریخ اس موڑ پر آ گئی تھی جب شاعری اور فنی لطافت سے زیادہ مقصد عزیز ہوتا ہے اور حالی تو ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنی مقصدیت کو پوشیدہ بھی نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اس نے اس نظم میں وہ شاعری کی ان روایات سے کھلم کھلا انحراف کر رہے تھے جو اس وقت تک پسندیدہ تھیں اور اگر قدیم شاعری کے پرستاروں کو اس نظم کے نئے پن سے دھکا پہنچا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ یہ نظم محض پیام ہو کر رہ گئی ہے یا اخلاقیات کا ایک بہی کھاتہ ہے۔ جس میں شعریت کا پتہ نہیں۔ حالی ایک باکمال شاعر تھے اور اس نظم کو ظاہری آرائش اور فنی لطافت سے بچا کر اپنی بات کو پر اثر بنانے کی کاوش ارادی تھی۔ وہ اپنے بھرپور وار کو شاعرانہ لطافتوں میں گم کر دینا نہیں چاہتے تھے انہیں اس بات کا بھروسہ تھا کہ اخلاقیات، حب وطن، بے تعصبی، محنت اور مشقت کی قدر و قیمت، ہمدردی، انسانیت، دلسوزی صبر اور وقت کا ساتھ دینے کا جو پیام وہ پیش کر رہے ہیں وہ کسی ملک کی قومی زندگی میں اپنی جگہ آپ بنائے گا۔ نظم کی سنجیدگی ظاہری آرائش کی کمی کو خود ہی پورا کر دے گی اور دنیا اس کی توانائی، خلوص اور انسانیت ہی کو اصل جوہر سمجھے گی۔ حالی کا یہ اندازہ غلط نہیں نکلا اور مسدس حالی آج بھی اسی طرح ایک اہم نظم ہے جیسی وہ ۱۸۷۹ء میں تھی اور میرا خیال ہے کہ اس پر سب سے اچھی تنقید وہی ہے جو خود حالی نے مسدس کے دونوں دیباچوں میں کی ہے۔

---

# کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے

از:- مس رشید موسوی (بی۔اے)

میرؔ کے کلام کو نقادوں نے "یاس و قنوطیت، نوحہ و ماتم کا مجموعہ" کہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میرؔ کا کلام درد و الم کا مرقع ہے جیسا کہ خود انھوں نے کہا ہے؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب نے ہم      درد و غم کتنے کئے جمع کہ دیوان کیا

لیکن اس کے وجوہات بھی قابلِ غور ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ میرؔ صاحب اپنی زندگی میں بچپن ہی سے مسلسل ناکامیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ ان کی سب سے بڑھ کر بدنصیبی اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ ماں کی محبت سے جو تمام محبتوں سے بے نیاز کر دیتی ہے محروم ہو گئے۔ اس کے بعد باپ کی وفات اور عزیز و اقارب کی طوطا چشمی، بے سر و سامانی اور زمانے کی بے مروتی۔ یہ ایسی حالتیں نہ تھیں کہ میر جیسے حساس شخص کے دل پر اثر نہ کرتیں۔ اپنی زندگی سے انھوں نے جن تلخ تجربات کو حاصل کیا تھا انہی کو انھوں اس انداز میں بیان کیا کہ وہ سارے عالم کے محسوسات و تجربات ہو گئے۔ اور کلام کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا۔

کسی شاعر کے کلام کا معیار اس کے کلام کی تاثیر ہے اور عوام میں اس کی مقبولیت۔ اسی معیار پر میر صاحب کا رتبہ اردو کے شعراء میں سب سے اعلیٰ پایا جاتا ہے۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا شعر جو سوز و گداز اور درد کی تصویر ہوتا ہے دل میں گھر کر لیتا ہے اور میرؔ ہی وہ پہلے خوش نصیب شاعر ہیں جن کے کلام کی قدر ان کی زندگی ہی میں ہوئی اور مرنے کے بعد بھی۔ جب تک اردو زبان کو جاننے والے دنیا میں باقی ہیں ان کا کلام قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

فانیؔ نے میر کی تقلید کی لیکن فانیؔ کے یاس و قنوطیت اور میرؔ کے یاس و قنوطیت میں نمایاں فرق ہے۔ فانی کے یاس زندگی کی المیہ کی شکل ہے جس میں ہنسی خوشی، امید اور رجائیت کی جھلک بالکل نہیں ہے۔ فانیؔ نے زندگی سے پیار کے بجائے نفرت کرنا سکھایا۔ فانی کے یاس زندگی سے فرار اور گریز ملتا ہے۔ برخلاف اس کے میر کی شاعری زندگی سے بہت قریب لاتی ہے۔ زندگی سے محبت کرنا سکھلاتی ہے۔ یاس میں امید کی کرن بھی جھلکتی نظر آتی ہے۔ غم کے اندھیرے میں مسرت کی ہلکی سی جھلک بھی ملتی ہے۔ میرؔ خود حرماں نصیب ہیں لیکن دوسروں کو اس بدنصیبی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے۔ اپنی زندگی میں میرؔ کو آسائش و آسودگی میسر نہ ہوئی اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اس سے محروم رہیں۔ میرؔ انھیں زندگی کی وہ ساری خوشیاں دے دینا چاہتے ہیں جس سے وہ خود محروم رہے۔ میرؔ کے "نشاطِ غم" نے انھیں "عذابِ سخن" سہنا دیا۔

میرؔ کے اشعار میں الفاظ بالکل سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش اور درد چھپا ہوا ہے۔ پڑھنے والا یہ نہیں دیکھتا کہ سلیس، سادہ اور معمولی ترکیبوں میں کیا کیا دقیق مطالب بھرے پڑے ہیں۔ اپنے اندازِ بیان کی سادگی

سلاست سے میر صاحب لوگوں کی توجہ اپنی طرف کر لیتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

---

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

---

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

---

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا انداز بیان کس قدر دلکش اور پر اثر ہے۔ سادگی و صفائی اور روزمرہ کی پابندی جو اس زمانے کا خاصہ تھی اس کے ساتھ ساتھ کلام میں درد اور تاثیر نے انھیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز بنا دیا۔ ایہام گوئی جو دوسرے ہمعصر شاعروں کے پاس ملتی ہے میر کے پاس نہیں ہے۔

میر انیس سوز و غم کے بیان میں اپنا نظیر نہیں رکھتے لیکن وہ بھی میر کے گرد کو نہیں پہنچتے۔ انیس کے ہاں تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے۔ میر خود سوز و غم کا پتلا ہے اور اس کے اپنے ذاتی غم کی سچی تصویر ہے جس میں تکلف نام کو نہیں۔ انیس کے ہاں خیال کے مقابلے میں الفاظ کی کثرت ہے اور خیال سے پہلے لفظ پر نظر پڑتی ہے۔ لیکن میر کے شعر اور الفاظ اس طرح ایک دوسرے سے گھل مل کر ایک ہو گئے ہیں کہ لفظ اور خیال پر علیحدہ نظر نہیں پڑتی۔ انیس کے ہاں الفاظ کی شان و شوکت اور ہنگامہ ہے لیکن میر کے پاس سکون و دھیما پن اور خاموشی ہے اور خاموشی سے اپنا اثر کرتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

ہوگا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

لفظ "آرام طلب" ملاحظہ ہو۔ عشق و محبت میں یہ حال ہو گیا کہ اگر گھر بار چھوڑ کر بے یار و مددگار محبوب کی دیوار کے نیچے پڑا ہو۔ اسے طنز سے آرام طلب کہا جا رہا ہے کہ اسے محبت سے کیا کام۔ آرام طلبی کا یہ حال ہے تو محبت میں مصیبت کیا ہوگی۔
ایک شعر کی سادگی ملاحظہ ہو ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اس قبیل کا ایک شعر ان کے ہمعصر مرزا رفیع سودا کے دیوان میں ملتا ہے ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت — خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

دونوں شعر ملاحظہ ہوں۔ ایک سونے والے کے سرہانے بیٹھ کر دوسرے کو خاموش رہنے کی ہدایت کرنے کے لئے ایسے ہی الفاظ کا انتخاب ــــ اور بیان کی سادگی، سلاست اور دھیما پن ہو کہ سونے والے کے آرام میں خلل نہ آنے پائے۔ سودا کے ہاں وہ نرمی اور سادگی نہیں جو میر کے شعر میں ملتی ہے۔ میر کی شاعری میں ایک ٹھنڈی اور میٹھی تڑپ، ایک آواز، نزاکت اور شیرینی ہے۔ غم کی حالت وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہمارے ہی دل کی بات ہو۔ ان کا ہر شعر دل میں اتر جانے کے لئے دل کی گہرائیوں میں سمانے کے لئے ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا "میر کے شعر کو سمجھا جا سکتا ہے، سمجھایا نہیں جا سکتا"۔ جو دھوپ شبنم جس طرح اثر کرتی ہے اسی طرح میر کا شعر دل پر اثر کرتا ہے۔ کلام میں قنوطیت کے باوجود پژمردگی یا پسپائی نہیں بلکہ غم میں اپنا نشاط ہے کہ زندگی کا

خوشی قربان کردی جائے۔ میر کا غم انسان کو پست نہیں بناتا بلکہ ہمت افزائی کرتا ہے ایک ایسا المیہ ہے جس سے دل مرجھاتا نہیں بلکہ شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آنسو بہتے ہیں لیکن خوشی کے۔ یہاں پر محمد اکرم صاحب کا خیال نقل کر دینا ناموزوں نہ ہوگا کہتے ہیں۔ میر کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب تو زبان اور بیان کی دل آویز پاکیزگی ہے جہاں تک غالب اور میر کا تعلق ہے اگر پاکیزگیٔ زبان اور سوز و گداز کو کمالِ شاعر سمجھا جائے تو میر کو غالب پر فوقیت ہے۔ غالب کی زبان میں وہ صفائی نہیں جو میر کی غزلوں میں ہے اور جو سوز و گداز میر کے اشعار میں عام ہے وہ بھی عام طور پر غالب کو میسر نہیں۔ ان دونوں باتوں میں میر کا رتبہ غالب سے بالا ہے۔ زبان اور پاکیزگیٔ بیان و سلاست ملاحظہ ہو۔

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے     اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

---

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے     پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

---

میر ان نیم باز آنکھوں میں     ساری مستی شراب کی سی ہے

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میر صرف غزل کیلئے پیدا ہوئے تھے۔ اخلاقی مسائل اور تصوف اور دوسرے موضوعات پر نسبتاً کم شعر ہیں اور جو اب میں اپنے مخصوص انداز میں ہیں۔ سادہ الفاظ اور سلیس ترکیبوں کے در پردہ وہ بلند خیالات پوشیدہ ہیں۔ ملاحظہ ہو اس شعر میں کس قدر بلند مضمون کو کس خوبی، سلاست اور آسانی سے ادا کر دیا ہے۔

سرسری تم جہان سے گذرے     ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

اخلاقی مسائل کو بیان کیا ہے۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا     یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر     میں بھی کبھی کسو کا سرِ پُر غرور تھا

فنا و بقا کے مضمون جس کو بیشتر شعرا نے باندھا ہے اس کوچہ میں بھی میر اپنے مخصوص انداز میں نظر آتے ہیں۔ غالب نے کہا ہے فنا کے بارے میں۔

یک نفس بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل     گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

اور ذوق نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے۔

کیا اعتبارِ ہستی ناپائیدار کا     چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

اور اسی نکتہ کو میر نے سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات     کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

چاک گریباں کا مضمون جو نہایت فرسودہ اور پامال قسم کا ہے میر نے سادگی اور دلکش اسلوب میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اردو شاعری میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے     دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کہا جاتا ہے کہ انسان کے طرزِ بیان سے اس کی سیرت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مقولہ شاعر کے کلام پر اور زیادہ صادق آتا ہے۔ غالباً کسی شاعر کے کلام پر اس کی سیرت اور طبیعت کا اتنی قدر اثر نہ پڑا ہوگا جتنا کہ میر کے کلام میں نظر آتا ہے۔ ان کے اشعار پڑھ کر معلوم ہوتا ہے ان کے ایک ایک

لفظ، طرزِ بیان، ترتیب و بندش الفاظ ان کے قلبی واردات و احساسات کا صحیح مرقع ہیں۔

میر نے شاعری کو ذریعہ عزت یا وسیلۂ معاش نہیں بنایا۔ چاہتے تو وہ بھی سودا کی طرح درباروں کی سرپرستی میں آرام سے گزار سکتے تھے۔ لیکن ان کی حساس و خوددار فطرت نے انھیں بادشاہوں کی نازبرداری اور درباریوں کی خوشامد سے دور ہی رکھا۔ فاقے کئے، رنج و الم سہے لیکن دستِ سوال دراز نہ کیا اور نہ ہی حرفِ شکایت زبان پر لائے۔ مسرت و آرام ان کی قسمت میں نہیں تھا۔ قسامِ ازل نے حساس دل اور خوددار طبیعت دی تھی۔ ایک حرماں نصیب قیدی کی سی زندگی گذاری لیکن کوئی ایسا فعل نہ کیا جو ان کی وضع داری اور شان کے خلاف ہو۔ محبت میں ناکامی، زمانہ والوں کا غلط برتاؤ اور حد سے بڑھی ہوئی خودداری نے انھیں مجنون بنا دیا تھا۔ عشق میں ہمیشہ ناکام رہا کرتے لیکن آدابِ عشق کی سختی سے پابندی کرتے رہے۔ عشق کو رسوا نہ کیا ؂

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　　　کتنے آنسو پلک تلک آئے

غمِ عشق نے انھیں کہیں کا نہ رکھا اور اس حال پر پہنچا دیا ؂

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　　　اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

شاعری، موسیقی اور مصوری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور شاعری تو اپنے مطالب کو صاف طور پر بیان ہونے ہی نہیں دیتی۔ ہم لاکھ کوشش کریں لاکھ نکتے نکالیں پھر بھی واضح طور پر نہ ہم مطلب سمجھ سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو سمجھا سکتے ہیں۔

ہر بڑے شاعر نے میر کو مانا ہے اور ان کے کمالِ سخن کے معترف ہیں۔ غالب نے کہا ؂

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب　　　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

دوسرے مقام پر بطورِ شہادت ناسخ کے خیال کو اپناتے ہیں ؂

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اور ذوق اس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں ؂

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب　　　　ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سودا بھی میر کی استادی کے قائل ہو ہی جاتے ہیں ؂

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ　　　　ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرح

مولانا حالی میر کی تقلید کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں ؂

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے　　　　غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

اور خود کو اپنی برتری اور بزرگی کا کچھ کم احساس نہ تھا۔ دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے　　　　معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور اس مقام پر تو حد کر دی میر نے ؂

مستند ہے میرا فرمایا ہوا　　　　دونوں عالم پر ہوں میں چھایا ہوا

# اسرار الحق مجاز اور ان کی فنکارانہ عظمت

از :- جناب اصغر کاظمی پوری صاحب

۱۹۵۵ء ختم ہوتے ہوتے بھی کتنے دلوں پر وہ زخم چھوڑ کر جو سالہا سال تک رستے رہیں گے۔ یادداشت ساتھ نہیں دیتی کہ کوئی اور سال اس سے زیادہ منحوس گزرا ہو اور اردو کے ان گنت ادیب یکے بعد دیگرے نگاہوں سے اوجھل ہوتے گئے ہوں۔ ان ادیبوں کی یادیں خون کے آنسو رلانے والی ہیں جن کو اس منحوس سال نے اردو کی سبز و شاداب نکہت و نور سے بھرپور وادیوں سے اٹھا کر اجل کے دہکتے ہوئے ریگزار میں پھینک دیا۔ سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر اعظم کریوی، سید [illegible] دہلوی، خواجہ حسن نظامی، چراغ حسن حسرت، برجموہن دتاتریہ کیفی۔ ابھی ماتم کے غم کے آنسو ابھی خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ہندوستان کے محبوب شاعر مجاز کے انتقال کی خبر بد کا دھواں فضاؤں میں رچ گیا۔ یہ غم اتنا عظیم ہے کہ آنسو بھی ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔

اردو کے اس نامور اور تابناک چوالیس سالہ ستارے کو ۵ دسمبر رات کے دس بجے فالج کے دماغی حملے نے اردو ادب کے آسمان سے توڑ کر پھینک دیا۔ یہ حقیقت تھی کہ مرحوم ایک عرصے سے مختلف امراض میں مبتلا تھے اور کیوں نہ ہوتے۔ یہ ادیب خود ساختہ یہ زہر آلود فضائیں جن کا ادیب مقابلہ کرتے آ رہے ہیں انہیں میں بچار ہے ہیں۔ خود موت خدا ہیں لیکن پھر بھی یہ وقت اچانک ساتھ چھوڑ دینے کا نہیں تھا۔ ۱۹۵۲ء کی طرح ابھی ایک بار اور یہ دکھا دیا تھا کہ زندگی موت سے مغلوب نہیں ہو سکتی۔ زہر پی کر زندہ رہ سکتی ہے۔ مر نہیں سکتی۔ لیکن ایک ننھی سی کرن کہاں تک دیو پیکر تیرگی کے ہیبت ناک سایوں کا مقابلہ کرتی۔ آخر مغلوب ہو گئی۔ خود انھوں نے بھی ایک قطعہ میں اس کا اعتراف کیا ہے ؎

وقت کی سعی مسلسل کارگر ہوتی گئی　　زندگی لحظہ بہ لحظہ مختصر ہوتی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا ہی رہا ساز حیات　　موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہوتی گئی

لیکن اے مرگ دشمن دوراں اے ناسازگار فضاؤ! اس شمع کو مجاز روشن کر گئے ہیں ہم دل کے لہو کا آخری قطرہ دے کر بھی فروزاں رکھیں گے۔ ہم اپنے ارادوں کی پختگی کی گردنوں کا سہارا دے کر اس کی لو کو منزل تک لے جا کر ہی چھوڑیں گے۔ ہم نے ظلمت کو مٹانے کی قسم کھائی ہے اور ہم ناکامیاب نہیں ہو سکتے۔

اسرار الحق مجاز ردولی میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے اور علیگڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا ریڈیو کے رسالے "آواز" کی ادارت پر مقرر ہوئے اور قریب دو سال تک انجام دینے کے بعد دست کش ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سے ایک رسالہ "نیا ادب" جاری کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان پر اسی قسم کا فالج کا ایک حملہ ہوا جس سے وہ بچ گئے اور صحت یاب ہونے کے بعد دہلی کی ہارڈنگ لائبریری میں ملازمت کر لی جو ۱۹۵۲ء تک قائم رہی۔

زمانہ ہوا دو ماہی "سویرا" لاہور میں ساحر لدھیانوی نے "جان پہچان" کے عنوان سے مجاز کا ایک چھوٹا سا مگر بید دلچسپ تعارف دیا تھا۔

"علیگڑھ یونیورسٹی کا شاعر محفل وفا، مطرب بزم دلبراں، بحیثیت مجموعی ان فنکاروں میں سے ہے جو اپنی عمر سے پہلے پختہ ہو جاتے ہیں اور دنیا کو اپنے تصورات سے ہم آہنگ نہ پاکر یا تو خودکشی کر لیتے ہیں یا دیوانے ہو جاتے ہیں۔ مجاز دو بار دیوانگی کے مراحل بھی طے کر چکا ہے اور قدم بقدم خودکشی کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ عصمت کا کہنا ہے کہ کسی زمانے میں کالج کی لڑکیاں مجاز کے نام کی پرچیاں نکالا کرتی تھیں "مجاز ہم میں سے کسے چاہے گا۔ کسے دلہن بنائے گا؟" —— آج کل عورت مجاز کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں مجاز نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے اور اتنا کچھ دیا ہے جو اس کے ہمعصروں کے زندگی بھر کے اثاثہ سے زیادہ ہے۔ نوجوان شعرا میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے فن کا رشتہ شعوری طور پر عوامی قوتوں سے جوڑا اور سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد اور تاریخی محرکات کے بہاؤ کو سمجھ کر انسانیت کو آزادی کی سرخ صبح کا مژدہ دیا۔ پچھلے دو تین برس سے بید خاموش اور افسردہ رہنے لگا ہے، دن رات شراب پیتا ہے اور گلی کوچوں میں مارا پھرتا ہے۔ زندگی، محبت، مستقبل ہر شے سے بے نیاز ہو چکا ہے پھر بھی جب کبھی جلوسوں اور جلسوں میں تنے ہوئے سینوں اور بھنچی ہوئی مٹھیوں کے ساتھ مزدور اس کے گیت گاتے ہیں تو اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک آہ بھر کر کہتا ہے

یہ ایسا رندی مجاز اک شاعر، مزدور، دہقاں ہے
اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے

جنگ سے پہلے آل انڈیا ریڈیو میں تھا، پھر ہارڈنگ لائبریری میں ملازم ہو گیا۔ پچھلے دنوں بمبئی چلا آیا اور لوگ پکچرز کی نئی فلم "دوراہے" کے گانے لکھ رہا تھا۔ سنا ہے اب وہ سب کچھ چھوڑ کر اپنے وطن لکھنؤ میں آیا ہے، اپنی محبوب مے نوشیوں اور مشہور آوارگیوں کی طرف۔"

۱۹۳۸ء میں ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن "شب تاب" کے نام سے اور پھر تیسرا اور چوتھا "آہنگ" کے نام سے شائع ہوا۔ ابھی کچھ ہی سال پیشتر ان کی قدیم اور جدید نگارشات کا مجموعہ "ساز نو" کے نام سے کتابی دنیا لکھنؤ سے شائع ہوا۔

اردو کے شعری ادب میں مجاز کا ایک مخصوص مقام ہے۔ ان میں احساس کی شدت، مشاہدہ، تفکر کی گہرائی، آہنگ اور ماحول کی اثر آفرینی بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کی زندگی پر ہر سمت سے حملے بھی ہوئے۔ جن کا انھوں نے ثابت قدم رہ کر مقابلہ کیا۔ اس وجہ سے بھی ان کی نظر میں گہرائی، شعر و ادب میں صلابت اور فن میں پختگی اور معنویت پیدا ہوئی۔ اقتصادی کشمکش، بھوک، آہ و فغاں، زرد چہروں، جھلسی ہوئی جوانیوں، تہذیب و تمدن کے رستے ہوئے ناسوروں، آئین و روایات کی مضبوط زنجیروں میں جکڑی ہوئی مجبور نسلوں نے ان کے مشاہدے کو گہرائی بخشی اور ان کے فن کو حقیقت کی ترجمانی کا شعور عطا کیا۔ ان کے کلام میں شکست خوردہ ارادوں کی پرواز میں اور بجھی ہوئی سرد امنگوں کا کوئی مقام نہیں ہے۔ حوادث دوراں کا ہمیشہ بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے اور اپنے جدید اور پختہ اسلوب کے ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے وہ فن کو منزل کی طرف بڑھاتے رہے۔

۱۹۵۵ء میں ندیم قاسمی نے فرمایا تھا۔

"یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ گزشتہ دس پندرہ برس میں بے شمار تجربات کئے گئے۔ نظم کی نئی نئی ہیئتیں نکالی گئیں۔ کسی نے ماضی کی روایات سے علی الاعلان بغاوت کر دی۔ کسی نے معمولی سی تبدیلی پر اکتفا کی۔ کوئی نظم کی پرانی صورتوں میں نیا مواد پیش کرنے میں کوشاں رہا۔ کسی نے نفسیاتی معموں کو معموں ہی میں نظم کر ڈالا کسی نے ترغیبات کے تحکم کھلا ذکر سے گھبرا کر انتہا درجے کے مبہم استعاروں کی پناہ لی۔ الغرض بے شمار پینترے بدلے گئے اور بدلے جاتے ہیں لیکن کسی تجربے نے صداقت کی صورت اختیار نہ کی بلکہ ہر تجربہ مزید تجربات کے بوجھ سے بودا اور پوچ ہوتا گیا اور آج کل یہ حالت ہے کہ اردو شاعری کا ہیئتی نظام افراتفری کے عالم میں ہے۔ دور جدید کے چند ممتاز شعرا کا کلام دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ تمام حضرات ایک ہی مرکز سے وابستہ ہیں مگر ان کی منزلیں بلکہ راہیں تک معین نہیں۔ نصب العین کا فقدان ہے اور وہ شاعری جس نے جمہور کی بیداری کا بیڑا اٹھایا تھا ابہام اور بے راہ روی کا ایک طومار بن کر رہ گئی ہے۔"

مجاز کی شاعری بھی گذشتہ بیس بائیس سالوں میں پروان چڑھی اور پھولی پھلی۔ انھوں نے بھی ماضی کی روایات اور حال کی دریدہ دہنیوں کے خلاف آواز بغاوت بلند کی مگر ان کی قوت بیان نے ان کو بے راہروی اور افراتفری کی لعنتوں سے محفوظ رکھا۔ ان کے تاثرات بغیر کوئی الجھن پیدا کئے قاری کے ذہن و دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم خوبی ہے کہ انھوں نے نظم کی پرانی صورتوں ہی میں نیا مواد پیش کیا۔ اردو نظم میں ہیئتی انقلاب لانے والوں میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہیئتی انقلاب لانے والوں میں نظم معرا، نظم آزاد اور گیت چلے آتے ہیں جن میں سے کسی صنف سخن کو مجاز نے نہیں اپنایا۔

بقول ڈے جی پیرلیس

"ہیئت کی آواز پر معنی کے قدم اٹھتے ہیں رکھتے ہیں۔ فرسودہ مواد میں بھی اس وقت زندگی پیدا ہو جاتی ہے جب فنکار ہیئت کی تخلیق سوجھ بوجھ اور احتیاط سے کرتا ہے۔ فن میں بعض ایسی باتیں ہیں جن میں کوئی کشش نہیں ہوتی لیکن فنکار صورت کو خوب بنا کر ان میں حسن اور کشش پیدا کر دیتا ہے۔"

مجاز نے اپنی نظموں کی تخلیق میں انتہائی سوجھ بوجھ اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ اسی لئے ان کی معمولی معمولی باتوں میں بھی کشش اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ سرمایہ داری پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس کے ذکر میں کوئی کشش باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ لیکن مجاز کی نظم "سرمایہ داری" پڑھنے کے بعد ذہن پر سرمایہ داری کی اصلی تصویر کھنچ آتی ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں جو نہیں جانتے تھے جان گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

یہ انسانی بلا خود خون انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک موت سے بڑھ کر بھیانک ہے

ان تمام دماغوں پر جو سرمایہ داری کو خدا اور تقدیر کی دین سمجھتے ہیں ایک ضرب کاری ہے۔ اس کو انسانی بلا کہہ کر انھوں نے وہ انکشاف کیا ہے کہ اس کے آگے خدا اور تقدیر کے قدیم دلالوں کی کوئی دلیل نہیں ٹھہرتی۔ اسی طرح ان کی ایک دوسری نظم ہے "غدار"۔ بظاہر سبھی جانتے ہیں کہ غدار کس کو کہتے ہیں۔ نہ اس لفظ میں کوئی حسن ہے نہ کشش مگر مجاز نے اس ڈھنگ سے غدار کا کیرکٹر پیش کیا ہے کہ یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ کچھ نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر اس نظم کا آخری بند ؎

جب لڑائی کا بگل بج جائے گا
جب زمیں کیا آسماں تھرائے گا

تو اسے مستقبل پائے گا
یاد تک کرتی ہی کر دو مجھ کو ہے

مجاز کے یہاں اشتراکیت کی تبلیغ کرنے والی نظمیں کافی تعداد میں موجود ہیں جن میں مزدوروں، کسانوں کی طرفداری کی گئی ہے اور حکومت و سرمایہ داری کے خلاف اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان نظموں سے ان کی صداقت کا جوش، خلوص کی گرمی اور عمل کا ولولہ صاف جھلکتا ہے۔ ان نظموں میں ان کے اسلوب بیان کی دلکشی، تلمیح، استعاریت و کنایت بھی کچھ موجود ہے۔ "ایک جلاوطن کی واپسی" "ہمارا جھنڈا" "انقلاب" "خانہ بدوش" "نوجوان سے" "مزدوروں کا گیت" "آہنگ نو" "بول اری او دھرتی بول" وغیرہ ان کی بہت کامیاب نظمیں ہیں۔ ذیل میں انہیں کے کچھ اقتباسات دیئے جا رہے ہیں:-

تجھ پہ یہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں — جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم — جنس آزادیٔ انساں کے خریدار ہیں ہم
برہمن تیرے ہیں کل ملت اسلام تری — صبح کاشی تری، سنگم کی حسیں شام تری
دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ — تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ
سرفروشان بلاکش کا سہارا بن جا — اٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

(ایک جلاوطن کی واپسی)

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا
توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا ابھی یونہی لہرائے گا
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

(ہمارا جھنڈا)

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے — کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب — اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے — آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام — غرق ہوں گے آتشیں لہروں میں منظر تمام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق — آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگ شفق
اور اس رنگ شفق میں باہزاراں آب و تاب — جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

(انقلاب)

ان کی کہیں زمیں نہ ان کا کہیں مکاں — پھرتے ہیں یوں ہی شام و سحر زیر آسماں
دھوپ اور ابر و باد کے مارے ہوئے غریب — یہ لوگ وہ ہیں جن کو خدا بھی نہیں نصیب
پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں — روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

(خانہ بدوش)

یہ پوری نظم ہی موثر ہے لیکن طوالت کے لحاظ سے صرف چند ہی شعروں پہ اکتفا کی ہے۔ یہ دو مصرعے "یہ لوگ وہ ہیں جن کو نوالہ بھی نہیں نصیب" اور "بے روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں" کتنے پُر اثر ہیں۔ کونسا ایسا انسان ہے جو انہیں پڑھ کر غم کی گہری اتھاہ میں ڈوب نہ جائے گا۔

شراب پیتے ہے سب نے غریب کے خون سے — تو اب امیر کے خون سے شراب پیدا کر
یہاں زمیں پہ جو پیدا ہو تو ہمت کر — اسی زمیں سے مہکتے گلاب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر — جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

(نوجوان سے)

جینے کی تمنا رکھتے ہیں — مٹنے کا کلیجہ رکھتے ہیں
سرکش ہیں سر اونچا رکھتے ہیں
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم
گو آج بھی ہیں ادبار میں ہم — کہتے ہیں کھلے بازار میں ہم
ہیں سب سے بڑے سنسار میں ہم
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم
ہم قبضہ کریں گے دفتر پر — ہم وار کریں گے قیصر پر
ہم ٹوٹ پڑیں گے لشکر پر
مزدور ہیں ہم، مزدور ہیں ہم

(مزدوروں کا گیت)

تم تو تنہا بھی نہیں ہو کئی دمساز بھی ہیں — روس کے مرد بھی ہیں چین کے جانباز بھی ہیں
کچھ نہ کچھ ساتھ فرنگی فسوں ساز بھی ہیں — اور ہم جیسے بہت زمزمہ پرداز بھی ہیں
دور انسان کے سر سے یہ مصیبت کر دو
آگ دوزخ کی بجھا دو اسے جنت کر دو

(آہنگ نو)

ان تمام نظموں میں ملک کے سچے بہی خواہ کی روح بول رہی ہے۔ ایک ایسے انسان کا دل دھڑک رہا ہے جو انقلاب کی آمد کے لئے سرفروشی کا آرزو مند ہے۔ یہ نظمیں ہندوستان کی تحریک آزادی کا لازوال اثاثہ ہیں۔ مجاز کے کلام میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، نشست الفاظ کا انداز اور بندشوں کا طریقہ استعمال صاف جھلکتا ہے۔ ان کے شیشے میں بادۂ شیراز کا رنگ بھی آسانی سے پہچانا جاتا ہے۔ مثال کے لئے ان کی نظم "نذر علیگڑھ" کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:—

اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی

ہر شام ہے شامِ مصر یہاں، ہر شب ہے شبِ شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
یہ دشتِ جنوں دیوانوں کا، یہ بزمِ وفا پروانوں کی
یہ شہرِ طرب رومانوں کا، یہ خلدِ بریں ارمانوں کی

علیگڑھ سے اپنی عقیدت کا اظہار صرف ایک ہی شعر میں کس خوبی سے کیا ہے ؎

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں، پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

مضامین کے تنوع، شاعرانہ قدرتِ بیان اور جمالیاتی تاثرات کے لحاظ سے ان کی نظمیں "آج کی رات"، "بتانِ حرم" اور "نورا" بے حد کامیاب ہیں۔

دیکھنا جذبِ محبت کا اثر آج کی رات
میرے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات
محوِ گلگشت ہے یہ کون مرے دوش بدوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گزر آج کی رات
اور کیا چاہیے اب اے دلِ مجروح تجھے
اس نے دیکھا تو بہ اندازِ دگر آج کی رات
پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات
نغمہ و مے کا یہ طوفانِ طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات
ان کے الطاف کا اتنا ہی کرم کافی ہے
کم ہے پہلے سے بہت دردِ جگر آج کی رات

(آج کی رات)

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرمِ نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان وہ ٹھنڈی ہوا
دیدنی تھا نازنینانِ تمدن کا ہجوم
بے حقیقت تھا نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم
وہ حجاب آگیں تکلم وہ رسیلے قہقہے
وہ نشاط آگیں تبسم وہ سریلے قہقہے
قہقہے جن میں صبا کا راگ سیاروں کے گیت
نقرئی لَے کی صدا جنت کے مہ پاروں کے گیت
میرا نغمہ باعثِ دلداریِ خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہِ نشاطِ جاں تو ہے

(بتانِ حرم)

اور یہ ہیں ان کی "نورا" کے خلوص اور محبت کی رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے چند اشعار ؎

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارہ
وہ دیر و حرم کے لیے اک شرارہ
جوانی سے طفلی گلے مل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی
لبوں پہ تھا لعل و گہر کا خزانہ
نظر عارفانہ، ادا راہبانہ
مجھے بیٹھے بیٹھے شرارت کی سوجھی
جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی [illegible]
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی
لبِ لعل افشاں سے اک [illegible]
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر
کہ شمعِ حیا رہ [illegible]

(نورا)

"رات اور ریل" ان کی بہت مشہور نظم ہے جس سے ان کے فن کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ انھیں قافیوں پر قدرت ہی حاصل نہیں تھی بلکہ احساس میں وہ حدت بھی تھی جس نے بیان کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال دیا ہے۔ اس نظم میں دریا کی سی روانی ہے جس میں کہیں ٹھہراؤ نہیں اور آخری شعر پڑھ جانے پر بھی یہ یقین نہیں ہوتا کہ نظم کا اختتام ہو گیا۔

مجاز کے سینے میں باغی سپاہی کا دل تھا جو اپنے ملک کو بہر صورت آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ انگریزوں سے انھیں شدید نفرت تھی۔ اپنی نظم "بدیسی مہمان سے" میں انھوں نے "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے کو کس خوبصورتی اور دلیری سے منظوم کیا ہے ؎

مسافر جاگ وقت بے کسی ہے — ترے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں سونے کے توڑے — یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
یہ عالم ہو گیا ہے مفلسی کا — کہ رسم میزبانی اٹھ گئی ہے
مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے — وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

آگے چل کر انگریز حکمرانوں کو ہندوستان کی طاقت اور باغی ارادوں کی بیداری سے روشناس کراتے ہیں ؎

گھٹا جو اس سمندر سے اٹھی ہے — دُرِ خوش آب بھی برسا چکی ہے
مگر اب اس کا عالم ہی جدا ہے — یہ بدلی آگ برساتی اٹھی ہے
ستارہ صبح کا بے نور ہے اب — در و دیوار پر دھوپ آ چکی ہے
یہاں ہر شاخ شمشیر برہنہ — گلوں سے خون کی بو آ رہی ہے
یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے — یہاں سے ایک آندھی اٹھ رہی ہے

دوسری عالمگیر جنگ کا اختتام اپنے ساتھ برطانوی اقتدار کو بھی لیتا گیا۔ ہندوستان کو بھی آزادی نصیب ہوئی لیکن ماؤنٹ بیٹن پلان کے مطابق دو حصوں میں تقسیم ہو کر۔ شروعات میں تو خارجیت پسند شعرا اور ادیب ماؤنٹ بیٹن پلان کی آئینی باریکیوں سے متعارف نہ ہو سکے مگر رفتہ رفتہ ان پر اس نام نہاد کی آزادی کے تمام ناگزیر نتائج ظاہر ہونے۔ چنانچہ مجاز بھی تمام عمر آزادی کے خواب دیکھ کر اپنی نظم "جشن آزادی" کا یہ بند لکھنے پر مجبور ہوئے ؎

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں — یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں
وہ جس کی تاب و توانائی کا جواب نہیں — ابھی وہ سعی جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغاز کار مرداں ہے

عرصہ دراز سے عورت فنکاروں کے اعصاب پر سوار رہا ہے اور کسی زمانے کا شعری ادب اس کے ذکر سے خالی نظر نہیں آتا۔ یہ کہہ دینا تو صحیح نہیں ہوگا کہ عورت کا ذکر ہی شعر و ادب میں نہیں ہونا چاہیے۔ ہونا چاہیے اور ضرور ہونا چاہیے کیونکہ عورت بغیر زندگی ادھوری ہے لیکن صحت مندانہ انداز میں۔ ذہنی عیاشی کی لذتیت کے طور پر بیشتر ادیبوں نے عورت کا ذکر کیا ہے [illegible] داری کو صحت مند اثرات قبول کرنے کے عوض ذہنی عیاشی کی ترغیب دیتا ہے۔ اس قسم کے ادب سے جو انحطاطی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ سماجی زندگی کو مسموم کرتی ہے لیکن مجاز میں ہمیں ذہنی عیاشی یا فراری ذہنیت کی مثالیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے عورت کو اپنی بہت سی نظموں کا موضوع بنایا ہے لیکن جو کچھ کہا ہے بہت صحت مندانہ انداز میں جس سے جنسی بھوک کے بجائے زندگی اپنی [illegible] بلکہ اس سماجی نظام سے جس کی عورت صدیوں سے [illegible] کی طرح شکار رہی ہے دلوں میں ایک شدید نفرت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ مثال کیلئے

ان کی نظم "نوجوان خاتون سے" کے چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

حجاب فتنہ پرور اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردہ بنا لیتی تو اچھا تھا
تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس نظم سے مجاز کی وسعت نظر، بیداری شعور اور پختگی خیال کا پتہ چلتا ہے۔ نظم طویل نہیں لیکن جدید کا جواب ہے۔ ایک اور نظم ہے "مجھے جانا ہے اک دن" ؎

مجھے جانا پڑے گا تیری بزم ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی تو حسن کے پیروں میں ہے زنجیر حنابندی
ابھی ہے عشق پر آئین فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریک طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیر زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

یہاں محض حسن شباب سے جانے کا سبب تغافل یار نہیں بلکہ زندگی کے وہ اہم تقاضے ہیں جن کو حسن و عشق پر فوقیت حاصل ہے۔

قریب قریب ہر شاعر ابتدائی دور میں حسن و عشق کی سہانی فضا سے والہانہ طور پر گزرتا ہے۔ مجاز نے بھی خالص رومانی تراش خراش کی نظمیں کہی ہیں جو اردو ادب میں گرانقدر اضافہ ہیں۔ مثلاً "عیادت"، "اعتراف"، "نذر دل"، "کس سے محبت ہے"، "ایک غمگین یاد"، "ان کا جشن سالگرہ"، "عہد شکستہ"، "اصنام عشق"، "[illegible]"، "ادام" وغیرہ۔ چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں ؎

ہر نفس پر روح بے خود سی نغمہ ریز ہو
ہر نظر شوق کا افسانہ کہے جاتا ہے
نشۂ نازہ جوانی میں خمار آلودہ ادا
جسم ذوق گہر اطلس دکھا کر بہکے
ایک صیاد پر خود تمکین اندام سوار پیشتر جی
زلف پیچاں لیے ظلمت بکھیرے

[illegible] ادام ؟

چمک تاروں کی چشم سرمگیں میں
جھلک چاندی کی جسم مرمریں میں
تبسم اس جبیں کے نرم خطوط میں
فضاؤں میں ملیں [illegible]

وہ محرابوں کی سیمیں پر ثنایاں — فضائے نور میں کچھ پڑھ کے شب بھر
ادھر ہم نے اک آہ سرد کھینچی — ہنسی پھر آ گئی اپنے کئے پر

(اصنام عشق)

اے گوکہ ترے دم سے مری زمزمہ خوانی
ہو تجھ کو مبارک یہ تری نور جہانی
افکار سے محفوظ رہے تیری جوانی
چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ

(ان کا جشن سالگرہ)

ایک حسین و جمیل خاتون کے لئے اس سے بہتر دعا کیا ہو سکتی ہے۔

لب عیسیٰ پہ لاکھا ہے نہ رخساروں پہ غازہ ہے
جبین نور افشاں پر نہ جھومر ہے نہ ٹیکا ہے
جوانی بے سہاگ اس کا تبسم اس کا گہنا ہے
نہیں آلودہ ظلمت سحر دامانیاں اس کی

(کس سے محبت ہے)

تم اگر روٹھو تو اک تم کو منانے کے لئے — گیت گا سکتا ہوں میں آنسو بہا سکتا ہوں میں
تم سمجھتی ہو کہ ہیں پردے بہت سے درمیاں — میں یہ کہتا ہوں کہ ہر پردا اٹھا سکتا ہوں میں
تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوس نظر — مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

پھر آخر میں کہتے ہیں —

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں — دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

(نذر دل)

"عبادت" کا یہ شعر کتنا حسین ہے ؎

ملتی ہوئی نگاہ میں بجلی بھری ہوئی — کھلتے ہوئے لبوں میں گلستاں لئے ہوئے

نظمیں تو اور بھی باقی ہیں مثلاً "عشرت تنہائی"، "اندھیری رات کا مسافر"، "خواب سحر"، "طفلی کے خواب"، "شکوہ مختصر"، "احسان"، "تمہید"، "نذر خالدہ" وغیرہ جو اعلیٰ تخلیقات ہیں لیکن مضمون کی طوالت کے لحاظ سے الگ الگ بحث کرنا اور اقتباسات پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک نظم رہ گئی ہے جس پر کچھ کہنا اشد ضروری ہے اور وہ ہے "آوارہ"۔ یہ نظم ان کے دیوان کی سب سے زیادہ بلند کامیاب اور مشہور ہے۔ یہ وہ نظم ہے جس کی شہرت کا ڈنکا ہندوستان کے کونے کونے میں بج چکا ہے۔ اردو ادب میں بہت کم نظمیں ہوں گی جن کو اس سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہو۔ یہ نظم ان کی نفسی الجھنوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس نظم میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، نشست الفاظ کا انداز ہ۔

بندشوں کا طریقۂ استعمال قابلِ قدر ہے اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسی کی اپنی روداد حیات ہے جو مجازؔ نے اپنے قلم سے کاغذ پر پھیلا دی ہے۔ نظم طویل ہے اس لئے ایک دو بند ہی مثالاً پیش کر رہا ہوں ؎

راستے میں رک کے دم لوں یہ مری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں مری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ایک نظم اور جو انھوں نے گاندھی جی کی موت سے متاثر ہو کر کہی تھی ذکر سے رہی جا رہی تھی۔ اس کے بھی دو اشعار بطور مثال پیش ہیں ؎

ہندو چلا گیا نہ مسلماں چلا گیا — انساں کی جستجو میں اک انسان چلا گیا
خوش ہے بدی جو دام یہ نیکی پہ ڈال کے — رکھ دیں گے ہم بدی کا کلیجہ نکال کے

اب اردو شاعری کی اس حد سے زیادہ بدنام صنف پر آئیے جس کو غزل کہتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی کہ اس صنف ادب میں جذبات کو زیادہ دخل ہے اور زندگی کے اہم مسائل کو کم لیکن اردو کے جدید غزل گو شعرا نے جنھوں نے غزلیات میں نئی قدروں کو اجاگر کیا ہے۔ مجازؔ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید ترین مرکزیت اور داخلیت بھی ہے اور ماورائیت اور جامعیت بھی۔ غزل میں جو اجمال اور رعایت ہوتی ہے اس کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ سوالی و مطالب کی تلخیص کر کے ایک طویل مضمون کو ایک یا دو اشعار میں ادا کر دیا جائے۔ مجازؔ کی غزلیات کے مندرجہ ذیل اشعار بھی نظموں سے کسی حالت میں کم زود اثر نہیں ہیں ؎

اس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے — جہاں سے چاہتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں

---

ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجازؔ — وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

---

یہ سب ہاتھ ہیں خون سے جن کے تر — یہی تھے مسیحا، یہی چارہ گر

---

خامشی کا تو نام ہوتا ہے — ورنہ یوں بھی کلام ہوتا ہے

---

آشفتگیٔ وحشت کی قسم، حیرت کی قسم، حسرت کی قسم — اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں، ہم رازِ تبسم پا بھی گئے
یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی — محفل تو تری سونی نہ ہوئی [illegible] بھی گئے

---

میری نظروں میں حشر بھی کیا ہے — میں نے اس کا جلال دیکھا ہے
جب بھی آنکھیں ملیں ان آنکھوں سے — دل نے دل کا مزاج پوچھا ہے

کبھی اک رند اور واماندۂ افکارِ تنہائی — کبھی محفل کی محفل طور سے بے طور ہے ساقی

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجے، ہم صورتِ جاناں بھول گئے

نہ پوچھیے مری دنیا کو، میری دنیا میں — خود آفتاب بھی ذرہ ہے آفتاب نہیں

حسن کا غم بھی حسیں، فکر حسیں، درد حسیں — ان کو ہر رنگ میں ہر طور سنورجانا تھا

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا — تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں — یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے
ابھی بزمِ طرب سے کیا اٹھوں میں — ابھی تو آنکھ بھی پرنم نہیں ہے

مجاز نے اچھے قطعات بھی کہے ہیں جن میں سے دو ذیل میں دیئے جا رہے ہیں:
اپنا غم اوروں کو دے، اوروں کا غم لینے سے کیا — تیری کشتی پار لگ جائے گی اس کھینے سے کیا
بات تو جب ہے کہ مرجا عرصہ گاہِ رزم میں — اس پہ دم دینے سے کیا اور اس پہ دم دینے سے کیا

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے — سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے — موت آواز دے رہی ہے مجھے

مجاز نے اپنی نظموں، غزلوں، قطعات وغیرہ کی تخلیق میں انتہائی سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ ان میں تفکر کی گہرائی اور ماحول اثر آفرینی بدرجہ اتم موجود تھی اور انھیں تمام چیزوں کی بدولت وہ وقت سے کچھ پہلے ہی پختہ ہو گئے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر میں ت زیادہ نہیں لکھا لیکن جو لکھا ہے وہ اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔ ان کی موت سے اردو ادب کو جو زبردست نقصان پا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے۔

# نواب سر نظامت جنگ بہادر

از:- جناب غلام پنجتن صاحب

آج سے سو سال پہلے روسیو نے کہا تھا کہ "گو انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے" انسان کے دماغی ارتقاء نے ہر جگہ ان زنجیروں کے جوڑ کھول دیئے۔ انگریزی سامراج دماغی ارتقاء کو تو نہ روک سکا لیکن دیسی ریاستوں میں آزاد خیالی اس حد تک آنے دی جو اس کی سامراجیت کی ہمنوا رہے۔ جب تک ہم اس جکڑ بندی کا بتاؤں نکالے بغیر اپنے اس زمانے کے مشاہیر کو دیکھیں گے ہم ان کی وہ قدر نہیں کر سکتے جس کے وہ حقیقتاً مستحق ہیں۔ نہ ہمیں ان کے وہ خد و خال نظر آ سکتے ہیں جو ان کو ایک امتیازی مقام پر پہنچاتے ہیں۔ نظام الدین احمد نواب افضل الدولہ بہادر کے انتقال کے دو سال بعد ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ یہ سالار جنگ اول اور امیر کبیر کی کورجینسی (Co-Regency) کا زمانہ تھا اس وقت برٹش ریذیڈنٹ کی سیاسی گھرکیاں بندر بھبکیوں کی حد سے نکل کر واجب التعمیل دوستانہ مشوروں کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس وقت بھی ان کا خاندان انتظامات ملکی میں منسلک تھا۔ ان سیاسی گھرکیوں کی روایتیں ان کے بچپن کے کانوں میں پڑی تھیں۔ انہوں کے مقابلے میں امراء کا غرور و نخوت کا جذبہ اور "صاحب عالیشان بہادر" کے سامنے احساس بے چارگی کا اظہار انھوں نے دیکھا تھا۔ ثروت و نکبت کے دلخراش فرق اور علم و فضل کی بے مائیگی کا ان کے دل پر اثر پڑا تھا اور پیرانہ سالی عشق و سال و عروج کے زمانے میں اس خط پر بھی آنسو بہائے تھے جو لارڈ ریڈنگ نے سر علی امام کی برار کی واپسی کی کوششوں کے جواب میں شہریار دکن کو لکھا تھا۔ ان کے میٹرک کامیاب ہونے کے ایک سال پہلے سالار جنگ اول اپنی شکست خوردگی کا صدمہ لئے ہوئے دنیا سے سدھار چکے تھے۔ سالار جنگ نے جو طریقہ اپنی زندگی میں اچھے خاندانوں کے ہونہار بچوں کو انگلستان میں تعلیم دلانے کا کام شروع کیا تھا۔ اس سے مستفید ہونے کی تیاری انھوں نے سروجنی نائیڈو کے والد ماجد ڈاکٹر اگھور ناتھ کے حلقہ درس میں شامل ہو کر کی اور مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی۔ گو ان کی تعلیم کی ابتداء مدرسہ اعزہ میں ہوئی جس کی ترقی و توسیع کا خیال ان کو مدت العمر رہا۔ اس زمانے میں سروجنی دیوی سے جو ادبی رشتہ قائم ہوا وہ ان دونوں میں باوجود سیاسی بعد المشرقین کے مدت العمر قائم رہا۔ دونوں علم و ادب کی صنف شاعری میں منزل بہ منزل استادی کے درجہ پر پہنچے۔ فرق اتنا رہا کہ سروجنی دیوی کا کلام شہرت دوام حاصل کر گیا۔ اور انھوں نے اپنے احساسات ذہنی اور ارادت قلبی کے شہ پاروں کو خاص حلقہ سے باہر آنے نہ دیا۔ ۱۸۸۸ء میں مرحوم ٹرینٹی کالج کیمبرج میں شامل ہوئے۔ وہ پہلے حیدرآبادی نوجوان تھے جنھوں نے ایل ایل بی کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور بیرسٹری کی سند لی۔

اگرچہ اس دور میں ٹوری ازم (Toryism) کا دور انگلستان میں ختم ہو چلا تھا اور ڈیموکریسی اور ریڈیکلیزم کالجوں میں آگئی تھی۔ پھر ہندوستانیوں کو جن تلخیوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا وہ انھیں کا دل جانتا ہے جنھوں نے انیسویں صدی کے آخری دور میں اس کو سہا۔ اسی دور میں جو ہندوستانی نوجوان یورپ سے تعلیم حاصل کر کے واپس آتے تھے وہ سب سوائے چند خوش قسمتوں کے انگریز افسروں کی نظروں میں کھٹکتے تھے۔ وہ یا تو (Zoolayism) یعنی خوشامد کے شکار ہو جاتے تھے یا شہنشاہیت کے خلاف نفرت کا بیج بونے لگتے تھے۔ انھیں نوجوانوں کی زبوں حالی پر اکبر الہ آبادی نے کہا تھا ؎

کچھ قدر نہیں اس کی پرستش بھی نہیں اس کی — نیٹو کی لیاقت بھی مفلس کی جوانی ہے

فلسفہ جدید کے اکتساب کے باوجود نظام الدین احمد کی خاندانی سنجیدگی یورپ کے اخلاق سوز عادات پر ناک بھوں چڑھاتی رہی۔ انھوں نے تمدن جدید کے ہر آئین کو قطعی اور الحیانہ سمجھا۔ تکمیل تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ حیدرآباد لوٹے تو انھوں نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح غیرت مندی کو ہر چوکھٹ پر ٹھوکر کھاتے دیکھا جس کو ان کی خودداری گوارا نہ کر سکی اور انھوں نے ترک وطن کر کے مدراس کا رخ کیا اور وہاں کے ہائیکورٹ میں "این رول" ہو گئے۔ ان کے دوران قیام انگلستان میں امراء کے محل صاحب کردار اور غیور طبیعتوں سے محروم ہو کر مصنوعی خلوص و محبت کے شیش محل بن چکے تھے۔ صدر المہام اور معین المہام کی حکومت ان کے معتمدین کے بل بوتے پر چلتی تھی۔ ۱۸۹۳ء میں محسن الملک اس کے بعد وقار الملک پھر سردار الملک حیدرآباد سے خارج البلد ہو چکے تھے اور سردار دلیر الملک کی دلاوری کو گھن لگ چکا تھا۔ عماد الملک ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ ہی دنیاوی اقتدار سے قطع نظر کر کے پیشگاہ خسروی سے سررشتہ تعلیم کی جانب رجعت ذرا ہو چکے تھے اور تمدن انسانی کے ضروری شعبہ جات کو قابل قدر امداد اور ملکی سیاسیات سے ہٹ کر خاموشی کے ساتھ پہنچا رہے تھے۔ مسٹر ہرمزجی ہوم سکریٹری تھے۔ ہرمزجی کو جب یہ معلوم ہوا کہ جس نوجوان کو ان کے بنگلے کا ایک ہی طواف عہدہ دلا سکتا تھا وہ مدراس ہائیکورٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے تو فوراً اطلاع نامہ جاری ہوا کہ حسب قرارداد یا تو سرکاری خدمت انجام دو یا تعلیم کی رقم واپس کرو۔ جس طرح دوسرے درمیانی طبقے کے خاندانوں کی حالت تھی رفعت یار جنگ اول کا بھرم بھاری اور پٹارہ خالی تھا۔ نظام الدین احمد کے بڑے بھائی فصیح الدین احمد جو آگے چل کر رفعت یار جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے اس وقت محض دوم تعلقدار تھے۔ نظام الدین احمد نے یہ گوارا نہ کیا کہ اتنی بڑی رقم کا بار ان کے خاندانی بوڑھوں پر ڈالا جائے اس لئے وہ بادل نخواستہ اپنی امنگوں اور امیدوں کی قربانی کر کے واپس آئے۔ انھیں پرانی معتمد عدالت میں تقرر کر کے بٹھا دیا گیا۔ اسی ہلالی شخص اپنے کردار اور ذہانت کے بل بوتے پر انھوں نے ہوم سکریٹری کے دفتر میں دوم مددگاری حاصل کر لی۔ پھر معتمد عدالت العالیہ ہوئے۔ فوجداری بلدہ کی نظامت اول کو سنبھالا۔ انڈر سکریٹری مجلس وضع قوانین رہے۔ پھر رکن عدالت العالیہ اور سر مجلسی کی خدمت انجام دیتے ہوئے ۱۳۱۶ف کے پرآشوب زمانے میں معتمد سیاسیات ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد صدر المہام بنا دئیے گئے۔ ان چوٹی کے عہدوں پر [illegible] جو کچھ انھوں نے کیا اس کی تفصیل میں جانے کا وقت کو ہزار ہا مشکلات دیکھنی پڑیں گی۔ الحاصل انھوں نے موسیٰ ندی کی طغیانی کی تباہ کاری بھی دیکھی اور پھر حیدرآباد کو عروس البلاد بنانے میں بڑا حصہ بھی لیا۔ جب تک وہ عہدہ دار رہے زمانے نے ان کا ساتھ دیا مگر عمر کے آخری دور میں موت سے ان سے ناسازگاری کی اور حیات اتنی بڑھی کہ انھوں نے وہ سیاسی طغیانی بھی دیکھ لی جس کے

روکنے کے لئے ۱۹۲۵ء سے اپنی پوری مدبرانہ قوت صرف کر رہے تھے۔

ان کا عمل بچپن سے بڑھاپے تک "زیستن برائے خدمت" پر رہا۔ ذمہ دارانہ عہدوں کی مصروفیت جس کو انھوں نے کبھی ماتحتوں پر نہیں ڈالا۔ ان کا علمی اور ادبی ذوق عمادالملک کی صحبت میں عالمانہ راستہ پر بڑھتا گیا۔ دائرۃ المعارف آصفیہ کتب خانے کی توسیع میں نظامت جنگ ان کے صلاح کار و معاون رہے۔ انھیں کی صحبت میں نظامت جنگ کو یہ یقین ہوگیا کہ جب تک مشرقی امور و السنہ کی جانب توجہ نہ کی جائے اور محاسن مذہبی کو اجاگر نہ کیا جائے ترقی ناممکن ہے۔ ان کے مزاج کی شگفتگی کو ان کی فطری سنجیدگی انھیں مرجھائے رکھتی تھی۔ مغرب کے بعد ان کے رہنے گنے دو چار دوستوں جن میں نواب عابد نواز جنگ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں کی صحبت میں ان کے ادبی لطیفے اور علمی بذلہ سنجیاں اپنا رنگ جماتی ہیں۔ جہاں ان کو اپنی انگریزی نظموں کی داد ملتی تھی اور وہ عابد نواز جنگ کی انگریزی نظموں کے اردو نظم میں ماہرانہ ترجموں کی داد دیتے تھے۔ افسوس یہ ہے کہ ان دونوں کے یہ شہ پارے منظر عام پر نہیں آئے۔ ۱۹۱۱ء میں ان کی چند نظموں کا مجموعہ لندن میں بڑے اصرار کے بعد شائع ہوا۔ انگلستان کی ادبی دنیا میں ان نظموں کی بڑی آؤبھگت ہوئی۔ جنگ عظیم کے بعد بہت کچھ کالے پن کا پردہ اٹھ چکا تھا اور ہندوستانیوں کی لیاقت کا اعتراف سفید رنگ والوں پر کھلتا کم ہوگیا تھا۔ نظامت جنگ کے پاس تحسین و مبارکبادی کے بہت سے خطوط آئے۔ والد مرحوم نواب سراج یار جنگ نے بہت کچھ چاہا کہ وہ کم سے کم چند خطوط کے اقتباسات شائع کر دیئے جانے پر راضی ہو جائیں مگر انھوں نے پریس میں نہ دینا تھے نہ دیئے۔ باوجودیکہ ان کے کلام و گفتار میں موسیقیت تھی وہ عیش و نشاط کی صحبتوں سے خواہ ان کے ہم عمر و ہم رتبہ دوستوں ہی کی کیوں نہ ہو بہت دور بھاگتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ساری عمر برہمچاری رہے۔ ان کے اخلاق و تہذیب کی بلندیاں بڑے بڑے سربلندوں سے اپنی تعظیم کرا رہی تھیں۔ ان کی خودداری میں جبیں سائی کے فقدان اور تنہا پسندی کے میلان نے انھیں مغرور اور جاہ پسند مشہور کر رکھا تھا۔ مگر جن کو انھیں قریب سے دیکھنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا وہ ان کے دلدادہ رہے۔ ان کو مرحوم میں وہ خوبیاں نظر آتی تھیں اور ان کی دوستی میں وہ راحت اور استقامت تھی جس کا اس پُربہار ملک میں قحط تھا۔ ان کی سب میں بڑی خوبی جس نے ان کو ہر دلعزیز بنا رکھا تھا یہ تھی کہ وہ نوجوان اہل غرض کو امیدوں میں بہلانا ناپسند کرتے تھے اور پہلے ہی ملاقات میں معلوم کرا دیتے کہ ان سے کس حد تک مدد کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ یہ کہنے والے تو بہت سے ملیں گے کہ نظامت جنگ نے مجھے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ایسے غالباً مشکل سے ملیں گے جو یہ کہہ سکیں کہ مجھے نظامت جنگ نے یہ کہا تھا مگر کیا کچھ نہیں۔

۱۹۰۱ء میں سرور نگر میں ملکہ وکٹوریہ کی یادگار میں ایک یتیم خانہ قائم کرنے کی تجویز ہوئی۔ اس غرض سے ایک کمیٹی سرمایہ فراہم کرنے کے لئے بنائی گئی جس کے وہ اعزازی معتمد بنے۔ جو کوششیں انھوں نے اس سلسلہ میں کیں ان کے افتتاح کے موقع پر سر ڈیوڈ بار رزیڈنٹ وقت نے پرخلوص الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ اسی وقت سے جو رزیڈنسی کی نظر میں چڑھے ہیں تو چڑھتے ہی چلے گئے۔ پہلی جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں ۱۹۱۹ء میں وہ او۔بی۔ای ہوئے پھر سی۔آئی۔ای اور خزانہ صدر المہامی میں نائب بن گئے۔

سر آسمان جاہ کی وزارت کے زمانے ہی سے سکے کا مسئلہ ایک پریشانی کی صورت اختیار کرتا چلا آ رہا تھا جس کو سر کیسن واکر نے اپنی معین المہامی کے دور میں ایک قانون منظور کرا کر ختم کر لیا۔ سر کیسن نے اس سلسلہ میں نظامت جنگ کی معلومات و مطالعہ کا کھلم کھلا اعتراف کیا۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ سب عہدہ داروں سے زیادہ مفید مشورے نظامت جنگ نے دیئے جن کی بنا پر انھوں نے اس مسودے کے دفعات پر غور کر کے اور ترمیمیں کیں۔ رود موسیٰ کی طغیانی کے بعد بازیافت اور تقسیم مال کی جو

شروع کی گئی جس کی نگرانی حلقۂ بیرون بلدہ میں ان کے سپرد ہوئی۔ اس کام کو جس خوش اسلوبی اور ہمدردی سے انھوں نے اختتام کو پہنچایا اس کے سراہنے والے اور مرحوم کو دل سے دعا دینے والے آج بھی موجود ہیں اور ان کی خلوص اور ہمدردی کا ذکر کرتے ہیں۔ عدالت اور امور عامہ کی معتمدی کے زمانے میں انھوں نے بیت المعذورین کے قیام کی کارروائی شروع کی اور سرکار سے دو ہزار روپئے ماہوار کی ماہانہ امداد منظور کرائی۔

جوڈیشل اور اگزیکیوٹو اختیارات کی علحدگی کی داغ بیل انھیں کے ہاتھوں پڑی۔ جب انھوں نے اپنے زمانۂ معتمدی میں مشیر قانونی کی شرکت میں تحصیلداروں سے دیوانی کے اختیارات لئے جانے اور منصفوں کی تعداد بڑھانے کی اسکیم سرکار میں پیش کی جو تھوڑی ترمیم کے ساتھ منظور ہوئی۔ جب حیدرآباد میں سٹی امپروومنٹ بورڈ قائم ہوا تو اس کی اعزازی معتمدی کے فرائض کا بار انھیں کے کاندھوں پر ڈالا گیا۔ یہ کام کافی وقت اور سردردی چاہتا ہے۔ شہر کی آرائش اور گنجان آبادی کی توسیع و اصلاح ان کا نام صدیوں زندہ رکھے گا۔ کرشنا اور تنگبھدرا کی تقسیم آب کا جھگڑا مدراس اور حیدرآباد کی حکومتوں کے درمیان سالہا سال سے چلا آرہا تھا۔ دونوں حکومتوں کا ایک مشترکہ بورڈ اس مسئلہ کو تصفیہ کرانے کے لئے بلایا گیا۔ انھوں نے لارڈ پنٹلینڈ (Lord Pentland) کو راضی کرلیا۔ حکومت کی طرف سے مسٹر میکنزی چیف انجنیر اور مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم شریک ہوئے۔ اس بورڈ کے ذریعہ اس امر کو منظور کرالینے میں جن پر حیدرآباد کی حکومت کو اصرار تھا وہ کامیاب ہوگئے۔

سر علی امام جب حیدرآباد میں آئے اور باب حکومت کی تنظیم عمل میں آئی تو اس میں انھوں نے سر علی کی بڑی مدد کی جس کا خود سر علی نے بارہا اعتراف کیا ہے۔ دو سیاسی شخصیتوں کے درمیان باوجود دوستی اور ہم جلیسی کے شبہات کا جو غیر شعوری پردا پڑا رہتا ہے وہ تھوڑے ہی دنوں میں چاک ہوگیا۔ سر علی اور ان میں اختلافات ہوئے لیکن کبھی ایک دوسرے کی نیت پر شبہ نہ ہوسکا اور نہ ذاتیات کا بیر کبھی ان اختلافات میں نمایاں ہوا۔ دونوں کی افتاد زندگی اور طبیعتوں میں فرق تھا۔ نظامت جنگ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے عادی تھے۔ سر علی گو ایک ماہر ڈپلومیٹ اور کامیاب ایڈوکیٹ تھے لیکن کبھی کبھی ان کی طبیعت جوش میں آجاتی تھی اور وہ اپنے پیش نظر مقصد کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ داؤں پر لگادیتے تھے انھوں نے شملہ اور دہلی کا گرم و سرد دیکھا تھا وہ حیدرآباد اور بلارم کے خشک و تر سے قطعی ناواقف تھے۔ نظامت جنگ ان اوچھے ہتیاروں سے واقف تھے جو آئے دن ہندوستانی ریاستوں میں چلتے رہتے تھے۔ پرنس آف ویلز کی مہمان داری کے سلسلے میں رائج ہونے کے منوانے میں سر علی نے لارڈ کرزن ایسے بلند پایہ انگریز سے ٹکر لی اور نظام دکن کی شان رکھ لی۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ وہی جس کا نظامت جنگ کو خدشہ لگا ہوا تھا ادھر جب سر اکبر اور سر علی کی چلی تو حضور نظام نے علی امام کے بازو پر رخصتی امام ضامن باندھ دیا۔ ادھر گورنری کیا بلکہ شہنشاہ ہند کی پریوی کونسل کی ممبری تک سے سر علی محروم ہوگئے جو وائسرے کے دوسرے ممبران قانون کو ملی اور سر اکبر کو ۱۹۳۶ء میں یہ اعزاز بھی دیا گیا۔ انھیں سر علی کے چلے جانے کے بعد سے جن سیاسی گتھیوں میں آئے اور برسہا برس الجھنا پڑا ان پر نظر ڈالنا آج جب کہ شہنشاہیت اور آصفجاہیت دونوں ختم ہوچکی ہیں عبث ہے۔ اپنی سیاسی زندگی میں انھوں نے اپنے ادبی ذوق کو کم ہونے نہیں دیا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے فنون ادب کے میر مجلس بنے۔ انھوں نے پہلے کونوکیشن کے جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں جو خطبہ پڑھا وہ آج بھی اتنی تعلیمی ترقی کے بعد کسی ماہر تعلیم کے سامنے رکھ دیا جائے تو وہ یہی کہے گا۔ اس کا مصنف تعلیم کا حقیقی دوست ہے اور علم کو علم بالذات سمجھ کر اس سے شیفتگی رکھتا ہے۔ اس کے فقرے فقرے سے عالمانہ شان ٹپکتی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں ایسے پروفیسر چاہتے تھے جو تعلیم کا اصل اصول شفقت اور تربیت کو قرار دیں۔ اگر اساتذہ کے

تقریریں ان کی جگہ پاتیں تو بندے ماترم سے شروع ہو کر دکشا پیچ پائی تک کے جو مناظر ہوئے سرا کبر حیدری کو دیکھنا پڑے اس کی نوبت نہ آتی۔ اس سے زیادہ ملک کی کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے کہ جس نے اپنی پوری پوری عمر فنون لطیفہ کی خدمت میں صرف کر دیا ہو اس کے مرنے کے بعد اس کے شاعرانہ دل و دماغ کو لندن میں سراہا جائے اور یہاں ایک نوجوان گریجویٹ بھی نہ نکلے جو ان کی انگریزی نظم سنا سکے۔

ذاتی اغراض کے تحت اور بے غرض خدمت خلق کرنے والوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن کھل ہی جاتا ہے۔ جزا سزا کی قائل 'قیامت پر ایمان بالغیب رکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ حکومت سے علٰحدہ ہو کر سر نظامت جنگ مرحوم و مغفور کا جو زمانہ گزرا اس میں انھوں نے کتنا توشۂ آخرت جمع کیا یہ ان کے خلوص ہی کا کرشمہ تھا کہ ان کا قلب "دیار حبیب" کی پس ماندہ فاقہ کش مصیبت زدہ عوام کے درد سے تلملا اٹھا۔ حج وزیارت کی دولت سے مالا مال ہو کر جب واپس لوٹے تو وہ شیخ سعدی کے "خر عیسیٰ" کے مصداق نہ بنے۔ انھوں نے دامے درمے' قدمے مدینہ والوں کو راحت پہنچانے کے لئے اپنے مقدور سے کہیں زیادہ کیا۔ اس ضعیف العمری میں گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر جو خدمت انھوں نے کی وہ ان کی قبر کو تا قیامت منور رکھے گی اور میدان حشر میں ایسی آن بان سے چلتا دیکھے گی جس سے وہ دنیا کے درباروں میں چلتے تھے۔ ان کی عمر کچھ اور دن وفا کرتی تو وہ بہزمجسٹی سلطان نجد اور خادم حرمین شریفین کو اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے دیکھ لیتے۔ مگر انھیں موت نے ایرو ڈرام پر جانے نہ دیا اور وہابی عقائد کی بندشوں نے خادم مدینہ کو اس شیدائے مدینہ کے مزار پہ آنے نہ دیا۔

دامان نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد (از سیاست)

---

# سر نظامت جنگ مرحوم کو خراج عقیدت

**ڈاکٹر سید محمود کی تقریر** ڈاکٹر سید محمود وزیر خارجہ امور ہند نے سر نظامت جنگ مرحوم کے رفقائے کار سے خواہش کی کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں جو کام شروع کئے تھے انھیں جاری رکھیں۔ ڈاکٹر سید محمود نے آج صبح مرحوم کی قائم کردہ مجلس علم و عمل کا معائنہ کیا اور مجلس کی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی

نواب مہدی نواز جنگ وزیر طبابت' ڈاکٹر جی۔ ایس ملکوٹے وزیر تعمیرات اور سابق وزیر نواب لیاقت جنگ' ڈاکٹر نظام الدین اور مسٹر حسن الدین احمد بھی شامل ہیں' ڈاکٹر محمود کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر سید محمود نے اس موقع پر ممتاز اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نظامت جنگ مرحوم اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کی وجہ ہندوستان ہی میں مقبول نہیں تھے بلکہ ان کی شخصیت بین الاقوامی تھی وہ ایک انسان کامل تھے۔ انھوں نے جس ڈھنگ سے اپنی زندگی گزاری ہے وہ سب کے لئے قابل تقلید ہے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مرحوم نے قرآنی تعلیمات کی اشاعت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اب مسلمانوں خصوصاً ان کے رفقائے کار کا یہ فریضہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کام کو آگے بڑھائیں جسے انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔

**ڈاکٹر ملکوٹے کی تقریر** ڈاکٹر جی۔ ایس ملکوٹے نے نظامت جنگ مرحوم کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی موجودہ زندگی مرحوم کی رہبری اور ہدایت کی منت پذیر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ وہ مرحوم کا اپنے والد کی طرح احترام کرتے تھے اور وہ بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی موجودہ زندگی مرحوم کی زندگی کا عکس ہے

مرحوم نے نہ صرف نوعِ انسان کی بے لوث خدمت کا سبق نہیں سکھایا بلکہ سیاسی زندگی میں بھی ان کی رہنمائی کی۔ مرحوم کی شخصیت عالمگیر حیثیت کی حامل تھی۔ مرحوم بعض باتیں ایسی کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے باخبر ہیں غرض کہ وہ ایک سچے مسلمان اور اچھے انسان تھے۔
ڈاکٹر ملکوٹے نے کہا کہ نواب صاحب مرحوم نے جو زمین قیمتی تقریباً (۳۰) ہزار روپے بغرض تعمیر دواخانہ مجھے مفت عنایت کی تھی اس کو میں بخوشی واپس کرنے تیار ہوں کیونکہ میں موجودہ حالات کے لحاظ سے تعمیر دواخانہ کے موقف میں نہیں ہوں۔

## مرحوم کی یادگار

نواب ناظر یار جنگ بہادر نے معزز مہمانوں سے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا اور ایک مختصر اور جامع تقریر کی جس میں انجمن کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور نواب صاحب مرحوم کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک مکمل انسان تھے اور آخر عمر تک اپنی عام صلاحیتوں کو نہ صرف علم و ادب بلکہ قوم کی اصلاح کے لئے کوشش کرتے رہے اور اپنی تمام جائداد وقف کر دی۔ یہ ان کے ایثار کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جس پر ہم لوگ ان کی یادگار کے طور پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔
نواب لیاقت جنگ بہادر نے کہا کہ نواب سر نظامت جنگ مرحوم نے جس قدر ایثار کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مرحوم ایک سچے مسلمان اور مکمل انسان تھے۔ مرحوم نے اپنی یادگار ایک انجمن چھوڑی ہے جس کو چلانا اور اس کے کام کو آگے بڑھانا نہ صرف ان کے جانشینوں بلکہ دوستوں کا بھی فریضہ ہے کہ مرحوم کی روح کے لئے خوشی کا سامان مہیا ہو۔ مولوی نور الاسلام صاحب نے نواب چھتاری کا پیغام تعزیت اور لندن ٹائمز و دیگر اخبارات کے اقتباسات پڑھ کر سنائے ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور نے سر اسٹیورڈ فریزر سابق رزیڈنٹ حیدرآباد کا پیام تعزیت موسومہ مولوی میر باسط علیخاں صاحب پڑھ کر سنایا جس میں نواب صاحب مرحوم کو دولت مشترکہ کا بہترین شاعر خیال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب کو صدر نشین انجمن علم و عمل نواب مرحوم کے جملہ تصانیف کا ایک سٹ پیش کیا گیا۔ موصوف نے حسب استدعا اراکین انجمن علم و عمل نواب صاحب مرحوم کی تصویر کی نقاب کشائی کی جس کے لئے مولوی میر باسط علیخاں صاحب نے خاندان کی جانب سے ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا کی کہ خدا ہم سب کو مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

## مکتوب ڈاکٹر جی۔ ایس ملکوٹے (وزیر تعمیرات حکومت حیدرآباد) بنام نواب مولوی عظیم الدین احمد صاحب برادر خورد نواب نظامت جنگ مرحوم

محبی نواب عظیم الدین احمد صاحب اور افراد خاندان!
اس دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ یہ واقعہ ہے کہ اگرچہ ہم میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ اس دنیا میں ہماری ہستی بالکل فانی ہوتی ہے تاہم ہر ایک آخر وقت تک توقع رکھتا ہے کہ ہمیشہ جیوں گا۔ یہی امید انسان کو ہمت دیتی ہے اور اسی وجہ سے ہم کو امید تھی کہ نواب صاحب اگرچہ عمر رسیدہ ہیں لیکن وہ طویل عرصہ تک زندہ رہیں گے۔
آدمی روز پیدا ہوتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ایسا نہیں بن سکتا کہ لوگوں کی محبت اور عقیدت حاصل کر سکے۔ ان کے اعلیٰ تصورات، سادہ زندگی، وسعت خیالی، طریقۂ غور و فکر، ان کی اپنے اطراف پیدا کی ہوئی روحانی فضا، ہر قریب آنے والے کے ساتھ پدرانہ شفقت، گہری محبت، وسیع فیاضی، اعلیٰ انتظامی قابلیت اور پاکیزہ تصورات وغیرہ کی وجہ سے ہر بڑا اور چھوٹا ان سے محبت اور احترام کرتا تھا۔ وہ جس طرح تفصیلات پر نظر رکھتے اور غریبوں سے محبت کرتے تھے اس سے وہی شخص واقف ہو سکتا تھا جو ان کو قریب سے جانتا تھا۔ انھوں نے جو کچھ بھلائی کی اس کی اطلاع و تشہیر کی کبھی اجازت نہیں دی۔ اسی لئے جب تک کوئی ان کے قریب نہ ہو جاتا ان کو معلوم بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک ایسے انسان تھے۔
میں محسوس کر رہا ہوں کہ ان کی وفات کے باعث گویا میں اپنے باپ سے محروم ہو گیا ہوں۔ میرے ساتھ ان کو بہت

غیر معمولی محبت تھی اور اگرچہ میرا دماغ یہ صدمہ اٹھانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تاہم ان کی موت کی خبر نے مجھے مبہوت بنا دیا۔ آج بھی ہر وقت میں دیوار پر سے نظر ڈالتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں کہ ان کی کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی ہے۔ حالانکہ آج بالکل تاریکی ہے۔ ان کا جسم نہیں بلکہ ان کا روحانی فیضان مجھے متاثر کرتا اور میں اب بھی ان کو موجود پاتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ان کا روحانی فیض ہمیشہ جاری رہے۔

میں آپ کے جذبات میں آپ سے ہم آہنگ ہوں اور اپنی بیوی، بھائیوں، بچوں دیگر افراد خاندان اور خود اپنی طرف سے آپ اور خاندان کے ہر فرد کو اور ان کے قریبی دوستوں کو پیام تعزیت بھیجتا ہوں۔ خدا کی مرضی یہی تھی۔ وہ ہمیں اور آپ سب کو اس صدمہ کے برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

(انگریزی سے ترجمہ) آپ کا مخلص جی۔ ایس ملکوٹے

## مکتوب سر اسٹیورڈ فریزر (سابق ریزیڈنٹ حیدرآباد) بنام نواب میر باسط علیخاں صاحب (داماد نظامت جنگ مرحوم)

عزیزی باسط!

سر نظامت جنگ کی وفات نے مجھے اپنے ایک قدیم ترین دوست سے محروم کر دیا۔ یہ معلوم کر کے تسلی ہوتی ہے کہ وہ اپنی ضعیفی میں تنہا نہیں تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نیند میں اطمینان کے ساتھ فوت ہوئے اور اس طرح ان کو اور ان کے دوستوں کو ایک طویل علالت کی زحمت برداشت کرنی نہ پڑی۔ وہ ایک غیر معمولی اہمیت کے انسان تھے۔ میری رائے میں تو دولت متحدہ نے ان سے بڑا شاعر نہیں پیدا کیا اور یہ قابل غور ہے کہ ان کے الہامات کا ماخذ ان کی آخر عمر تک جھلکتا رہا۔

ہماری دوستی طویل المیعاد ہونے کے سبب ایک غیر معمولی قسم کی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے کو ۱۹۱۴ء ۱۹۱۸ء کی لڑائی کے زمانے میں اچھی طرح پہچان لیا۔ لیکن جب میں ۱۹۲۰ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہو گیا تو پھر ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے اور ہماری دوستی (۳۵) سال تک بذریعہ تحریر جاری رہی۔

میں آپ کو تعزیت کا خط پہلے ہی لکھتا لیکن میں نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ اس غیر معمولی فلسفی شاعر پر لندن ٹائمز میں ایک تعزیتی مضمون نہ چھپا۔ لیکن چونکہ اس میں ان کے آخر زمانہ کا ذکر نہ تھا اس لئے میں نے حسب ذیل تعزیتی تحریر ٹائمز میں چھپوائی۔

"میں نے سر نظامت جنگ کے بارے میں آپ کا تعزیتی نوٹ پڑھا لیکن میں ان کی عمر کے آخری سالوں کے کارناموں کے بارے میں چند سطور کا اضافہ چاہتا ہوں۔

انگریزی شاعری اب بھی عوام میں ان کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور ان کے کلام کے جو نسخے مجھے وقتاً فوقتاً ملتے رہے ان کا موضوع ان کی ابتدائی نظموں کی طرح انگلستان کی محبت اور اس کی بڑائی سے تعلق خاطر ہی رہا۔ مثال کے طور پر یہ نظمیں قابل ذکر ہیں — یوم سلطنت (ایمپائر ڈے) پر ان کے خیالات جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئے۔ ۱۹۵۱ء کی لبرلیکل نظمیں اور ادرشاہ جارج ششم کی وفات پر ۱۹۵۲ء میں ان کی نظم اور دوسری الیزبتھ کی تخت نشینی کی نظم جو ایک رات قبل پہلی جون کو جو انھوں نے لکھی تھی وغیرہ وغیرہ۔

گہرا مذہبی ایقان رکھنے والے صوفی کی طرح انھوں نے قرآن بحیثیت رہبر زندگی ایک مضمون لکھا تھا اور باوجود ضعیفی اور کمزور صحت کے آخر وقت تک ایسے ہی تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی جرائد بھی اس غیر معمولی انسان کے بارے میں ضرور لکھیں گے۔ براہ کرم میری مخلصانہ تعزیت قبول کیجئے۔

آپ کا مخلص
(انگریزی سے ترجمہ)
ایس۔ ایم فریزر

# گولکنڈہ

از:۔ جناب اشفاق حسین صاحب

۱ — یہ بالا حصار ہے۔ گولکنڈہ کی اس بلندی سے قطب شاہی بادشاہوں نے آندھرا دیس میں ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔

۲ — ایسا تمدن جس میں ترکستان اور ایران کے شان و شکوہ کے ساتھ تلنگانہ کی سندرتا اور کوملتا ہیں

۱ — بلند اور عظیم الشان محلوں کے پاس ہی مندر اور مسجد کی تعمیر اس تمدن کی حقیقی آئینہ دار ہے۔

۲ — تلنگانہ کے نظر فریب مناظر، دلکش تالاب اور حسین پہاڑیاں اور ان کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت۔

۱ — اور کھیتوں میں گونجنے والے دلکش گیت۔

۲ — ان سب نے قطب شاہوں کے دل میں رس اور مٹھاس بھر دی۔ اور انھوں نے ایسے تمدن کی داغ بیل ڈالی جس میں ایرانی نغموں کا کرم بھی تھا اور دکنی گیتوں کا رس بھی۔

۱ — گولکنڈہ کی سلطنت کو ختم ہوئے ڈھائی سو سال ہوچکے مگر آج بھی اس کے تمدنی نقوش سرزمین دکن پر ثبت ہیں اور اس دور کی یاد دلاتے ہیں جب یہ سرزمین آپس کے میل جول کا گہوارہ بن رہی تھی۔

۲ — گولکنڈہ کا بانی سلطان قلی قطب شاہ ترکستان کے حکمران خاندان سے تھا، بہمنی سلطنت کے آخری دور میں وہ دکن آیا اور اپنی قابلیت اور ذہانت سے گولکنڈے کا صوبہ دار بنا اور جب بہمنی سلطنت ختم ہوئی تو اس نے گولکنڈے میں قطب شاہی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

۱ — اس طرح ترکستانی اور بہمنی تمدن کا ملاپ تلنگانے کے تمدن سے ہوا اور قطب شاہی تمدن پر مقامی رنگ اس درجہ غالب آگیا کہ نصف صدی کے بعد گولکنڈہ ایک آندھرا راجدھانی بن گیا۔

۱ — اور قطب شاہی بادشاہ آندھرا کے راجہ معلوم ہونے لگے۔ اہل تلنگانہ گولکنڈے کو اپنی سلطنت سمجھنے لگے۔

۲ — قطب شاہوں نے تلنگانے کو اپنا گھر بنالیا اور آندھرا کی معاشرت کو اپنا کر ترکستانی وضع قطع چھوڑ مقامی لباس اور طور طریق اختیار کیا۔

۱ — انھوں نے تلگو کی سرپرستی ہی نہیں بلکہ خود تلگو سیکھی اور اس میں شاعری کی۔

۲ — تلگو کے علاوہ صدیوں کے میل جول سے دکن میں جو نئی زبان دکھنی بن رہی تھی۔ قطب شاہوں نے اس کی ترقی میں دل کھول کر حصہ لیا۔

۱ — نہ صرف شاعروں کی سرپرستی کی اور نثر نگاروں کو نوازا بلکہ خود شاعری کی اور ایک لازوال سرمایہ چھوڑ گئے۔

۱ — گولکنڈے کی علم نوازی کے ساتھ اس کی دولت و ثروت کی شہرت دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی اور گولکنڈے کے ہیرے ساری دنیا میں مشہور ہوگئے۔

دنیا کے مشہور ہیرے کوہ نور کو گولکنڈہ ہی کی چٹانوں نے اگلا تھا۔

۲۔ ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں سے تجارتی کارواں اور سیاح گولکنڈہ آنے لگے۔

۱۔ اور گولکنڈہ کا شمار قرون وسطیٰ کے متمدن ترین ملکوں میں ہونے لگا۔

۲۔ گولکنڈہ کی تاریخ کا زرین دور ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی سے شروع ہوتا ہے۔

۱۔ اپنے بھائی جمشید قطب شاہ کے عہد میں ابراہیم کو وجیانگر کے راجہ رام راج کے یہاں پناہ لینی پڑی۔

۲۔ راجہ رام راج نے ابراہیم کی غیر معمولی آؤبھگت کی۔ ابراہیم سات سال تک وجیانگر میں رہا۔

۱۔ جنوبی ہند کی اس عظیم الشان سلطنت میں رہ کر ابراہیم نے تمدنی بصیرت حاصل کی اور وہیں گولکنڈہ کی سلطنت کو ایسی بنیادوں پر قائم کرنے کا عزم کیا جن میں ایران اور تلنگانہ کا حسین ملاپ ہو۔

۲۔ جمشید قطب شاہ کے بعد ابراہیم قطب شاہ کی تخت نشینی تلنگانہ کا ایک مسرت خیز واقعہ تھا۔

۱۔ وجیانگر سے چل کر جب ابراہیم کا کاروان گولکنڈہ کی دیواروں کے قریب پہنچا تو گولکنڈہ کا بچہ بچہ شادمانی میں ڈوبا ہوا تھا۔

۲۔ ابراہیم کے استقبال کے لئے گولکنڈہ کے بوڑھے جوان سبھی قلعہ کے باہر نکل آئے اور شاہانہ جشن کا اہتمام کیا گیا۔

(پس منظر میں ہجوم کی آوازوں کے ساتھ باجوں اور تاشوں کی آوازیں)

۱۔ جگدیو راؤ اور اس کے ساتھیوں نے قلعہ کی تمام کنجیاں ابراہیم قطب شاہ کے سامنے رکھ دیں اور قلعہ میں چلنے کی درخواست کی۔

۲۔ ان ہی جانبازوں کی مدد سے ابراہیم کو گولکنڈہ کا تخت نصیب ہوا۔

۱۔ ابراہیم کی تخت نشینی گولکنڈہ کی تاریخ کا بہت ہی مبارک دن تھا۔

۲۔ دیورکنڈے اور وجیانگر کے قیام نے اسے تلگو زبان اور تلگو ادب سے روشناس کرایا۔ ابراہیم نے نہ صرف تلگو سیکھی بلکہ اس پر اچھا خاصا عبور حاصل کیا۔

۱۔ تلگو ادب کے آسمان پر اس وقت جو تارے جھلملا رہے تھے وہ ابراہیم کی توجہ اور سرپرستی سے تابناک ہو گئے۔

۲۔ اسی دور میں مشہور تلگو شاعر گنگادھر نے تلنگانہ کی حسین فضاؤں میں اپنے نغمے بکھیرے۔ ابراہیم قطب شاہ کی سرپرستی میں اس نے تلگو ادب کی مشہور کتاب "تپتی سمورن باکھیانم" لکھی

۱۔ تلگو ادب اور آندھرا کلچر سے بادشاہ کی اس دلچسپی کو دیکھ کر قطب شاہی امراء نے بھی تلگو ادب کو نوازا۔

۲۔ پٹن چرو کے صوبہ دار امیر خاں کے دربار میں تلگو ادب کے ایک اور مشہور شاعر "ہنگر کنرتی تلنگا آریہ" کی قدر و منزلت ہوئی اور اس نے مشہور کتاب "یایاتی چرترا" اپنی یادگار چھوڑی۔

۱۔ ابراہیم قطب شاہ کے فیض سے جہاں علم و ادب سرشار ہوئے اس کی حسن نظر نے آندھرا دیس کے فطری مناظر کو حسین تر بنا دیا۔ پدوملی کا تالاب، ابراہیم باغ، باغ گلشن، ابراہیم پٹن اور حسین ساگر اس کی ذوق تعمیر کی یادگاریں ہیں۔

۲۔ اور سب سے بڑھ کر موسیٰ ندی کا پہلا پل ہے۔ دو محبت بھرے دلوں کی [illegible] جس کی تعمیر کا باعث ہوئی اور دو بچھڑے دلوں کو [illegible] کے لئے موسیٰ ندی کے کنارے ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے مل گئے۔

۱۔ ابراہیم کے بے [illegible] باپ نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد قلی کو [illegible] کی ساری

مصلحت پسندیوں کو قربان کر دیا۔

ا۔ شہزادہ قلی اور بھاگ متی کے فسانۂ عشق کی یہ اولین یادگار — پرانا پل — اپنی تعمیر کے لئے شہزادہ کے جذبِ عشق اور ابراہیم کی بے مثل بصیرت کا رہین منت ہے۔

ب۔ شہزادہ قلی اور بھاگ متی کی داستان عشق۔

(چار پانچ لڑکیوں کے قہقہے)

شہزادہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اخلاص خاں۔

اخلاص جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل۔ صاحب عالم

شہزادہ ہم تنہائی چاہتے ہیں۔ ان سے کہو کہ یہاں سے چلی جائیں۔ کہدو کہ یہ قہقہے ہمارا دل بہلانے کی بجائے ہمیں کچوکے دے رہے ہیں۔

اخلاص عرب، ایران، ارمینیا، ترکی اور گجرات کی یہ حسین دوشیزائیں جہاں پناہ نے یہاں اس لئے رکھی ہیں کہ شہزادہ کا دل بہلے — جہاں پناہ کا خیال ہے کہ صاحب عالم کا بھاگ متی سے لگاؤ جوانی کی ایک ترنگ ہے۔

شہزادہ جوانی کی ترنگ — جو آگ ہمارے جسم و جاں میں لگی ہوئی ہے اسے کون جان سکتا ہے۔ یہ کمزور بند اس طوفان کو نہ روک سکیں گے۔ اخلاص خاں۔ ہمارا جسم پھنکا جا رہا ہے۔

اخلاص ایک رقاصہ کی خاطر یہ بے چینی صاحب عالم

شہزادہ اخلاص خاں — تم ہمارے پرانے رفیق ہو۔ ہمارے غم کے شریک نہ بن سکو تو کچھ کہو نہ دو۔

اخلاص صاحب عالم — دنیا کی حسین سی حسین دوشیزہ آج شہزادہ کے نظر کرم کی منتظر ہے۔

شہزادہ پر اب ہمارے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ایک دل تھا سو وہ بھی نذر ہو گیا۔

اخلاص خدا کے لئے سوچئے صاحب عالم — جہاں پناہ کا خیال کیجئے۔ اس عظیم سلطنت کا خیال کیجئے جس کی عنان

ایک دن آپ کو سنبھالنی ہے۔

شہزادہ محبت کی اس راہ پر ہم اتنا آگے بڑھ چکے کہ لوٹنا ممکن نہیں۔ اب کوئی آہنی دیوار بھی سرِ راہ ہو تو ہم اس سے ٹکر لینے میں دریغ نہ کریں۔ محبت کی خاطر ہم بڑی سی بڑی قربانی دینے کا عزم کر چکے ہیں۔ آخر بار سن لو اخلاص خاں ہم سلطنت کو ٹھکرا سکتے ہیں مگر بھاگ متی کو نہیں۔

اخلاص صاحب عالم!

شہزادہ ہم جو عہد کر چکے اسے نبھانا ہمارا فرض ہے۔ چاہے اس میں جان کی بازی ہی کیوں نہ لگا دینی پڑے۔

اخلاص صاحب عالم!

شہزادہ (کھوئے ہوئے انداز میں) کسے خبر تھی کہ محبت کی ٹھنڈی چھاؤں ریگستان کی تپتی دھوپ بن جائیگی۔ کون جانتا تھا کہ سکھ اور شانتی کی چند گھڑیوں کے بعد مسلسل اضطراب ہمارے زندگی سے لپٹ جائے گا۔ محبت کی وہ مسرت آگیں اولین گھڑی آج بھی ہمارے تصور کے گوشے میں امانت کے طور پر محفوظ ہے۔

(پس منظر میں رقص)

جب کسی کے جھومتے اور لہراتے قدم اپنی فنکارانہ ضربوں سے ہمیں ایک نئی زندگی کی سوغات دے رہے تھے۔ (رقص نمایاں) — زندگی کے یہ عزیز ترین لمحے ہمیں اب بھی یاد ہیں۔ جب پہلی بار ہم نے اسے رقص کرتے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی رقص کر رہی ہے۔ کائنات رقص کر رہی ہے اور اس وقت ہمارے دل کا ہر تار لرز اٹھا اور اس مدبھری نغمگیت سے ایک نشہ سا چھا گیا۔ پھر جب یہ لمحے بیت گئے تو زمانہ نے ساری بیداریاں ہم پر صرف کر دیں۔ ہم اس محل

کی چار دیواری میں بند کر دیے گئے اور ہمارا دل ہلانے
کے یہ اُلو کے سامان کر گئے۔ خدا خدا
اخلاص۔ ہوش میں آئیے صاحب عالم
شہزادہ۔ خدا خدا یہ اضطراب، یہ مسلسل اضطراب کبھی کم بھی ہوگا۔
اخلاص۔ صاحب عالم
شہزادہ۔ یہ شمعیں گل کر دو اخلاص خاں۔ بجھا دو یہ شمعیں۔
یہ روشنی ہمارے خیالات کی راہ میں تاریکی بن کر لہرا
رہی ہے۔۔۔ اور تم۔۔۔ اور تم اب جا سکتے ہو۔۔۔
ہمیں بالکلیہ تخلیہ چاہیئے۔
(پس منظر میں طوفان اور بارش)
پہرہ دار۔۔۔ باہر یہ آوازیں کیسی ہیں۔
اخلاص۔ صاحب عالم۔۔۔ کئی گھنٹوں سے بارش اور طوفان
نے فضاؤں کو گھیر رکھا ہے اور سنا ہے موسیٰ ندی
میں بڑے زور کا سیلاب آیا ہے۔
شہزادہ۔ کیا کہہ رہے ہو اخلاص خاں۔۔۔ کہیں چلیم پر تو آفت
نہیں آئی۔ الٰہی کہیں۔۔۔ اخلاص خاں یہ شمع اٹھاؤ
اور جلد بالا خانہ پر چلو۔۔۔ جلدی کرو (تیز ساز)
۔۔۔ ارے چلیم کا تو کہیں پتہ ہی نہیں کوئی چراغ
تک نہیں ٹمٹا رہا ہے۔ اُف یہ بارش اور یہ طوفان
۔۔۔ اب کیا ہوگا اخلاص خاں۔۔۔ اگر بھاگ متی
کو کچھ ہو جائے تو ہم زندہ نہیں رہ سکیں گے۔۔۔
زندہ نہیں رہ سکیں گے۔۔۔ محبت ہمیں آزما رہی
ہے۔ لو ہم اس آزمائش میں کود پڑتے ہیں۔
اخلاص۔ صاحب عالم۔
شہزادہ۔ تم ہٹ جاؤ اخلاص خاں۔۔۔ ہماری اس سے بڑھ کر
کوئی آزمائش نہیں ہو سکتی۔۔۔ لو۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔
کسی کو خبر نہ ہو۔۔۔ کسی کو خبر نہ ہو۔
اخلاص۔ صاحب عالم۔۔۔ رک جائیے صاحب عالم۔۔۔
صاحب عالم۔۔۔

دو چار آوازیں ہیں۔۔۔ اس بارش اور طوفان میں کون
ہاتھی پہ چلا آ رہا ہے۔
۲۔۔۔ ارے شہزادہ محمد قلی۔۔۔ اور یہ گھوڑے پہ پیچھے کون ہے؟
۱۔۔۔ یہ تو اخلاص خاں ہیں۔
۲۔۔۔ ہاتھی تو ہوا کی طرح گذر گیا۔
(سب چیخ کر) حضور شہزادے شہزادہ عالم
سلحدار۔۔۔ کیا ہوا پہرہ دار۔
سب مل کر۔۔۔ شہزادہ محمد قلی ہاتھی پر سوار چلیم کی طرف ہوا کی
رفتار سے جا رہے ہیں۔
سلحدار۔۔۔ دوڑو گھوڑوں پر شہزادے کا تعاقب کرو۔
(گھوڑوں) کی ٹاپوں کی آواز)۔۔۔ جلدی کرو
کہیں شہزادہ سیلاب کی زد میں نہ آ جائے۔
اخلاص۔ صاحب عالم۔۔۔ صاحب عالم۔۔۔ خدا کے لئے
آگے نہ بڑھئے۔
شہزادہ۔ تم پھر پہنچ گئے اخلاص خاں۔۔۔ دیکھتے ہو موسیٰ ندی
کس بے رحمی سے امنڈ آئی ہے۔ ارے یہ ہاتھی
تو پانی میں کودتے جھجک رہا ہے۔
اخلاص۔ خدا کے لئے صاحب عالم۔۔۔ ہم پر رحم کیجئے۔
شہزادہ۔ کچھ کہنے کا یہ وقت نہیں ہے اخلاص خاں۔ لاؤ
مجھے اپنا گھوڑا دے دو۔ جلدی کرو۔ کہیں میں دیر
سے نہ پہنچوں۔۔۔ یہ گھوڑوں پر کون آ رہے ہیں۔
اخلاص۔ پہرہ دار حضور
شہزادہ۔ ان سے کہو کہ وہیں رک جائیں۔ میرا پیچھا نہ کریں۔
اخلاص۔ خدا کے لئے شہزادے۔۔۔ صاحب عالم۔
شہزادہ۔ (دور سے) تم لوگ جاؤ اخلاص خاں۔۔۔ ہم تو سیلاب
میں کود پڑے۔
اخلاص خاں اور پہرہ دار۔ صاحب عالم۔۔۔
صاحب عالم۔۔۔
(تیز ساز)

۱۔ اسی طرح شہزادہ محمد قلی جان کی بازی لگا کر بھاگ متی تک پہنچ گیا۔

۲۔ جب دوسرے دن یہ خبر ابراہیم قطب شاہ کو ملی تو اس نے شہزادے کے اس بے پناہ جذبہ کی قدر کرتے ہوئے موسی ندی پر پل کی تعمیر کا حکم دیا۔

۱۔ کچھ عرصے بعد شہزادے نے بالا حصار کی بلندیوں سے دیکھا کہ موسی ندی کے سینے پر اس کی محبت کا نقش ثبت ہو گیا ہے۔

۲۔ اس جذبۂ محبت نے نہ صرف پرانے پل کی تعمیر کی بلکہ شہر حیدرآباد کی تخلیق بھی اسی باعث ہوئی۔ (چارمینار، چار کمان، بادشاہی عاشور خانہ اور دار الشفا محمد قلی ہی کی یادگاریں ہیں۔)

۱۔ ابراہیم قطب شاہ کے بعد جب شہزادہ محمد قلی کے سر پر چتر شاہی رکھا گیا تو گولکنڈے کے گلی کوچے جشن مسرت کے ترانوں سے گونج اٹھے۔

۲۔ ابراہیم قطب شاہ نے گولکنڈہ کے چمن میں ملے جلے تمدن کے جو پھول کھلائے تھے وہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں مہک اٹھے اور ساری فضا میں ان کی خوشبو سے عطر بیز ہو گئیں۔

۱۔ ایران و تاتار کے لباس اب دکھنی رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔

۲۔ محمد قلی قطب شاہ نے اس رنگ کو اس درجہ چمکایا کہ وہ بالکل دکھنی معلوم ہونے لگا۔

۱۔ اس نے تاتاری لباس کی بجائے دکھنی لباس سے اپنے بدن کو زینت دی۔ سر پر سمور کی کلاہ کی بجائے دکنی وضع کی پیچ دار پگڑی، پوستین اور تاتاری قبا کے بدلے ململ کا جامہ اور شبنم کا نیمہ پہنا۔ ہاتھوں میں جڑاؤ کڑے ڈالے اور داڑھی منڈھائی جو بالکل تلنگانہ کی طرز تھی۔

۲۔ اور سب سے بڑھ کر محمد قلی نے اس زبان کو ترقی دی جو صدیوں کے میل جول سے دکن میں بن رہی تھی۔

۱۔ یہ دکنی زبان تھی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کی آئینہ دار تھی اور جو گولکنڈے کے تمدن میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

۲۔ محمد قلی نے نہ صرف اس زبان کی سرپرستی کی بلکہ فارسی کی بجائے دکنی کو اپنا لیا اور اس زبان میں شعر کے ایسے پیکر تراشے جن کا حسن اب تک ماند نہیں پڑ سکا۔

۱۔ اس نے دکنی میں پچاس ہزار شعر کہے اور فارسی اور تلگو میں بھی طبع آزمائی کی۔

۲۔ اس کی شاعری کا موضوع اس کی زندگی کی طرح رنگا رنگ رہا ہے اس کا تخیل سرزمین تلنگانہ کی طرح شاداب اور اس کا اسلوب سادہ، سلیس اور رنگین ہے اور جگہ جگہ اس نے اپنی شاعری میں تلگو کے لفظ استعمال کئے ہیں۔

۱۔ تلنگانہ کے ہرے بھرے کھیتوں، نظر فریب تالابوں اور حسین پہاڑیوں نے اس کی فکر کی آبیاری کی۔

۲۔ اس کی شاعری پر شکوہ محلوں میں بند نہ رہ سکی۔ وہ محل کے شان و شکوہ کو چھوڑ کر عوام کے ساتھ کھلے میدانوں میں نکل آتا ہے جہاں وہ عوام کے رنج اور غم اور خوشی اور مسرت میں ان کا ساتھی بن جاتا ہے۔

۱۔ اس کے یہاں عید دن، تہواروں، کھیل کود تماشوں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عام رسم و رواج پر بیسیوں نظمیں ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر اعظم کا دل عوام کے ساتھ دھڑکتا رہتا تھا اور اس نے عوام کی زندگی کو اپنی زندگی میں سمو لیا تھا۔

(پس منظر میں شور اور باجے)

۲۔ یہ اسی کا فیض نظر تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی اسی جوش اور عقیدت کے ساتھ محرم مناتے تھے اور دکن کی سرزمین پر اب بھی اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

۱۔ محمد قلی کی بصیرت نے یہ جان لیا تھا کہ یہاں ایک ملا جلا تمدن ہی زندہ اور پائندہ رہ سکتا ہے اور اس نے آج سے

ساڑھے تین سو سال پہلے اس تمدن کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔

۲۔ وہ عید اور بقرعید کے علاوہ نوروز، بسنت اور مرگ کی تقریبوں کے جشن بھی مناتا اور ان موقعوں پر وہ سب کے ساتھ مل کر خوشی کے نعرے لگاتا۔

۱۔ نوروز پر وہ کہتا ہے۔ "نورانی نوروز کے جلوؤں کے ساتھ آیا اور سارا چمن چاند کی طرح جگ مگ کر رہا ہے۔ چمن میں بلبلیں جگہ جگہ ایسی دکھائی دے رہی ہیں جیسے حسینوں کی آنکھوں میں تل۔

۲۔ پھولوں کے گچھوں میں کالے کالے بھونرے ایسے نظر آتے ہیں۔ جیسے کالی کوئلیں ہری ہری ڈالیوں میں اڑتی پھر رہی ہوں۔

۱۔ ایک بار عید اور نوروز مل کر آئے تو محمد قلی نے کہا۔

۲۔ نوروز اور یوم عید آپس میں بھائی بہن کا عیوض پکڑ کر ایک ہو گئے ہیں اور عید کی دُہری خوشیاں اپنے ساتھ لائے ہیں۔

۱۔ سخت گرمیوں کے بعد جب بارش شروع ہونے لگتی ہے۔ تو زندگی کی ناخوشگواری خوشگواری میں بدل جاتی ہے۔ محمد قلی نے بارش کے آغاز کو بڑی اہمیت دی کیونکہ دکن میں بارش کا موسم ہی بہار کا موسم ہے۔

۲۔ جس روز مرگ لگتا وہ بڑی دھوم دھام سے مجلس آرائی کرتا۔

۱۔ شاہی محلوں میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھائی جاتیں اور ہر طرف خوشی و مسرت کا اظہار کیا جاتا۔

۲۔ عوام بادشاہ کو اپنا شریک مسرت دیکھ کر پھولوں نہ سماتے۔

۱۔ محمد قلی کا جذبہ تخلیق اس جشن کی مسرت میں شعر کے نئے نئے پیکر تراشتا۔

۲۔ برسات کی آمد پر وہ کہتا ہے۔

۱۔ بارش کا موسم آیا اور کھیتوں کا راج شروع ہو گیا کیونکہ آج ہری ہری ڈالیوں کے سروں پر پھولوں کے تاج پہنائے جائیں گے۔

۲۔ زمین نے سر پہ جواہر کی پگڑی باندھ لی اور آنکھوں میں کانچ کے رنگ کا سرمہ لگا لیا۔

۱۔ ہرے بھرے جنگل دیکھ کر چاروں طرف سے مور کوک رہے ہیں۔

۲۔ ہرے جنگل میں لال لال پھول نہیں ہیں بلکہ زمرد کی لگنوں میں بشنبی تیل کی شمعیں جل رہی ہیں۔

۱۔ جب بسنت کا موسم آتا اور گولکنڈہ کے حسین سبزہ زاروں میں بسنتی پھول کھل اٹھتے تو محمد قلی کی زندگی بھی جھوم اٹھتی۔

۲۔ گولکنڈے کے وسیع میدان ایک پر کیف منظر میں بدل جاتے جہاں محمد قلی سب کے ساتھ جشن میں شرکت کرتا

— (لطیف قہقہے) —

۱۔ اور بسنت کے سواگت میں محمد قلی کے دھڑکتے دل کی آوازیں شعر کے روپ میں اس طرح گونج اٹھتیں۔

(کورس)

شاہ کے گھر میں سعادت کی خبر لایا بسنت
نین تیجی کے چمن میں پھول پھل لایا بسنت
سبز سارے نورتن کسوت کے ہیں رنگ رنگ
سرو کی مینا میں بھی شبنم کی مے بایا بسنت
سارے پھولوں کی 'بسنت کا پھول' مہمانی کیا
گل پیالہ بن کے خدمت کے لئے آیا بسنت
ہر کے رنگ میں بسنت کا رنگ جھلکتا نور سا
اور چندر کے حوض میں چندن سی ہکایا بسنت
موتی اور یاقوت کے گھر گھر میں انباراں لگے
ہر گدا کو مثل خاقاں کر کے دکھلایا بسنت
شکر ایزد کر معانی رات دن آنند سے
تیرے مندر میں خوشی آنند سے آیا بسنت

۱۔ قلعہ گولکنڈے کے پاس نئے قلعہ میں جو پر فضا تالاب اور وسیع مرغزار ہے وہاں اب بھی بسنت پر ایک میلہ

سانگا رہتا ہے۔
۲۔ اس طرح بسنت کے شیدائی محمد قلی کے جشن کی
یادگار اب بھی منائی جاتی ہے۔
ا۔ محمد قلی نے شادی بیاہ کی رسموں پر بھی کئی نظمیں لکھی
ہیں۔ مہندی، سانچق، جلوہ یہ سب اس کی شاعری
کا موضوع بنے ہیں۔
۲۔ جلوہ کی نظم تو اب بھی دکن میں شادیوں کے موقع پر
گائی جاتی ہے۔
ا۔ عوام کی زندگی میں گھل مل جانے کی یہ مثال تاریخ میں
شاید ہی کہیں مل سکے۔
ا۔ محمد قلی کا عہد گولکنڈہ کی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔
۲۔ جہاں میر مومن اور مرزا محمد امین جیسے صاحب کمال اور
صاحب تدبر اس کی دربار کی زینت بنے تو اسیر راؤ
اور دھرما راؤ جیسے دکھنی سورما اس کی سلطنت کی
ترقی کا سنگ بنیاد ثابت ہوئے۔
ا۔ میر مومن نے گولکنڈہ کی تمدنی قدروں میں اضافہ کیا
تو اسیر راؤ سلطنت کے استحکام اور ملک کے امن
اور امان کا باعث بنا۔
۲۔ کچھ یہی بات تھی کہ جب محمد قلی کے بعد اس کے بھتیجے
اور داماد محمد قطب شاہ نے عنان سلطنت سنبھالی تو
ملک میں ہر طرف خوش حالی اور امن امان کا دور دورہ تھا۔
ا۔ اور محمد قلی نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا تھا۔ محمد قطب شاہ
نے اسے سینے سے لگائے رکھا اور اس دور میں دکن کا
گوشہ گوشہ علم و ادب کی جوت سے جگمگا اٹھا۔ محمد قطب شاہ
کو تعمیری ذوق بھی ورثہ میں ملا تھا۔ مکہ مسجد اسی کی یادگار ہے
۲۔ گولکنڈہ میں تالاب نما کٹورا حوض کے کنارے جو اب
بھی عہد ماضی کی یادگار کے طور پر باقی ہے۔ شاعروں،
ادیبوں اور اشتاپ پرداز وں کے جمگھٹے رہتے اور حوض
کے آس پاس کے سبزہ زار علم و ادب کے چرچوں سے
گونج اٹھتے۔
ا۔ اس حوض کے کنارے ہر بڑے شاعر کا گروہ الگ الگ
اپنی محفل جماتا۔
۲۔ اس طرح کٹورا حوض کے گوشے کئی شعری حلقوں میں
بٹ گئے۔ کٹورا حوض کا مغربی حلقہ ملا وجہی کے نام
سے منسوب تھا۔
ا۔ وجہی محمد قلی کے دربار کا ملک الشعراء اور سب رس اور
قطب مشتری کا مصنف، دکھنی کا سب سے بلند پایہ شاعر ہے
۲۔ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں اس کا ستارہ عروج پر تھا
محمد قطب شاہ کے دور میں غواصی نے اس کی جگہ لے لی
اور کٹورا حوض کا جنوبی گروہ غواصی کے نام سے
منسوب تھا۔
ا۔ گو محمد قطب شاہ وجہی کی بڑی قدر کرتا تھا۔
۲۔ ان دو استاد شاعروں کے علاوہ طبعی، قطبی اور ابن نشاطی
گولکنڈہ کی محفل ادب کی زینت تھے۔
ا۔ محمد قطب شاہ کے ذوق شعر کے باعث ہر مہینہ بالاحصار
میں محفل شعر و سخن منعقد ہوتی جس میں بادشاہ خود شرکت
کرتا اور نہ صرف داد سخن سے نوازتا بلکہ خلعتوں سے بھی سرفراز
کرتا۔
۲۔ اس محفل شعر میں عرش آشیانی محمد قلی قطب شاہ کا کلام
بھی پڑھا جاتا۔
(پس منظر میں مجمع کا شور)
ا۔ سب شاعر اور درباری امراء اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے
ہیں۔ ملا وجہی دیر سے پہنچے۔ انھیں سامنے کی نشست پر
جگہ نہ مل سکی۔ یوں بھی دربار کے ملک الشعراء ملا غواصی
سے ان کی چشمک ہے۔
۲۔ لیجئے بادشاہ کی آمد آمد کا اعلان ہو رہا ہے۔ سب
حاضرین کھڑے ہو گئے۔
چوبدار ۔۔ جہاں پناہ، شاہ دوران، سلطان اقلیم سخن،

سلطان محمد قطب شاہ۔

سلطان۔ ملا غواصی

غواصی۔ جہاں پناہ ۔ سب شاعر حاضر ہیں اجازت ہو تو۔

سلطان۔ ملا وجہی نظر نہیں آتے ۔

وجہی ۔ بندہ حاضر ہے جہاں پناہ ۔

سلطان ۔ آپ ادھر یہاں آ بیٹھیے ۔ اتنی دور کیوں بیٹھے ہیں آپ ۔

وجہی ۔ بندہ نوازی ۔

سلطان ۔ ہاں ملا غواصی مشاعرہ شروع ہو ۔ یہ حضرت عرش آشیانی کا کلام پڑھنے کی سعادت کون حاصل کرے گا ۔

غواصی ۔ حضرت اجازت ہو تو بندہ ـــ

سلطان ۔ نہیں بیاض ملا وجہی کو دی جائے ۔ اس کا حق انھیں کو پہنچتا ہے ۔

وجہی ۔ بندہ اس سرفرازی پر نازاں ہے ۔

غواصی ۔ حضرت اجازت ہو تو گولکنڈہ کے نوجوان شاعر طبعی اپنا کلام عرض کریں ۔

سلطان ۔ اجازت ہے ۔

طبعی ـــ ہوا مجنوں برہ سے سد حد گنوا ہیں

انخا دانا سو دیوانا ہوا ہیں

تجھے دل میں چھپایا ہوں الیس کے

خرابے میں لگایا ہوں دیوا ہیں

اچایا ہوں تیرے غم کے پہاڑاں

عجب ہے نین سینا پھٹکر سو آ ہیں

صنم تیرے بدل ہو کر برہمن

گلے میں اپنے بجایا جنیوا میں

منجے کیا دیکھتی ار ناں گل اندام

پرانا ہوں نہیں عاشق نوا ہیں

غواصی ۔ اب ایک اور نوخیز شاعر ابن نشاطی اپنا کلام پیش کریں گے ۔ انھوں نے مجرد سے دو ڈرہ نفظوں

میں سو کر غم عشق کا ایک دلگداز منظر کھینچا ہے ۔ عرض کرتے ہیں ۔

ابن نشاطی ۔ لگے چشمہ ہو کر نیناں ابلنے

لگیا جیون شمع ہو کر جیو جلنے

دھواں آہاں کا سر پر ہوئے ل چھائے

گرم بھاپاں سوں چھاتاں پر چھالے آئے

گلی سنے ہوا دل تنگ و ناشاد

ہوا ٹکڑے گریباں پھول کی باد

برہ کی آگ سوں دل جل ہوا راک

صبوری کا جو تھا دامن ہوا چاک

غواصی ۔ اجازت ہو تو اب فدوی کچھ عرض کرے ۔

سلطان ۔ اجازت ہے ۔

غواصی ۔ عرض کرتا ہے، جہاں پناہ ۔

(یہ شعر تحت اللفظ پڑھے جائیں)

ہوئے جمع جنگی ہزبران تمام

قوی اور خونخوار ایران تمام

یک یک جان ایک کوہ یا برج جیوں

لے ہاتاں میں تیغے پھرے گرز جیوں

غضب ناک ہو جیوں انگے دل ہوئے

کلیجے پہاڑاں کے پھوٹ جل ہوئے

ادھیا غل جدھر کا ادھر مار مار

قیامت زمیں پر ہوا آشکار

جھلک دیکھ بجلیاں سی تروار کی

اڑی فاختی سخت سنسار کی

سٹے دھرت پو یوں منڈیاں کاٹ کاٹ

سو کس کوں سمجھتا نہ تھا باٹ گھاٹ

جو دریا لہو کا ابلنے لگیا

گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا

سلطان ۔ "گگن اس پو کشتی ہو چلنے لگیا" اچھا کہا ہے

گیوں ملا وجہی۔

وجہی۔ جہاں پناہ نے بجا ارشاد فرمایا۔ اجازت ہو تو بندہ بھی کچھ عرض کرے۔

سلطان۔ ضرور ضرور۔

وجہی۔ طاقت نہیں دوری کی اب توں بیگی آمل رے پیا
تج بن منجے جینا بہت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کیتی ہوں میں پانی انجھو پیتی ہوں میں
تجھ بے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا
ہردم توں یاد آتا منجے اب عیش نیں بھاتا منجے
برہا یوں ستاتا منجے تج باج تل تل رے رے پیا
تو جیو میرا میں سو دل کے سات رہتا کیوں نہ تل
دن رات میں ہیں ایک تل نیں تجھ سے غافل رے پیا

سلطان۔ واہ واہ لفظ لفظ میں درد بھر دیا۔ "تجھ سے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل رے پیا" کیا خوب کہا ہے۔

وجہی۔ جہاں پناہ کی سرفرازی ہے۔

غواصی۔ اب حاضرین جہاں پناہ کا کلام سننے کی عزت اور فدوی پڑھنے کی سعادت حاصل کرے گا۔

آوازیں۔ ارشاد ارشاد

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا
کہ اس بن نین ہیں یک تل قرارا
صبوری کو نہیں ہے ٹھار دل میں
صبوری کیوں کرے ہو کر تمہارا
میا کرنا کرے معشوق ایسے ہو
کہو نا کیا کرے عاشق بچارا
بسنت کھیلے ہیں اور ساجنا یوں
کہ آسماں رنگ شفق پایا ہے سارا

وجہی۔ جہاں پناہ نے دل کی دھڑکنوں کو ایسا حسین جامہ پہنایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

سلطان۔ آج کی محفل سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ سب شاعروں کو ہماری طرف سے خلعت عطا ہوں۔
اب ہم حضرت عرش آشیانی کا کلام سننے کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حاضرین باادب ہو جائیں۔

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج یک تل جیا جائے نا
کہے تھے پیا بن صبوری کروں
کہیا جائے اما کیا جائے نا
نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے
کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا
قطب شہ نہ دے مجھ دوانے کو پند
دوانے کو کچھ پند دیا جائے نا

۱۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلام کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

۲۔ گولکنڈہ کی ان محفلوں نے جن شاعروں کو جنم دیا وہ زمانے کو بہت کچھ دے کر رخصت ہوئے۔

۱۔ محمد قلی قطب شاہ کی ہمہ گیر شعری صلاحیتیں اپنی تمام رنگا رنگیوں کے ساتھ اب بھی اس کے دیوان میں محفوظ ہیں۔

۲۔ وجہی کی سب رس اور قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، ابن نشاطی کی پھول بن اور طبعی کی بہرام و گل اندام اب بھی دکھنی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

۱۔ گولکنڈہ نے شاعروں اور ادیبوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔

۲۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جب بیجاپور سے گولکنڈہ کا قدیم نمک خوار ملک خوشنود سفیر بن کر آیا تو گولکنڈہ نے ملا غواصی کو سفیر بنا کر بیجاپور بھیجا گیا۔

۱۔ محمد قطب شاہ کے بعد عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں جہاں علم و فن کی سرپرستی ہوئی۔ یہ دور گولکنڈہ کی

تاریخ کا اختتامی باب بھی ثابت ہوا۔

۲۔ احمد نگر اور بیجاپور کے بعد اب مغل حکمراں گولکنڈے کو اپنانے کی فکر میں تھے۔

۱۔ اس دور میں حیات بخشی بیگم کی شخصیت گولکنڈہ کی تمدنی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔

۲۔ یہ خاتون محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی، محمد قطب شاہ کی بیوی اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں تھی۔

۱۔ حیات آباد اور پانچویں محرم کا لنگر اب بھی اس کی یادگار کے طور پر باقی ہیں۔

۲۔ پانچویں محرم کا لنگر حیدرآباد کے گاؤں گاؤں میں اب تک منایا جاتا تھا۔

۱۔ ایک مست ہاتھی جس پر عبداللہ قطب شاہ سوار تھا جنگلوں میں بھاگ نکلا اور کئی دن تک عبداللہ قطب شاہ کی کوئی خبر نہ ملی تو حیات بخشی بیگم نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں منت مانی۔

۲۔ (خاتون) اے امام شہید مظلوم، آپ کی اس لونڈی
کے جگر کا ٹکڑا اگر خیر و خوبی سے لوٹ آئے
تو دولت خانہ شاہی میں داخل ہونے سے
پہلے چالیس من سونے کی زنجیر بنواؤں گی
اور مست ہاتھی کے پاؤں میں لنگر کر کے آپکے
غلام سلطان عبداللہ کی کمر میں باندھ کر قلعہ
گولکنڈہ سے حسینی علم تک پا پیادہ لے جاؤں گی۔

۱۔ عبداللہ قطب شاہ جب صحیح سلامت لوٹ آیا تو حیات بخشی بیگم نے یہ منت پوری کی۔

۲۔ حیدرآباد میں یہ لنگر صدیوں تک جاری رہا۔ عوام بھی ہر سال محرم میں یہ لنگر مناتے رہے۔

۱۔ عبداللہ قطب شاہ شاعری کے علاوہ فن موسیقی کا بھی دلدادہ تھا۔

۲۔ اس کے دربار میں لاہور، آگرہ، بیجاپور اور احمد نگر سے اہل کمال اور موسیقار آتے اور اپنے کمال فن کی داد پاتے۔

۱۔ قلعہ کے باہر پیاماتی بیٹھ اب بھی عبداللہ [illegible] ذوق سرود کی یاد دلاتا ہے۔

۲۔ جب وہ امور سلطنت سے تھک جاتا تو رقص و سرود کی محفلیں منعقد کرتا۔

۱۔ پیاماتی بیٹھ کے محل کی تعمیر اس طرح ہوئی [illegible] مدھر سنگیت کی آوازیں بالا حصار میں سنی جا[illegible]

۲۔ کبھی عبداللہ قطب شاہ پیاماتی بیٹھ نہ جا[illegible] کی بلندیوں سے پیاماتی بیٹھ کے مطربوں کے [illegible]

۱۔ رات کے پچھلے پہر جب گولکنڈہ کے عظیم ا[illegible] خاموشیوں میں ڈوب جاتے تو فن موسیقی کا [illegible] قطب شاہ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ر[illegible] جمع کر دیتا اور پھر پیاماتی بیٹھ کے محل [illegible] کانوں میں گونج اٹھتے۔

۲۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں مغل [illegible] کی دیواروں تک چڑھ آئے اور اسے [illegible]

۱۔ گولکنڈہ کے آخری بادشاہ ابوالحسن تانا[illegible] ہی ہنگاموں سے گھرا رہا۔

۲۔ تانا شاہ کے عہد میں تلنگانہ کے امیروں [illegible] عہدے ملے۔ تانا شاہ تلنگانہ ہی کی سرزمی[illegible] اور فطری طور پر اسے اس ماحول سے [illegible]

۱۔ ابوالحسن کے دور میں مادنا اور اکنا [illegible] پر چھائے رہے۔

۲۔ اور ان دونوں وفاداروں نے آخر تک [illegible] دیا اور اس کی خاطر اپنی جان کی بھی [illegible]

۱۔ آخر ۱۶۸۶ء میں مغل حملہ آور سیلاب [illegible] کی دیواروں سے ٹکرا گئے۔

۲۔ مگر یہ دیواریں اتنی مضبوط ثابت [illegible] آٹھ مہینے تک محاصرہ کرنا پڑا۔ [illegible]

اس کے جانبازوں کے عزم و ہمت میں ذرا سی لغزش ہوئی۔
۱۔ اس محاصرہ سے تنگ آکر مغلوں نے گولکنڈے کے ایک سپہ سالار سے ساز باز کر لی اور اس نے رات کے پچھلے پہر مغل فوجوں کو ایک چور دروازہ کی راہ قلعہ میں داخل کر لیا۔
۲۔ مگر ابوالحسن کے جانثار اس پر بھی تلواریں سونت کر سامنے آگئے۔ ابوالحسن کے باہمت سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے تو شجاعت اور وفا داری کی مثال قائم کر دی
۱۔ وہ چند جانبازوں کے ساتھ اس مغل سیلاب میں کود پڑا جو قلعہ کی سمت بڑھا آرہا تھا۔
۲۔ اس کی اس بہادری اور وفاداری کو زمانہ آج تک سرا[ہتا ہے]
۱۔ گولکنڈہ پر پوری طرح مغلوں کا قبضہ ہو گیا مگر مغل شہن[شاہ] یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر گولکنڈہ میں عبدالرزاق لار[ی] سا ایک اور سپہ سالار ہوتا تو شاید گولکنڈہ کبھی فتح نہ ہوتا۔
۲۔ تقریباً دو سو سال تک ایک ملے جلے تمدن کو پروان چڑ[ھا کر] گولکنڈہ کی حکومت ختم ہو گئی۔
۱۔ مگر اس نے جو تمدنی ورثہ چھوڑا ہے وہ اب بھی دکن [کا] سرمایۂ امتیاز ہے۔
۲۔ اور آنے والی نسلیں اس ورثہ کو اپنے سینوں سے لگائے رکھ[یں گی]

# کوئی کہہ دے

از:- جناب قمرالدین اپل صاحب

میں چک کے پیچھے کھڑی ہوں۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ نہ جانے آج میرا دل کیوں چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہے۔ آج میری بہن نعیمہ کی لاش صحن میں ایک چارپائی پر پڑی ہے۔ ایک سفید کفن میں لپٹی ہوئی۔ ایسا معلوم دیتا ہے۔ جیسے آج کی رات وہ ایک پرسکون نیند سوئے گی۔ اسے کہانی نہیں سنائے گی۔ ہم تین بہنیں تھیں۔ آج میں اکیلی ہوں۔ میری دو بہنیں میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ دونوں مجھ سے بڑی تھیں۔ شکیلہ بڑی کا نام تھا۔ یہ لاش نعیمہ کی ہے۔ آج یہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیگی۔ میری لاش بھی شاید کسی دن اسی جگہ ایک کفن میں لپٹی پڑی ہوگی۔ میری ماں شاید اس وقت تک جیتی رہے۔ وہ بہت بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت کمزور ہوگئی ہیں۔ وہ روٹی لاکر کھاتی ہے۔ میری دو بہنیں اس کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان دونوں نے مجھے کبھی روٹی اور چرخے کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ پر اب میں اپنی ماں کی مدد کیا کروں گی۔ میرے دو بھائی اختر اور نجیب ماں کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انور صحن میں ہے۔ صحن میں عورتیں اکٹھی ہو رہی ہیں۔ میری پھوپھیاں نعیمہ کا چہرہ ننگا کرکے دیکھنے والوں کو دکھا رہی ہیں۔ نعیمہ کے سر سے ابھی تک خون رس رہا ہے۔ عورتوں کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ میری ماں ہوش میں آگئی۔ اس نے میرا نام لے کر بڑبڑانا شروع کر دیا ہے۔ میرے بھائی نے میرا نام لے کر پکارا "اے عذرا! ادھر آؤ"

میری ماں مجھ سے چمٹ گئی۔ وہ کہہ رہی ہے۔ "عذرا میری بیٹی۔ تم کیوں رو رہی ہو۔ نہ رو میری بیٹی"

اس کی آنکھیں خشک ہیں۔ پھر وہ اٹھ کر نعیمہ کی لاش کی طرف بھاگی۔

"ماں کیوں پاگل ہوگئی ہو۔ صبر کرو" میرے ایک بھائی نے کہا۔

وہ لاش سے چمٹ گئی اور چیخنے لگی "میری نعیمہ! تو ہم سے آج جدا ہو رہی ہے۔ تو ہمیں اپنی شکل پھر کبھی نہ دکھائے گی۔ میری شکیلہ بھی مجھے چھوڑ گئی"

عورتوں کے رونے کی آواز اونچی ہونے لگی ہے۔ میرا دل چیخ چیخ کر رونا چاہتا ہے۔ پر مجھے ڈر لگتا ہے کہیں میرے بھائی مجھے برا بھلا نہ کہیں۔ میری ماں کا سفید سر کھلا ہے میری بھاوجیں ایک طرف بیٹھی اس کے سر کو گھور رہی ہیں۔ وہ کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتی ہیں۔ میری پھوپھیاں جلی کے میرے پاس آگئیں اور مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ "نہ رو بیٹی، صبر کرو۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم اپنے بھائیوں کی اب اکیلی بہن ہو خدا تمہیں سلامت رکھے"

مجھے کچھ یاد ہے۔ کچھ اسی قسم کے الفاظ نعیمہ کو میری سب سے بڑی بہن شکیلہ کے مرنے پر کہے گئے تھے۔ نعیمہ سلامت نہ رہی۔ اس کی لاش صحن میں پڑی ہے۔ اب میری باری ہوگی۔ پر مجھے تو موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ ..

اس کی لاش کے اوپر پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ مولوی صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔ نیچے گلی میں میرے دو ماموں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں اور میرے بھائی ایک طرف خاموشی سے بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب آ گئے۔ میرے ماموں اور بھائی مکان میں داخل ہو رہے ہیں۔ میری ماں ان کا راستہ روک رہی ہے اور کہہ رہی ہے ۔ "ٹھہرو۔ خدا کے لئے تھوڑی دیر ٹھہرو۔ وہ ہمیشہ کے لئے چلی جائے گی اور میں کبھی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکوں گی۔"

میری ماں چیخ رہی ہے اور چند عورتیں کہہ رہی ہیں "بہن حوصلے سے کام لو۔ صبر کرو۔ خدا کی یہی مرضی تھی۔"

لاش اٹھ رہی ہے۔ میرے بھائی اور ماموں اسے اٹھائے مکان سے باہر لے جا رہے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے گی۔ میری ٹانگیں لرز رہی ہیں۔ مجھ سے کھڑا نہیں رہا جاتا۔ میری بہن مجھ سے جدا ہو رہی ہے میں اکیلی ہوں۔ عورتیں چیخ رہی ہیں۔ بچے چلا رہے ہیں اور کلمہ شہادت کی آواز بلند ہوئی۔ میں کھڑکی میں بیٹھی رو رہی ہوں۔ مجھ سے میری بہن کو لے گئے۔ میری ماں بے ہوش پڑی ہے۔

اب خاموشی ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی ہیں۔ میری بھاوجیں اپنے اپنے کمروں میں بیٹھی ہیں۔ میری ماں سسکیاں بھر رہی ہے اور میں اس کے پاس بیٹھی خاموش رو رہی ہوں۔ ایک کونے میں سوت کے دو گچھے پڑے ہیں اور دو چرخے دیوار سے لٹک رہے ہیں۔ میرے بھائی واپس آ گئے۔ میرے ماموں نہیں آئے۔ وہ دوکاندار اور کاروباری آدمی ہیں۔ میرے بھائی مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ "عذرا صبر کرو۔ تم بچی نہیں ہو۔ اس طرح نہیں رونا چاہئے مرنے والے کو تکلیف ہوتی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ اپنے کمروں کو چل دیئے۔ میری ماں ایک چارپائی پر پڑی ہے آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہی ہے۔ یہ پنکھا شکیلہ کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔ نعیمہ مجھ سے اکثر کہا کرتی تھی۔ "شکیلہ بہت خوبصورت تھی" نعیمہ کہتی "جس وقت وہ مری، اس وقت اس کی عمر (۳۰) سال کے قریب تھی۔ وہ تم سے بہت ملتی جلتی تھی۔ اس کے بال تمہاری طرح سنہرے تھے اور رنگ بہت ہی سفید تھا۔ اکثر لڑکیاں اس کو دیکھ کر جلا کرتی تھیں۔ وہ اونچے قد کی تھی۔ اس کی چال میں بہت تیزی تھی۔ وہ ہر کام بہت جلدی جلدی کر لیتی تھی۔ میں جب پوچھتی تو کہتی جب تک میں کام کو ختم نہ کر لوں مجھے چین نہیں آتا وہ ماں کے ساتھ سوت کاتا کرتی تھی جس طرح میں کاتتی ہوں۔ اس کے لئے اکثر رشتے آتے رہے۔ مگر چار سے بھائی انھیں رد کرتے رہے۔ وہ اس وقت بمشکل تمام گھر کا خرچ چلایا کرتے تھے۔ انور بیکار تھا۔ انھیں شکیلہ کی شادی کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی بہن کو خالی گھر سے نکالنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر لوگوں نے آہستہ آہستہ رشتے کے لئے آنا ترک کر دیا۔ شکیلہ ماں کے ساتھ دن رات ایک کرنے لگی اور سوت کاتتے لگی۔ اس نے دو سال میں تین سو روپے اکٹھا کیا۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اختر کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے۔ وہ جوا کھیلتا ہے اور لوگوں سے قرضہ لیتا ہے۔ اس نے سونے کی زنجیر جو گلے میں ڈالی ہوئی ہے وہ جوئے میں جیتی ہوئی ہے۔ اس زنجیر سے اسے بہت محبت ہے۔ اسے اپنے گلے سے کبھی علیحدہ نہیں کرتا۔ ماں نے دو ایک بار اسے کہا کہ زنجیر توڑ وا کر مجھے انگوٹھی بنوا دو۔ مگر وہ نہ مانا۔ تو اختر کو پولیس والے پکڑ کر لے گئے۔ ماں اپنے بھائی کے پاس گئی اور چھڑوانے کے لئے کہا تو اس نے کہا کہ اس کا قرضہ کون دے۔ ماں واپس آ گئی۔ شکیلہ نے یہ سب سنا اور دیکھا۔ ماں کی ممتا اور بھائی کی محبت نے جوش مارا۔ شکیلہ نے وہ تین سو روپیہ اپنے بھائی کے قرضوں میں صرف کر دیا وہ اس رات بہت روئی۔ ماں اسے دلاسا دیتی رہی اور میں بھی اسے کہتی رہی کہ بہن رونے کی کیا ضرورت ہے اور روپیہ جمع ہو جائیگا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ سوت کاتنے سے اس کی بچی ہوئی خواہش پوری نہ ہو گی۔۔ اس کے بعد جوں جوں

وقت گزرتا گیا اس کی سفید رنگت پیلاہٹ میں بدلنے لگی۔ مگر وہ ماں کے ساتھ سوت کاتتی رہی اور میں مدد کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے بخار آنے لگا اور کھانسی نے اس پر شدید حملے شروع کر دئیے۔ اس کی صحت گرنے لگی اور اس کے آنکھوں کے گرد سیاہی پھیلنے لگی۔ مگر اس کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ آیا۔ صرف ایک فرق تھا کہ وہ اب پہلے کی طرح خوش طبیعت نہ رہی تھی۔ افسردہ خاطر رہنے لگی تھی اور اپنے بھائیوں سے کھل کر بات نہ کرتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اس کی راتوں کی نیند اڑ گئی اور بخار اسے دائمی رہنے لگا۔ شروع شروع میں اختر اور دوسرے بھائی انور اور جمیل اس کے معالجے کی طرف رجوع ہوئے مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ پھر انھوں نے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قطعاً لاپرواہی اختیار کر لی۔ میں ماں کے ساتھ سوت کاتنے لگی اور جو پیسے بھی ہم کماتیں وہ اس بیچاری کے دوا دارو پر خرچ ہو جاتا۔ ماں روتی اور میں شکیلہ کی خاطر داری اور خدمت کرنے میں کوئی کوتاہی نہ برتی۔ مگر اس کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس کی آنکھیں ڈوبتی گئیں۔ ہمسائے اور قریبی اس کی عیادت کو آنے لگے۔ اور میں اکثر گھبرا کر انور اور جمیل کو کہتی کہ "کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ" وہ کہتے "آج دوا ضرور لائیں گے"۔ مگر جب شام کو گھر آتے تو بھول جاتے۔ ماں کی بندھی ہوئی آس ٹوٹ جاتی۔ اختر کہیں چلا گیا اور ایک مہینہ گھر نہ آیا۔ شکیلہ مجھ سے پوچھتی کہ اختر کہاں ہے۔ میں کیا جواب دیتی۔

اسی طرح وقت گزرتا گیا۔ ہمارے یہ مشکل دن ہم پر پہاڑ ہو گئے۔ مجھے اکثر سر درد رہنے لگی تھی۔ ماں مجھے زیادہ مشقت سے روکتی اور خود آدھی آدھی رات تک چرخہ کاتتی مگر شکیلہ کی حالت مجھ سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ اسے دوا چاہیے تھی۔

ایک مہینے کے بعد ایک رات اختر واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ماں سے پوچھا تو کہنے لگا "تمہاری بہو ہے ماں"۔ ماں اسے خاموشی سے گھورتی رہی۔ وہ شکیلہ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا "کیا حال ہے بہن"؟

وہ بولی "اچھی ہوں"

شکیلہ نے اختر کو کہا کہ "وہ اس کی بیوی کو دیکھنا چاہتی ہے"۔

"مجھے دیکھ لینا شکیلہ" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا "وہ تھکی ہوئی ہو گی"۔

"تو عذرا میری بہن" نعیمہ کہتی "اس رات ایک نحوست اس گھر پر چھائی ہوئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ گلی میں سے چوکیدار کے پکارنے کی آواز کبھی کبھی آتی اور کبھی کبھا کہیں دور سے کتوں کو بھونکنے کی آواز اس گہری خاموشی میں سنسناہٹ پیدا کر دیتی تھی۔ میں شکیلہ کے پاس بیٹھی تھی اور ماں نماز پڑھ رہی تھی۔ یکدم شکیلہ نے کھانسنا شروع کر دیا۔ اس کی کھانسی کی شدت نے اس کے سانس میں رکاوٹ ڈالی اور وہ بستر پر لوٹنے لگی۔ اس کی کمزور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور ان میں ایک بے رحمی کی جھلک تھی۔ اس کے خوبصورت سنہرے بال اس کے پیلے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ چارپائی پر تڑپ رہی تھی۔ بالآخر اس کا تنفس تھوڑی دیر کے لئے ٹھیک ہوا۔ ماں نماز چھوڑ کر چارپائی کے قریب آگئی اور رونے لگی۔ تینوں بھائی سو رہے تھے۔ شکیلہ کی کھانسی ان کی نیند میں مخل نہیں ہوتی تھی۔ وہ کھانسنے کی آواز کے عادی ہو چکے تھے۔

اس نے پھر کھانسنا شروع کیا۔ مجھے ایسا معلوم دیتا تھا جیسے اس کے جسم میں ہڈیاں کھنک رہی ہیں۔ ماں نے گھبرا کر روتے ہوئے کہا "نعیمہ اختر کو آواز دو۔ جاؤ شکیلہ کی حالت خراب ہے۔ ان سب کو جگا دو"۔

شکیلہ نے رکتے ہوئے کہا "ماں انھیں تنگ نہ کرو وہ تھکے ہوئے ہوں گے۔ عذرا کہاں ہے۔ تم سو گئی ہوئی تھیں۔ عذرا اس وقت تمہیں جگایا نہیں گیا۔

کھانستے ہوئے اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ ...

ساکت پڑی تھی۔ اس کے تنفس میں تیزی تھی۔ اس نے اپنی زبان کو چبا ڈالا تھا۔ وہ مر گئی۔

ماں پنکھا جھل رہی ہے۔ شکیلہ کا پنکھا۔ جسے مرے ہوئے (۱۵) سال ہو گئے۔ آج نعیمہ جو مجھے شکیلہ کی باتیں سنایا کرتی تھی قبر کی تاریکی میں کھو گئی۔ میری دو بہنیں مجھ سے چھن گئیں میرے بھائی اپنے اپنے کمروں میں ہیں۔ میری ماں اٹھی اور نعیمہ کا صندوق اٹھا لائی۔ وہ رو رہی ہے۔ وہ نعیمہ کے سِلائے ہوئے کپڑوں کو دیکھ رہی ہے۔ ریشمی جوڑے۔ یہ کپڑے اس نے بنائے تھے۔ یہ پھول اس نے کاڑھے تھے۔ وہ رو رہی تھی اور سسکیاں بھر رہی تھی۔

میں مرنا نہیں چاہتی۔ ایسی کرب ناک موت۔ نعیمہ میری بہن مر گئی۔

نعیمہ کے سر میں درد بڑھنے لگا اور اختر جوا کھیلتا رہا انور اور جمیل اپنی دلچسپیوں میں مشغول رہے۔ نعیمہ اور میں ماں کے ساتھ سوت کاتنے لگیں۔ پھر ایک دن آیا۔ جب جمیل کی شادی ہوئی۔ کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ لڑکی والوں نے اپنی لڑکی کو کچھ نہیں دیا۔ صرف نکاح پر اکتفا کیا گیا۔ نعیمہ اور میں نے اپنی پس انداز جو تقریباً ایک سو روپیہ تھی اپنے بھائی کی شادی کے موقع پر کھانے پر صرف کر دی۔ وہ کہنے لگا "نعیمہ تھوڑے دن ٹھہر جاؤ میں تمہارے لئے دولت ہی دولت اکٹھی کر لوں گا۔ ہم دونوں بہنیں جمیل بھائی کے ان ہمدردانہ اور محبت بھرے الفاظ کو سن کر خوشی سے رو پڑیں۔

نعیمہ کے لئے رشتے آنے لگے۔ ماں کہتی رہی کہ "نعیمہ کی نسبت کر دی جائے۔" بھائی کہتے "یہ لڑکا اچھا نہیں۔ یہ لڑکا کوئی ہنر نہیں جانتا۔ یہ بدصورت اور بھونڈا ہے۔ یہ عمر رسیدہ ہے"

اور اسی طرح شکیلہ پر گزری ہوئی واردات نعیمہ پر دہرائی جانے لگی۔ شروع شروع میں نعیمہ نے بالکل خیال نہیں کیا۔ پھر دن بھر کی مشقت کے بعد اپنے بھائی جو ان کے پاس آ بیٹھتیں اور دیا

اپنا وقت ہنس ہنس کر گزارنے کی کوشش کرتیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ رات زیادہ ہو گئی تو بھاوجوں نے کہنا شروع کر دیا کہ اب تمہارے بھائی آتے ہی ہوں گے۔ انھیں آرام کرنا ہو گا۔ اب تم جا کر سو جاؤ۔ ان کی آنکھوں میں ایک تلخ حقیقت چھپی ہوتی تھی۔ جو چھپائے نہ چھپتی تھی۔

نعیمہ کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا۔ اس کی خوشی اور ہنسی مزاح میں آہستہ آہستہ کمی آنی شروع ہو گئی۔ جمیل رنڈی کے مکان پر گانا سنتا رہا۔ وہ اکثر وہاں جاتا ہے۔ ضرورت پڑے تو قرض بھی لیتا ہے۔ ماں سمجھاتی ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے "ماں دن بھر کی تھکن کے بعد اگر کبھی کبھی تفریح ہو جائے تو کیا بری بات ہے۔ گانا سننا برا نہیں اور پھر ماں۔ میں وہاں پیسے تو خرچ نہیں کرتا۔ میرے دوست کرتے ہیں۔"

ماں نے رو رو کر اپنی آنکھیں کمزور کر لیں۔ اس کی کمر جھک گئی ہے۔ وہ تھوڑی دور چل کر ستانے کے لئے ٹھہر جاتی ہے۔ نعیمہ چرخے کی اداس آواز میں آہستہ آہستہ کھانسنے لگی۔ میں نعیمہ کو کہتی کہ بہن تم سوت نہ کاتا کرو۔ تمہیں آرام چاہیئے۔

"نہیں" وہ کہتی "ہماری ماں میں سکت نہیں رہی۔ وہ اکیلی ہمارا بوجھ نہیں اٹھا سکتی نا۔ اس کی اداسی اور افسردگی دیکھ کر میرا جی پھٹ جاتا تھا۔

پھر ایک دن وہ پورے جوش اور ولولے کے ساتھ زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں میں دوڑنے کے لئے تیار ہو گئی وہ میرے پاس آئی اور بولی "عذرا۔ آج سے ہم دوگنا کام کیا کریں گی۔ تم میرا ہاتھ بٹاؤ گی۔ بتاؤ۔ وعدہ کرو۔"

میں نے اسے "ہاں" کہی اور پھر چرخہ پورے زور سے چلنے لگا۔ روئی سوت میں تبدیل ہونے لگی۔ دن رات ایک کیا جانے لگا اور دو سال متواتر سوت بنتا رہا۔ اختر اور جمیل کے ایک ایک بچہ بھی ہو گیا۔ راتوں کو ہماری آنکھیں تھک کر بند ہونے لگیں اور کمروں میں ہلکا ہلکا درد۔ جب بھی

رات کو میری آنکھ کھلتی تو نعیمہ سوتے میں بڑبڑا رہی ہوتی اور پھر کھانسنا شروع کر دیتی۔ میں دعائیں مانگتی۔ اے اللہ اس کی کھانسی کو دور کر دے مگر دعائیں بیکار تھیں۔ نعیمہ گاہ میں آنے والے بزاز سے کپڑ خریدتی اور ان کو اچھے اچھے لباس میں تبدیل کر دیتی۔ اپنی خوشی کو آنکھوں میں چھپائے وہ پھول کاڑھتی اور میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ سوت کی کمائی ریشمی کپڑوں میں بدلنے لگی۔ نعیمہ نے اپنی شادی کیلئے پانچ جوڑے تیار کئے۔

اس کے چہرے میں خون نہ رہا اور کھانسی میں اضافہ ہونے لگا۔ ایک دن میں نے ماں سے جھجکتے جھجکتے کہا "ماں نعیمہ کے جوڑے مکمل ہو گئے۔ ماں نے اختر اور جمیل سے کہا تو انھوں نے جواب دیا "کپڑے تو بن گئے ماں مگر زیور اور فرنیچر کہاں سے آئیگا۔ تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ"۔

نعیمہ کے کانوں نے سب کچھ سن لیا مگر زبان سے اف تک نہ کی۔ اس رات وہ پہلی دفعہ اس پرانے بخار میں مبتلا ہو گئی جو اس گھر میں شکیلا پر وارد ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنی چارپائی کے قریب بلایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "عذرا! میری بہن۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ میں تم سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتی مگر معلوم ہوتا ہے۔ مجھے جلدی یا دیر سے تم سے جدا ہونا ہی پڑے گا۔ تو نے میرے لئے کتنی محنت اور مشقت کی ہے۔ ان کپڑوں کو تیار کرنے میں۔ میری پیاری بہن"۔ وہ مجھ سے چمٹ گئی اور ہم دونوں خاموشی سے روتی رہیں۔

چند دنوں کے بعد وہ بستر علالت پر دراز ہو گئی مگر اختر اور جمیل خاموش دیکھتے رہے۔ کہتے "ماں! بخار ہے۔ اتر جائے گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ موسم کی خرابی ہے"۔

ہمسائیوں سے عیادت ہونے لگی۔ نعیمہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی وہ چل پھر نہیں سکتی تھی۔ کبھی کبھی ماموں عیادت کے لئے تشریف لے آتے اور دعائیہ کلمات کہہ کر اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

انور گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ وہ حکومت کے خلاف سر بازار نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ احراری تھا۔

میری ماں کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ اس کو چھڑا لاتی۔ کئی دفعہ وہ بازار میں لوگوں کے ساتھ آ[تا] تھا پانی پیا اتر گیا اور ماں منتیں خوشامدیں کر کے اسے بچا لاتی۔ مگر حکومت کے آگے کس کا زور چل سکتا ہے۔

اور کل رات نعیمہ کی زندگی کی آخری رات چہار شنبہ کی رات۔ ہمارے بازار میں ایک عرس تھا۔ اس موقعے پر ایک رنڈی کا ناچ ضرور ہوتا تھا اور ان کو تبرکات تقسیم ہوتے تھے۔ سر شام ہی لوگ آ گئے تھے اور کافی بھیڑ تھی۔ بجلی کی روشنی سے بازار بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بالآخر دس بجے کے قریب ایک عورت نیلی ساری میں ملبوس آ کر ناچنے لگی۔ محلے کے بڑے بڑے آدمی جمع تھے اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں میرے ماموں بھی بیٹھے تھے۔ ایک طرف جمیل کھڑا تھا۔ ہمارا مکان سر بازار تھا اور کھڑکیاں بازار کی طرف کھلتی تھیں۔ محلے کی عورتیں اور جوان لڑکیاں دیکھنے کیلئے اکٹھی ہو گئیں۔

میں نعیمہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں درد تھا۔ وہ سخت بخار میں مبتلا تھی اور کھانس رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا "آج آخری چہار شنبہ ہے بہن۔ اٹھو۔ آؤ کھڑکی میں بیٹھ جاؤ اور نیچے تماشہ دیکھو"۔ اس نے اپنی کمزور آنکھیں کھولیں اور بولی "مجھ سے چلا نہیں جائے گا۔ عذرا میں وہاں تک کیسے جاؤں گی"۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ماں نے اور میں نے اسے اٹھایا اور کھڑکی تک لے گئیں۔ اسے کھڑکی میں بٹھایا اور چک گرا دی۔ میں اسے تھامے ہوئے تھی اور وہ کھڑکی میں سے نیچے جھانک رہی تھی۔ اس نے اپنے بھائی اور دونوں ماموؤں کو پہچان لیا۔

وہ کھانستے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ جمیل کھڑا ہے عذرا؟ میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی ہیں۔ میرے ماموں بھی بیٹھے ہیں اس عورت کا لباس کتنا خوبصورت ہے۔ کتنی خوبصورت ساڑی ہے"۔ میں نے اس کی سوکھی [illegible] ہوا تھا۔

ماں آ گئی۔ وہ [illegible]۔ میری بچی تو جلدی [illegible]

اچھی ہو جائے گی۔ عذرا! تمہاری بہن کی طبیعت آج ٹھیک معلوم دیتی ہے۔"

"ہاں ہاں" میں نے جواب دیا۔

نیچے یکدم قہقہے بلند ہوئے اور گھنگروؤں کی آواز طبلے کے ساتھ ساتھ بجنے لگی۔

میں نے دیکھا۔ میرے ماموں اس عورت کو نوٹ دے رہے ہیں۔ ہر دو تین منٹ کے بعد ایک نوٹ۔ پھر میں نے دیکھا۔ میرے بھائی نے اپنے منہ میں نوٹ پکڑا ہوا ہے۔ وہ عورت ناچتی ہوئی آئی اور اپنا منہ جمیل کے منہ کے قریب لے جا کر نوٹ کو اس کے منہ سے نکال لیا۔ قہقہے پھر بلند ہوئے اور طبلہ زور سے بجنے لگا۔

نسیمہ کھانس رہی تھی اور پھر وہ نقاہت سے بولی "عذرا مجھے یہاں سے لے چلو۔ مجھے میری چارپائی پر پھینک دو۔ تم نے جمیل کو دیکھا؟"

میں خاموش تھی۔ میں نے جمیل کو دیکھا تھا اور اپنے دونوں ماموں بھی دیکھے تھے۔

وہ پھر بولی "سنو عذرا۔ جاؤ ماں سے کہو۔ میرے کپڑے کہاں ہیں۔ وہ لے آؤ۔"

میں نے ماں کو آواز دی اور وہ چھوٹا سا صندوق لے آئی۔ اس نے کپڑے نکالے اور ان کو دیکھا۔ ماں جا چکی تھی۔

"عذرا بہن" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے وہ کانپ رہی تھی۔ اس نے میرا نام دہرایا۔ میں اور اس کے قریب ہو گئی۔ پھر وہ بولی "یہ کپڑے تمہارے لئے ہیں۔ تم ان کو میری موت کے بعد پہن لینا۔ ورنہ یہ صندوق میں پڑے پڑے گل سڑ جائیں گے۔"

"کیا کہہ رہی ہو بہن" میں نے روتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں عذرا۔ آؤ۔ مجھ سے بغلگیر ہو جاؤ" وہ سسکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

میں اس سے بغلگیر ہو گئی۔ اس کا جسم جل رہا تھا۔

اور وہ ایک ہڈیوں کا ڈھیر بن چکی تھی۔ میرے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

وہ کھانستے ہوئے پھر بولی "جاؤ عذرا میرے لئے پانی کا ایک گلاس لے آؤ۔ ماں کو نہ بلاؤ۔ میں سنبھل کے بیٹھوں گی۔"

میں پانی لینے چلی گئی۔

وہ کھڑکی میں سے کود گئی۔ تین منزل اوپر سے۔ اس کی لاش جمیل کے قدموں میں پڑی تھی اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

میری ماں کپڑوں کو دیکھ رہی ہے اور رو رہی ہے۔

"ماں اٹھو خدا کے لئے۔ ان کپڑوں کو صندوق میں بند کر دو۔ اس پنکھے کو چھپا دو۔ میرے بھائیوں کو جا کر کہہ دو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھ پر رحم کر دو۔"

# غزلیں

## ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ

دراز گیسوؤں سے ساز باز کرتے ہیں
وہ اپنی قید کی مدت دراز کرتے ہیں

سناتے ہیں انھیں حسن و وفا کے افسانے
اسی بہانے سے عرض نیاز کرتے ہیں

گو سنتے دیکھتے ہیں منہ سے کچھ نہیں کہتے
جو راز داں ہیں کب افشاء راز کرتے ہیں

ہے انقلاب زمانہ ترا فریب نظر
قدیم چال سے افلاک ناز کرتے ہیں

کسی غرض کسی مطلب سے کرتے ہوں گے ادا
جو پنجگانہ ادائے نماز کرتے ہیں

مئے دو آتشہ جو صبح و شام پیتے ہیں
ہم اس سے قلب و جگر کو گداز کرتے ہیں

خدا سے مانگتے کچھ بھی نہیں خدا کے سوا
ہم اپنے سجدوں کو یوں سرفراز کرتے ہیں

نہ کہئے گر انھیں دیوانہ اور کیا کہئے
جناب اپنی طبیعت پہ ناز کرتے ہیں

---

## مجیب خیرآبادی

دم بخود ہوائیں تھیں، دور تھی سیاہی تک
کیا خروش طوفاں تھا اک مری تباہی تک

ہے انھیں کے قدموں پر تاج پادشاہی تک
جن کی خستہ حالی پر ہنس پڑی تباہی تک

ان دلوں بغاوت ہے شکوۂ تغافل بھی
مورد سزا ٹھہرا عذرِ بے گناہی تک

گردش زمانہ بھی ایک سبب سہی لیکن
سلسلہ ہے وحشت کا تیری کم نگاہی تک

دور تک نہ تھا کوئی خط رہگزر روشن!
یوں سفینہ آپہنچا ساحل تباہی تک

اک ہمیں سے روشن ہے کچھ رہ طلب ورنہ
کھو گئے دھندلکوں میں راہبر سے راہی تک

مشکلیں مجیب آخر سہل ہو گئیں یعنی
حادثوں کی یورش تھی عزم محکم پناہی تک

## پنڈت رگھوپتی راؤ جذبؔ عالمپوری

جب پھول بن کے داغِ محبت نکھر گئے
نکہت کی طرح ہم بھی چمن سے گذر گئے

جلوے کسی کے میری نگاہوں میں بھر گئے
مہر و نجوم و ماہ نظر سے اتر گئے

چھٹکی ہوئی تھی چاندنی جب حسن و عشق کی
راتیں وہ کیا ہوئیں، وہ زمانے کدھر گئے

طعنے کمالِ جذبۂ دل کو نہ دیجئے
نالے کئے ہی کب تھے کہ جو بے اثر گئے

تھا یہ تمہارا فیضِ تبسم بہار میں
دامن اگر کھلی ہوئی کلیوں سے بھر گئے

اللہ رے ان کی بزمِ محبت کی دلکشی
جانا قرینِ وضع نہیں تھا مگر گئے

سوزِ حیات تھی مرے دل کی فسردگی
پہلو میں میرے آتے ہی سب پھول مر گئے

ایسا ہی کچھ کٹھن تھا محبت کا راستہ
دو گام بھی نہ ساتھ مرے راہبر گئے

خانہ خراب عشق پہ رحم ان کو آگیا
ناکامیوں کے تیر بڑا کام کر گئے

گلشن تو اپنے حال پہ قائم رہا مگر
ہم صورتِ بہار ادھر آئے ادھر گئے

وہ اور ہیں جو راہ سے منزل کی لوٹ آئے
اے جذبؔ ہم پہنچ کے رہیں گے، اگر گئے

## نامی انصاری

یہ اشکِ خونِ دل تو بڑے کام آگیا
لیکن حیاتِ حسن پہ الزام آگیا

میخانہ میں تھا ذکرِ شباب بہارِ نَو
بیساختہ لبوں پہ ترا نام آگیا

طے کر لیا تھا میں نے کہ میخانہ کو سلام
لیکن خیالِ بیعتِ خیّام آگیا

کچھ ذوقِ میکشی کی تڑپ کام کر گئی
کچھ اعتبارِ ساقیٔ گلفام آگیا

آیا تھا صرف عشق لباسِ وجود میں
تخلیقِ کائنات کا الزام آگیا

اس جذبۂ خلوص کی کیا داد دیجئے
صحرا میں بھی خیالِ در و بام آگیا

میں جا رہا تھا سوئے سوادِ حرم مگر
کیا کیجئے کہ دَیر سے پیغام آگیا

ان مست انکھڑیوں کی طرف کیا اٹھی نظر
اکبارگی خیالِ مے و جام آگیا

نامیؔ نے بزمِ ناز میں رکھا ہی تھا قدم
چرچے ہوئے کہ شاعرِ خود کام آگیا

---

## جلال الدین جلال

اس حسن کے رنگین ساحل پر جب موجِ نظر ٹکراتی ہے
جلووں کے ستارے چن چن کر یہ تابِ نگہ بن جاتی ہے

جس بزم میں نغمے پلتے تھے واں یاس کا ہے سناٹا اب
ہاں شب کو کبھی اک گوشے میں امید بہک کر گاتی ہے

کیا جانے کھو جاتی ہے کہاں وہ نادیدہ ویرانوں میں
اوہام و خرد کے میداں میں جو راہ افق تک جاتی ہے

اس بارش پہ آئی مینا میں افلاک سمائے جاتے ہیں
یہ جادۂ موجِ صہبا ہے یاں برق بھی ٹھوکر کھاتی ہے

بادل تو اٹھا ہی کرتے ہیں بادل سے کہیں کچھ ہوتا ہے
آتی ہے جو بجلی گرنے کو ہاں مینہ وہی برساتی ہے

آغاز کے شیریں خوابوں سے انجام کا ترشہ کا ڈھلتا ہے
یہ کیف کی دنیا منتی ہے تو کیفِ جنوں بن جاتی ہے

دزدیدہ نگاہی ہائے غضب ادھر اس پہ جھکانا پلکوں کا
رہ رہ کے عروسِ نَو کی طرح اس بت کی نظر شرماتی ہے

اس دل نے جلالؔ آتے آتے لاکھوں کو سلایا محفل میں
کہہ دو کہ نہ چھیڑے کوئی اس اب نیند ہمیں بھی آتی ہے

## تہذیب

ان کا غصہ ہی بجا ہے شاید
کوئی اپنی ہی خطا ہے شاید

دل کہیں بھی جو نہیں لگتا ہے
درد کا نشو و نما ہے شاید

ہنس کے ملنے لگے وہ ہر اک سے
ان کا معیار گھٹا ہے شاید

اس میں کانٹے ہی نظر آتے ہیں
راہِ اربابِ وفا ہے شاید

وہ بظاہر جو ہے انجان اتنا
مائلِ لطف و عطا ہے شاید

رہگذر اور کرے سجدہ تہذیب
کوئی نقشِ کفِ پا ہے شاید

---

## تہنیت

آپ کی چشمِ التفات
اپنی متاعِ کائنات
اور کا ذکر بے مزہ
بات ہے آپ ہی کی بات
آپ کی رہ میں ہو نثار
بس یہی مقصدِ حیات
وہ وجود زندگی
بن گئی آپ ہی کی ذات
کون بیان کر سکے
آپ کی بے کراں صفات
جذبۂ شوق کی کمی
دیدہ و دل کی ہے وفات
دونوں ہیں آزمائشیں
زندگی ہو کہ ہو ممات
دیکھ حرم کی سادگی
چھٹ گئے سب تکلفات
یاد میں ان کی تہنیت
کٹ گئی زندگی کی رات

---

## سعادت نظیر

یاد جب آئی ادائے چشمکِ قاتل مجھے
ایک اک ذرہ نظر آنے لگا بسمل مجھے
عشق کا ہے اعتبارِ مستقل حاصل مجھے
خود نویدِ زندگی دیتا ہے مستقبل مجھے
قوتِ دل ہے مری طوفان شکن، دریا نشاں
کیوں ہوا دیتا ہے اپنی دامنِ ساحل مجھے؟
گریۂ شبنم بھی دیکھا خندہ ہائے گل کے ساتھ
رازِ فطرت کیا ہے؟ کچھ تو ہی بتا، اے دل مجھے
قوتِ بے باک جب توڑے مسافت کے قیود
پھر نظر آئے نہ کیوں زیرِ قدم منزل مجھے؟
سوزشِ پروانۂ جاں باز میرے دل میں ہے
کیا لبھائے گی کسی کی گرمیِ محفل مجھے؟
حوصلوں نے جب حوادث کو کیا زیرِ نگیں
کاروانِ شوق سمجھا رہبرِ کامل مجھے
سختیوں سے موت کی بھی کھیلتا رہتا ہوں میں
زندگی کی کوئی مشکل اب نہیں مشکل مجھے
اضطرابِ شوق کے ہاتھوں ہے دل بے اختیار
کھینچتی ہے اپنی جانب دور سے منزل مجھے
میں وہی ہوں، دل وہی، شورش وہی، کاوش وہی
دیکھتی ہے اجنبی نظروں سے کیوں محفل مجھے؟
اک تری نسبت سے مشتِ خاک پہنچی ہے کہاں
رہنے دے برباد ہی اے گردِ گارِ دل مجھے
زورِ بازو کے سہارے آگے بڑھتا ہے نظیر
خود بناتا ہے عمل سے اپنا مستقبل مجھے

---

## احقر کاشی پوری

جنھیں نور و نغمہ کی چاہ تھی وہ سیاہیوں سے گزر گئے
انھیں موت نے بھی جھڑک دیا جو غمِ حیات سے ڈر گئے
کبھی جس کے محض خیال ہی سے ہزار رنگ بکھر گئے
وہ بہار زیبِ چمن ہوئی تو گلوں کے چہرے اتر گئے
ہمیں اب شکستِ دل و نظر بھی عزیز ہے کہ اسی سے ہم
غمِ عیش و یاسِ امید کے کئی "مرحلوں" سے گذر گئے
وہی رقصِ رنگ کی جھن جھن، وہی نکہتوں کی چھبن مگر
جنھیں دل سے نسبتِ خاص تھی وہ پیام جانے کدھر گئے
ترے التفاتِ ستم نما کا میں دل سے شکر گذار ہوں
مری زندگی کے سیاہ دن یہی زہر پی کے نکھر گئے
جنھیں آندھیوں نے نگل لیا وہ حریفِ دورِ خزاں تو تھے
مگر ان گلوں کا قصور کیا جو بہار ہی میں گزر گئے
غمِ زیست پھر غمِ زیست ہے اسے لطف کیف سے کیا غرض
جو ملی نگاہ تو دو گھڑی کو فضا میں گیت بکھر گئے
انھیں راستے ہی میں ڈس لیا کبھی حسن نے کبھی عشق نے
ترے قیدیوں کو زماں مکاں کے پیامِ شام و سحر گئے
نہیں یہ نہیں کوئی مصلحت، اسے بزدلی ہی کہوں گا میں
غمِ زندگی سے نظر ملی تو نظر بچا کے گزر گئے

---

## نور تقی

برا سی ٹھیس لگے اور اشک بھر لاؤں
میں کوئی اور نہیں ہوں کہ غم سے گھبراؤں
ہماری بزم میں ہے کس کو اب شعورِ وفا
کسے خزانۂ الفت کے راز سمجھاؤں
کہاں کی چارہ گری اور کہاں کی ہم نفسی
دعا کرو کہ غمِ زندگی سے چھٹ جاؤں
جو تیری یاد مرے سوزِ غم کو فرصت دے
نفس نفس سے زمانہ پہ آگ برساؤں
کہاں کے شیشہ و ساغر نگاہ ساقی سے
نظر ملی بھی نہ تھی ڈگمگا گئے پاؤں
کسی کے پائے حنائی مری جبینِ نیاز
میں کیوں نہ اپنے مقدر پہ نور اتراؤں

---

## سید صادق علی صادق

آسودۂ گلشن تم کو ابھی تکمیلِ بہاراں کرنا ہے
خود اپنا ہی دامن بھرنا کیا اوروں کا بھی دامن بھرنا ہے
ہر غنچہ کھلے ، ہر پھول ہنسے ، ہر شئے پہ مسرت چھا جائے
اے اہلِ چمن اس طرح تمہیں تنظیمِ گلستاں کرنا ہے
ہر لمحہ جب ہے بارِ گراں ہر سانس ہے جب شعلہ ساماں
پھر تو ہی بتا انصاف سے دل یہ جینا ہے یا مرنا ہے
منزل پہ سیاہی کے پہرے ہر گام پہ ہے رہزن کی نظر
سب کچھ یہ سہی اے دوست مگر ان راہوں کو طے کرنا ہے
یہ شکوۂ رنج و محن کیسا یہ دہشتِ دار و رسن کب تک
اس خوف کو صادق کیا کہئے خود سائے سے اپنے ڈرنا ہے

---

# نظمیں

## قامو صحرائی ــــــــ چیرہ دستی

نفس نفس میں تلاطم ہے چیرہ دستی کا
کوئی جواز بھی آخر ہو مے پرستی کا

نظر نظر سے عیاں ہیں حکایتیں دل کی
کہیں رکاؤ بھی آخر ہو اپنی پستی کا

قدم قدم پہ بچھی جا رہی ہے تاریکی
اجڑ چکا ہے سکون جب سے دل کی بستی کا

کہیں تو کس سے کہیں درد دل کا افسانہ
رفیق جب کہ ہو دشمن بقائے ہستی کا

جب انتقام پہ آئیں اٹھا کے چھوڑیں گے
دبا ہوا ہے جو طوفان سر میں مستی کا

## فیروزہ نقش ــــــــ قطعات

بقعۂ نور دل ہے داغوں میں
قابل دید بن گئے ہیں ہم
خیر اپنی مٹائے تاریکی
رشک خورشید بن گئے ہیں ہم

عمر کے سانچے میں زیست ڈھلتی ہے
آرزو کروٹیں بدلتی ہے
ہم جہاں ہم نشین رہتے ہیں
ان دیاروں میں موت پلتی ہے

آپ کا مشغلہ ہے مے نوشی
ہم کہ اپنے لہو کو پیتے ہیں
آپ کو زندگی میسر ہے
ہم نہ مرتے ہیں اور نہ جیتے ہیں

## ابوسعد سید اسمعیل سید ــــــــ تلخی احساسات

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

آدمی آدمی کا ہے دشمن
زندگی مجرموں کی ہے روشن
کیوں یہ دنیا ہے نیکوں سے بدظن

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

جس جبیں پر رہے داغ سجدہ
طاق ابرو میں ہو جس کے قشقہ
فتنہ ان ہی سروں میں ہے خفتہ

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

ایشیاء سے ہے جس کو عداوت
دیکھتا ہے بنظر حقارت
اب اسی سر کی ہوگی دباغت

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

کمسنی میں ادا سے جوانی
وقت کے پہلے ہے شادمانی
اور جوانی میں ہے ناتوانی

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

کون کب تک سنے لن ترانی
طول ہے زندگی کی کہانی
ہو گئی سنتے سنتے پرانی

میں زباں گر ذرا بھی ہلا دوں
قلب گیتی میں ہلچل مچا دوں

## الیاس

ماجد کریم ظفری

آہ یہ کیا کہ تری آنکھ سے آنسو بہ جائیں
[illegible] کون گمانہ یہ دلِ سوز سماں
آہ یہ تیری محبت! یہ ترا دردِ نہاں
منہ نہ موڑو مرا اے دوست مری جانِ جہاں
دلِ مجبور کو بھی دیکھو! جنوں کو بھی دیکھو
مجھ کو بھی دیکھو! مرے حالِ زبوں کو بھی دیکھو
اک طرف دیس ہے، ماں باپ ہیں، دشواری ہے
اک طرف پاؤں کی زنجیر ہے رسوائی ہے
اک طرف تیری محبت سے گریزاں ہوں میں
اک طرف تو نے محبت کی قسم کھائی ہے
توڑ کر پاؤں کی زنجیر بغاوت کر لوں
تیرا منشاء ہے کہ میں تجھ سے محبت کر لوں
میں وہ دہقاں نہیں اک کوڑی بھی جس کے پلے
میں وہ مزدور کہ ہوں نانِ جویں کا محتاج
میں وہ مجبور کا پوت [illegible] مفلس ہوں، وہ نادار کہ بس
مجھ کو پانے گی نہ ہرگز تری غیرت سرتاج
شالِ کشمیر کا پیوند سزاوار نہیں
تم امیروں کو غریبوں سے سروکار نہیں
میں نے مانا کہ تجھے میرے بنا چین نہیں
اور آتا نہیں اک پل بھی ترے دل کو قرار
پھر کروں کیا کہ مرے پاس فقط اک دل ہے
تیرے ماں باپ کو دولت سے ہے کوٹھی سے پیار
اس لئے اے مرے محبوب تو آنسو پی لے
کسی مزدور پہ دل ہے تو لبوں کو سی لے

---

شاہدہ عمیدہ تحسین

## گمشدہ انگوٹھی کے دوبارہ ملنے پر

کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
تجھ کو کھو کر بڑھ گئی تھیں اور توقیریں تری
منعکس سی ہو گئی تھیں دل میں تصویریں تری
بندگی وہ ہے کہ سجدوں کی ضرورت ہی نہ ہو
زندگی وہ ہے جو مرہونِ مسرت ہی نہ ہو
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
تو مری روٹھی تمنا کا درخشاں خواب ہے
داستان زندگی کا جیسے مرے باب ہے
تجھ میں مضمر میرے ننھے گیت ہیں شہکار ہیں
زیبِ قرطاس و قلم روٹھے ہوئے افکار ہیں
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
ڈر رہی ہوں اس مسرت کی نئی تمہید سے
خوف ہے پھر آج کی اس یاد کی تجدید سے
عارضی میری خوشی یہ رنجِ دیرینہ نہ ہو
آج کی تجدید پھر اک عہدِ پارینہ نہ ہو
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری
رشتۂ انس و محبت کو بڑھا کر اور بھی
پیار اور اخلاص کے انداز دکھا کر اور بھی
چھوٹنے پر مجھ سے تو مجبور ہو جائے کہیں
ڈھونڈھ ہیں پاؤں نہ تجھ کو تو جو کھو جائے کہیں
کتنی یادیں تجھ سے وابستہ ہیں انگوٹھی مری

---

## خودکشی سے پہلے

شوبادر رضوی

دوست اس درجہ مصائب سے پریشان نہ ہو — زیست کو واقعی وغدار کا فسانہ نہ بنا
چند بے ربط افسانوں کا سہارا لے کر — اپنی الفت کو ہزیمت کا نشانہ نہ بنا

متفق ہوں تیرے ان درد بھرے لفظوں سے — اپنی دنیا میں تو اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں
منزلیں پاس سرکتی ہوئی کتراتی ہیں — راہ میں اپنی دھندلکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

اس سے پہلے کہ تیرے ذہن کی محرابوں میں — جل کے بجھ جائیں امیدوں کے ضیا بار چراغ
اس سے پہلے کہ پہنچ جائے کسی چوٹی پہ — اپنی فردوس تخیل کا نہ پاکر تو سراغ

دیکھ بازاروں میں گلیوں میں چوراہوں میں — دیکھ کٹیاؤں میں روندے ہوئے دوراہوں میں
کتنی مخلوق ہے اس دور کی ظلمت کا شکار — کتنے مہتاب سسکتے ہیں حسیں باہوں پر

دیکھ ان تیرہ و تاریک سے تہ خانوں کو — جن میں پھوٹی نہ کبھی آس کے سورج کی کرن
دیکھ ہر موڑ پہ بیٹھے ہوئے انسانوں کو — کھا گیا جن کو زمانے کا بہیمانہ چلن

یوں اگر ہے تو زمانے کا بہیمانہ چلن — توڑ ڈالے گا امیدوں کے حسیں تاج محل
رنج و آلام کے بادل یوں ہی منڈلائیں گے — ٹمٹماتا ہی رہے گا تری آشا کا کنول

یوں نہیں ہے تو مرے دوست سکوں کی خاطر — بڑھ کے للکار سسکتے ہوئے انساں کو پکار
تیرہ و تار گھروندوں میں چراغاں کرنے — چونک دے ہمارے زمانے میں بغاوت کے شرار

پھر نئی صبح نیا دور نئے آدم زاد — اپنی نفرت کا ہمالہ پہ علم گاڑیں گے
تیری فردوس تخیل تجھے مل جائے گی — اپنے دامن سے کبھی گرد الم جھاڑیں گے

## لسانی تقسیم

سراجہ کسوت پرشاد

رہتے تھے آپس میں ہم مل مل کے سب — اب نہ جانے تم کہاں اور ہم کہاں
ہے ریاست اس کی جس کی ہے زباں — یک اکھاڑہ بن گیا ہندوستاں
خوش نہ گجراتی نہیں کرناٹکی — ہیں تلنگے اور مرہٹے خونفشاں
ناچ آزادی کا اب ناچیں گے لوگ — ڈال کر پاؤں میں اپنا بیڑیاں
ناخدا ہی جب خدا کو بھول جائے — پھر بھلا کشتی کہاں ساحل کہاں
ملک سارا جب کہ صحرا بن گیا — دیکھئے جائے کدھر کو کارواں
مٹ گئے مذہب کے جھگڑے آجکل — لڑنے والی ہے زبانوں سے زباں

ہے زباں والوں کی یہ دنیا گراں
بے زبانوں کا فقط ہے آسماں

# تبصرے

## از :- ادارہ

**ادب لطیف (لاہور)** مکتبہ اردو لاہور کا یہ ترجمان سالہاسال سے شائع ہوتا ہے۔ مرزا ادیب نے یہ خاص اردو نمبر دسمبر ۱۹۵۵ء میں مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ ابتداء میں چند مشاہیر اردو خسرو، ولی، میر، سودا، نظیر، آتش، نسیم، سپرد، کیفی، عبدالحق، ذاکر حسین اور منشی نولکشور کی پوری صفحہ کی تصاویر درج ہیں۔

اس اردو نمبر کو چار پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "اردو ہماری زبان" کے عنوان پر مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر دیوانہ، گوپی چند نارنگ وغیرہ کے مضامین شریک ہیں۔ دوسرے حصہ کا عنوان ہے "اردو کے لسانی و ادبی مسائل"۔ اس عنوان کے تحت پاکستان کا لسانی مسئلہ اور اردو کی ترقی، کا مسئلہ، اردو اور رومن رسم الخط وغیرہ پر مفید اور اہم مضامین درج ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر اردو لاہور یونیورسٹی نے "اردو کے ناشروں" اور "اردو پنجاب یونیورسٹی میں" کے عنوانوں پر عمدہ اور معیاری مقالے قلمبند کئے ہیں۔ یہ حصہ بہت معلوماتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے اہل اردو پاکستان میں اردو کی رفتار ترقی سے واقف ہو سکتے ہیں۔

تیسرا حصہ پاکستان کے مشہور شہروں مثلاً کراچی، ڈھاکہ، لاہور، پشاور اور راولپنڈی میں اردو کے کام اور حالت تک جائزہ کے لئے وقف ہے اور یہ بھی بہت پر از معلومات ہے۔

چوتھا حصہ اردو کے اداروں کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیات اردو پر بسیط تعارفی مضمون اس میں شریک ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو پر غلام حسین ذکار صاحب نے محنت اور کاوش سے معلومات فراہم کی ہیں۔ اگرچہ ایک دو جگہ بعض ناموں میں غلطی ہو گئی ہے۔ لیکن اتنی دور بیٹھ کر ادارے کے کاموں کا جس خوبی سے جائزہ لیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ غلطیاں قابل درگذر ہیں۔ جامعہ عثمانیہ پر ڈاکٹر زور صاحب کا مقالہ بھی بہت ہی جامع اور مانع ہے۔

آخر میں اردو کے ایک عظیم ناشر کے عنوان سے منشی نولکشور کا تذکرہ درج کیا گیا ہے جو اپنی نوعیت کا واحد معلوماتی مضمون ہے۔

عبدالعزیز فطرت اور مدوش صدیقی کی طویل گراں مایہ نظمیں بھی قابل تعریف ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ اردو نمبر ایک بہت کامیاب سعی ہے اور اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت اردو کے مسائل کیا ہیں اور ان کو پاکستان میں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ یقین ہے کہ پاکستانی ارباب فکر اس دعوت غور و فکر پر دھیان دیں گے اور اس زبان کی خدمت کے لئے کربستہ ہو جائیں گے۔

یہ خاص نمبر (۳۱۶) صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی قیمت دو روپے بارہ آنے کچھ زیادہ نہیں۔

**افکار (کراچی)** اوبنبان بندر روڈ کراچی سے شائع ہوتا ہے اور اب اس نے اپنا دس سالہ نمبر خاص اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کو صہبا لکھنوی صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اور کسی خاص موضوع یا مسائل کے لئے وقف کرنے کی جگہ عام نمبروں کی طرح رنگا رنگ مضامین نظم و نثر سے اس خاص نمبر کو آراستہ کیا ہے۔ ناولٹ، ڈرامہ، رباعی، نظم، گیت، افسانہ، سفرنامہ، خاکے، دیس دیس کی کہانیاں اور نظم، فنون لطیفہ، مقالے، جائزے اور رفتار عالم غرض جملہ عنوانات کے تحت اردو کے مشاہیر اہل قلم کے رشحات بڑی محنت اور کاوش سے جمع کر دئیے ہیں۔

ابتدا میں چار صفحات کی تصویریں بھی ہیں۔

(۴۴۰) صفحات اور قیمت تین روپے۔

اس کے لکھنے والوں میں پرکاش پنڈت، پروفیسر شور، جان نثار اختر، جوش، شاذ تمکنت، خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر ملک راج آنند، علی اختر، عبدالرحمن چغتائی، احمد ندیم قاسمی بطور خاص قابل ذکر ہیں اور یہ خاص نمبر اپنے گلہائے رنگ رنگ کی وجہ سے شوق سے پڑھا جائے گا۔

**نوائے وقت** مرتبہ نظام الدین ایس گورے کر ایم اے استاد شعبہ اردو و فارسی سینٹ زیویرس کالج بمبئی۔ ناشر رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ قیمت دو روپے۔

یہ (۱۰۳) صفحات کی ایک مختصر سی کتاب ہے جس میں جناب گورے کر صاحب کے مختلف مضامین اور تقاریر جمع کی گئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پروفیسر نظام الدین صاحب بمبئی کے ان اصحاب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جو وہاں کے کالجوں کے طلباء میں اردو زبان اور ادب کا اچھا ذوق پیدا کر رہے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعوں مثلاً مشترکہ زبان، گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ، غالب کی شخصیت، اکبر اور مغربیت اور کیفی کی شاعری پر دلچسپ اور مفید مضامین قلمبند کئے ہیں۔ اردو کے ادب پر ان کی اچھی نظر ہے اور اردو کے مسائل پر غور و فکر کرنے کی عمدہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ کتاب بہت اچھی چھپی ہے اور اس قابل ہے کہ طلبہ اور اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے مطالعہ کریں۔

**پیام مشرقی** مرتبہ میر ولایت علی صاحب ناشر ادارہ علیہ اعظم پورہ۔ حیدرآباد۔ قیمت دو روپے

(۱۸۲) صفحات کی اس کتاب میں مولوی میر ولایت علی صاحب نے علامہ عنایت اللہ خاں صاحب مشرقی

کی مختلف تصانیف کے جامع اور مستند اقتباسات مرتب کئے ہیں۔ ابتداء میں حالات زندگی لکھے ہیں اور مشرقی صاحب کے خطبات اور تصنیفات پر تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔

علامہ مشرقی ایک زمانہ میں ہندوستان کے مشاہیر سیاست میں شمار پاتے تھے اور قیام پاکستان سے قبل انھوں نے مسلمانوں کے رہبر کی حیثیت سے بڑا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن قائد اعظم محمد علی جناح کی تحریک پاکستان اور اس کے حصول کے بعد انھوں نے از خود گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ سر سید احمد خاں کے بعد ہندوستان میں جو مختلف مشاہیر اسلام پیدا ہوئے ان کی تاریخ میں علامہ مشرقی کا نام بھی ایک صاحب ایثار مرد مجاہد کی یاد دلائے گا۔ اور یہ کتاب ان کی زندگی اور کام کے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی۔

## اسلامی تعلیمات

موظفہ میر ولایت علی صاحب ناشر ادارۂ علمیہ اعظم پورہ حیدرآباد۔ قیمت چار روپے۔

مولوی میر ولایت علی صاحب جو علامہ مشرقی سے بہت متاثر ہیں اس کتاب کے مولف ہیں اور انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کے وسائل شرح و بسیط کے ساتھ پیش کریں۔ اس کتاب کا تعارف ڈاکٹر امیر علی صاحب نے قلمبند کیا ہے۔ اور تعلیم قرآن پر صحیح معنوں میں عمل کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مسلمانوں کے مسائل اور مختلف ضروریات کے بارے میں اس کتاب میں مفید معلومات اور مشورے درج ہیں۔

## تلگو ادب کی تاریخ پر ایک نظر

مرتبہ سخی تبسم صاحب ایم اے۔ ناشر شعور پبلیکیشنز عثمان پورہ حیدرآباد

یہ ایک چھوٹا سا مضمون ہے جس میں تلگو زبان کے آغاز سے لے کر اٹھارویں صدی عیسوی کے ختم تک تلگو ادب کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور مولف کا خیال ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے بعد سے زمانہ حال تک کے تلگو ادب کی تاریخ دوسرے حصہ میں پیش کی جائے گی۔

مولف نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ تلگو ادب کے بارے میں ان کی معلومات بالواسطہ ہیں۔ بہر صورت یہ چھوٹی سی کتاب اردو میں ایک ایسی زبان کے بارے میں معلومات پیش کرتی ہے جس کی نسبت اس زبان میں اب تک کچھ نہیں لکھا گیا تھا۔ مولف سے توقع ہے کہ اس موضوع پر مزید محنت کر کے آئندہ ایک مکمل کتاب شائع کریں گے۔

## معانی القرآن

مرتبہ مولوی حافظ محمد مظہر صاحب ناشر مجلس ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد دکن قیمت بارہ آنے [۱۲]

حافظ محمد مظہر صاحب حیدرآباد کے ایک مشہور علمی و دینی خاندان کے فرد ہیں اور ان کی کئی کتابیں اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں۔ چنانچہ ادارۂ ادبیات اردو سے بھی ان کی ایک تاریخی کتاب "دارالعلوم کے سپوت" چھپ چکی ہے جس میں حیدرآباد کی اس مشہور درسگاہ کے سپوتوں کا تذکرہ درج ہے۔ اب انھوں نے تفہیم و تدریس قرآن کے لئے ایک آسان سلسلہ شروع کیا ہے جس کے ذریعہ سے ان کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے آسانی سے اس کتاب کو سمجھ سکیں گے۔ کتاب بہت محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے اور توقع ہے کہ مقبول ہوگی۔

## انگاروں کے گیت

مجموعہ کلام حسن شہیر صاحب۔ ناشر کتابستان الہ آباد۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔

یہ تقریباً سو صفحات کا ایک مجموعہ کلام ہے جس کے مصنف حسن شہیر صاحب کے پہلے مجموعہ "صبح زنداں" پر اس سے قبل سب رس میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ حسن شہیر صاحب ترقی پسند شعراء کی صف میں ایک با شعور فنکار ہیں جو آہستہ آہستہ اپنے لئے ایک جگہ حاصل کرتے جا رہے ہیں اور کیا عجب ہے کہ ان کے کلام کی وجہ سے ترقی پسند شاعری میں ایک نیا باب کھل جائے۔ اس میں ایک خاص انفرادیت ہے اور ان کی ذہنی تخلیق میں ایک نئی شگفتگی اور پاکیزگی نظر آتا ہے۔ وہ زیادہ تر آزاد نظمیں لکھتے ہیں لیکن ان کا کلام شعریت اور فنکارانہ نزاکتوں سے محروم نہیں ہے۔ یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ "انگاروں کے گیت" پہلے مجموعے کی طرح مقبول ہوگا۔ اور نوجوان شعراء کے لئے نمونہ کا کام دے گا۔

## کتاب نورس

مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد۔ ناشر دانش محل لکھنؤ۔ صفحات (۱۹۸)۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

نورس ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور (۹۸۸ھ۔۱۰۳۶ھ) کی نظموں کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر موسیقی سے تعلق رکھتی ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ اپنے خاندان کا چھٹا بادشاہ تھا۔ اس نے علم و ادب اور فنون لطیفہ اور موسیقی کی بے نظیر سرپرستی کی۔ اور اس کی شہرت سن کر دور دور سے سینکڑوں ارباب کمال اور مشاہیر فن اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔

ابراہیم نے جو نظمیں خود لکھیں وہ نہ تو دکنی میں ہیں نہ گجراتی میں بلکہ اس نے مختلف زبانوں کا ایک ایسا مرکب اپنے اظہار خیال کے لئے استعمال کیا جو اس عہد میں موسیقی کی اصطلاحوں اور موسیقاروں میں رائج تھا۔ اسی لئے اس نے کئی ایسے بھی لفظ استعمال کئے جو کرناٹک موسیقی کے لئے رائج تھے اور جن کو مرتب کچھ نہ سکے۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کتاب کو مرتب کر کے بڑی خدمت انجام دی ہے مگر اس کے مطالعہ سے جگہ جگہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے ابراہیم عادل شاہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور نہ اس کی کتاب نورس کو صحیح طور پر پڑھ سکے ہیں۔ وہ دکنی زبان، کلچر اور تاریخ سے قطعی طور پر ناواقف ہیں اور یہی وجہ ہے اس کتاب کے دیباچہ اور خود کتاب کے اشعار میں ایسی ایسی واضح اور سنگین غلطیاں نظر آتی ہیں جو دکنی زبان اور تاریخ سے واقف کار ہرگز نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ تمام غلطیاں مشہور انگریزی رسالے اسلامک کلچر کے ایک مضمون میں وضاحت سے درج ہیں جو ڈاکٹر زور صاحب نے لکھا ہے اور جو شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر نذیر احمد اس کے دوسرے ایڈیشن میں اس کو درست کرلیں گے اور ہندی اور انگریزی میں بھی چونکہ وہ یہ کتاب چھپوانا چاہتے ہیں اس لئے ان میں بھی اس کا لحاظ رکھیں گے۔ ہم اسلامک کلچر کے اس مضمون کا اردو ترجمہ آئندہ سب رس کے کسی شمارے میں بھی شائع کر رہے ہیں۔

اس قسم کی ایک دو مثالیں یہ ہیں کہ ابراہیم عادل شاہ نے اپنی والدہ کو ان نظموں میں ہر جگہ حاجی بڑی صاحبہ کے لقب سے یاد کیا ہے اور یہی طریقہ دکن میں اب تک رائج ہے کہ خواتین کے لئے مذکر افعال اور صفات استعمال کئے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ہر جگہ شمالی ہند کی یعنی معیاری اردو کے مطابق حاجی بڑی صاحبہ وغیرہ لکھ دیا ہے۔

اسی طرح ملکہ جہاں کو ملکہ جہاں اور کنہیا کو گئے ہیں اور اجہرت کو اجرچ لکھا ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات کی بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ چونکہ آئندہ ڈاکٹر زور صاحب کا تفصیلی مضمون شائع ہوگا اس لئے یہاں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ یہ کتاب مرتب کی ناواقفیت کی بنا پر بہت ہی غلط مرتب ہوئی ہے اور ابراہیم عادل شاہ جیسے بڑے شاعر اور علم و ادب کے سرپرست کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی ہے۔

# ادارۂ ادبیات اردو

## علمی، ادبی و کلچرل مصروفیات

## سنہ ۱۹۵۵ء

**اتوار۔ ۲ر جنوری**

شام کے چار بجے سلور جوبلی کی ذیلی کمیٹی برائے ڈراما منعقد ہوئی جس میں ایکٹروں وغیرہ کا انتخاب کیا گیا۔

**پیر۔ ۳ر جنوری**

اعتراف خدمات حضرت امجد کے لئے ایک مشاورتی مجلس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں محمد اسد اللہ صاحب انجنیر کو صدر مجلس منتخب کیا گیا اور مختلف اصحاب کو کام تفویض کئے گئے۔

**جمعرات ۶ر جنوری**

شام ۵ بجے مجلس استقبالیہ سلور جوبلی ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مختلف امور کے لئے ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں اور ان کے کنوینر منتخب ہوئے۔

**جمعہ۔ ۷ر جنوری**

شام کے ۵ بجے مسٹر پی ہنمنت راؤ ڈپٹی منسٹر مال و صدر مجلس استقبالیہ سلور جوبلی ادارہ نے اورینٹ ہوٹل میں ایک پریس کانفرنس کو مخاطب کیا جس میں حیدرآباد کے جملہ اخباروں اور نیوز ایجنسیوں کے نمائندوں کے علاوہ اردو اور دوسری زبانوں کی انجمنوں کے نمائندے اور ادارے کے کارکن شریک ہوئے۔

**پیر۔ ۱۰ر جنوری**

شام کے ۵ بجے سلور جوبلی کی مالیاتی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور فراہمی رقم کے وسائل پر غور و خوض اور تقسیم کار عمل میں آیا۔

**جمعہ۔ ۱۴ر جنوری**

۵ بجے شام سلور جوبلی ڈنر کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور انتظامی امور طے کئے گئے۔

**منگل۔ ۱۸ر جنوری**

۵ بجے شام مجلس مشاورت اعتراف خدمات حضرت امجد کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا جس میں کام کی رپورٹ پیش ہوئی اور آئندہ کا پروگرام تیار کیا گیا۔

**ہفتہ۔ ۲۲ر جنوری**

شام کے چار بجے سلور جوبلی کی نمائش کے لئے رسم خط اور خطاطی کی ذیلی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔

**منگل۔ ۲۵ر جنوری**

شام کے ۵ بجے مجلس انتظامی سلور جوبلی کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں جلسوں کے پروگرام اور دیگر تفصیلات طے کی گئیں۔

**جمعرات ۔ ۲۷ر جنوری**

شام کے ۵ بجے ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کا افتتاحی اجلاس شروع ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی چیف منسٹر حکومت حیدرآباد نے کی۔

- رات کے آٹھ بجے سلور جوبلی کا ڈنر ترتیب دیا گیا۔
- رات کے نو بجے لوک گیت اور ڈراما پیش کیا گیا۔

**جمعہ ۔ ۲۸ر جنوری**

شام کے ۵ بجے علمی اجلاس بصدارت پنڈت کاشی ناتھ راؤ ویدیہ اسپیکر حیدرآباد اسمبلی منعقد ہوا۔

- رات کے نو بجے "شام غزل" بصدارت شری ایم۔ این گپتا معتمد تعلیمات حکومت حیدرآباد شروع کیا گیا۔

**ہفتہ ۔ ۲۹ر جنوری**

شام کے ۵ بجے علمی اجلاس بصدارت شری گوپال راؤ ایکبوٹے وزیر تعلیم شروع ہوا۔

- رات کے ½ ۹ بجے کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جوش ملیح آبادی۔ جگر مرادآبادی۔ عرش ملسیانی وغیرہ نے حصہ لیا۔

**پیر ۔ ۳۱ر جنوری**

شام کے ۵ بجے ڈائمنڈ جوبلی حضرت امجد منائی گئی۔

- رات کے ½ ۹ بجے ڈائمنڈ جوبلی مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

**اتوار ۔ ۶ر فروری**

شام کے ساڑھے چار بجے اردو میں لفظ شماری کی کمیٹی کا اجلاس منعقد کیا گیا جس میں ہندوستان کے مختلف مقامات سے اس کام میں تعاون کرنے والے اصحاب کی فہرست تیار کی گئی اور ابتدائی لائحہ عمل مرتب کیا گیا

**جمعرات ۔ ۱۷ر فروری**

شام کے ۵ بجے شری ایل۔ سمنت راؤ صدر استقبالیہ نے سلور جوبلی کے کارکنوں کو چائے پر مدعو کیا۔ شری ڈگمبر راؤ بندو کارگذار چیف منسٹر حیدرآباد نے بھی شرکت کی اور تقریر کی اور کتاب ڈاکٹر زور مرتبہ محمد بن عمر صاحب ڈاکٹر زور صاحب کو پیش کی۔

- شام کے ۷ بجے مجلس انتظامی سلور جوبلی ادارہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں حسابات آمد و خرچ سلور جوبلی پیش کئے گئے۔

**جمعرات ۔ ۲۴ر فروری**

شام کے ۵ بجے ڈائمنڈ جوبلی حضرت امجد کی مجلس انتظامی کا اجلاس ہوا جس میں آمد و خرچ کے حسابات کی تفصیل پیش کی گئی۔

**ہفتہ ۔ ۲۶ر فروری**

ساڑھے تین بجے مجلس اردو امتحانات کا اجلاس طلب کیا گیا جس میں ممتحنین کا انتخاب عمل میں آیا اور نصاب پر نظر ثانی کی گئی۔

**جمعرات ۔ یکم مارچ**

سوشیل سنٹر سید علی گوڑہ کا افتتاح کیا گیا۔

**چہارشنبہ ۔ ۲۳ر مارچ**

سوشیل سنٹر اثاث محلہ جیلی بازار کا افتتاح کیا گیا

**جمعرات ۔ ۳۱ر مارچ**

۵ بجے شام ادارہ کی مجلس انتظامی کا ارسٹھواں اجلاس منعقد ہوا۔ گذشتہ سال کی تنظیم ادارہ اور موازنہ پر غور کرکے سال حال کے لئے سفارشات مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی

بنائی گئی۔ مسٹری پی ہنمنت راؤ کو اس مجلس کا رکن منتخب کیا گیا۔ سلور جوبلی کی تقریبات کی کامیابی پر مجلس استقبالیہ کے عہدہ داروں اور مختلف کمیٹیوں کے معتمدین کو صدر صاحب ادارہ کی طرف سے شکریہ کے خطوط ارسال کرنے کا تصفیہ کیا گیا۔

**جمعہ۔ یکم اپریل**

سوشیل سنٹر دبیر پورہ (ریلوے گیٹ) کا افتتاح عمل میں آیا۔

**ہفتہ۔ ۲؍اپریل**

صبح ساڑھے آٹھ بجے مجلس انتظامی کی منتخبہ ذیلی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ۱۹۵۵ء کی تنظیم ادارہ پر نظر ثانی کرکے جدید سفارشات مرتب کی گئیں۔

**منگل۔ ۱۲؍اپریل**

شام کے ساڑھے پانچ بجے مجلس اردو امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں عام معلومات کی کتاب مرتب کرنے اور پوسٹ لٹریسی کا نصاب بنانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور اردو امتحانات کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔ بالغوں کے لئے مشاہیر ہند پر کتابیں لکھوانے کا تصفیہ کیا گیا۔

**جمعہ۔ ۱۵؍اپریل**

۶ بجے شام ادارے کی مجلس انتظامی کا انہتروا اجلاس منعقد ہوا۔ ذیلی کمیٹی کی سفارشات بعد ترمیم منظور کی گئیں۔ سوشیل سنٹرس کو مزید چھ ماہ کے لئے جاری رکھنے کا تصفیہ کیا گیا اور ادارت کی مجلسوں کے جملہ دفتروں کو ادارے میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۳۵۵ء و ۱۹۵۶ء کا موازنہ منظور کیا گیا۔

**ہفتہ۔ ۱۴؍مئی**

صبح ساڑھے نو بجے مجلس اردو امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں ادارے کے امتحانات بابتہ جون کے ممتحنین کا تقرر کیا گیا۔ ادارے کی شاخ جہاں آباد کو نصاب اردو دانی و اردو زبان دانی کا ایک ایک سٹ بھجوانے کا تصفیہ کیا گیا۔

**چہارشنبہ۔ ۱۸؍مئی**

رات کے آٹھ بجے ڈاکٹر حفیظ سید صاحب الہ آباد نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

**چہارشنبہ۔ یکم جون**

سوشیل سنٹر جنگم میلہ کا افتتاح کیا گیا۔

**چہارشنبہ۔ ۸؍جون**

مس دولبن متعلقہ سوئٹزرلینڈ کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر سردار محبوب اور زینت ساجدہ وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**جمعہ۔ ۱۰؍جون**

صبح دس بجے ادارے کے اردو امتحانات (اردو فاضل اردو عالم، اردو زبان دانی اور اردو دانی) حیدرآباد کے زنانی و مردانی مرکزوں کے علاوہ جہاں آباد، کلیانی اور اورائی (یو۔پی) میں بھی تین دن تک لئے گئے۔

**ہفتہ۔ ۱۸؍جون**

شام کے سات بجے پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی اسپیکر بنگال اسمبلی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

**اتوار۔ ۲۶؍جون**

شام کے چار بجے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب علیگڈھ کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر سروری، سید محمد صاحب، محمد بن عمر صاحب، حمید الدین صاحب شاہد،

اکبرالدین صاحب صدیقی، نصیرالدین صاحب ہاشمی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**جمعہ۔ یکم جولائی**

سوشیل سنٹر انات محلہ چنچل گوڑہ کا افتتاح کیا گیا۔

**پیر۔ ۱۸ر جولائی**

شام کے ساڑھے چار بجے پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی بمبئی کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ پروفیسر سروری، سید محمد صاحب، نصیرالدین صاحب ہاشمی، ڈاکٹر حفیظ قتیل، حمیدالدین صاحب شاہد، اکبرالدین صدیقی صاحب، محمود حسین صاحب، محمد بن عمر صاحب وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**چہارشنبہ۔ ۲۷ر جولائی**

شام کے پانچ بجے ادارے کی مجلس امتحانات کا اجلاس منعقد ہوا جس میں جون کے امتحانات کے نتائج منظور کئے گئے، اور آئندہ امتحانات (اردو دانی اور زبان دانی) کی تاریخوں کا تعین کیا گیا۔

**پیر۔ یکم اگسٹ**

سوشیل سنٹر کوہ پر گلاب سنگھ کا افتتاح عمل میں آیا۔

**ہفتہ۔ ۲۰ر اگسٹ**

شام کے ساڑھے چار بجے شمس الدین اصغر صاحب لکچرار پشاور یونیورسٹی کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ زینت ساجدہ صاحبہ، محمود حسین صاحب، اکبرالدین صدیقی صاحب، حمیدالدین شاہد صاحب، سید محمد صاحب، محمد بن عمر صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔

**جمعرات۔ ۱۵ر ستمبر**

سوشیل سنٹر انات خیریت آباد کا افتتاح عمل میں آیا۔

**ہفتہ۔ یکم اکتوبر**

سوشیل سنٹر کوہ پر کھمی لال منیپورہ کا افتتاح کیا گیا۔

**اتوار۔ ۲ر اکتوبر**

صبح دس بجے ادارے کی مجلس انتظامی کا سہ ماہی اجلاس منعقد ہوا جس میں ریسرچ فیلوشپ، سوشیل سنٹرس، تعمیر عمارت ادارہ اور جدید مطبوعات کے بارے میں فیصلے کئے گئے۔ ارکان مجلس عمارت کا انتخاب عمل میں آیا۔

**جمعرات۔ ۶ر اکتوبر**

شام کے ۵ بجے مجلس عمارت کا اجلاس ہوا جس میں تعمیر عمارت ادارہ کی چند تفصیلات طے کی گئیں۔

**جمعرات۔ ۲۰ر اکتوبر**

سوشیل سنٹر کونڈہ مالیگاوہ کا افتتاح عمل میں آیا۔

**پیر۔ ۲۴ر اکتوبر**

سوشیل سنٹر کوہ پر کھمی لال منیپورہ میں یوم اقوام متحدہ منایا گیا۔

**چہارشنبہ۔ ۲۶ر اکتوبر**

شام کے ۷ بجے ایک محفل شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، [illegible]، شاہد صدیقی، کنول پرشاد کنول، سلیمان اریب اور [illegible] نے اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ ادارے کے اکثر معتمد [illegible] مجالس اور کارکن شریک رہے۔ کرتار سنگھ دگل اور ان کی بیگم صاحبہ، قمرالنساء [illegible]،

مسز سردار جعفری وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**جمعرات۔ ۲۷ر اکتوبر**

شام کے پانچ بجے ادارے کی مجلس تحقیق و ادب کا جلسہ ہوا جس میں ۱۹۵۶ء و ۱۹۵۷ء کے لئے اس مجلس کے ارکان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۱۹۵۶ء کی مطبوعات ادارے کے مسودے منتخب کئے گئے۔

**اتوار۔ ۶ر نومبر**

شام کے ۶ بجے ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ چیف منسٹر حکومت حیدرآباد نے ادارہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جس کی تفصیلات اور تقریریں سب رس بابت ڈسمبر میں شائع کی گئیں۔

**پیر۔ ۷ر نومبر**

سوشیل سنٹر کوچہ کشن لال ملیپورہ کی جانب سے یوم رحمۃ العالمین زیر صدارت نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ منایا گیا۔

**چہارشنبہ۔ ۹ر نومبر**

ادارے کے قدیم ساتھی اور مشہور شاعر مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی نے سرشام وفات پائی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "نمود زندگی" ۱۹۴۰ء اور "ترجمان زندگی" ۱۹۵۲ء ادارے کی طرف سے شائع ہو چکے ہیں۔

**منگل۔ ۲۲ر نومبر**

شام کے ۶ بجے [illegible] خان صاحب ناظم مکتبہ جامعہ کو چائے پر مدعو کیا گیا جس میں مولوی سید محمد صاحب، ڈاکٹر حفیظ قتیل، خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، اکبر الدین صدیقی صاحب، زینت ساجدہ صاحبہ، محمد بن عمر صاحب، مناظر علی صاحب [illegible]

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے بھی شرکت کی۔ اردو کے ناشروں کی تنظیم اور مطبوعات کی تشہیر و فروخت کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی۔

**چہارشنبہ۔ ۳۰ر نومبر**

ادارے کے اردو ریسرچ فیلوشپ کے لئے درخواستیں طلب کرنے کے لئے اخبارات میں اعلان کیا گیا۔

**جمعرات۔ یکم ڈسمبر**

سوشیل سنٹر چارمینار میں یوم کل ہند سماجی تعلیم زیر صدارت خواجہ حمید الدین صاحب شاہد معتمد اردو امتحانات و تعلیم بالغان منعقد ہوا۔ اور بالغان زیر تعلیم میں پیس اندازی کی اسکیم شروع کی گئی۔ ادارے کے دوسرے سوشیل سنٹروں میں بھی اسی تاریخ کو یوم کل ہند سماجی تعلیم منایا گیا۔

**جمعہ۔ ۹ر ڈسمبر**

شام کے ساڑھے چار بجے صوفی محمود خاں صاحب متعلم انگلینڈ کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر محمد یوسف الدین، نصیر الدین صاحب ہاشمی، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، خواجہ حمید الدین صاحب شاہد، زینت ساجدہ صاحبہ، سید محمد صاحب، ڈاکٹر حفیظ قتیل، جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی، محمد بن عمر صاحب، سلامت النساء بیگم صاحبہ، اکبر الدین صدیقی صاحب وغیرہ نے شرکت کی۔

**چہارشنبہ۔ ۱۴ر ڈسمبر**

شام کے ساڑھے پانچ بجے خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب ایڈیٹر منادی کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ اس صحبت میں دوست محمد اللہ الدین صاحب، فیاض الدین نظامی صاحب، ظہیر الدین احمد صاحب، عثمان سبحانی صاحب، مرزا فاروق علی صاحب صوفی، اکبر الدین صدیقی صاحب، عارف الدین حسن صاحب، ضامن علی صاحب غازی، مولانا حافظ محمد حامد صدیقی صاحب، دوست علی اشرف صاحب،

نصیر الدین صاحب ہاشمی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ اردو کے مستقبل اور رسم الخط کے بارے میں تبادلہ خیال کیا گیا۔

**منگل ۔ ۲۰ر دسمبر**

شام کے پانچ بجے ڈاکٹر بابورام سکسینہ صاحب پروفیسر سنسکرت الہ آباد یونیورسٹی و معتمد ہندی پرچارنی سبھا کو ادارے میں چائے پر مدعو کیا گیا۔ ڈاکٹر آر نیدر رشما، پروفیسر سروری، سید محمد صاحب، محمود حسن عمر صاحب، اکبر الدین صدیقی صاحب، بھال چندر کھالیکر صاحب، شام لال صاحب، شری اپادھیا، زینت ساجدہ صاحبہ وغیرہ نے بھی شرکت کی۔

**چہارشنبہ ۔ ۲۱ر دسمبر**

ادارے کی مجلس اردو انسائیکلوپیڈیا کے معتمد مولوی فیض محمد صاحب صدیقی نے صبح ۹ بجے وفات پائی۔ ان کی متعدد کتابیں ادارے کی طرف سے شائع ہوئی ہیں اور وہ ادارے کے ابتدائی طرح اندازوں میں سے تھے۔

**اتوار ۔ ۲۵ر دسمبر**

ادارے کے امتحانات اردو دانی و اردو زبان دانی حیدرآباد کے زنانہ و مردانہ مرکزوں کے علاوہ مرکز ویراج پیٹھ جنوبی کورگ میں ایک ساتھ منعقد ہوئے۔

---

# ادارے کی کتابیں

## معاصرین کی نظر میں

**راہ رو اور کارواں**

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے ۲۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنا جشن نقرئی منایا۔ یہ ادارہ ربع صدی سے دکن میں اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہا ہے اور خوشی کا مقام ہے کہ اس کا ولولۂ کار ہنوز روز اول کی طرح جوان ہے۔ زیر نظر کتاب ڈاکٹر عبد الحفیظ قتیل ایم' اے۔ پی ایچ ڈی پروفیسر اردو نظام کالج نے جشن نقرئی کی تقریب پر مرتب کی ہے۔ اس میں چونتیس ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات جمع کئے گئے ہیں جنھوں نے ادارہ ادبیات اردو کے لئے گزشتہ ربع صدی میں نظم و نثر لکھی۔ ان میں سے بعض برعظیم میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اردو میں ایسی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ اگر برعظیم پاکستان و ہندوستان کے تمام ان علاقوں میں جہاں اردو کے اچھے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اپنے اپنے حلقے کے موجودہ و گذشتہ اکابر ادب کے حالات شائع کرنے کا شوق پیدا ہو جائے تو جلد ہی اردو کے ادبا و مصنفین کا ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار ہو سکتا ہے۔ "راہ رو اور کارواں" دلچسپ بھی ہے اور پر از معلومات بھی۔
(الحمرا لاہور بابتہ جولائی ۱۹۵۵ء)

**گنج طلسم**

حضرت شاہ نعیم الدین نعمت اللہ ولی گولکنڈہ (دکن) کے ایک مشہور عالم اور صاحب معرفت بزرگ گزرے ہیں۔ ان کی فارسی مثنوی "گنج طلسم" کو ڈاکٹر حفیظ سید صاحب نے صرف ایڈٹ ہی نہیں کیا بلکہ سلیس اردو میں ترجمہ بھی فرما دیا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے اور صاحب مثنوی کے مختصر حالات فاضل مرتب اور مترجم نے قلمبند کئے ہیں۔ ڈاکٹر ایم حفیظ سید کی علمی تحقیقات پر رشید قریشی (ایم' اے) کا ایک مختصر سا تعارف بھی ہے۔ مثنوی گنج طلسم میں بڑی روانی اور [illegible] پایا جاتا ہے۔ (فاران دسمبر ۱۹۵۵ء)

# علمی و ادبی تعاون

۱۹۵۵ء میں بھی ادارۂ ادبیات اردو ملک کی دوسری علمی و ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں سے حسب سابق
ون کرتا رہا اور ان کا تعاون حاصل کرتا رہا۔

حکومت ہند کی ساہتیہ اکاڈیمی نے اردو کے ایسے ادیبوں اور شاعروں کی فہرست طلب کی تھی جو زندہ ہیں
اکیڈیمی کے قیام یعنی ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء تک زندہ تھے۔ اور جن کی قابل لحاظ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ فہرست ساہتیہ
یڈمی کی اس کتاب کے لئے درکار تھی جو ہندوستان کی جملہ زبانوں کے مشاہیر ادب کے بارے میں وہ مرتب کر کے
ئع کر رہی ہیں۔ چنانچہ ادارے نے تقریباً (۱۲۵) ادیبوں اور شعرا کے نام اور پتے حروف تہجی کے لحاظ سے مرتب
کے روانہ کئے۔

○

ساہتیہ اکاڈیمی نے محکمۂ تعلیم ہند کی خواہش پر اوائل ۱۹۵۶ء میں ہندوستانی زبانوں کی مطبوعات کی نمائش
رنے کا ذمہ لیا ہے اور ادارے سے خواہش کی کہ ادارے کے نوادر بھی اس کے لئے روانہ کئے جائیں چنانچہ ادارہ
نے تعاون کا وعدہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں مراسلت جاری ہے۔

○

ساہتیہ اکاڈیمی کی خواہش پر ادارے نے جملہ علوم و فنون کی مستند اردو کتابوں کی ایک مکمل فن وار فہرست بھی
مرتب کر کے روانہ کی

○

ادارے کے معتمد اعزازی ساہتیہ اکاڈیمی کی مجلس مشاورت کے رکن ہیں اور اس کے لئے اردو شاعری کا انتخاب
بھی مرتب کر رہے ہیں۔

○

ساہتیہ اکاڈیمی نے خواہش کی ہے کہ اردو کے ادب اطفال کی فہرست مرتب کر کے ارسال کی جائے۔ یہ کام اب
ہو رہا ہے۔

○

حیدرآباد کی ہندی پرچار سبھا کے ساتھ دکنی اردو کتابوں کو ناگری رسم الخط میں شائع کرنے کے کام میں

علمی و ادبی اور رقمی تعاون جاری رہا۔ چنانچہ چند کتابیں مثلاً سب رس از ملا وجہی، سیف الملوک و بدیع الجمال از غواصی اور قطب مشتری از ملا وجہی ناگری رسم الخط میں شائع ہو چکی ہیں اور چند اور کتابیں مثلاً کلیات محمد قلی قطب شاہ، کلیات بحری وغیرہ زیر طبع ہیں۔

○

جاپان کے پروفیسر اردو آرگاموصاحب کی خواہش پر ٹوکیو میں اردو کتب خانہ قائم کرنے کے لئے ادارے کی طرف سے (۱۵۰) کتابیں ارسال کی گئیں۔

○

چیکوسلواکیہ سے جان مارک صاحب نے پراگ میں اردو کتب خانہ قائم کرنے کے لئے ادارے سے مدد کی خواہش کی ہے جس کے بارے میں کارروائی جاری ہے۔

○

ہالینڈ اور اسرائیل میں اردو کتب خانوں کے قیام کی کارروائی بھی جاری ہے۔

○

حیدرآباد کی انجمن ترقی اردو، ہندی پرچار سبھا، تلگو ساہتیہ پریشد اور دیگر لسانی اداروں کے ساتھ مل کر ماہ اگست میں یوم ٹیگور کا اہتمام کیا۔

○

انجمن ترقی اردو کے اردو ہال میں دوسری کلچرل اور آرٹ انجمنوں کے ساتھ ازبکستان کے کلچرل وفد کی یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو استقبالیہ تقریب میں حصہ لیا۔

○

اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی کے ساتھ علمی و ادبی تعاون میں شرکت کی۔

---

# تاثرات

(ادارے کے کاموں سے متعلق مختلف اصحاب علم وفضل نے ۱۹۵۵ء میں جو تاثرات شائع کئے یا معتمد صاحب اعزازی کے نام روانہ کئے ان میں سے چند کا انتخاب۔)

## پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (ڈائرکٹر اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی)

یہ سہ ماہی ہمارے ہی لئے مبارک ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ اسی میں حیدرآباد دکن کے ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی (۲۵) سالہ نقرئی جوبلی کا جشن (۵) دنوں تک بڑی شان اور ادبی اہمیت کے ساتھ منایا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ادارہ دراصل اس خواب کی تعبیر ہے جو اہل دکن نے عرصہ ہوا ایک مرتبہ پھر اردو زبان وادب کو ہندوستان کے لئے مستند اور کارآمد بنانے کے لئے دیکھا تھا۔ اس ادارے کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ اگر ایک شخص بھی خلوص و ایثار سے عزم و استقلال کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہو جائے تو پھر نہ رفتار کی کمی رہتی ہے اور نہ مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ادارے نے اپنی ربع صدی کی زندگی میں جتنی بھی کتابیں شائع کیں اور تعلیم بالغان و توسیع اردو کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دیں وہ کسی بھی ادارے کے لئے قابل صد فخر ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں ادارہ نے حضرت امجد حیدرآبادی کی ڈائمنڈ جوبلی بھی منائی جو بہت کامیاب رہی۔

اس جشن کی دو ممتاز خصوصیتیں قابل ذکر ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اس میں ہر قوم اور جماعت کے نمائندوں نے دل کھول کر حصہ لیا اور دوسری یہ کہ یہ تقریروں کا ہنگامہ نہ تھا بلکہ اس میں جو مقالات پڑھے گئے وہ بڑی حد تک اردو کی تاریخ کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتے ہیں۔ خدا کرے ادارہ روز بروز یوں ہی ترقی کرتا رہے۔

(مطبوعہ "نوائے ادب" بابتہ اپریل ۱۹۵۵ء)

## پروفیسر ہارون خان شروانی (حیدرآباد)

سب رس جشن سیمیں نمبر نے پرانے سب رس کی یاد تازہ کر دی۔ اس پچھلے چھ مہینے میں مختلف اداروں نے جو اپنے اپنے جشن منعقد کئے ہیں ان کا گویا حرف آخری ادارے کا جشن سیمیں تھا۔ یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ آپ نے ملک کے تمام اردو پریمیوں کی توجہ از سر نو حیدرآباد کی طرف منعطف کرادی جو اردو زبان کا ایک دور میں نہیں بلکہ کئی دوروں میں گہوارہ رہا ہے۔ مجھے جشن سیمیں کے جلسوں میں حاضری کا موقع ملا اور میرا یہ تجربہ بہت سے اعتبارات سے انوکھا اور سبق آموز تھا۔ اللہ تعالیٰ ادارے کو اس سے بھی زیادہ استحکام بخشے اور آپ کو مدت دراز تک اردو زبان کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

سب رس بھی "ایک نئے موڑ" سے گذر رہا ہے۔ اس کے لئے بھی میری نیک تمنائیں قبول کیجئے۔ پچھلے کچھ دنوں سے بعض اعتبارات سے اس میں ذرا سی کمی محسوس ہوتی تھی وہ اب پوری ہوتی نظر آتی ہے اور پہلی

قسط کے طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اس شمارے کی کتابت، طباعت اور کاغذ ہے۔
میں ہر اعتبار سے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

## پروفیسر بھگوت دیال ورما (پونہ)

گذشتہ ماہ میں جب آپ کے ادارہ کو دیکھنے کا شرف آپ نے عطا فرمایا تھا اس وقت آنجناب نے اور آپ کے رفقاء کار نے خاکسار اور میری شاگرد کی جو ذرہ نوازی کی اس کے لئے میں اور میری شاگرد مسز اُشا اتھاپے نہایت ممنون ہیں۔

آپ کا بھیجا ہوا انگریزی کا دیتزہ بھی ملا۔ اردو کے ویتزے تو آپ نے اسی وقت مرحمت فرمائے تھے۔ ان سب کو پڑھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ آپ صاحبان بڑی جانفشانی سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ آپ سب کی عمر دراز کرے اور علم دوستی میں ترقی دے تاکہ ہم جیسے دور افتادہ بھی آپ کی تصنیفات سے فائدہ اٹھاسکیں۔ آمین۔

زمانۂ قدیم میں ایک شاعر نے کہا تھا ؎

"دیدن روئے سلاطین دیدہ روشن می کند"

لیکن حقیر کا خیال ہے کہ ــــ

"دیدن روئے ادیباں دیدہ روشن می کند"

اور آپ کے ادارے کے معزز و ممتاز اراکین صاحبان کے درشن کر کے مجھے جو سرور قلبی حاصل ہوا وہ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ خوشی اور احسان کی یاد کبھی دل سے نہ جائے گی۔ آپ صاحبان کے لئے یہی عرض کر سکتا ہوں کہ ؎

ایں سلسلۂ طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

قادر مطلق آپ سب کو ہمیشہ علم کی خدمت میں ہی قیمتی زندگی گذارنے کا موقع دے۔

مسز اُشا اتھاپے نے آپ کی خدمت میں ادارے کا ایک فوٹو بھیجا ہے ملا ہوگا۔ وہ بھی آپ کی درازئ عمر کے دعا کرتی ہیں اور بہت احسان مند ہیں۔

# دو ساتھی بچھڑ گئے

۱۹۵۵ء اردو دنیا کے لئے اتنا منحوس ثابت ہوا ہے کہ اہل اردو عرصہ تک اس کو یاد رکھیں گے۔
ادارہ ادبیات اردو کے دو قدیم ساتھی بھی اس سال اس سے بچھڑ گئے۔

(۱)

مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے نام سے اردو دنیا عرصہ سے واقف تھی۔ ان کی نظمیں ساقی، ہمایوں وغیرہ میں گذشتہ ربع صدی میں پابندی سے چھپتی رہی ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "نمود زندگی" ادارے نے آج سے پندرہ سال قبل ۱۹۴۰ء میں چھپوایا تھا اور دوسرا مجموعہ "ترجمان زندگی" گذشتہ سال ہی شائع کیا تھا۔ وہ ایک وضع دار اور نیک منش انسان تھے اور اپنے کلام میں زیادہ تر عوامی زندگی کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان کی شاعری حقیقت کا آئینہ ہوتی تھی۔ وہ تکلف اور آورد اور فرضی مضامین کی طرف کبھی دھیان نہ دیتے تھے۔ اسی لئے مشاعروں اور محفلوں سے گھبراتے تھے۔ ان کی گوشہ نشینی اور محفل آرائی سے نفرت ان کی وضعداری کے باعث تھی۔ موجودہ سوسائٹی جو ایک عبوری دور کے انتشار اور مختلف و متضاد نقاط نظر کے ٹکراؤ کا شکار ہو رہی ہے ان کی افتاد طبع کو بہت کم بھاتی تھی۔

وہ اگرچہ آخر وقت تک اپنی وضع نہ چھوڑ سکے لیکن زمانے کے جدید رجحانات سے غیر محفوظ بھی نہ رہے اور کوشش کرتے رہے کہ کچھ دور اس کے ساتھ بھی چلیں۔ جیسا کہ ان کی بعض نظموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اپنے رنگ کے ایک ایسے باکمال شاعر تھے اور اپنے کلام میں اپنی وضع کو اس خوبی سے نبھاتے تھے کہ ان میں ایک انفرادی اور استادانہ شان پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ عہد حاضر کا کوئی شاعر ان کی اس آن بان میں ان کا حصہ نہ بن سکا۔

ان کے کلام کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں۔ وہ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے اور نثر کی کتابوں کے مسودے مجھے دکھائے بھی تھے اور ادارے کی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے۔ نقد سخن اور فن شعر پر بھی ایک ایک کتاب لکھی تھی۔ افسوس ہے کہ اچانک دو چار روز کی علالت میں ۹ر نومبر کو سر شام انتقال کر گئے۔ اور جب کالج میں مجھے اس کی اطلاع ملی تو میں فوراً چند احباب کے ساتھ ان کے مکان پر پہنچا۔ وفات کے بعد بھی ان کے چہرے پر وہی لاابالی پن اور معصوم مسکراہٹ نمایاں تھی جو ان کی ہر ملاقات میں ملنے والوں کا دل لبھایا کرتی تھی۔

انھوں نے اپنے شہر اور محلہ اور گلی میں بھی گمنام زندگی ہی گذار دی۔ چنانچہ ان کی گلی میں جب ان کے ہمسایوں سے ان کا نام بتلایا اور مکان دریافت کیا تو انھوں نے نہ صرف ان کی وفات سے لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ

ان کے نام سے بھی ان کو نہ پہچان سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موت کے بعد بھی محفل آرائی اور مجمع اور شور و شغب نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ سوائے حضرت امجد کے کوئی اور قابل ذکر ہستی ان کی میت میں شریک نہ رہی۔

(۲)

ابوالمکارم مولوی فیض محمد صدیقی صاحب ادارہ ادبیات اردو کے ابتدائی رفیقوں میں اس کے طرح انداز ہو میں ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ مجھے تقریباً تیئیس سال سے ان سے تعلق خاطر رہا۔ وہ جامعہ عثمانیہ کے ایک اقامت خانہ مسرت منزل میں میرے کمرے سے متصل مقیم تھے اور اپنے عجیب ڈھب، سادگی اور بے تکلفی اور اپنی گفتگو کی وجہ سے اپنے ہم چشموں میں بہت ممتاز اور ملاقاتیوں اور دوستوں کے محبوب تھے۔ تصنیف و تالیف یا ذوقِ علمی کے زمانے ہی سے شوق تھا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔ لیکن محض اسی کے ہو کر نہ رہے۔ محفل آرائی اور دوستوں اور کھیل تماشوں کے بھی ہمیشہ دلدادہ رہے۔ دوستوں کے ساتھ آخر وقت تک نبھایا۔ ان کے قریب ترین احباب میں بعض بڑے عہدوں پر بھی فائز ہوئے اور اب تک ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک ہمیشہ فیض محمد کی دوستی پر ناز کرتا رہا حالانکہ وہ اپنی اعلیٰ لیاقت اور مسلسل محنت کے باوجود مرتے دم تک مدرسہ کی مدرسی ہی پر کارگذار رہے۔ مولوی میر مظہر حسین صاحب ناظم بندوبست اور مولوی غلام حیدر صاحب رکن بورڈ آف روینیو کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات رہے۔ اور اول الذکر کے یہاں تو وہ رات میں دیر تک بے تکلف اور خوش و خرم وقت گذار کر گھر آئے تھے اور جب صبح اٹھے اور مدرسہ کو جانے کی تیاری کرنے لگے تو اچانک فوت ہو گئے۔ وہ زندگی میں جس طرح ہر مشکل سے ایک خاص لاپروائی کے ساتھ لاابالی انداز میں نبھڑتے تھے موت سے بھی وہی سلوک گوارا رکھا۔ کوئی کشمکش، زحمت اور علالت سے دوچار نہیں ہوئے۔

ادارۂ ادبیات اردو کے تقریباً ہر کام اور ہر شعبہ سے ان کا تعلق رہا۔ کسی وقت بھی کسی کام سے منہ نہیں موڑا۔ جب ادارے نے اردو انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا تہیہ کیا تو فیض محمد صاحب سے بڑھ کر ہمہ جہتی معلومات رکھنے اور بے تحاشا کام کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اور انہی کو اس شعبہ کا معتمد مقرر کیا گیا۔ چنانچہ وہ اس کام میں ایسے گتھ گئے کہ گھر دار، بیوی بچوں اور ملازمت کی بھی فکر نہ رہی۔ مجبور کر کے رخصت کی درخواست دلائی اور محکمہ سے نصف تنخواہ پر رخصت منظور کرائی اور عرصہ تک ادارے سے اس کا تکملہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ کئی سال اس طرح انھوں نے ادارے میں گذار دیئے اور معتمد سے لے کر اہلکار اور چپراسی تک کا کام کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ وہ دھن کے بڑے پکے تھے لیکن بعض اوقات جب کبھی کام سے جی اچاٹ ہو جاتا تو اپنے مذکورہ بالا دوستوں کے یہاں پہنچ جاتے اور دو دو تین تین دن اپنے کام اور ادارے سے غائب ہو جاتے۔

افسوس ہے کہ حیدرآباد میں ۱۹۴۶ء سے جو سیاسی طوفان شروع ہوا وہ جیسے جیسے بحرانی کیفیت میں مبتلا ہوتا گیا اردو انسائیکلوپیڈیا کا کام پیچھے پڑتا گیا۔ اس وقت کے عہدہ دار اس کی اہمیت سے واقف نہ تھے یا واقف ہونا نہیں چاہتے تھے۔ امداد اور ہمت افزائی کے فقدان سے فیض محمد صاحب اور ارباب ادارہ کا دل کھٹا ہو گیا۔ آخرکار فیض محمد صاحب سرکاری ملازمت میں رجوع ہو گئے اور تعلیمات کی مدد کی سے ترقی کر کے اس وقت کے وزیر تعلیم کے پرسنل مددگار بن گئے۔ مگر جب یہ سیاسی بحران ختم ہوا اور وہ وزارت ٹوٹ گئی تو فیض محمد صاحب پھر اپنی

قدیم خدمت مدرسی پر لوٹا دیئے گئے یہاں تک کہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء میں صبح ۹ بجے ان کا انتقال ہوگیا۔

فیض محمد صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہوئیں۔ وہ ایم۔ایڈ تھے اور تعلیم و تدریس کے اصولوں پر ماہرانہ دست رس رکھتے تھے۔ ایک کتاب مصلحان تعلیم لکھی تھی جو تقریباً پچیس سال قبل شائع ہوئی۔ مسولینی اور ابن سعود کے حالات زندگی پر بھی دو کتابیں شائع کیں۔ ادارے نے جب بالغوں کے لئے معلوماتی کتابوں کا سلسلہ شروع کیا تو فیض محمد صاحب نے "آبدوز اور سرنگ" "پانی کی کہانی" "عمادالملک" "دادا بھائی نوروز جی" اور دیگر متعدد کتابیں اس کے لئے لکھ دیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا کے لئے بھی سینکڑوں مضامین قلمبند کئے۔ نصابی کتابوں اور ان کی شرحوں کا سلسلہ الگ جاری رہا۔ غرض لکھنے اور چھپوانے سے کبھی نہیں گھبراتے اور ہر وقت ایک نیا کام اور نیا سلسلہ ان کے پیش نظر رہتا تھا۔ زندگی کو رجائی انداز میں دیکھتے اور رہتے تھے۔ ناامیدی اور یاس پر بھی اگر وہ مضمون لکھتے تو امید اور خوشی و فرحت سے معمور ہو جاتا۔

افسوس ہے کہ ادارہ ایک ایسے باہمت اور شگفتہ ساتھی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

---

## آہ! حضرت منظور ــــــــــ خورشید جنیدی

فرد کے ہوش و حواس گم ہیں ذرا جنوں کو پکار لینا
وفاتِ منظور کی خبر اے ندیم پھر اس کے بعد دینا

نہیں ہے تابِ فغاں نہیں ہے نہیں ہے یارائے غم نہیں ہے
خبر نہیں تجھ کو دوست یہ موت اک قیامت سے کم نہیں ہے

یہ کیا کہا یہ اسی کی میت ہے سامنے جو رکھی ہوئی ہے
وہ کیسی تکلیف تھی نہ جانے کہ جان لے کر ہی جو ٹلی ہے

اٹھا کے چادر کو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہو رہا ہے
کشاکشِ زندگی سے تھک کر ابھی ابھی جیسے سو گیا ہے

وہی ہے عالم شگفتگی کا اسی طرح رخ پہ تازگی ہے
سکون چہرے سے ہے نمایاں لبوں پہ اب بھی دبی ہنسی ہے

یہ کیا ستم ہے یہ کیا غضب ہے یہ کیسا غم ہے غم مسلسل
وہ آج خاموش ہوگیا جس پہ خود تکلم کو ناز تھا کل

وہ پیکرِ مہر جس نے میری خلوص کے ساتھ رہبری کی
وہ شاعرِ باکمال جس نے کمال کی رہ مجھے دکھائی

زباں کا مالک بیاں پہ قادر شعورِ محاکات کیا نہیں تھا
انیس کی یاد تازہ کر دی نظیر کی طرز کو نکھارا

نشستِ ہر لفظ سے ہے ظاہر کمال اسی کے کمالِ فن کا
اسی کے حصے کی چیز تھی انتخابِ الفاظ کا سلیقہ

کہیں تو نازک خیالیاں ہیں کہیں خیال آفرینیاں ہیں
کہیں نظر دوربیں بنی ہے کہیں تو باریک بینیاں ہیں

بچشمِ غائر کیا تھا برسوں مشاہدہ جس نے زندگی کا
کیا بہ انداز نو بہ نو پیش تذکرہ جس نے زندگی کا

وہ مردِ عارف چلا گیا زندگی سے منہ موڑ کر اچانک
ہائے کیا مصلحت تھی اس میں کسی کو ہونے نہ دی خبر تک

---

# جدید تنظیم کتب خانہ مطبوعات

## ادارۂ ادبیات اردو کا افتتاح

ادارۂ ادبیات اردو کا کتب خانہ اردو دنیا میں غیر متعارف نہیں ہے۔ اس کے مخطوطات کے دو تفصیلی تذکرے شائع ہو چکے ہیں اور انھوں نے اردو کے تحقیقی کام کرنے والوں میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ پہلی جلد تو اب کمیاب ہو گئی ہے۔

مخطوطات کے ساتھ ادارے کے کتب خانہ میں مطبوعات کا بھی رفتہ رفتہ کافی اہم ذخیرہ جمع ہونے لگا اور بعض کتابیں جو آج کل اردو دنیا میں نادر اور نایاب سمجھی جاتی ہیں وہ بھی حسن اتفاق سے اس میں محفوظ ہو گئی ہیں۔

اس کتب خانے کی تنظیم اور نگرانی کا کام ابتداء میں ایک علم دوست نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار نے اعزازی طور پر انجام دیا اور سالہا سال تک وہ یہ خدمت محض اپنے علمی و ادبی ذوق کی بناء پر انجام دیتے رہے جس کیلئے ادارہ ان کا ہمیشہ شکر گزار رہے گا۔ انھوں نے ادارہ کے کتب خانے کو واقعی ایک کتب خانہ بنا دیا اور فہرست کتب کے نہ صرف رجسٹر کے رجسٹر اپنے قلم سے لکھے بلکہ کارڈس بھی مرتب کئے۔ دوست و احباب کے کتب خانوں سے کتابیں حاصل کیں اور جو عطیے دینے پر راضی نہ ہوئے ان کو فروخت کر دینے پر مجبور کیا۔ افسوس ہے حیدرآباد کے سیاسی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کی خانگی ضروریات اور حالات میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی اور اس کے بعد وہ ادارے کو اپنا قیمتی وقت نہ دے سکے

اس اثناء میں کتابیں برابر جمع ہوتی رہیں اور جب ان کی تعداد دس ہزار سے بڑھ گئی اور ملک کے سیاسی حالات میں اعتدال پیدا ہو گیا تو ستمبر ۱۹۵۲ء میں ادارے کی تنظیم جدید کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس تنظیم میں سب سے پہلے کتب خانے کی طرف توجہ کی گئی۔ اس سلسلہ میں مقامی ماہرین کتب خانہ کی ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ، مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ، مولوی مسعود یزدانی صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ، مولوی سید محمد صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ، جناب راجندر پرشاد صاحب لکچرار چادر گھاٹ کالج وغیرہ شامل ہیں۔ اس کمیٹی کے معتمد مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب لکچرار اردو سٹی کالج مقرر ہوئے۔

اس کمیٹی نے کتب خانوں کے جدید ترین طریقۂ تنظیم اور ادارہ کے کتب خانے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر فوراً تقسیم کا ایک خاکہ مرتب کیا اور اس کے مطابق کتب خانے کی تنظیم اور فہرست کی تیاری کا کام مولوی اکبر الدین صاحب صدیقی اور مولوی غلام رسول صاحب مرتب فہرست کتب خانہ سٹی کالج کے سپرد کیا۔ ان دونوں اصحاب نے ایک سال کے عرصے

میں کتب خانے کی جملہ کتابوں کو پہلے زبانوں (یعنی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی) کے لحاظ سے الگ الگ کیا اور پھر ازدو کتابوں اور رسائل و جرائد کی فن وار تنظیم کر کے علیحدہ علیحدہ الماریوں میں رکھا اور فہرست کی پہلی جلد طباعت کے لئے تیار کی۔

حسن اتفاق سے یہ جلد چھپ کر اوائل جنوری میں مطبع سے آئی اور جب آنریبل ڈاکٹر سید محمود وزیر وزارت خارجہ کے ورود حیدرآباد کی اطلاع ملی تو اس موقع کو غنیمت غیر مترقبہ جان کر اس جدید تنظیم شدہ کتب خانہ کا افتتاح ان کے دست مبارک سے کرایا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف باوجود کثیر معروفیات کے ازراہ علم دوستی ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء کو شام میں ساڑھے چھ بجے ادارے پر تشریف لائے اور افتتاح کے لئے وقت مرحمت فرمایا۔ اس تقریب میں سو سے زیادہ مہمان شریک ہوئے جن میں ادارے کے مختلف مجلسوں اور کمیٹیوں کے ارکان اور ہمدردوں کے علاوہ حیدرآباد کے علمی و ادبی و کلچرل کارکن بھی شامل ہیں۔

**علمی و ادبی و کلچرل خدمتگار**

ڈاکٹر سید عبداللطیف صدر انجمن ہند مشرقی تعلقات۔ جانکی پرشاد صاحب معتمد اردو مجلس۔ مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب صدر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس و سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ ڈاکٹر ناظر یار جنگ۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ سلیمان اریب صاحب ایڈیٹر صبا۔ رمن راج سکسینہ صاحب ایڈیٹر سب رس۔ نصیر الدین صاحب ہاشمی معتمد کتب خانہ خواتین دکن مہا دی نقشبندی صاحب۔ سکینہ بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ مہدی نواز جنگ۔ منسٹر طبابت۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال۔ عارف الدین حسن صاحب۔ مرزا ضامن علی صاحب غازی۔ عالم خوندمیری صاحب معتمد پریم چند سوسائٹی۔ مولوی محمد سلطان صاحب۔ مولوی حسن الدین احمد صاحب۔ مولوی ضیا محی الدین صاحب آرکیٹکٹ۔ رشید قریشی صاحب۔ غلام رسول صاحب۔ پی ہنمنت راؤ صاحب ڈپٹی منسٹر مال۔ حسن نعیم صاحب۔

**یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر ارباب علم**

ڈاکٹر قاری قطب الدین صاحب۔ ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب نائب ناظم آثار قدیمہ۔ مولوی مسعود یز دانی صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ عثمانیہ۔ مولوی سید محمد صاحب۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل سید ابوالفضل صاحب۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد۔ اکبر الدین صدیقی صاحب۔ مولانا حافظ محمد حامد صاحب صدیقی۔ شام لال صاحب۔ سید معین الدین قادری صاحب۔ تصدق فاطمہ صحنی صاحبہ۔ سید حمید شطاری صاحب۔ رشید الحسن صاحب۔ رامچندر پرشاد صاحب۔ مظہر احسن گیلانی صاحب۔ مولوی مظفر حسین صاحب۔ احمد اللہ خاں صاحب۔ محمد بن عمر صاحب۔

**دیگر علم دوست اصحاب و خواتین**

سری کرشن سہنا صاحب معتمد مالگزاری۔ مولوی محمد حسین حالی صاحب انجنیر۔ کشن داس دلیلہ صاحب۔ مولوی سید رحمت اللہ صاحب سابق ناظم رجسٹریشن۔ مولانا سید علی اکبر صاحب بلگرامی سابق صوبہ دار۔ ملا عبدالباسط صاحب۔ نواب میر باسط علی خاں صاحب سابق ہائیکورٹ جج۔ مسز کملا سہگل۔ رشا جہاں بیگم صاحبہ ایم ایل لے۔ مولوی عبدالحمید خاں سابق وزیر عدالت۔ برگیڈیر علی احمد صاحب۔ فلائیٹ لفٹنٹ ونود سہگل صاحب۔ میر مظفر علیخاں صاحب۔ مولوی عبدالرحیم صاحب۔ گروراج پرشاد صاحب۔ ڈاکٹر وحید النساء بیگم۔ قاری واحد علی صاحب۔ لالہ دیوی دیال صاحب۔ سید غلام افضل بیابانی صاحب۔ مولوی سید عبدالعلی صاحب۔ میر اعظم علیخاں صاحب۔ عارف علیخاں صاحب۔ عطا اللہ شاہ بخاری صاحب۔ سوا سندرم صاحب سیاسیٹ سکریٹریس صاحب۔ مولوی شہاب الدین صاحب سابق نائب ناظم اطلاعات۔ شری سیوا چندرا صاحب۔ مولوی محبوب علیخاں صاحب رجسٹرار۔ مولوی سید عبداللہ صاحب۔ مولوی مظہر اللہ صاحب۔ میر رضا علیخاں صاحب۔ مولوی حبیب محمد صاحب سابق صوبہ دار و ۔۔ راجہ امین چند صاحب۔ مولوی کرم اللہ خاں صاحب۔

# استقبالیہ تقریر

## از: نواب لیاقت جنگ بہادر صدر ادارہ

میں نہایت مسرت کے ساتھ اپنی اور ارباب و ارکان ادارۂ ادبیات۔ اردو کی طرف سے آج شام ادارے میں آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

یہ ادارہ آج سے پچیس ۲۵ سال قبل قائم ہوا تھا اور گذشتہ سال اسی ماہ اس کی سلور جوبلی کی تقریبات منائی گئی تھیں جن کا افتتاح حیدرآباد کے عہد دست چیف منسٹر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا اور جن میں شرکت کے لئے حیدرآباد کے باہر سے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ حضرت جگر مرادآبادی۔ جناب قاضی عبدالغفار صاحب مولانا عبدالوہاب بخاری۔ جناب جوش ملیح آبادی۔ جناب بالمکند عرش ملسیانی جیسے اصحاب بھی حیدرآباد تشریف لائے تھے۔

۱۹۵۵ء ادارے کی تاریخ میں اس لئے بھی ایک یادگار سال ثابت ہوا کہ اس سال ماہ نومبر میں اس کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اور جو جد و جہد سر اکبر حیدری مرحوم کے زمانے سے شروع ہوئی تھی اور جس کے لئے ادارے نے سالہا سال سے رقم جمع کر رکھی تھی۔ اس سال ایک زمین کے بطور عطیہ حاصل ہونے کی وجہ سے تکمیل کو پہنچی اور جناب اس وقت جہاں تشریف فرما ہیں اس کے قریب ہی یہ زیر تعمیر عمارت جناب کے ملاحظہ سے گذرے گی۔ اس کا جو عمدہ نقشہ ملک کے مشہور آرکیٹکٹ مولوی فیاض الدین صاحب نے تیار کیا ہے اس کو بجائے خود آرٹ کا ایک نمونہ سمجھا جا رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ڈاکٹر طاہر سیف الدین صاحب نے اس کو ملاحظہ فرما کر اتنا پسند کیا کہ اس کے جلد تکمیل پانے کی دعا فرمائی اور اس کی کمان پر اپنے ہاتھ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر فرما دیا۔

اس ادارہ کا کام جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا مختلف شعبوں اور جلسوں کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے۔ اس کی تقریباً پچاس شاخیں مختلف لسانی علاقوں میں کام کر رہی ہیں۔ جن میں دار المطالعے قائم ہیں اور اردو زبان اور ادب کا ذوق عام کرنے کے لئے ادارے کے اردو امتحانات کے نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ امتحانات ۱۹۴۴ء سے لئے جا رہے ہیں اور ان کی وجہ سے اب تک ہزاروں ناخواندہ لوگ خواندہ بن گئے کیونکہ ادارے نے مشہور ماہر تعلیم مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی میں ناخواندہ بالغوں کو اردو سکھانے کے لئے بڑے مفید قاعدے مرتب اور شائع کرائے جو بہت مقبول ہوئے۔

اردو کا ذوق بلند کرنے کے لئے اردو عالم اور اردو فاضل جیسے امتحانات بھی ادارے نے رائج کئے جن میں شریک ہو کر اب تک سینکڑوں امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ خود شہر حیدرآباد میں ادارے کی طرف سے اکتالیس تحصیلی مراکز

قاہرہ میں بھی اردو کی تعلیم کے علاوہ مختلف علمی اور کلچرل مصروفیات جاری ہیں۔

ادارے کا ایک شعبہ دکن کی تاریخ اور کلچر پر تحقیقی اور علمی کام انجام دیتا رہا ہے۔ چنانچہ اس کے تحت متعدد تاریخی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور خاص کر یہاں کے شہروں مثلاً گولکنڈہ، قندھار دکن اور بالکنڈہ کی تاریخوں کے علاوہ دکن کی مشہور تاریخی شخصیتوں کے سوانح حیات بھی یہ شعبہ شائع کر چکا ہے۔

دکن کے قدیم و جدید شعراء و مصنفین کی نسبت بھی اس ادارے نے خاص کام کیا ہے اور نہ صرف ان کے تذکرے اور کلام کے مجموعے اور انتخابات مرتب اور شائع کئے ہیں بلکہ ان کی یادگاروں کی حفاظت کا کام بھی انجام دیتا رہا ہے۔

نوخیز شعراء و مصنفین کی ہمت افزائی اور ان کی نظم و نثر کی اشاعت کی طرف بھی ادارے نے بڑی توجہ کی اور ایسے کہ قیام کے اغراض و مقاصد میں دراصل اس کام کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ تقریباً پچاس شعراء و مصنفین ادارے کی طرف سے اردو دنیا میں روشناس کئے گئے اور ان کا ایک تذکرہ مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل سلور جوبلی کے موقع پر "راہ رو اور کارواں" کے نام سے شائع کیا گیا۔

اردو میں تحقیقی کام کو جاری رکھنے کے لئے ادارہ پچاس روپیہ ماہانہ کے دو ریسرچ فیلوشپ بھی کئی سال سے دیتا آیا ہے جس سے اب تک علیگڈھ، آگرہ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی کے طلبا استفادہ کر رہے ہیں۔

ادارے کا ایک شعبہ بچوں کے ادب کے لئے بھی مخصوص ہے اور اس نے تقریباً دو درجن باتصویر اور دیدہ زیب کتابیں بچوں اور ان پڑھ بالغوں کے لئے تیار کرا کے چھپوائیں۔ اسی طرح ادارے کے شعبہ نسواں نے عورتوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ایک درجن کتابیں مرتب اور شائع کرائیں۔

اس ادارے نے اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا کام بھی شروع کیا اور پہلی جلد مرتب کر کے ابتدائی ۴۰ صفحات بھی شائع کر دیئے۔ مگر افسوس ہے کہ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے یہ کام تشنۂ تکمیل رہا ہے۔

گذشتہ سال ادارے کی سلور جوبلی کے ساتھ اردو میں لفظ شماری کے کام کی بنا ڈالی گئی تھی اور مولوی حسن الدین احمد صاحب ایم۔ اے جو اس تجویز کے محرک ہیں اس کا عملی تجربہ حاصل کیا اس کے بعد متاثر ہوئے تھے چنانچہ انھوں نے اس اثناء میں چند ہندوستان کے ایسے احباب سے مراسلت کی جو اس کام میں مدد دے سکتے ہیں اور ان کو تعاون پر راضی کر لیا۔ اس کا ایک لائحہ عمل بھی بن چکا ہے۔ چونکہ اس کام کے لئے کافی رقم کی ضرورت ہے اس لئے وزارت تعلیمات حکومت ہند سے جس نے اپنے منصوبے میں اس کام کو بھی شریک کیا ہے رقمی امداد چاہی گئی ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ مولوی حسن الدین احمد صاحب نے گذشتہ سال (۱۲۰۰) بارہ سو اردو کتابیں جاپان کے پروفیسر آرہ موٹو صاحب کو روانہ کیں جس میں ادارہ ادبیات اردو کی تقریباً (۱۵۰) مطبوعات شریک تھیں۔ چند دن کی یہ تحریک نہایت کامیاب رہی اس لئے موجودہ سال ادارے نے اس کام کو بھی آگے بڑھانے کا تہیہ کیا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کو اردو کتابیں روانہ کرنے کا کام ایک ذیلی کمیٹی کے تفویض کیا گیا ہے۔ اس طرح بہت قریب میں اسرائیل میں اردو کی ایک لائبریری قائم ہو جائے گی جو آنریبل ڈاکٹر سید محمود صاحب کے اسم گرامی سے موسوم ہوگی۔

ادارہ نے اردو کا ایک مکمل حوالہ جاتی کتب خانہ قائم کرنے کا شروع ہی سے اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ اس میں

[illegible] مطبوعہ اور قلمی کتابیں محفوظ ہیں۔ ادارے کی قلمی کتابوں کا ذخیرہ تمام اردو [illegible]
[illegible] اور جس میں سے پانچ مخطوطات کے مبسوط تفصیلی تذکرے کی [illegible] جلدیں ہیں
اس کے مصنف ڈاکٹر زور صاحب نے مرتب کیں جو شائع ہو چکی ہیں۔
[illegible] مطبوعہ کتابوں کو جدید اصول پر ترتیب دینے اور ان کی فن وار فہرست [illegible] کے شائع کرنے کا کام [illegible]
[illegible] ایک کمیٹی بنائی گئی جس میں مولوی خواجہ محمد احمد صاحب ناظم آثار قدیمہ۔ ڈاکٹر
محمد راحت اللہ خان صاحب کیوریٹر کتب خانہ آصفیہ۔ مولوی مسعود یزدانی صاحب مہتمم کتب خانہ [illegible] اور مولوی
[illegible] صدیقی صاحب [illegible] معتمد اعزازی کتب خانہ ادارہ جیسے اصحاب شامل ہیں جنہوں نے جدید [illegible]
[illegible] کتب خانے کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر فن وار تقسیم کا ایک خاکہ مرتب کیا اور اس کے مطابق کتب خانہ
[illegible] تنظیم اور فہرست کی تیاری کا کام مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب اور مولوی غلام رسول صاحب مرتب فہرست کتب خانہ
سٹی کالج کے سپرد کیا۔ ان اصحاب نے ایک سال کے عرصہ میں کتب خانہ کی جملہ کتابوں کو پہلے زبانوں (اردو، فارسی، عربی
[illegible] انگریزی) کے لحاظ سے تقسیم کیا اور پھر اردو کتابوں اور رسائل و جرائد کی فن وار تقسیم کر کے علیحدہ علیحدہ الماریوں
میں رکھا اور فہرست کی پہلی جلد مطبوعہ کے لیے تیار کی جس میں پانچ ہزار کے قریب کتابوں اور [illegible] رسالوں کی تفصیلات
درج کی گئی ہیں۔ یہ ایک حسن اتفاق ہے کہ جناب کے ورود مسعود کے زمانے میں یہ فہرست [illegible]
[illegible] اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کے کتب خانہ کی مطبوعات تک عوام و خواص کی رسائی ممکن ہو سکی ہے۔ ورنہ
ہر کتاب کے لئے جملہ رجسٹروں میں تلاش کر کے [illegible] مطلوبہ کتاب برآمد ہو سکتی تھی۔ [illegible]
[illegible] کتب خانہ کا افتتاح جناب کے ہاتھوں عمل میں آ رہا ہے اور اسی کی فہرست کا پہلا نسخہ
جناب کے ملاحظہ کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ ادارے کے کتب خانے میں سینکڑوں ایسی
نادر کتابیں موجود ہیں جو اب نایاب ہو چکی ہیں۔ [illegible] فورٹ ولیم کالج۔ نصیر الدین حیدر۔ شمس الامراء اور قدیم اردو کی
[illegible] چھپائی ہوئی کتابیں [illegible] ۱۸۵۷ء سے پہلے کے چھپے ہوئے اخباروں اور رسالوں کے فائل بھی شامل ہیں۔
[illegible] کی تکمیل کے لئے جناب ادارہ مولوی اکبر الدین صدیقی صاحب [illegible] کا
[illegible] اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ فارسی مطبوعہ کتب کی فن وار فہرست بھی جو آجکل مرتب کر رہے ہیں جلد مکمل
کر دیں گے۔ چونکہ اردو زبان اور شعر و سخن کے بیشتر تذکرے فارسی [illegible] کی مدد کے بغیر اپنے
[illegible] کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام اردو دنیا [illegible] ادارے کے کتب خانے سے استفادہ
[illegible] ڈاکٹر شائستہ [illegible]۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی [illegible]۔ ڈاکٹر خواجہ احمد
[illegible] ڈاکٹر حفیظ سید الہ آباد۔ [illegible] اور [illegible]
[illegible] سروری صاحب [illegible] اصحاب ہیں
جنھوں نے ادارے کے کتب خانے سے [illegible] استفادہ کیا۔

۳۱ [illegible] ہندوستان کے اکثر مشاہیر مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی۔ مولانا حسرت موہانی [illegible]۔ [illegible]
ڈاکٹر رام بابو سکسینہ۔ مسٹر غلام محمد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی [illegible] نائیڈو۔ ڈاکٹر [illegible]

نیاز فتحپوری۔ خواجہ ناظم الدین۔ ڈاکٹر سینتی کمار چیٹرجی۔ سر حسان سہروردی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ مولانا حفظ الرحمن اور اردو کے اکثر دبیشتر پروفیسر اور شعرا اور صاحبان کمال ادارے کے معائنے کے لئے تشریف لائے اور اس کی مصروفیات اور خدمات پر اظہار خوشنودی فرما چکے ہیں۔ آج ہم مسرور ہیں کہ جناب یگانہ صرف یہاں تشریف فرما ہوئے ہیں بلکہ ہمارے کتب خانہ کے شعبہ مطبوعات کا افتتاح بھی فرما رہے ہیں۔ ہم سب جناب کی اس زحمت فرمائی کیلئے شکرگزار ہیں۔

"ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ اردو دنیا میں غیر متعارف نہیں ہے۔ اس کے مخطوطات کے دو تفصیلی تذکرے شائع ہو چکے ہیں اور انھوں نے اردو کے تحقیقی کام کرنے والوں میں اتنی مقبولیت حاصل کی کہ پہلی جلد تو اب کمیاب ہو گئی ہے۔ یہ جلد تذکرہ اردو مخطوطات کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی تھی اور کراؤن سائز کے (۴۰۰) صفحات پر مشتمل تھی۔ دوسری جلد ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور ہندی کے (۵۰۰) مخطوطات کا تذکرہ ہے۔ تیسری ابھی زیر ترتیب ہے۔

مخطوطات کے ساتھ ادارے کے کتب خانے میں مطبوعات کا بھی رفتہ رفتہ کافی اہم ذخیرہ جمع ہو گیا اور بعض کتابیں جو اس وقت اردو دنیا میں نادر اور نایاب سمجھی جاتی ہیں وہ بھی حسن اتفاق سے اس میں محفوظ ہو گئی ہیں۔"

**اقتباس از پیش لفظ ڈاکٹر زور**

مطبوعہ فہرست مطبوعات اردو کتب خانہ

ادارہ ادبیات اردو

# تقریر افتتاحی

از ڈاکٹر سید محمود صاحب وزیر وزارت خارجہ حکومت ہند

ڈاکٹر زور صاحب اور ارکان ادارہ!

میں زور صاحب کے نام اور کام سے تو بہت دنوں سے واقف ہوں لیکن آج تک ملا نہیں تھا۔ میں آج جو کچھ تھوڑا بہت آدھے گھنٹے کے اندر دیکھا اس سے مجھے اپنی جہالت پر افسوس ہوا۔ اس سے پہلے جو حاضر نہ ہو سکا اس سے ایک نقصان ہوا۔ میں ابھی حیدرآباد میں آیا تھا۔ سلطان سعودی عرب کے ساتھ اس وقت اگر اس ادارے کے کام سے واقف رہتا تو کافی رقم دلا سکتا۔ لیکن افسوس ہے کہ میں اس کو کچھ بھی نہ دلا سکا۔ اب بھی ممکنہ کوشش کروں گا کہ اس کو کچھ رقم دلا سکوں۔ میں نے ہندوستان میں بہت سے مقام اور ادارے دیکھے لیکن میں نے اتنا اچھا کام کہیں نہیں دیکھا۔ ہم شمال کے لوگ باتیں تو بہت کرتے ہیں لیکن اتنا کام نہیں کرتے۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدرآباد میں اردو کا جو کام ہو رہا ہے اس کی ہندوستان بھر میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔

یہاں بہت اچھا کام ہوا ہے اور یوں تو دکن میں شروع ہی سے عمدہ خدمات کی گئی ہیں۔ چنانچہ ولی جو اردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا ہے وہ بھی دکن ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ مجھ پر آج ایک چیز کا بڑا اثر ہوا وہ یہ کہ آپ نے اپنی تحریر یا تقریر میں مصیبت اور پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مصیبت یا تکلیف سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ یہاں کے اردو کے کام کرنے والے حالات سے گھبرائے بغیر مردانہ وار آگے بڑھے جا رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب تو ٹنڈن جی نے بھی اپنا نظریہ بدل دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ شاید سمجھ گئے ہیں کہ اردو کی جتنی مخالفت کی جائے گی اتنا ہی کام زیادہ جوش اور ولولہ سے کیا جائے گا جیسا کہ پنڈت نہرو نے کہا تھا اور شاید اسی لئے ٹنڈن جی نے اپنا نظریہ بدل دیا چنانچہ وہ اب کہنے لگے ہیں کہ اردو بھی ہندوستان ہی کی ایک زبان ہے۔ ہم کو خوش ہونا چاہیئے کہ ٹنڈن جی جو کچھ رہے تھے کہ اردو ایک بدیسی زبان ہے۔ اب وہ اس کو اپنے ملک کی زبان کہہ رہے ہیں اور بابو سمپورنانند نے بھی یہی خیالات اب ظاہر کئے ہیں لیکن اتنا تو نہیں جتنا ٹنڈن جی نے کہا ہے۔ یہ آپ لوگوں کے کام کرتے رہنے کا اثر ہے۔

میں پھر یہی کہوں گا کہ آپ لوگ گھبرائیے نہیں۔ جو زبان ملک کی بن چکی ہو اس کو کوئی ختم نہیں کر سکتا۔ آپ نے بھولے سے بھی یہ نہیں کہا کہ ان حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ میں کام کرنے کی اتنی زبردست قوت ہے مجھے جو خوشی ہوئی میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ میں پوری کوشش کروں گا اور وزیر تعلیم ہند سے کہوں گا کہ وہ ادارے کو زیادہ سے زیادہ رقم دیں۔ آپ نے ریسرچ کے لئے اسکالر منتخب کئے ہیں اور تحقیق کا بہت کام کیا اور کرایا ہے۔

معلوم نہیں کہ وزیر تعلیم ہند آپ کے کام سے واقف ہیں یا نہیں ۔ جب یہ سب خصوصیات منسٹر صاحب تعلیم کو معلوم ہوں گی تو وہ کافی رقم آپ کے ادارے کو ضرور دیں گے۔ اگر یہ کام بند ہو تو یہ ہم سب کے لئے بڑے افسوس کی بات ہوگی۔

آپ نے میری عزت افزائی کی کہ اسرائیل میں میرے نام سے اردو کتب خانہ کھولنے کا ارادہ کیا ہے کہیں عرب میرے دشمن نہ بن جائیں۔ مہربانی فرماکر ان کو میرا دشمن نہ بنا دیجئے۔ میں سلطان سعودی عرب کو لکھنے والا ہوں کہ وہ آپ کو رقم مدد دیں۔ لیکن اسرائیل میں کتب خانہ قائم ہو تو وہ میرے مخالف ہوجائیں گے اور یہ رقم نہ مل سکے گی۔

میں آخر میں ڈاکٹر زور اور ادارے کے جملہ ارکان کو اتنے اچھے کام پر مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ نے میرے دل کو اس مختصر سے وقت میں جتنا مسخر کر لیا ہے اس کے اظہار کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔

آپ نے ابھی عمارت کا ذکر کیا ہے میں دعا کرتا ہوں کہ اس کی جلد تکمیل ہوجائے اور آئندہ میں جب آؤں گا تو آپ کے کتب خانے کو اس میں سجا ہوا دیکھوں گا جس سے مجھے اور بھی خوشی ہوگی۔

آخر میں آپ سب کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ اس طرح اردو کے کام کو مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھائیں گے۔

## حیدرآباد کے علمی ادارے

حیدرآباد کے موقر روزنامہ "رہنمائے دکن" مورخہ ۱۵ر جنوری ۱۹۵۶ء میں حسب ذیل اداریہ اس تقریب سے متعلق شائع ہوا۔

"اس مرتبہ ڈاکٹر سید محمود وزیر وزارت خارجہ نے حیدرآباد کے دورے میں یہاں کے علمی اداروں کی سیر کی اور ان کے بے نظیر اور شہرہ آفاق کارناموں سے واقفیت حاصل کی۔ ادارہ ادبیات اردو اور دائرۃ المعارف کی علمی خدمات اور ان کی کارکردگی سے ڈاکٹر صاحب بہت متاثر ہوئے اور ان کے متعلق جن ندریں خیالات کا اظہار کر کے ان کی ستائش کی ہے۔ وہ محض رسمی یا محض حوصلہ افزائی کی باتیں نہیں ہیں کہ ان کو کوئی وزن نہ دیا جائے۔ اس دور میں یہ اور ایسے علمی اداروں کو اپنی بقاء ترقی کے لئے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے واقف ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب اگر ان دشواریوں کو دور کرنے میں ان کی مدد کریں تو یہ ادارے بہت گراں قدر خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام اردو انسائیکلوپیڈیا کا کام آغاز ہوا تھا مگر افسوس کہ حیدرآباد کے سیاسی انقلاب نے اس عظیم الشان کام کو تقریباً ناممکن بنا دیا کیونکہ اب تو حکومت ہندی اور علاقہ واری زبان کی ترقی کی دیوانہ وار سعی لا حاصل کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں اردو انسائیکلوپیڈیا کیسے مرتب ہوسکتا ہے کاش ڈاکٹر صاحب کی حسن توجہ سے پھر یہ کام شروع ہو کر انجام کو پہنچ جائے تو ان کے دورے کی [illegible] یادگار ہوگی۔"

# تاریخ ادبیات عربی

(ادارہ ادبیات اردو کی ایک نئی کتاب)

## معاصرین کی نظر میں

حیدرآباد کا ادارہ ادبیات اردو اپنی مطبوعات کے لئے کافی مشہور ہے۔ یہ کتاب بھی اسی کے سلسلہ مطبوعات کی ایک کڑی ہے۔ مولف نے بڑی کاوش، تحقیق اور محنت سے ادبیات عربی کی تاریخ مدون فرمائی ہے جس میں اسلامی ادبیات عربی کا بھی مفصل (لیکن پھر بھی تشنہ) تذکرہ آیا ہے۔ اردو لٹریچر میں یہ کتاب ایک اچھا اضافہ کرتی ہے۔

(تجلی بابتہ جنوری ۱۹۵۶ء)

سید ابوالفضل صاحب ایم اے (عثمانیہ) نے یہ کتاب تقریباً ۱۶ سال قبل لکھی تھی لیکن اس کے چھپنے کی نوبت اب آئی ہے۔ اس دوران میں جنگ یورپ کی وجہ سے ادب میں بھی ایک انقلاب آیا۔ اس ادبی انقلاب کے بیان کے لئے عصر حاضر کے باب میں انھوں نے ایک ضمیمہ شامل کر دیا ہے۔ کتاب میں انڈکس بھی شامل ہے اور انڈکس سمیت اس کی ضخامت صرف تین سو صفحات کے قریب ہے۔ اس کے باوجود کتاب بہت جامع ہے اور پر از معلومات ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے۔ سید ابوالفضل صاحب نے قدیم و جدید تاریخی کتابوں پر ایک گہری نظر ڈالی ہے اور عربی ماخذوں کے علاوہ جدید ترین یورپی ماخذوں سے بھی مدد لی ہے۔ ہماری رائے میں ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے ہر شخص کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ادارۂ ادبیات اردو نے ادب کی بہت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس ادارہ کو زندہ رکھنا اردو ادب کے بہی خواہوں کا فرض ہے۔

(الحمرا بابتہ دسمبر ۱۹۵۵ء)

عربی ادبیات اور اس کے علوم و فنون کی تاریخ پر اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ عربی میں قدیم و جدید دونوں قسم کی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ انگریزی میں بھی بعض اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مصنف نے ان کی مدد سے یہ کتاب مرتب کی ہے اور اس کا بڑا حصہ جرجی زیدان کی تاریخ ادب اللغۃ العربیہ سے ماخوذ بلکہ اسی کی تلخیص ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ مصنف کا اضافہ ہے۔ اس کتاب میں عہد جاہلیت سے لے کر موجودہ زمانے تک ہر دور (عہد جاہلیت، اسلام، خلافت راشدہ، اموی، عباسی، عثمانی) [illegible] ترقیوں اور

علوم و فنون کی مختصر تاریخ ہے جس میں اس دور کی خصوصیات اور اس کے مشہور مصنفین اور ان کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ عربی علوم و فنون کی وسعت کے مقابلہ میں یہ کتاب بہت مختصر ہے مگر اردو میں اتنے معلومات بھی ایک جگہ نہیں مل سکتے اس لئے یہ کتاب بھی غنیمت ہے۔

(معارف بابتہ جنوری ۱۹۵۶ء)

مرتبہ سید ابوالفضل ایم۔اے (عثمانیہ)۔ ضخامت (۲۰۸) صفحات۔ کتاب کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس میں کیا ہوگا۔ اردو ادب میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں ادبیات عرب پر [illegible] معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے سات ابواب ہیں۔ پہلے باب میں قس بن ساعدہ سے لے کر تابط شرا تک۔ دوسرے باب میں زیاد بن ابیہ سے لے کر فرزدق و طرماح تک۔ تیسرے باب میں الکندی سے لے کر [illegible] تک۔ چوتھے باب میں [illegible] سے لے کر صفی الدین الحلی تک۔ پانچویں باب میں حاجی خلیفہ [illegible] تک۔ چھٹے باب میں مارون النقاش سے لے کر منفلوطی، شوقی اور المطران تک کے مختصر حالات زندگی ان کی [illegible] اور شاعرانہ خصوصیات درج ہیں۔ آخری باب، خاتمہ میں، عصر جدید کے شعرا کے ساتھ اس دور کی [illegible] افسانوی ادب اور جدید تحریکات کا تذکرہ ہے۔

فاضل مصنف شعر و ادب میں بصیرت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی تنقید عمیق ہی نہیں وزنی بھی ہے۔ یہ کتاب بلا مبالغہ تاریخ و ادب کے ہزاروں صفحات کا نچوڑ ہے۔ انداز بیان بھی دلچسپ اور باوقار ہے۔

(فاران بابتہ دسمبر ۱۹۵۵ء)

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۸) [illegible]

کے تعاون نے ہی عملی شکل اختیار کرتے ہوئے "ادارۂ ادبیات اردو" کی صورت اختیار کر لی ........

[illegible] "ادارۂ ادبیات اردو" حیدر آباد (دکن) کی دلچسپ حالات مختصر سی سرگذشت۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ [illegible] کے [illegible] کارکنوں نے بغیر کسی "شاہی سرپرستی" کے فقط اپنے دست و بازو کے سہارے اور [illegible] عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کو [illegible] انجام دے کر اردو [illegible] کو [illegible] کر دیا کہ [illegible] اور شوق [illegible] کسی مہم کو سر کرنے میں [illegible] بہتر [illegible] اور [illegible] ہیں۔

[illegible] کون کیا [illegible] گا [illegible] عشق نے زور آزمائی کی

[illegible] ۲۳ جنوری ۱۹۵۵ء [illegible] کے پاس عظیم الشان [illegible] اپنی [illegible] منائی۔ اس شاندار موقعہ پر [illegible] سے حصہ لیا۔ برصغیر ہند و پاک کے [illegible] عزائم اور پختہ ارادوں کے نقشے [illegible] اور ان کی تعلیم و تربیت کر [illegible] بنایا گیا۔

[illegible] دینے میں پوری طرح [illegible] خدمت کر کے ان [illegible]

[illegible] پیدا کرتے رہیگا [illegible] عبداللطیف لاہور

# ادارۂ ادبیات اردو

(سالنامہ ادب لطیف کے مضمون سے چند سطریں)

ادب لطیف لاہور نے دسمبر ۱۹۵۵ء میں ایک بسیط اردو نمبر شائع کیا تھا جس میں جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیات اردو پر بھی مضامین لکھوا کر شریک کئے ہیں۔ جناب غلام حسین صاحب نگار نے ادارہ پر ایک طویل معلوماتی مقالہ قلمبند کیا ہے۔ اس سے چند سطریں اقتباس کر کے یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے علمی و ادبی سرچشموں سے فیض پانے والوں نے بہت قلیل عرصہ میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت بھی مہیا کرنا شروع کر دیا۔ ادارۂ ادبیات حیدرآباد (دکن) اسی سلسلہ کی ایک عظیم الشان کڑی ہے۔ جسے قائم کرنے، زندہ رکھنے اور اس کے زیر اہتمام اردو زبان اور ادب کے درخشاں کارنامے سرانجام دینے میں جامعہ کے فارغ التحصیل فرزندوں نے بڑا اہم حصہ لیا۔

۱۹۳۱ء میں حیدرآباد کے چند اولوالعزم، روشن خیال اور اردو دوست نوجوانوں نے اپنی قوت عمل کے بھروسے پر ادارۂ ادبیات اردو کی بنیاد ڈالی۔ انھیں کسی حکومت یا حکمران کی سرپرستی حاصل نہ تھی لیکن عوام کی فلاح و بہبود کا جذبہ، علم و ادب کا نور پھیلانے کا شوق اور لگاتار کام کرنے کا جوش انھیں ایسا تائید و حمایت اور سرپرستی سے بے نیاز ہو کر اپنے کمزور لیکن قیمتی بازوؤں کے سہارے آمادہ عمل کر رہا تھا۔ اس ادارہ کی تاسیس کا خیال ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے روشن ذہن کی پیداوار ہے اور انھیں کے ارادوں اور حوصلوں نے اسے عملی صورت دے کر ایسے بلند مقام پر پہنچایا جہاں اس کے شاندار کارناموں کی ایک پوری تاریخ مرتب ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدرآباد کے ان ممتاز فرزندوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی قابلیت اور محنت سے نہ صرف جدید حیدرآباد کی ذہنی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے بلکہ اردو زبان اور ادب کی قابل قدر خدمات انجام دے کر تحقیق کی تاریخ میں اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کر لیا ہے ............ ادارۂ ادبیات اردو کے موسسین میں ڈاکٹر زور کے علاوہ پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی مرحوم اور نصیرالدین ہاشمی کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کے تعاون اور بے لوث اشتراک سے ہی ادارہ نے کاموں کو عملی صورت دی [illegible] ادارہ کے بانیوں کا ذکر بے غرض کہنا موضوع کی حد سے اتفاقی بہت [illegible] اور اپنے فرض سے کوتاہی کرنا ہے۔ [illegible]

(دیکھئے صفحہ ۸۰)

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان



# سب رس

## صوفی نمبر

جلد (۲۰) مارچ و اپریل ۱۹۵۶ء شمارہ ۳، ۴

نگراں

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد

چندہ سالانہ چھ روپے سکۂ ہند

ششماہی تین روپے آٹھ آنے سکۂ ہند

قیمت ایک روپیہ سکۂ ہند

باہتمام مہتمم ادارۂ ادبیات اردو "اعجاز پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

# فہرست



امام تغزل حضرت صفی اورنگ آبادی



عبدالحمید خاں خیالی



سید ظہیر علی عدیل

# آبحیات کا آخری شاعر

## صفیؔ اورنگ آبادی

از:- جناب سید عبدالحفیظ صاحب

گردش ایام نے جب خاندان مغلیہ کے آخری چشم و چراغ شاہنشاہ ظفرؔ سے شمشیر و سناں چھین لی اور وہ قلعہ بند ہوکر اقلیم سخن پر حکمرانی کرنے لگے ۔ لال قلعے کی چار دیواری غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ و ظفرؔ کی غزل سرائی سے گونجنے لگی اس طرح مادر اردو کا ماحصل زیست یعنی اردو غزل محلات شاہی میں سنورنے لگی، لیکن بوڑھے شہنشاہ کے سر پہ "تاج سخن" بھی پیر فلک سے بھی دیکھا نہ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ع

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا

دلّی اجڑ گئی ۔ باغوں کی بہاریں، محلوں کا عیش، خوشیاں، جلسے، میلے، تماشے سب کچھ اجڑ گیا، جو تھا جل گیا، راجوں کے راج گئے، نوابوں کے ٹھاٹ گئے، غرض کہ ایک قیامت سی قیامت تھی ۔ ہر طرف بھگدڑ پڑی ہوئی تھی ۔ ایسے میں امراء و سلاطین کی پروردہ ناز "غزل" جب لال قلعے کے محلات شاہی سے نکلی اور بے سہارا ہوکر دلی کی گلیوں میں در بدر پھر رہی تھی حضرت داغؔ نے اس کی دستگیری کی اور سینے سے لگا کر دکن کی طرف آنکلے ۔ وطن سے دور غریب الدیار رہ کر جو نازنین مدتوں مغل شاہوں کی گود میں پل کر بڑھی تھی وطن پہنچی تو پھر ایک بار دربار آصفی میں جلوہ افروز ہوگئی ۔ لیکن حضرت داغؔ کی دور رس نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ اب اردو غزل کے لئے امارت و شاہی کی گود میں بقا و ارتقا کا دور گذر چکا ہے ۔ زر و جواہر کے انبار میں اب یہ بیل منڈھے چڑھے اس کا کوئی امکان نہیں ۔ تاج و تخت کے سائے، عیش و طرب کی ہوائیں، دولت و زر کے اجالے، غرض کہ ایسا کچھ بھی اس کے موافق مزاج نہ ہوسکے گا بلکہ اب تو ـــ چاند تاروں کی چھاؤں، سادہ و پر کیف فضائیں، زبان و بیان کا بے ساختہ پن ہی اس کے لئے سرمایۂ حیات ہوسکتا ہے ۔ چنانچہ نواب مرزا خاں داغؔ نے اپنے جیتے جی ہی اپنا یہ حق بھی ادا کر دیا اور اردو غزل کو اس کے ناموافق ماحول سے نکال کر اس کا اپنا گھر بنا دیا جہاں پہنچتے پہنچتے اگرچہ کہ اس کی شاہانہ زندگی کی شام ہو چکی تھی لیکن یہی وہ گھر تھا جہاں سے اس کی بقائے دوام و قبولیت عام کا آفتاب طلوع ہونے والا تھا ۔ چنانچہ دلّی کی یہ امانت جب میرؔ و مومنؔ کی متاع شہنشاہ ظفرؔ کا سکون اور غالبؔ کا جنون لئے ہوئے صفیؔ کے گھر پہنچی تو اس نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے ۔ جان و آبرو کی نذر دے کر اسے آب حیات پلا دیا ۔

(۲)

قاعدے کی بات ہے کہ جب کسی کے سرپرست اٹھ جاتے ہیں تو بیگانے تو بیگانے اپنوں کے بھی تیور بدل جاتے ہیں ۔

یہی بات اردو زبان وادب کے لئے بھی پیش آئی۔ ایک ایک کرکے سرپرستانِ اردو اٹھنے لگے اور چل چلاؤ کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ ہی لگ گیا۔ بہادر شاہ ظفر کیا چل بسے کہ شعر وسخن کی بساط ہی الٹ گئی۔ غالب گئے، ذوق رخصت ہوئے، مومن کو موت کی نیند آگئی۔ حالی و آزاد بھی بند حیات سے چھوٹ گئے۔ لے دے کے ایک داغ رہ گیا تھا سو وہ بھی مٹ گیا، پھر کیا تھا ایک طرف اغیار کی بن آئی تو دوسری طرف نادان دوستوں نے دوستی و رفاقت کے بہانے زبان وادب کی تباہی پہ کمر باندھ لی۔

اردو زبان وادب اور خصوصاً صنفِ غزل کے لئے حالات دن بدن ناموافق ہوتے جارہے تھے۔ اردو لکھنے پڑھنے والے نوجوان طبقہ میں نام نہاد جدت وترقی کے زہریلے اثرات پھیلتے جارہے تھے۔ ہند، عرب وایران کی زبانوں کے امتزاج سے پیدا ہونے والی اردو برفانی علاقوں کی سرد اور ٹھٹھرا دینے والی ہواؤں کے سائے میں پلے ہوئے چند گم کردہ راہ افراد کے ہاتھوں ہوس و آز کی تسکین کا کھلونا ہو کر رہ گئی تھی۔ سرزمین ہند ودکن کے سپوتوں نے اپنی بے مائیگی علم کو چھپانے، سستی شہرت اور جھوٹی واہ واہ کی خاطر اپنی مادری زبان کی عزیز ترین متاعِ حیات "غزل" کے ساتھ جو دست درازیاں کی ہیں اغیار بھی اسے دیکھ کر شرما گئے۔ شہوت نفس و آوارگی کے ہاتھوں، "دنیا" پر خود غلط افراد کا ایک غول تھا جو چند بے جان لفظوں اور کھوکھلے خیالوں کے سہارے زبان وادب کی خدمت کا ڈھونگ رچائے ہوا تھا۔ لیکن اس نام نہاد علم وادب کی ظلمتوں سے بہت دور جہل وگمراہی کے بادلوں سے گھرے ہوئے آسمانِ ادب کے افق پر سرزمین اورنگ آباد سے ایک ستارہ طلوع ہو چکا تھا جس کی روشنی سپیدۂ سحر کی طرح دھیرے دھیرے پھیلتی جارہی تھی۔ ادھر سرزمین دکن میں اردو زبان کے آخری مجدد نواب مرزا خاں جا چکے تھے لیکن دامنِ غزل پہ جو داغ ابھر آیا تھا وہ ان مٹ ہو کر رہ گیا۔ ابھی اس بولتی، گاتی، گنگناتی، فردوسِ گوش غزل میں کیفی کے فنکار ہاتھوں نے کیف و سرمستی کا رنگ بھرنے نہ پایا تھا کہ ایک مردِ قلندر کے جذبۂ ایثار ومحبت نے اس کا دل موہ لیا اور اس طرح ولی اورنگ آبادی کی یہ لازوال تخلیق ہندوستان بھر کے درباروں، ایوانوں اور تاج وتخت کو روندتی ہوئی صفی اورنگ آبادی کا مقدر ہو کر زندۂ جاوید ہو گئی۔

(۳)

یہ بات بہت کم ہی لوگ جانتے ہوں گے کہ ایک غریب وبدنام آدمی نے اردو زبان وادب کے ساتھ کیا کیا نہ کیا۔ صفی کے جاننے والے اب تو انگلیوں پہ گنے جاتے ہیں لیکن وہ دن دور نہیں کہ ہر اردو بولنے والے کو جاننا ہی پڑے گا کہ صفی کون تھا۔ جاننا ہی پڑے گا کہ بھوک، افلاس وگمنامی کے طوفانوں سے ٹکراتا ہوا نام وشہرت کے رفعتوں کو روندتے ہوئے خدمت وایثار کی دھن میں مگن وہ کون متوالا تھا جس نے سرزمین دکن کو رشکِ شیراز بنا دیا۔ زمانہ دیکھے گا کہ جیتے جی جسے پوچھا نہ گیا وہ پوجا جائے گا۔

اگرچہ کہ یہ بات عام نہیں لیکن دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا، کہنے والوں نے کہا اور سننے والے کانوں نے سنا کہ دکن کی گمنام گلیوں میں گھومنے والا یہ محو و مجذوب صفت شاعر صفی ہے جو حقیقی معنی میں میر ومومن، غالب، ذوق وداغ کا صحیح جانشین ہے۔ ظاہر پرست اور سطح بین دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی دوررس وجوہر شناس نگاہوں سے حقائق چھپ نہیں سکتے۔ چنانچہ صفی کے اندر چھپی ہوئی عظیم المرتبت ادب نواز شخصیت بھی ان دیدہ وروں سے چھپ نہ سکی جن کی نگاہیں جہالت کے پردوں کو چیرتی ہوئی مستقبل تک جا پہنچتی ہیں۔ چنانچہ قدر دانوں نے چاہا تھا کہ انھیں گمنامی سے نکال کر نام ونمود کے اس ہنگامہ کا صدر نشین کردیں لیکن اردو کے اس خاموش اور بے لوث خدمت گار نے زبان وادب کی تجارت کرنے والوں کی صفِ تجارت میں شرکت کو کبھی گوارا نہ کیا۔ فکر معاش، رفیقۂ حیات اور اولاد کا غم، بے مہری احباب، غرض زندگی و اسبابِ زندگی لے

سارے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر شعر و ادب کا دیوانہ صفی اپنے شیریں و دل نشیں انداز میں غزل خوانی کرتے ہوئے بڑھتا ہی جا رہا تھا زبان و ادب کے نکتہ سنج ارباب علم و فن کی محفلوں سے لے کر ڈھول اور چکی کی دھنوں میں گائے جانے والی گیتوں میں بھی صفی کی غزلیں داخل ہو گئی تھیں اور "اردو غزل" نے اپنے مخصوص و محدود حلقوں سے نکل کر بچے بڑے، عورت، مزدور، مسافر سبھی کے درد و محبت کی زبان بن گئی تھی۔ یہ سچ ہے کہ اردو غزل کو ارتقائی حدود تک پہنچانے والوں میں حضرت داغ کے بعد کوئی اور نام لینا غلو و بدذوقی کا ثبوت ہو جائے گا لیکن اس حقیقت سے انکار بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ عین اس وقت جب کہ اوج کمال کی انتہائی بلندیوں سے دھکیل کر اسے پامال کر دینے کی تدبیریں ہو رہی تھیں حضرت صفی نے اسے نہ صرف گرنے اور پامال ہونے سے بچا لیا بلکہ وہ زندگی دے دی جو رہتی دنیا تک اردو بولنے والوں کے دل و زبان پر محبت و نغمہ بن کر رہے گی۔ مختصر یہ کہ معماران شعر و ادب کی یہ مرمریں عمارت یعنی "اردو غزل" جب صفی کے ورثہ میں آئی تو اس نے اس کے دامن میں محاورہ و سلاست زبان کی نہریں بہا دیں، خون دل سے رنگین حسن و محبت کے نقوش سے اسے زیں کر دیا، فکر و خرد کی پوری صلاحیتیں ذوق نظر کی تمام تر تابناکیاں، خیال و بیان کی ساری نزاکتیں اس نے غزل کی آرائش میں صرف کر دیں اور اس طرح اسلاف کی اس مرمریں تخلیق کو حسن و زندگی سے معمور کر کے "تاج محل" بنا دیا اور مادر اردو کے چرنوں میں ارپن کر دیا۔

(۴)

ہم سمجھتے ہیں کہ صفی اب ہماری صفوں میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ سمجھ رہا بھی اب موت کے کنارے پہنچ گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایک بلند و بالا، کشادہ جبیں، بڑی نشیلی آنکھوں والا ایک مرد قلندر کاندھے پر رومال ڈالے، تہمد کرتے میں ملبوس ضعف و تنفس سے لڑکھڑاتا پسینہ میں شرابور، لکڑی کے سہارے مغلپورہ کی گلیوں میں گھومتا نظر نہیں آتا۔ نگاہیں اسے تلاش کرتی ہیں اور فضاؤں میں گھومتے ہوئے ان شعروں کی تصویر بن کر جب وہ سامنے آتا ہے تو یارائے ضبط نہیں رہتا۔

آفت کشانِ عشق کے دل ٹوٹ جائیں گے    میرا اخیر وقت جو آساں نہ ہو سکا

---

کونسا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے    شب کو اک آواز آتی ہے "الٰہی کیا کروں"

پھر آنکھیں وفور اشک سے جب دھندلا جاتی ہیں تو اس دھندلکے میں فضاؤں کی بلندی پر کچھ ستارے چمکنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی ان نمایاں اور روشن تاروں کی روشنی سے دھندلکے دور ہونے لگتے ہیں اور زبانِ غزل پکار اٹھتی ہے اور صفی کی متلاشی انہی ستاروں کے جھرمٹ میں تیرا شاعر پوشیدہ ہے وہ مرا نہیں، مرے گا ہی نہیں، موت بھی جو اسے چھو جائے تو اسے مرنا محال ہو جائے۔ صفی زندہ ہے، زندہ تھا اور زندہ ہی رہے گا۔

جب کہ اس کی روح پاک اس کے دکھ زدہ غم و اندوہ سے داغدار، محنت و خدمت سے چور چور جسم کو چھوڑ کر ملاء اعلیٰ کی طرف چل پڑی اور زمین شعر و ادب کا یہ آفتاب بظاہر دواخانہ عثمانیہ کی سربلند دیواروں میں ڈوب گیا لیکن اسی آفتاب کی تابندگی و روشنی نے آسمان ادب پر چمکنے والے کتنے ہی ستاروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منور کر دیا۔

---

# کلام صفی کی چند خصوصیتیں

از:۔ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی

حضرت صفی مرحوم اورنگ آباد کے وہ مشہور اور باکمال شاعر تھے جنھوں نے ملک سخن میں اپنے کلام کو یادگار زمانہ چھوڑا ہے۔ صفی مرحوم نے "ولی" کی پیروی میں غزل کی دنیا آباد رکھی تھی۔

"ولی" اورنگ آباد کا وہ پہلا شاعر تھا جو آسمان شاعری پر آفتاب بن کر چمکا اور مہتاب بن کر روشن ہوا اور اپنی ضیا پاشی سے دنیائے شاعری کو منور کیا تھا۔ ولی کے بعد ڈھائی سو سال کے عرصہ میں بیسیوں نامور شعراء ولی کی روشن کی ہوئی شمع کو جلاتے رہے اور اپنے کلام سے اردو زبان کی خدمت کرتے رہے۔ سراج، پروانہ، داؤد، آشفتہ، ارشد، فتوت، ہمرنگ، حیران، بیکل، ذرہ، شفیق، تمنا، مہتاب وغیرہ اردو غزل کی آبیاری کرتے رہے۔ غرض کہ اورنگ آباد میں ولی نے جس کام کو آغاز کیا تھا اور صنف شاعری میں جس عمارت کی بنیاد رکھی تھی اس کو بلند کرنے اور آراستہ کرنے میں جہاں دوسرے بیسیوں شعراء نے حصہ لیا وہاں صفی نے بھی بڑا حصہ لیا اور اردو غزل کو جلا دے کر چمکا دیا اور داغ کے سلسلہ میں غزل کی دنیا آباد رکھی تھی۔

صفی کو راست حضرت داغ سے تلمذ حاصل نہیں تھا بلکہ وہ کیفی کے شاگرد تھے اور کیفی داغ کے تلامذہ میں شامل تھے۔ اس طرح کیفی کے توسط سے صفی داغ کے سلسلہ میں منسلک ہوئے ہیں۔

حضرت داغ کی شاعری کے چند خصوصیتیں ہیں۔ اول زبان اور اسلوب بیان ہے۔ داغ دہلوی تھے اور زبان کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ دہلی کے شاہی قلعہ کی زبان استعمال کرتے تھے۔ داغ کی دوسری خصوصیت محاورات اور روزمرہ کا برمحل استعمال ہے۔ داغ نے محاورات کا ایسا برجستہ اور برمحل استعمال کیا ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تیسری خصوصیت کلام کا شوخی رنگین اور بانکپن ہے۔ چوتھی خصوصیت معاملہ بندی کا ہے۔ داغ کی یہ چاروں خصوصیتیں کیفی کے کلام میں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کیفی دو باتوں میں داغ سے بالکل مختلف تھے۔ یعنی داغ کے برخلاف سخت سخت ترزمیں اختیار کرتے تھے اور اس میں زیادہ سے زیادہ شعر موزوں کیا کرتے۔ اس خصوص میں کیفی اپنے زمانے اور ماحول کے رنگ سے مجبور تھے۔ وہ اس خصوصیت میں ذوق کے مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ کیفی کی دوسری خصوصیت جس میں داغ سے جداگانہ نظر آتے ہیں وہ ان کے کلام کا سوز و گداز ہے۔ کیفی کے کلام میں جو سوز و گداز ہے وہ ان کو اردو زبان کا ایک زبردست شاعر قرار دیتا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ صفی نے کن کن باتوں میں اپنے استاد کی پیروی کی ہے اور کن کن امور میں وہ داغ کی اتباع کرتے ہیں۔

مصحفی کے کلام میں ہم کو سوز و گداز نظر آتا ہے اور اس سوز و گداز کا اثر ہے کہ ان کی غزلیات عوام کے سینوں میں مچلتے ہیں۔ [illegible]ز کو شاعری کی جان تصور کرنا چاہئیے۔ جہاں سوز و گداز نہیں ہوتا وہاں شاعری میں ردہ پن آجاتا ہے۔ سوز و گداز لفظوں کے ہیر پھیر سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ ان کا برمحل استعمال۔ الفاظ سادہ لیکن دلکش ہوں اور ان کا استعمال نکتہ رس ہو تو شاعری کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مصحفی اس کو لے کر آئے تھے اور آخر تک انھوں نے نہایت مستقل مزاجی سے اس کو نبھایا ہے کیونکہ شاعری میں سوز و [illegible] شاعر کے دل کی آواز ہوتی ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اپنے نقوش جماتا اور لوگوں کا دل نشین ہوتا ہے۔ ایک دو بیتیں سنیے

اس نے شرما کے منہ جو پھیر لیا    میں نے سمجھا ادھر بلایا ہے

---

الٰہی مجھ کو دل دینے میں آخر مصلحت کیا تھی    اگر یہ چار انگل گوشت کا ٹکڑا نہیں ہوتا

---

آ فتیں ڈھائیں غضب برپا کیا    خیر تم نے جو کیا اچھا کیا

---

تنہا ہوں گھر میں اور شب انتظار ہے    مجھ کو چراغ خانہ چراغ مزار ہے

---

زباں سے آہ نکلی دل سے نالہ آنکھ سے آنسو    مگر ایک تیری دھن ہے جو نکلتی ہی نہیں سر سے

---

یہی آنکھیں یہی دل ہے تو بس اللہ حافظ ہے    نہیں معلوم کیا ترکیب ہے دنیا میں جینے کی

---

نہ کسی سے کوئی مطلب نہ شناسائی ہے    یعنی دنیا مجھے اک گوشۂ تنہائی ہے

---

ہو اثر کا الٰہی ذرہ ذرہ دہر کا جاگا    میری سوئی ہوئی تقدیر بھی بیدار ہو جائے

مصحفی کے کلام کو دیکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ اپنے استاد اور اوا استاد کی طرح دہلی کے اسلوب میں شاعری کرتے تھے۔ ان کا پورا کلام زبان کے لحاظ سے بلند پایہ ہے۔ وہ دکھنی تھے۔ دکن میں رہ دباش کرتے تھے لیکن ان کی شاعری دہلی کی زبان میں سنائی دیتی ہے۔ زبان کا حسن اور سادگی قابل داد نظر آتی ہے۔ شگفتگی اور روانی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا    جفا آئی، غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا

---

جس سے نہ بن سکے اسے بدنام کر دیا    کیا کیا کمال کرتے ہیں دنیا میں یار لوگ

---

دیوانہ اپنے کام میں کیا ہوشیار تھا　　　دنیا مثال دیتی ہے مجنوں کے عشق کی

---

زلف زنجیر ہو نہیں سکتی　　　شاعروں نے یہ پیچ ڈالی ہے

حضرت صفی کے کلام کی تیسری خصوصیت روزمرہ محاورہ بندی ہے جو کیفی کے توسط سے داغ کی پیروی کا سلسلہ بناتی ہے۔ محاورہ کا برمحل استعمال صفی کے کلام کو دوبالا کرتا ہے۔ محاورہ کا برمحل استعمال اور معنی میں معنی پیدا کرنا۔ محاورہ کو شاعری میں بہت سے لوگوں نے استعمال کیا ہے لیکن جس خوبی، نفاست اور سلیقہ سے صفی نے اس میں محنت کی ہے وہ بہت کم شاعروں میں ملے گی۔ انھوں نے محاورے ایسے استعمال کئے ہیں گویا خود ڈھل ڈھل کے آ گئے۔ انھوں نے اپنے شعر میں پتھر کو آئینہ بنانے کی جو مثال دی ہے وہ گویا حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ اپنے اشعار کو ایسے تراشا ہے کہ وہ پتھر سے آئینہ ہی نہیں بلکہ نگینہ بن گئے ہیں۔ سنئے چند شعر ؎

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا　　　بنانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

---

خدا کی قسم کھا کے وہ ہنس پڑے　　　خدا کی قسم کیا مزہ آ گیا
سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو　　　یہ دل ہے جدھر آ گیا آ گیا

---

اب تمہاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام!　　　جو ہوا اچھا ہوا، جو کچھ کیا اچھا کیا

کلام کی رنگینی اور شوخی چوتھی خصوصیت ہے جو صفی کو داغ سے ورثہ میں ملی۔ شوخی اور رنگینی کے بغیر شعر بے روح ہوتے ہیں۔ وہ نہ اثر پیدا کر سکتے ہیں اور نہ بزم حیات لے کر آتے ہیں۔ یہ شاعر کی مزاج کا پتہ دیتے ہیں اور اس کے دل کے ترجمان ہوتے ہیں۔

گویا ہیں یہ حسین بھی چینی کی مورتیں　　　ملتا نہیں ہے ان سے کسی بات کا جواب

---

اس بے وفا کو دیکھ کے روتے نہیں ہیں ہم　　　صدقہ اتار لیتے ہیں اپنی نگاہ کا

---

معشوق وہ کسی کے نہیں تو نہیں سہی　　　اچھا یہ پوچھئے کہ صفی کس کا نام ہے

---

دوست نے وعدہ کیا ہے دوستو　　　آج کی شب جاگنے کی رات ہے

صفی اپنے استاد کیفی کے مطابق سخت زمینوں میں طویل غزلیں موزوں کرتے تھے۔ مثلاً ایک مشاعرہ میں جو کیفی کے شعر

نہیں ہیں حضرت کیفی تو کیا ثاقب ہے برتر ہے

کی طرح پر ہوا تھا۔ صفی نے ترسٹھ شعر سنائے تھے اور مشکل سے مشکل قوافی نہایت برجستگی اور تیزی سے باندھے تھے۔ کبوتر جیسا قافیہ بڑی خوبی سے موزوں کیا ہے ؎

[redacted] آدمی کی امان ہو لاکھ دشمن ہو تو کیا پروا　　　وہاں جانے کو کنکری لو اور انڈوں کو کبوتر ہے

---

وہ چھیڑ پیار کے دیتا ہے سنتے ہیں وہ کیا ہوگا      جب آنکھیں لگ گئیں چھت سے تو کیا امید پھر سے

جو اشعار ان کے طبعی میلان کا پتہ دیتے ہیں میرے خیال میں یہ ہیں۔

کونسا آفت زدہ رہتا ہے کوچہ میں تیرے      شب کو ایک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں

---

معشوق کو بدنام بھی کرنا نہیں آتا      لوگوں کو برا کام بھی کرنا نہیں آتا

---

کیسی کیسی خواہشیں سینے میں ہیں      سینکڑوں بچھو میرے سینے میں ہیں

---

پروانہ کیا جلے گا محبت کی آگ میں      اک جانور غریب بساط اس کے چار پر

---

لب پہ فغاں نہ آنکھ میں آنسو نہ دل میں درد      میں کیا کروں زمانہ اگر قدرداں ہے اب

آخری شعر ان کے ذوق حسن کا گواہ ہے

صفی کے کلام کی ایک اور خصوصیت تشبیہ، استعارہ کا برمحل استعمال اور ان کے انداز میں حسن اور دلکشی پیدا کرتا ہے۔

داغوں نے گل کھلائے ٹپکنے سے جڑ دیئے      عاشق کا دل نہیں یہ تمہارا مکاں ہے اب

صفی کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کشش و اثر ہے۔ صوفیانہ محفل ہو یا طرب و نشاط کی بزم صفی کے اشعار شوق اور دلچسپی سے اب بھی سنے اور سنائے جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو بہت کم شاعروں کے نصیب میں آئی۔ داغ بھی اس میدان کے شہسوار ہیں کہ مقبولیت عام کا سہرا انھوں نے بھی کم کلاہی سے باندھا ہے۔

صفی کا ایک شعر ایک دیوان کی جگہ لے سکتا ہے۔

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے      کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی۔

پورے شعر میں ایک بھی مشکل لفظ نہیں ملے گا۔ لیکن "کانوں کانوں خبر ہونا" ایک سیدھا سادھا محاورہ ہے جس کو ایسے دلکش انداز سے استعمال کیا گیا ہے کہ شعر میں سادگی۔ حسن۔ رنگینی۔ زندگی۔ لطافت حتیٰ کہ روح داخل ہوگئی ہے۔ ایسے شاعر کا ایک شعر بھی اسے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ یہی وہ افضل خصوصیت ہے جس نے صفی کو زبان زد عام و خاص بنا دیا۔ دل کی باتیں سادہ زبان میں کچھ ان ہی کے شعروں سے دل میں چبھتی ہیں۔

---

# خطبۂ استقبالیہ

از:— پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری صدر شعبۂ اردو جامعۂ عثمانیہ

خواتین اور حضرات!

"یوم صفی" میں شرکت کے لئے آپ کی تشریف آوری پر میں آپ سب کا نہایت خلوص کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔ آج ہم سب حضرت صفی مرحوم کو ان کی شعری خدمات کے لئے خراج عقیدت ادا کرنے کی خاطر یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ حضرات تقریر کے ذریعہ اور ہم میں سے بہت سے اپنی زبان خموشی سے خراج عقیدت ادا کریں گے۔ میں خاص طور پر ہمارے وزیر منصوبہ بندی آنریبل ڈاکٹر چناریڈی صاحب کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں کہ آپ نے اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کے باوجود اپنے ملک کے ایک سربرآوردہ شاعر کی یاد میں منائے جانے والے دن کا افتتاح فرمانا منظور کر لیا۔ وزیر منصوبہ بندی نہ صرف ملک کی مادی ترقی کے لئے منصوبے بناتے ہیں بلکہ ملک کے عوام کی ذہنی اور علمی ترقی کے بھی آپ نے منصوبے بنائے ہیں۔ چنانچہ ملک میں بولی جانے والی زبانوں میں سستا ادب پیدا کرنے کا ایک منصوبہ آپ نے بنایا تھا جس کی مجلس مشاورت میں شریک ہونے کا مجھے بھی موقع ملا تھا۔ عوام کی ذہنی ترقی کی یہ لگن رکھنے والے وزیر کے ہاتھوں ملک کے اس عوامی شاعر کے یادگاری دن کا افتتاح ایک شائستہ موزونیت رکھتا ہے۔

یوم صفی کی صدارت کے لئے ہم کو ایک ایسی شخصیت ملی ہے جو اپنے ہمہ گیر جذبات ہمدردی اور ترقی پسند ادبی رجحانات کی بدولت ہر مکتب خیال کے ادیبوں میں ہر دلعزیز ہے۔ حیدرآباد کی کوئی ادبی سرگرمی ایسی نظر نہیں آتی جس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کہیں نہ کہیں شری ایل۔ این گپتا کی شخصیت نہ دکھائی دیتی ہو۔ آپ نے "یوم صفی" کی صدارت قبول فرما کر ہم کو مفتخر فرمایا جس کے لئے ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں اور آپ کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہمارے میئر بلدیہ شری دھرنی دھر مشٹگی کے بھی ہم مشکور ہیں کہ آپ نے اس جلسے میں شرکت کی زحمت گوارا فرمائی۔

صفی مرحوم دکن کے اردو غزل گو شعرا کے وسیع سلسلے میں شاید آخری بڑے استاد تھے۔ اس ادب پرور سرزمین سے غزل گو شاعر کئی اٹھے اور آگے بھی پیدا ہوں گے لیکن اب صفی پھر نہ پیدا ہوگا۔ فکر شعر کے رجحان ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں۔ صفی غزل کے مسلمہ استاد تھے اور غزل کے پورے گردوپیش پر انھیں عبور حاصل تھا۔ ان کا تعلق غزل گوئی کے اس دبستان سے تھا جو داغ دہلوی اور بیخود تھانوی کے اثر سے دکن میں ہماری صدی کے اوائل میں بہت مقبول رہا تھا۔ جذبات نگاری بلکہ معاملہ بندی اسی دبستان کی نمایاں خصوصیت ہے۔ لیکن خود صفی نے اپنے لفظ پرستی اور محاورہ بندی کے رجحان کی بدولت ایک انفرادیت سی پیدا کر لی تھی۔ زبان کے برتنے میں انھوں نے اپنے استاد کی طرح بعض وقت

اجتہاد سے کام لینے کی بھی کوشش کی جس کے بارے میں مکاتیب خیال کے اختلافات ہوسکتے ہیں تاہم اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ غزل کو انھوں نے استادانہ مہارت کے ساتھ استعمال کیا اور اپنے ترکے میں کئی خوش فکر تلامذہ چھوڑے۔ "گذرے ہوئے لوگوں کے لئے سچائی اور زندوں کے لئے لحاظ" کا ایک اصول انگریز نقادوں نے وضع کیا تھا۔

اب صفی ہم میں نہیں رہے اور ہمارے شاعروں کی حالت کے بارے میں آنکھیں کھول دینے والی اس حقیقت کے ظاہر کرنے میں مجھے پس وپیش نہیں کہ صفی کی زندگی شاعروں کے ضرب المثل افلاس کا نمونہ تھی۔ اپنے خون دل سے سینچی ہوئی متاع کو وہ کبھی کبھی چند سکوں کے بدلے مشتاقوں کے حوالے کرنے پر بھی مجبور ہو جاتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بڑی تھی۔ لیکن چند کے سوا سب کے سب ان کے احتیاج کے ساتھی تھے۔ وہ استاد کے لئے آنکھیں بچھا سکتے تھے۔ لیکن اس کے گھر میں فرش بچھانے کی سکت کم ہی میں تھی۔ صفی مستغنی تھے۔ انھیں نہ ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی پروا۔ وہ سچے قلندر تھے اور زندگی کے ۶۳ برس انھوں نے قلندرانہ شان سے کاٹ دیئے۔

سماج کی زبان اور سماج کے ذوق کی پرورش کرنے والے اس اہم طبقے کی یہ کس مپرسی حکومت اور ملک کے درمندوں کی آنکھیں کھول دینے کا ذریعہ بن سکے تو ملک اور قوم کے لئے فال نیک ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمارے نگر پتا میر بلدیہ کے ان سپوتوں کے لئے کوئی تجویز رکھتے ہیں اور شاید اس سلسلے میں "امیر شہر کے نکتہ ہائے گفتنی" بھی آپ ابھی سنیں گے۔

خواتین اور حضرات۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں ہے۔ میں پھر ایک دفعہ آپ سب کی اور خاص طور پر ہمارے وزیر منصوبہ بندی، جناب گپتا صاحب اور میر بلدیہ کی تشریف آوری کا تہ دل سے خیر مقدم کرتا ہوں اور آنریبل ڈاکٹر چنا ریڈی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ "یوم صفی" کا افتتاح فرمائیں۔

# صفی کو جیسا دیکھا ویسا پایا

از:- پروفیسر سید محمد صاحب ایم۔ اے

صفی صاحب کو پہلی بار میں نے اب سے کوئی ۳۵، ۳۶ برس پہلے اس زمانے میں دیکھا تھا جبکہ وہ منشی یا منشی عالم کا امتحان کامیاب کرکے طب کی تعلیم پا رہے تھے۔ میری عمر دس بارہ سال کی ہو گی۔ وہ ان دنوں مستعد پورہ میں رہتے تھے اور میرے ماموں زاد بھائیوں کے ہم عمر و ہم مکتب تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میاں تمہارے فلاں عزیز کی ایک کتاب میرے یہاں ہے۔ یہ ان کو واپس کرنی ہے۔ ذرا تم ان تک پہنچا دو۔ یہ کہہ کر وہ اپنے گھر چلے گئے اور ایک کتاب جو غالباً طب سے متعلق تھی لاکر میرے حوالے کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کتاب بڑے سلیقے سے ایک کور میں لپٹی ہوئی ہے۔ اس پر خوش خط میں ایک نوٹ لکھا ہے کہ یہ کتاب فلاں صاحب کی ہے۔ مطالعہ کے لئے مستعار لی گئی تھی انھیں واپس شدنی ہے۔

ان کے انداز گفتگو اور کتاب کے اس نوٹ کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا کہ یہ صاحب کس قدر با ضابطہ اور محتاط آدمی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں وہ شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت میں نے ان میں شاعروں کی کوئی خصوصیت نہیں دیکھی۔

اس واقعہ کے کئی سال بعد دوبارہ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو وہ اس وقت ایک شاعر کی حیثیت سے خاص شہرت رکھتے تھے اور مولانا حکیم ظہور احمد صاحب ظہور کے جو مدرسہ فوقانیہ مفید الانام کے استاد اردو و فارسی تھے، شاگرد ہو گئے تھے۔ حکیم صاحب میرے بھی استاد تھے۔ دوسری ملاقات کے موقع پر میں نے ان میں کچھ لا ابالی پن اور دستار و رفتار میں تھوڑا سا فرق سابقہ حالت کے مقابلے میں دیکھا مگر گفتار کے انداز میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ وہی محبت اور شفقت اور سنجیدگی جو میں نے پہلی دفعہ دیکھی تھی اس دفعہ بھی نظر آئی۔ اس کے بعد صفی صاحب سے ان کے انتقال کے چند روز پہلے تک مختلف موقعوں اور مختلف صحبتوں میں ملنے کا اتفاق رہا۔

جب تک صفی صاحب کے والد زندہ تھے وہ فکر معاش سے مستغنی رہے۔ مدرسہ نظامیہ اور طب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد شاعری کا ایسا مشغلہ اختیار کیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ شاعری کے سلسلے میں انھوں نے ادب اور شعر کی بہت سی اچھی اور معیاری کتابوں کا مطالعہ بہت شوق سے کیا اور اعلیٰ فنی استعداد حاصل کر لی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد انھیں فکر معاش دامنگیر ہوئی تو کسی دفتر میں امیدوار ہو گئے۔ لیکن طبیعت کے لا ابالی پن سے بہت جلد کام سے بیزار ہو گئے اور امیدواری کو خیرباد کہا۔ چند دنوں بعد پھر کسی دفتر میں کام کرنے لگے۔ اس طرح کئی دفتروں میں تھوڑے تھوڑے دن کام کرتے رہے۔ دو تین جگہ ملازمت بھی مل گئی تھی لیکن اوقات دفتر کی پابندی، اہلکارانہ فرائض کی انجام دہی ان کے بس کی بات نہ تھی بہت جلد ہمیشہ کے لئے ملازمت

کا خیال ترک کر دیا اور قناعت پسندانہ زندگی کو اپنا شعار بنا لیا۔ شاعر کی حیثیت سے ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ کئی لوگ ان کے قدر داں تھے۔ بے فکری کا زمانہ تھا۔ ان کی ذمہ داریاں بھی زیادہ نہیں تھیں وہ اور ان کی سوتیلی والدہ، دو آدمیوں کی گزر کسی نہ کسی طرح ہو جاتی تھی۔ انھوں نے اپنی ضروریات بھی بہت کم رکھی تھیں۔ ایک عرصہ تک انھیں کبھی کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ ادب دوست امیر لوگ ان کی شاعری کے قدر داں ان کی چھوٹی چھوٹی ضروریات پوری کر دیتے تھے لیکن جب حالات بدل گئے اور وہ زمانہ نہیں رہا تو صفی کی زندگی بڑی تکلیف سے گذرنے لگی۔ اگرچہ ان کے بہت سے شاگرد ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور ان کی ہر طرح کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے پھر بھی صفی کے لئے فراغت سے زندگی بسر کرنا بہت مشکل تھا۔ باوجود تنگ دستی کے صفی صاحب نے آخر عمر تک نہایت خودداری کے ساتھ زندگی گزاری اور سوائے اپنے چند مخصوص شاگردوں کے جن سے کبھی کبھی وہ بے تکلفانہ مدد لیتے تھے عام طور پر بڑے رکھ رکھاؤ اور وضع داری سے ملتے تھے اور کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ ضرورت مند یا تنگ دست ہیں۔

خودداری اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ صفی کی طبیعت میں بے حد انکسار اور انصاف پسندی تھی۔ وہ ہمیشہ ادبی مباحث میں اساتذہ کا احترام، دوسرے کی رائے کی قدر اور اپنی معلومات کے اظہار میں منکسرانہ انداز ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کے مزاج میں خود پسندی اور خود نمائی بالکل نہیں تھی۔ وہ باوجود ایک بڑے اچھے شاعر ہونے کے کبھی اپنی شاعری پر فخر اور تعلی نہیں کرتے تھے۔ اپنے ہم عصر شاعروں کے کلام کی داد و تحسین میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ بعض ایسے شاعروں کے بارے میں بھی جو ان پر جا و بیجا اعتراض کرتے تھے، کبھی انھوں نے برے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔

اگرچہ ان کی تعلیم کچھ باضابطہ نہیں ہوئی تھی لیکن انھوں نے اساتذہ کے کلام اور فن شعر کی کتابوں کے مطالعہ سے بڑی اچھی فنی استعداد پیدا کر لی تھی۔ شاگردوں کے کلام کی اصلاح کے موقع پر اور ادبی مسائل پر گفتگو میں ان کی فنی معلومات دیکھ کر مجھے اکثر حیرت ہوتی تھی۔

صفی کے کردار کی ایک اور خصوصیت جو خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ ان کی صاف گوئی تھی۔ ان کی طبیعت میں بناوٹ اور منافقت مطلق نہیں تھی۔ وہ اپنی جو رائے ہوتی بے لاگ طور پر مگر پسندیدہ انداز میں ظاہر کرتے۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی وہ اس کو صاف ظاہر کر دیتے تھے۔ کبھی کسی کی طرف سے ان کے دل میں بدگمانی پیدا ہوئی تو دوسری ملاقات میں چھوٹتے ہی اس کا اظہار کر دیا، مگر طرز بیان دل آزارانہ یا معاندانہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بلاشبہ اپنے تمام ملنے والوں سے محبت اور خلوص سے پیش آتے تھے اور ان کے دل کی بھی یہی کیفیت تھی۔

صفی نے بڑی برجستہ طبیعت پائی تھی اور اکثر بڑے برمحل فقرے چست کر دیتے تھے لیکن یہ چیز صرف مخصوص اور بے تکلف احباب تک محدود تھی۔ البتہ شاعری میں ان کی طبیعت کا یہ جوہر خاص طور پر نمایاں ہے۔

صفی کی طبیعت میں جلد بازی کی صفت بھی بہت نمایاں تھی۔ گفتگو ذرا جلد جلد کرتے تھے اور کسی بات کو طول دینے سے ہمیشہ بچتے اور جلد ختم کر دیتے تھے۔ شعر بھی بہت جلد کہہ دیتے تھے۔ مصرعے بھی بہت جلد لگا دیتے تھے۔ اس جلد بازی کی وجہ سے وہ صبر آزما اور محنت طلب کاموں سے گھبراتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی یہ خصوصیت ان کی عمر کے ساتھ بڑھتی گئی۔ بچپن میں وہ اتنے جلد باز نہ ہوں گے ورنہ انھوں نے خوش نویسی میں جو کمال پیدا کیا تھا اس کو حاصل کرنا ممکن نہیں تھا۔ ابتدائی زمانہ میں طبیعت میں لاابالی پن تھا اور نہ تیزی اور جلد بازی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے خطاطی کی باضابطہ مشق کی تھی اور

اس فن کو قابلِ تعریف حد تک حاصل کر لیا تھا۔

صفیؔ میں خود نمائی کی صفت بالکل نہیں تھی۔ وہ نہ بعض شاعروں کی طرح طلب اور بے طلب اپنا کلام لوگوں کو سنانے کے خواہش مند رہتے تھے نہ اپنے ذخیرہ کو رسالوں اور اخباروں میں طبع کرانے کے متمنی۔ بار بار کی فرمائش اور تقاضوں کے بعد کبھی ایک آدھ غزل کسی رسالے یا اخبار کو دیا کرتے تھے۔ وہ مشاعروں میں شریک ہونے کے بہت زیادہ عادی نہیں تھے۔ خاص خاص مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور اکثر یہ دیکھا گیا کہ ان کا کلام محفل سے غیر معمولی داد و تحسین حاصل کئے بغیر نہیں رہا۔

غرض اپنی وضع داری، سادگی، خوش اخلاقی، قناعت پسندی کے لحاظ سے صفیؔ اگلے زمانے کے بزرگوں کی ایک آخری نشانی تھے اور شاعری سے قطع نظر بہ حیثیت انسان بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔

# صفی کی عشقیہ شاعری

از :- جناب محمد منظور احمد صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) مددگار مدرسہ فوقانیہ چوک

عشق سے انسانی طبیعت زیست کا مزہ پاتی ہے۔ یہ انسان کے خمیر میں ہے۔ کیفیاتِ حسن سے انسان کا متاثر ہونا بھی فطری تقاضا ہے۔ اس لئے ہر زبان میں عشقیہ شاعری موجود ہے۔ چنانچہ اردو زبان میں بھی ولی سے صفی تک بڑے بڑے غزل گو شعرا پیدا ہوئے جنہوں نے عاشقانہ جذبات، دلی واردات اور کیفیاتِ حسن کو تخیل کی بلندی، خیالات کی پاکیزگی، زبان کی خوبصورتی اور اندازِ بیان کی دلکشی، دل نشینی کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھالا۔ لیکن جیسا کہ کہا گیا ہے ــــ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است ــــ اردو میں غزل گو شعرا کی کثرت کے باوجود، شعر کہنے کا فطری رجحان اور پاکیزہ ذوق رکھنے والے شعرا نے احساس، ادراک اور وجدان کے سہارے اپنی وحدت و انفرادیت کو قائم و برقرار رکھا۔

یہ صحیح ہے کہ غزل جذباتِ عشق کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ اثر پذیر دل رکھنے والے شعرا نے غالب کے اس ظرف تنگنائے غزل میں بقدرِ شوق وسعت و گنجائش پیدا کر ہی لی۔ انہی میں میر اسعد علی صفی اورنگ آبادی بھی شامل ہیں جن کی غزلیں نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی طرح خواص سے زیادہ عوام میں مقبول ہوئیں۔ عوام میں ان کی ہر دلعزیزی ان کے کلام کی سلاست، سادگی، روانی، بے تکلفی، خیالات کے سلجھاؤ اور نکھرے ہوئے دل نشیں رنگ تغزل کی وجہ سے ہے۔ درحقیقت یہی خصوصیات غزل کے لئے بمنزلہ حسن ذاتی کے ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر تم وقت کے مظلوم غلام نہ بننا چاہتے ہو تو مست بنو خواہ وہ مستی شراب کی ہو یا شاعری کی یا نیک کرداری کی۔ صفی زمانے کا آزمایا ہوا، ستایا ہوا اور عمر بھر قدرت کی طرف سے کھلونے دے کے بہلایا ہوا ایک مظلوم انسان تھا لیکن اس کی آزاد فطرت، خوددار طبیعت اور رند مزاجی کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ وہ زمانہ کا غلام بنے۔ شاید اس نے زمانہ کا مظلوم غلام نہ بننے ہی کی خاطر ہمیشہ مست رہنے کی کوشش کی اور اس کی یہ مستی کبھی شاعری کی مستی ہوتی تھی تو کبھی شراب کی۔ اور پھر جب ایک منزل ایسی بھی آئی کہ افلاس نے نہایت بے رحمی و سنگدلی سے غم روزگار کو بھلانے کا یہ آخری سہارا بھی اس سے چھین لیا تو اس نے صرف آنسو پیتے رہنے پر اکتفا کیا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ہوا ہوں جب سے مفلس اپنے آنسو آپ پیتا ہوں ۔۔۔ کر دیا کیا اے صفی عادت بری ہوتی ہے پینے کی

نگار ۱۹۴۱ء کے خاص نمبر میں نیاز فتحپوری نے صفی کی سلاستِ بیان کے متعلق کہا تھا کہ ــــ "وہ ایک نرم رو چشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے" ــــ صفی کے اشعار پڑھنے کے بعد دل پر اسی ہلکے سے ترنم کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے جدید اردو شاعری (صفحہ ۲۸۱) میں صفی کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار یوں فرمایا تھا کہ ــــ "داغ کا رنگ گویا

ان کے پاس چھن کر پہنچا ہے بلکہ اس سے بہت لطیف اور نازک تر ہو گیا ہے ۔ وہ روزمرہ کی بول چال میں ایسے نفیس شعر کہتے ہیں کہ شاید ہی کسی اور سے یہ طرز بن سکے ۔ اس کا بیشتر کلام سہل ممتنع ہے ۔ ان کے کلام کی اسی صفت (سہل ممتنع) کی چند مثالیں بھی سن لیجئے ؎

کونسا آفت زدہ رہتا ہے کوچے میں ترے　　　شب کو اک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں

---

اس کو تو دلاسا دے، تسلی دے، تشفی دے　　　عدو کا دل تو دل ہے؟ اور اے بیداد گر میرا؟

---

یا میری سن لیجئے یا قتل ہی کر ڈالئے　　　یا مجھے آرام ہو یا آپ کو آرام ہو

---

یہ مانا آسماں تو ظالموں کا ایک ظالم ہے　　　مگر میں کیا کروں جب ہو عقیدہ آپ پر میرا

نواب مرزا خاں داغ کو خوش قسمتی سے زندگی کی رنگینی اس قدر کثرت سے ملی کہ کبھی کبھی وہ اس سے مست و سرشار ہو کر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے اور بہک گئے۔ چنانچہ ان کی زندگی ہی کی طرح شاعری میں بھی کبھی کبھی ان کے ہاتھ سے متانت و سنجیدگی اور پاکیزگی خیال کا دامن چھوٹ گیا۔ داغ کے برخلاف صفی زمانے کی ناقدری اور اپنی قلندرانہ بے نیازی کی وجہ سے زندگی کے تلخ تجربات اور حوادث کا شکار رہے۔ اس لئے وہ داغ کی طرح رنگین نوا شاعر نہ بن سکے اور اگر ان کے کلام میں کہیں رنگینی خیال ہے بھی تو وہ ان کے خونِ دل کا اثر ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا ہے ؎

رنگینی خیال میں ہے خونِ دل صفی　　　میری خزاں ہے اور غزل کی بہار ہے

صفی کی سخت جانی نے شدتِ غم میں بھی کمالِ خوبی سے غم کو چھپانے، زندہ رہنے اور صبحِ زندگی کو جوں توں شامِ زندگی تک پہنچانے میں مدد دی۔ اسی لئے ان کے غم میں بھی آرزو کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مایوسی، ناکامی اور غم کی بدولت ان کے کلام میں ان کی زندگی کی تلخی پیدا نہ ہوسکی بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناگوار بات کو بھی وہ ضبط کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

اب تمہاری دوستی کو دونوں ہاتھوں سے سلام　　　جو ہوا اچھا ہوا جو کچھ کیا اچھا کیا

ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ اگر عشق واقعی سچا ہے تو پھر بے خطر اسے آگ کے دریا میں بھی کود پڑنا چاہیئے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

عاشق ہیں تو چناں چنیں کیا　　　مرنا ہے تو اگر مگر کیا

صفی قدیم طرز کا ایک کامیاب شاعر ہے۔ وہ ایک واقفِ فن اور پختہ مشق شاعر ہے۔ ادا کی [illegible]، بندش کی خوبی، واقعات کی دلکشی، تشبیہات، محاورات اور روزمرہ کا برمحل استعمال، ان کی عشقیہ شاعری کی جان ہیں۔ صفی میں داغ کے بہت سے انداز پائے جاتے ہیں لیکن ان کی شاعری، حسن و عشق کی عامیانہ و سوقیانہ اندازِ بیان سے پاک ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں مشکل سے مشکل قافیوں کو نہایت سلاست، روانی، برجستگی اور صفائی سے باندھا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، متانت اور حسنِ بیان

کا مجموعہ ہے اور زبان بھی شستہ ہے۔
مصحفی کے کلام کی جن خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے چند کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔
تشبیہہ، استعارہ، روزمرہ اور محاورے کے استعمال کی چند مثالیں سنئے:۔

آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے　　　　کانوں کانوں مجھے خبر نہ ہوئی

---

عشق میں بشاشت بہت کم رہے　　　　مے نے ہمیں کیف بہت کم دیا

---

آپ نے بخشا دلِ سوزاں مجھے　　　　یا کسی کافر کو جہنم دیا

---

تم ہم جو مل کے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں　　　　کیا مل کے بیٹھتے نہیں دنیا میں چار لوگ

**اندازِ بیان**

اندازِ بیان، خیال کی فرسودگی یا مضمون کی پامالی کے باوجود شعر کے ظاہری حسن میں نکھار پیدا کرنا بڑا کمال ہے۔ مصحفی پرانی بات ہی سے نئے اور انوکھے انداز بیان کے ذریعہ اچھوتا پن پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کی مضمون آفرینی لائق ستائش ہے۔ چند مثالیں سنئے:۔

جب اس نے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا　　　　زبان پر نہیں صورت پر اعتبار کیا

---

کسی کی حسرتوں کا خون جب ہوتا ہے اے قاتل　　　　تو سرخی دوڑ جاتی ہے ترے رخسار پر کیا کیا

---

نہ دیکھے وہ تو اپنا گریہ بے سود　　　　نہ پوچھے وہ تو اپنا مدعا کیا

---

تیری مژگاں کے تصور نے جگایا رات بھر　　　　ہم تو سنتے تھے کہ کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے نیند

مصحفی نے حسن کی سحر طرازی، عشق کی بے تاب تمنا، ولولہ، امنگ، حوصلہ اور محبوب کے تجاہل و تغافل پیہم کے باوجود اس سے مایوس نہ ہونے اور تلخئ کام و دہن کی آزمائش سے گذر کر زہرِ غم کو رگ و پے میں بخوشی جاری و ساری کر لینے کے والہانہ اور دیوانہ وار اشتیاق کو نہایت ہی دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ شراب وہی پرانی ہے لیکن چونکہ جام نئے ہیں اس لئے جنتِ نگاہ ہیں اور ان کی کھنک فردوسِ گوش ہے۔
چوٹ کھائے ہوئے دل کو موسمِ بہار کے آتے ہی مجسم بہار کی یاد تڑپا دیتی ہے۔ من کی نگری میں ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے سینے میں ایک خلش، ایک کسک، ایک چبھن ہوتی ہے جسے دل محسوس کر سکتا ہے کہہ سکتا نہیں اور دل کے زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔

جب آ گئی بہار تری یاد آ گئی　　　　ہر سالِ نو پہ تازہ یہ زخمِ کہن ہوا

پھر جب یادِ محبوب سے عاشق کی جان پہ بن جاتی ہے تو اس کے غمخواروں سے اس کی یہ ابتر حالت دیکھی نہیں جا
اس لئے وہ محبوب کو اس بیمارِ محبت کی حالت کا مشاہدہ کروانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ صفیؔ کو کامل یقین ہے کہ اس کا حال
محبوب کبھی نہیں آئے گا بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے کہ میرے یہ غمخوار اس بارگاہِ حسن سے خود زندہ سلامت واپس آ جائیں تو یہ بھی مجھ پر
ایک عنایت ہی ہو گی ؎

کسی طرح مرے غمخوار انھیں تو کیا لاتے　　　عنایت ان کی جو خود جا کے لوٹ آتے ہیں

آپ کو شاید یاد ہو غالبؔ کے قاصد نے بھی ایک بار بہت دھرمی، خود اعتمادی اور ضبط کا دعویٰ کیا تھا لیکن غالب
محبوب سے جب اس کا "آمنا سامنا" ہوا تو پھر وہ اپنی سُدھ بھول گیا۔ کچھ تو اسے اپنے دعویٰ کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا او
کچھ غالبؔ کے سامنے شرمندگی و ندامت کا خیال اور پھر ہوش و حواس کے گم ہو جانے کی وجہ سے بھی اس کا پتہ بھی غالبؔ کو ج
سکا۔ چنانچہ غالبؔ نے اس شعر میں اسی حادثے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم　　　میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

محبوب کے کوچہ میں قدم رکھتے ہوئے صفیؔ کا دل کبھی کبھی خوف کھاتا ہے اور وہ اپنی جان کی خیر مناتا ہے۔

صفیؔ کی جان بچ جائے تو بس ہے اس کے کوچے میں　　　وہاں سے زندہ آیا تو سمجھو کامیاب آیا

عاشق کے لئے روحانی مسرت کے چند لمحے ہی دراصل لازوال زندگی کا باعث ہوتے ہیں اور یہ روحانی مسرت سچے او
پاکیزہ جذبۂ حسن پرستی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا کی اس فانی زندگی کا صفیؔ کو کوئی اعتبار نہیں۔ لیکن اس کا ایقان ہے کہ اگر حسن
عشق کے لئے باعث زندگی ہو جائے تو پھر عشق لافانی اور لازوال ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

مجھ کو تو زندگی پہ نہیں کوئی اعتبار　　　تم وجہ زندگی ہو تو پھر اعتبار ہے

محبوب کی مہربانی عاشق کے لئے خزاں میں بھی بہار کا سا لطف رکھتی ہے اور اس کی نامہربانی، ناراضگی یا فراق سے بہا
کے حسین مناظر بھی اس کے دل کو پیہم خزاں کی طرح پژمردہ و سوگوار رکھتے ہیں اور سیرِ باغ کے وقت خندۂ گل خندہ بے
کا سا اثر رکھتے ہیں جسے وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ گویا دراصل وجہ بہار، موسم بہار نہیں بلکہ محبوب کا دلنواز اور زندگی بخش
برتاؤ ہے۔ صفیؔ کا شعر سنئے ؎

نامہرباں ہے تو خزاں ہے بہار بھی　　　وہ مہرباں ہے تو خزاں بھی بہار ہے

بارگاہِ حسن میں پہنچنے کے بعد عاشق کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کا محبوب محض رسمی طور پہ ہی اس کی آرزو معلوم نہ کرے بلکہ
مہربانی کا برتاؤ بھی کرے۔ محض دریافت حال سے عاشق کے دل کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس کے غم کی شدت میں اور اضافہ
ہو جاتا ہے اور پھر عاشق جب اپنی آرزو کا اظہار کرتا ہے تو بصد ہزار امنگ و اشتیاق کرتا ہے۔ اسے یہ توقع ہوتی ہے
کہ شاید محبوب کی نگاہِ کرم اب کی بار باعث زندگی ہو جائے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

آرزو رسم ادائی سے نہ پوچھ اے قاتل　　　آرزو آس کے بل بوتے کہی جاتی ہے

حسرتؔ موہانی نے چشمِ یار کی معجز بیانیوں کو اس طرح بیان کیا تھا ؎

اللہ رے چشمِ یار کی معجز بیانیاں　　　ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے

مصحفی کے محبوب کی ذرا سی مسکراہٹ اہلِ محفل کو غلط فہمی یا زیادہ صحیح الفاظ میں خوش فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے اور ہر شخص اپنے تصور کی دنیا میں امیدوں کا محل بنا لیتا ہے ؎

سب کو کیا کیا بندھی ہیں امیدیں
وہ ذرا بھی جو مسکرایا ہے

محبوب کی گفتار سے لذت حاصل کرنے کے لئے مصحفی عمداً جان بوجھ کر بہرے بنتے ہیں تاکہ اس کی روح پرور آواز سے کیف و سرور حاصل کریں اور ان کی یہ ترکیب کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔

بہرہ بنا ہوں لذت گفتار کے لئے
سو سو طرح جتاتے ہیں وہ ایک ایک بات

غالب نے بھی اسی لذتِ گفتار کے پانے کے لئے بالکل یہی طریقہ اختیار کرنا چاہا تھا چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

بہرہ ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

عاشق کا لاابالی پن حسن سے والہانہ وابستگی کا ارمان یا اس کا جذبہ سپردگی اسے راہ عشق میں مسلسل ناکامیوں کے باوجود ہوش سنبھالنے کا موقع ہی نہیں دیتا اور وہ اس بات پر کبھی غور ہی نہیں کرتا کہ اگر محبوب سے نباہ نہ ہو سکے تو پھر عشق کا انجام کیا ہوگا۔ مصحفی کہتے ہیں ؎

انجام عاشقی میں کبھی سوچتا نہیں
جاتا نہیں خیال کسی کا نباہ پر

محبوب کے غصے کی کیفیت کو مصحفی اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

جب وہ گرم عتاب ہوتا ہے
چہرہ اور آفتاب ہوتا ہے

ایک اور جگہ اس سے زیادہ بہتر اور رنگین انداز میں اس کیفیت کی تصویر کھینچی ہے ؎

لال انگارہ بنا جاتا ہے غصے سے وہ منہ
شفقی رنگ میں اور آگ لگی جاتی ہے

لیکن مصحفی محبوب کے غصے یا عتاب سے خفا نہیں ہوتا، مایوس نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے دل کو اس طرح بہلاتا ہے ؎

اہلِ جمال ہم سے مکدر بھی ہیں تو کیا
رہتی نہیں ہمیشہ گھٹا مہر و ماہ پر

حسرت موہانی سے ایک بار ایسی غلطی ہو گئی تھی کہ محبوب کے روٹھ جانے پر وہ بھی اس سے خفا ہو گئے تھے لیکن پھر جلد ہی انھیں اپنی اس غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ ان کا شعر ہے ؎

وہ جو بگڑے تو خفا تم بھی ہوئے کیوں حسرت
پائے نخوت پہ سرِ شوق جھکا دینا تھا

مصحفی تو سعیٔ لاحاصل میں بھی عمر کا حاصل پانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے بے وفاؤں سے وفا کرنے کا خیال ان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتا ؎

بے وفاؤں سے ہے اب تک بھی وفاؤں کا خیال
عمر کا حاصل ہماری سعیٔ لاحاصل میں ہے

عاشق اپنے محبوب کی آمد کا منتظر رہتا ہے تاکہ وہ آئے تو اس کی بیداد پسندی کی شکایت کرے اور غفلت شعاری سے باز آنے کی درخواست کرے لیکن جلوۂ حسن اور بیتابیٔ تمناؤں کے ہجوم سے بے اختیارانہ طور پر محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ اس کا حیرت اور رعبِ حسن سے زبان پر مہرِ خاموشی لگ جاتی ہے۔ اس خیال کا اظہار میر نے خوب کیا ؎

کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

وفورِ اشکِ پیہم اور ہجومِ شوقِ بیحد سے تو حسرت موہانی کی آنکھوں سے آبشارِ آرزو جاری ہو جاتا ہے ؎

وفورِ اشکِ پیہم سے، ہجومِ شوقِ بیحد میں — مری آنکھوں سے ہے اک آبشارِ آرزو جاری

صفی کا شعر بھی سنئے ؎

ہم ان کے سامنے مجبور ہو کے رو دیئے — اگر زباں سے ایک حرف بھی ادا نہ ہوا

پھر کبھی محبوب اگر وفادار رہنے کا عہد کرتا ہے اور اپنے اس عہد کا یقین دلانے کے لئے قسم کھانا چاہتا ہے تو دیکھئے صفی کہتے ہیں کہ ؎

عہدِ وفا پہ آپ قسم تو نہ کھائیے — آجائے گی ہنسی مجھے اس بات پر کہیں

کبھی کبھی مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے مایوس ہو کر صفی ترکِ عشق کا عہد کرتے ہیں لیکن ان کے بس کی بات نہیں کیونکہ عشق کیا نہیں جاتا بلکہ ہو جاتا ہے۔ انھیں کی زبان سے سنئے ؎

سو بار ترکِ عشق پہ وعدہ خلاف ہوں — گویا مری زبان تمہاری زبان ہے اب

غرض صفی کی عشقیہ شاعری اس کی سلاستِ زبان اور قدرتِ بیان کا اعجاز معلوم ہوتی ہے۔ وہ داغ کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔ موجودہ دور نئے خیالات، نئے نغمے، نئی خواہشیں، نئی پکار اور نئے مطالبے کر رہا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک انسان کے سینے میں دل زندہ ہے اور اس دل میں آرزو، تمنا اور گرمیِ حیات باقی ہے۔ شاعری میں حسن و عشق کے مضامین برابر باندھے جائیں گے، غزل باقی رہے گی اور اس طرح اردو دنیا صفی اورنگ آبادی کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

# محاورات میں صفیؔ کا مقام

از۔ جناب ابو محمد سید علی صاحب سریر

حضرت صفیؔ اورنگ آبادی سرزمین دکن کے ممتاز اور نامور شعراء کی فہرست میں ہیں جس پر جنوبی ہندوستان ہی نہیں بلکہ سارا ہندوستان بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر و سخن کے تعلق سے صفیؔ کا کلام ٹھکا ہوا تر و تازہ گوناگوں زیبائشوں اور دلفریبیوں کا گلدستہ، نظر فروز روح نواز تجلیوں کا مخزن، کیف و سرور کا منبع۔ عرفانیات و وجدانیات کا مرکز، چمنستان رنگ و بو کا آئینہ، نگارستان جمال کا مرقع ہے جس سے مطالعہ کرنے والوں کے دماغ معطر ہو جائیں اور جس کے متعلق بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ صرف قادر الکلام اساتذہ ہی نہیں بلکہ جنھیں بلا خوف و تردید مصلح ادب اور محافظ زبان کہا جاسکتا ہے۔

ہمارے ملک کی بڑی ناقدرشناسی ہے کہ آپ کا کلام آج تک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکا اور آپ کو ان کے کلام میں زبان و ادب کے اچھوتے موتی ہر طرف چمکتے نظر آتے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اصناف سخن میں حضرت صفیؔ نے تغزل ہی کا انتخاب کیا اور اس میں ان کی انفرادیت جگہ جگہ جھلکتی نظر آتی ہے۔

آج ہم اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں صرف یہ دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ صفیؔ نے اردو ادب کے محاورات میں کونسا مقام حاصل کیا اور اس سے زبان و ادب کا کیا اندازہ قائم رہ سکتا ہے۔

اردو ادب میں محاورہ کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی پڑھے لکھے سے پوشیدہ نہیں۔ بعض اساتذہ فن نے کلام کی خوبیوں کے تعلق سے جو معیار مقرر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"اہل زبان کے کلام میں چند ایسی مابہ الامتیاز باتیں پائی جاتی ہیں جو غیر اہل زبان کو میسر نہیں ہوسکتیں اور وہ باتیں ایسی ہیں جن میں محاورہ بندی، روزمرہ کی پابندی، فصاحت و بلاغت کے ساتھ الفاظ کی ڈھلت بیان میں صفائی کلام سنتے ہی سمجھ میں آجاتا ہے اور پھر اس کا اثر ہونا۔" [۱]

وغیرہ شامل ہے۔

اب رہا یہ امر غور طلب ہے کہ غزل گوئی میں سادگی بہتر ہوگی یا ادق گوئی ایک علیحدہ موضوع ہے جس پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں۔ قدما میں استاد راسخ دہلوی نے محاورات اور روزمرہ بول چال ہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون کو اس حسن و خوبی کے ساتھ ادا کیا کہ

---

[۱] دیکھو جلوۂ داغ صفحہ [illegible]

سننے والا بے ساختہ پھڑک کر رہ گیا۔ بالکل یہی حال حضرت کیفی اور صفی کا تھا۔ ایک بلند سے بلند مضمون کو سلیس پیرایہ میں ادا کیا۔ یہی کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک فطرت نگار شاعر کا حصہ ہوا کرتا ہے کہ وہ جس چیز سے متاثر ہو کر شعر کہتا اور قافیہ کے ذریعہ تصدیق کرتا ہے کہ سامعین گم ہو جاتے ہیں۔ صفی کے تغزل میں بھی جگہ جگہ اس کی جھلکیاں اور انوکھا پن نمایاں موجود ہے۔ قدیم اساتذۂ فن شاعری کا یہ متفقہ خیال ہے۔

غزل کے لفظی معنی معشوق سے گفتگو (بات چیت) کرنے کے ہیں۔ راز و نیاز کے رنگین مضامین نہ بیان نہ کئے جائیں اس وقت تک، غزل غزل کی تعریف میں نہیں آسکتی اور وہی شعر سامع کے قلب پر اثر انداز ہو سکتا ہے جس میں سچے جذبات و احساسات کے ساتھ اس کی معنوی حیثیت بھی برقرار رہے۔ جس شعر میں یہ ساری خوبیاں ہوں بقائے دوام حاصل کر سکتا ہے۔

حضرت صفی فرماتے ہیں اور کس خوبی سے فرماتے ہیں ؎

کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچہ میں ترے
شب کو ایک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں

جس طرح کسی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں ایک نصاب کی باضابطہ ضرورت داعی ہوتی ہے اسی طرح ایک شاعر کے لئے بھی حسب ذیل علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھنے کی ضرورت ہے تا وقتیکہ وہ علوم مروجہ میں کافی دستگاہ نہ حاصل کر لے اس وقت تک اس کے نصاب کی تکمیل نہیں ہو سکتی اور اس وقت تک اس کی شاعری بھی تشنہ رہے گی۔

علم لغت — جس سے الفاظ کا صحیح استعمال اور سمجھنے میں کوئی دقت نہ واقع ہو — دوسرے
علم معانی — جس سے الفاظ کا مناسب اور برمحل استعمال معلوم ہو سکے — اور تیسرے
علم بیان و بدیع و انشاء — جس سے کلام کے لفظی و معنوی محاسن کی جانچ پڑتال کی جا سکے۔

ان چند علوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم حضرت صفی کی شاعری کا غائر مطالعہ کریں تو شعر کی اہمیت دوبالا ہوتی ہے۔ جس شاعر کے پاس طرز ادا کے ساتھ لطف زبان کی دونوں خوبیاں موجود ہوں تو اس کا کیا کہنا۔ چنانچہ صفی نے اپنی غزل کے ایک مقطع کو اس طرح کہا ہے ؎

صفی حضرات کیفی و ضیا کا سب تصدق ہے
کہیں طرز ادا سیکھی کہیں لطف زبان پایا

محاورہ کے لفظی معنی آپس میں کلام کرنے یا (ایک دوسرے سے گفتگو کرنے) کے ہیں۔ محاورات جمع ہے محاورہ کی اس کے معنی ہم کلامیاں کرنا۔ اس کا مادہ حور ہے۔ اس میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ جس کی انتہا سات تک بھی ہو سکتی ہے محاورہ کہلاتا ہے اور اس پر روزمرہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔

محاورہ کا اطلاق خاص کر ان افعال پر کیا جاتا ہے جو مجازی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ محاورہ کے تعلق سے ذوق نے بھی "دیر چلو پانی" والا ایک محاورہ نظم کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا دیر چلو پانی سے ایمان بہہ گیا

ایک اور محاورہ "کشتی خدا پہ چھوڑ دو" "لنگر کو توڑ دو" کو کس اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

احسان ناخدا کے اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دو لنگر کو توڑ دو

اسی طرح حضرت صفی نے بھی ایک ہی شعر میں دو محاورات ایک "جی گھبرا جانا" اور دوسرا "باتیں ہیں باتیں" [illegible] کیسے اچھے انداز میں پیش کرکے محاورہ کے استعمال کا [illegible] ادا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہم نشیں خاموش جی گھبرا گیا — یہ میری باتیں ہیں یا برسات ہے

محاورہ کا محل استعمال دیکھئے اور جی کھول کر داد دیجئے۔ صفی کہتے ہیں ؎

لالہ و گل کا یہ جوبن چار دن ہی ہی سہی — سیر کے قابل بہار گلشن ایجاد ہے

عام طور پر شعراء نے اپنے دشمن کو دشمن کہا ہے یا آسمان کو اپنا عدو بنایا ہے لیکن آپ نے دل کو اپنا دشمن بتا کر بالکل نئی بات پیدا کی۔ محاورہ کی خوبی پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں ؎

وہ آتے ہیں تو اب کچھ حضرت دل رنگ لاتے ہیں — عجب آفت میں ہوں دشمن بغل میں دوست پہلو میں

شاعر کی نکتہ رس طبیعت کے مرقع کو ایک اور شعر کے ذریعہ سمجھئے۔ کہا ہے ؎

جو چیز عیش وہ عالم سے بے نیاز کرے — وہ درد دل ہے خدا جس کو سرفراز کرے

ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

ان کو دیکھو وہ نظر آیا کئے ہر ایک میں — مجھ کو دیکھو دیدہ و دانستہ اندھا ہو گیا

روزمرہ کے لفظی معنی ہمیشہ اور ہر روز کے اہل لغت نے لکھا ہے۔ روزمرہ کی پابندی تقریباً تحریر اور نظم گوئی میں ضروری ہے۔ اگر روزمرہ کی پابندی سے گریز کرتے ہوئے کوئی نئی بات کہی جائے تو ظاہر ہے فصاحت میں کمی واقع ہوگی۔ اس لحاظ سے اہل زبان نے روزمرہ کی پابندی کو نہایت ضروری قرار دیا۔

حضرت صفی کا ایک مقطع ہے ؎

محفوظ روزمرہ کو محبوب رکھو صفی — اللہ کا کلام ہے نبی کی زبان میں

جہاں لفظی خوبیوں کا سوال پیدا ہوتا ہے وہاں لفظ کے ساتھ ہی معنی کی خوبی پر نظر جاتی ہے۔ جب وہ لفظی اور مرادی معنوں سے اس کو تشفی ہو جانے کے بعد وہ مادہ کی جانب اس کا خیال منتقل ہوگا کہ وہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اگر یہ اردو میں منتقل ہوا ہے تو متقدمین نے جو قاعدے بیان کئے ہیں اس کے لحاظ سے پورا اتر سکتا ہے یا نہیں۔ اگر لفظ استعمال ہوا ہے تو پھر لفظ کی چھان بین کرے گا۔ ان تمام باریکیوں پر غور و فکر کرنا صرف اہل زبان ہی کا کام ہے۔ ان اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے صفی اورنگ آبادی اپنے مطلع میں کہتے ہیں۔

اہل زباں نہیں ہوں زباں داں ہوں اے صفی — رتبہ میرا زیادہ ہے اور اعتبار کم

اس حقیقت کا آج سب یکساں طور پر اعتراف کرتے ہیں کہ اس دور کا یہ ایک روشن پہلو ہے کہ اس میں اردو کی ابتدا اور تاریخ کے متعلق خاص توجہ کی گئی اور اسی طرح اردو کو سنوارنے کے جتن کئے گئے۔ شاعری کی دنیا میں چند بزرگوں نے سخنوری پر پہنچا دیا۔

حضرت صفی اورنگ آبادی جو بلاشبہ استبداد زمانہ کا شکار ہوئے اور کبھی انھیں ہندوستان گیر شہرت نصیب نہ ہو سکی مگر جہاں تک فن کا تعلق ہے وہ مسلمات میں تھے۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی بھر انھیں امید کے باغ کا ایک پھول بھی نہ ملا اور ان تنگ و تاریک غم خانہ میں خوشی کا دیا کبھی ضوفشاں نہ ہو سکا اور جب کی نگاہیں مسرتوں کے نور سے کبھی آشنا نہ ہوئیں پھر وہ کیسے شہرت تامہ حاصل کرتا۔ یہ فرض ان شعرا اور تلامذہ کا ہے جنھوں نے ان سے تلمذ کا شرف حاصل کیا ہے۔ اب ہمیں ان کارناموں کو اور سارے زبان کی خوبیوں کو چار دانگ عالم میں پھیلانا ہے جس کا بیڑا خود انھوں نے اپنی زندگی میں اٹھایا تھا اور ایک تعمیری نقشے کو

پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی بنیاد ڈال دی تھی بعد از کہ وہ نقشہ جو صرف اذہان میں مرتسم ہے اپنی شکل و صورت میں جلوہ گر ہو کر آنے والی نسلوں کے لئے بھی لا فانی یادگار بنا رہے۔

میں نے تو چند ہی شعروں کے حوالے سے اپنے ایک مختصر مضمون کی تکمیل کی ہے۔ ورنہ اس پر بہت کچھ لکھا اور کہا جا سکتا ہے۔

---

# نذرِ عقیدت

آج فیضِ سخن سے ہیں محروم — کیوں نہ اہلِ دکن رہیں مغموم
چل بسا شہ سوارِ عرصۂ نظم — جس کی غزلوں کی جا بجا تھی دھوم
بندش ایسی کہ سلک مروارید — لفظ لفظ گوہرِ منظوم
ذوق انگیز وہ ہر اک معنی — ندرت آمیز وہ ہر اک مفہوم
وہ زبان و بیان پر قدرت — برمحل وہ محاوروں کا لزوم
ناگوار اس کو عامیانہ روش — ناپسند اس کو سال خوردہ رسوم
تھے ادب کے فنون سب کے سب — ذات سے اس کی لازم و ملزوم
اب کہاں قادر الکلام ایسا — فانیؔ داغ دہلوی مرحوم
تھا وہ خدمت گزار اردو کا — ایسے خادم کو کہتے ہیں مخدوم
زندگی اس نے کس طرح کاٹی — ملنے والوں کو بھی نہیں معلوم
تھی قناعت پذیر طبعِ غیور — کسمپرسی نہ کر سکی مغموم
اب جو بعد اس کے سر اٹھاتے ہیں — اس کے آگے تھے دشنہ بر حلقوم
بلبلِ بوستانِ شعر و سخن — خوش نوائی سے ہو گیا محروم
وہ چمن کا نکھار ہی نہ رہا — چل گئی یک بیک جو بادِ سموم
لٹ گیا لٹ گیا غزل کا سہاگ — تجھ کو پیک اجل یہ کیا معلوم
اٹھ گیا ہائے کیا غزل کا امام — ہے غزل ختم "بس" فقط مرقوم
تھا وہ پیغمبرِ سخن حاوی — اور پھر لطف یہ کہ تھا معصوم

نہ رہا مد ظلہ کا محل
کہئے اب حضرت صفی مرحوم

غلام علی حاوی

# صفی اورنگ آبادی اور اُن کی شاعری

از:۔ جناب منیر صفوی صاحب

تجھے یہ صاف گوئی اے صفی بدنام کردے گی
لگائی جائیں گی رائیں ترے اشعار پر کیا کیا!

کسے خبر تھی کہ ضلع اورنگ آباد میں ایک حکیم کے گھر پیدا ہونے والا لڑکا کبھی گیسوے اردو کو سنوارنے میں نمایاں حصہ لے گا اور دنیائے شعر وادب میں ایک ممتاز مقام حاصل کر سکے گا۔ ۲۶ رجب ۱۳۱۰ھ کو سرزمین دکن کے ایک تاریخی مقام اورنگ آباد میں صفی نے جنم لیا۔ اورنگ آباد مغلوں کے زمانے ہی سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ نام بہاؤ الدین تھا لیکن بعد میں خود انھوں نے اپنا نام مرزا بہبود علی رکھا۔ مقام پیدائش پر اپنی زندگی کے سات سال گزارنے کے بعد صفی نے شہر حیدر آباد کا رخ کیا۔ تعلیم کا بے حد شوق تھا۔ ابتدا میں مدرسہ نظامیہ میں شریک ہوئے اور پھر مدرسہ طبیہ میں داخل ہوئے جہاں نصاب تو تکمیل کر لئے مگر امتحان نہ دے سکے۔

اتفاق کی بات ہے کہ مجھے صفی کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا کیونکہ ہمارے خاندان سے صفی کے بہت گہرے تعلقات رہے ہیں، اس لئے بچپن ہی سے مجھے ان سے بار بار ملنے، گفتگو کرنے، ان کا کلام ان کی زبان سے سننے اور علمی و ادبی مباحث سے استفادہ کرنے کے کافی مواقع ملے۔ جہاں تک میں نے انھیں سمجھا ہے اور اپنے بڑوں سے سنا ہے وہ یہی کہ صفی ایک پیدائشی شاعر ہیں۔ ان کے مزاج میں بچپن ہی سے شوخی اور شگفتگی موجود تھی۔ صفی کی عمر کا زیادہ تر حصہ اردو غزل گوئی میں صرف ہوا۔ وہ ہمیشہ اپنے فن میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کیا کرتے۔ ابتدا میں انھوں نے ضیا دہلوی کو اپنا کلام بتایا۔ پھر ظہور دہلوی سے مشورۂ سخن رہا۔ بعد ازاں انھوں نے فروغ کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ ابتدا ہی سے صفی کے کلام میں اس قدر پختگی، سلاست اور روانی تھی کہ خود ان کے اساتذہ کو تعجب ہوتا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے کلام کی اصلاح کو اپنے قابو سے باہر سمجھا۔ ابھی صفی کی شاعری درجۂ کمال تک پہنچی نہ تھی کہ ان کی نظر میں حضرت داغ کے شاگرد رشید کیفی پر پڑی اور سنہ ۱۳۳۶ھ میں صفی کو ان سے تلمذ حاصل ہوا۔ کیفی اپنے زمانے کے مستند اساتذہ میں سے ایک تھے۔ ان کی شاعری میں داغ کا رنگ بہت زیادہ جھلکتا ہے۔ کیفی کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے شاگردوں میں سے کوئی ایک نکلے جو داغ کا نام روشن رکھ سکے۔ اگرچہ صفی کو صرف دو سال تک کیفی کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ کیونکہ سنہ ۱۳۳۸ھ میں کیفی کا انتقال ہو گیا۔ لیکن پھر بھی اس مختصر سی مدت میں صفی کو ان سے کافی فیض پہنچا اور صفی نے اپنی اپج، جدت طبع، طرز بیان، سلاست و برجستگی اور زبان کی لطافت کا وہ سکہ کیفی پر بٹھایا کہ خود کیفی فخر کرنے لگے کہ میں ایک ایسے شاگرد کا استاد ہوں جو اپنے فن کی امامت کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ صفی ایک باکمال شاعر گزرا ہے اور اس کو اپنے فن پر کافی عبور حاصل تھا۔

صفی کا کلام یقیناً اردو دنیا میں ایک سدا بہار گلزار ہے اور ان کے اشعار خزانۂ علم وادب میں انمول جواہرات اور نایاب موتی کی طرح چمکتے دمکتے ہی رہیں گے۔ لیکن اردو زبان کے پرستاروں کی یہ بڑی کم نصیبی تھی کہ ان کے کلام کا ایک بھی مجموعہ ان کی زندگی میں منظرِ عام پر نہ آسکا۔

صفی قدیم مکتب خیال اور قدیم رنگ کے شعرا کی آخری یادگار تھے۔ داغ کے اٹھ جانے کے بعد شمع شعر و سخن ٹمٹما رہی تھی، صفی کی آواز فضا میں گونجی، شمع کی لو تیز تر ہوگئی، دنیائے شعر و ادب جگمگا اٹھی۔ سرزمین دکن نے جہاں قلی قطب شاہ، نصرتی، وجہی، غواصی، ابن نشاطی اور ولی کو جنم دیا اور ایک خاص مقام حاصل کیا وہیں صفی کا نام بھی دکن کے لئے موجب فخر و زینت بنا۔ صفی غربت کی چھاؤں میں جنم لیتے ہیں۔ غربت ہی کے گھٹے گھٹے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور غربت ہی کے تاریک سناٹے میں دور اور بہت دور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ صفی ایک بلند پایہ شاعر تھے لیکن زمانے کا جو برتاؤ ہر بڑے شاعر اور با کمال کے ساتھ رہتا ہے وہی برتاؤ صفی کے ساتھ بھی رہا جس کا لازمی نتیجہ صفی کو پریشان حالی اور تباہ کن ماحول میں اپنی زندگی گزارنی پڑی۔ صفی جہاں ایک طرف غم جاناں میں مبتلا تھے وہیں دوسری طرف انھیں غم دوراں سے بھی دوچار ہونا پڑا اور بعض مرتبہ تو غم دوراں اور غم روزگار نے انھیں اس قدر تنگ کیا کہ وہ زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑے ہو گئے۔ لیکن ان کی خوددار اور قناعت پسند طبیعت، زندگی کی تمام تلخیوں کو خاموشی کے ساتھ سہتی ہی رہی۔ خود صفی کے ایک شعر سے ان کی طبیعت اور خوددار فطرت کا اندازہ ہوتا ہے ؎

آبرو کھو کر کوئی کیوں اہل دولت سے ملے — پاؤ ٹکڑا لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

صفی ہر حال میں صابر و شاکر رہتے تھے اور دامن خودداری کو کبھی بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ زمانے کی گردشوں اور پریشانیوں سے جب وہ تنگ آ جاتے تو شعر و سخن ہی کی مصروفیات سے اپنے دل کو تسکین دیتے۔ تفکرات ہمیشہ صفی کو گھیرے رہتے لیکن اس کے باوجود مسکراہٹ ہمیشہ لبوں پر کھیلتی رہتی تھی۔ وہ جس کسی سے ملتے اس کے رتبہ کا بڑا خیال رکھتے۔ صفی میں غرور و تکبر نام کو نہ تھا۔ جس طرح ان کا کلام سیدھا سادھا ہے اسی طرح ان کی طبیعت سادگی پسند تھی، جو کوئی ان سے ملتا کچھ نہ کچھ تاثر لئے بغیر نہیں جاتا۔ زندگی کے درمیانی حصے میں صفی کو کچھ دنوں خوش حال زندگی گزارنے کے موقع ملے لیکن خوش حالی بھی صفی کی طبیعت جلد بیزار ہو جاتی تھی اور صفی کو تنگ دست و مفلس بنا کر چھوڑ دیتی۔ صفی کی زبان جس قدر سادہ تھی ان کے رہن سہن کے طریقے بھی اس سے کہیں زیادہ سادہ تھے۔ کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ صفی کو تمام اصناف سخن پر کامل عبور حاصل تھا اور خاص بات تو یہ ہے کہ جو تخیل کی بلندی، زبان کی سلاست، طرز بیان کی دلکشی، جدت طبع، مزاج کی شگفتگی، روانی اور برجستگی شاعری کے ابتدائی دور میں پائی جاتی ہے وہ آخری زمانے تک قائم رہی۔ یہی نہیں بلکہ دن بدن اس میں اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ صفی کے کلام کا زیادہ تر حصہ غزل پر مشتمل ہے اور غزل ہی صفی کے کلام کا سب سے اہم اور روشن پہلو ہے۔ صفی حیدرآباد کے واحد غزل گو شاعر تھے جن کے کلام میں فطری جذبات، تشبیہوں کی کشش، زبان کی لطافت اور روزمرہ کی بول چال اور محاوروں کی چاشنی بہ کثرت پائی جاتی ہے اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ایک شاعر کو درجۂ کمال تک پہنچا دیتی ہیں۔ صفی کی ہر غزل میں دل کی دھڑکن اور قلبی تلذذات کی عکاسی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعری کی تمام اصناف میں غزل ہی وہ صنف ہے جس میں فطری جذبات کی مصوری اور قلبی واردات کی ترجمانی بطریق احسن ہو سکتی ہے لیکن تا وقتیکہ شاعر اپنے خون جگر سے شاداب نہ کرے اس وقت تک شعر میں تاثر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ الفاظ میں کشش۔ صفی کی غزل میں یہ بات وہ خود کہتے ہیں ؎

رنگینیٔ خیال میں ہے خون دل صفی — میری خزاں ہے اور غزل کی بہار ہے

صفی کی غزلوں میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ شاعر کا محبوب اور اس کی ادائیں ہیں۔ چنانچہ قدیم طرز رکھتا ہے یہ چیزیں ناگزیر تھیں لیکن جس ڈھنگ سے صفی ادا کرتے ہیں اور جس سادگی اور بے ساختہ پن سے بیان کرتے ہیں وہی کا تو تھا۔

صفی کی طبیعت آزادانہ منش تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ ایک زندہ دل شاعر تھے اور ان کا کلام حسن و محبت کا آئینہ دار یا یوں سمجھئے کہ عشق و محبت کا ایک ایسا پیمانہ جو زندگی کی مختلف رنگینیوں سے لبریز ہو۔ وہ اپنے محبوب کی شکل و صورت، حسن و ناز، قد و گیسو، رخسار و جبیں کے حسین تصورات میں ہمیشہ الجھے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

کسی کو جب سے دیکھا ہے دکھائی کچھ نہیں دیتا
ہوئی میری نظر کو دوست کس کی نظر دیکھو

قیامت آئی یا اس فتنہ قامت کو شباب آیا
حیا آئی، غرور آیا، ادا آئی، حجاب آیا!

جلوہ دکھا دو مرتے ہیں عاشق تو رنج کیا
صدقے اتر رہے ہیں تمہاری نقاب کے

رخسار دیکھئے کے ہیں عالیجناب کے
گویا چمن میں پھول کھلے ہیں گلاب کے

ہزار جان سے صدقے ہزار ہیں تم پر
جو ہو سکے تو ذرا اور خوبصورت ہو

حسینوں کا تنزل بھی نہیں ہے شان سے خالی
بڑھاپے میں بھی ان لوگوں کے منہ پر نور ہوتا ہے

صفی کے کلام میں روحانیت بہت زیادہ ہے۔ صفی اپنی غزلوں میں ہمہ تن اپنے محبوب کی یاد میں محو پائے جاتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے معشوق کی نگاہوں کا مرکز رہتے ہیں تو کبھی اس کے در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے ملتے ہیں۔ کبھی شاعر اپنے محبوب پر چھا جاتا ہے تو کبھی محبوب کا عتاب شاعر پر رہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اپنے محبوب پر نثار کرنے ہر وقت تیار رہتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس کا محبوب اس کا اپنا ہو جائے۔ زمانہ اسے اپنے محبوب سے ملنے ہی نہیں دیتا اور کبھی سامنا ہو بھی جائے تو بے اعتنائی بدگمانی سے کلیجہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ ادھر انکساری، ادھر بے نیازی؛ ادھر جاں نثاری، ادھر جفا کشی۔ پھر بھی اس کی عقیدت اور محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ بہر حال اپنے محبوب کی توجہ کا مرکز بننا چاہتا ہے ؎

محبت سے نہ دیکھو تم تو دشمن کی نظر دیکھو
خفا ہو کر، بگڑ کر، روٹھ کر دیکھو مگر دیکھو

جس سادگی سے وہ اپنے محبوب سے التجا کرتا ہے وہ ایک سنگدل سے سنگدل انسان کے لئے بھی قابل توجہ ہے مگر صفی کا محبوب ایسا سفاک ہے کہ اسے ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔ صفی ماضی کے سنہرے دن اور رنگین محفل کی یاد دلا کر متوجہ کرنا چاہتا ہے ؎

زمانہ یاد ہے وہ بھی کہ ہر جگہ ہم تم
گئے تو دو بدو آئے تو دو بدو آئے

لیکن محبوب کی ضد دیکھ کر صفی کے منہ سے بادل ناخواستہ یہ نکل جاتا ہے ؎

اف ری ضد، اللہ ری ہٹ، یہ طبیعت، یہ مزاج
جو کہا تھا آپ نے آخر اسے پورا کیا

اور پھر صفی اپنے محبوب کی جفاؤں سے تنگ آ جاتا ہے اور اسے کوئی امید نظر نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا بے بس ہو کر غربت کے عالم میں تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تصویر جاناں میں کھویا ہوا ہر لمحہ قسمت کی کم نصیبی کا رونا رونے میں گزرتا ہی جاتا ہے۔ اب بجز اس کے کعبۂ محبت کا طواف ہی کیا جائے کوئی اور صورت تسکین کی نظر نہیں آتی ؎

کہیں جاتے ہیں تو اس کی گلی سے ہو کے جاتے ہیں
اگرچہ راستہ اس راستے سے دور ہوتا ہے

پھر بھی [illegible] صفی اور شدت نفرت و بدگمانی اس قدر بڑھتی گئی کہ وہ چیخ اٹھتا ہے ؎

[illegible] کی جان بچ جائے تو بس ہے اس کے کوچے میں
وہاں سے زندہ آیا تو سمجھو کامیاب آیا

یہ تھا صفی کی عاشقانہ شاعری کا ایک سرسری خاکہ جس کے ذریعے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کی غزلوں کے دامن عشق کی کامیاب کشمکش کے پہلو کو واضح کیا جائے۔

صفیؔ جہاں عزل گوئی کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے وہیں وہ خوفِ خدا اور یادِ خدا سے بھی غافل نہیں۔ صفیؔ مصیبت اور پریشانی میں خدا کو بھولنے والا نہ تھا اور ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرتا اور جو کچھ مانگتا ہے اسی سے مانگتا ہے۔ ان چند شعروں میں یہی رنگ جھلکتا ہے ؎

میں اسی بندہ نواز و بندہ پرور کے تصدق ہوں — جو بھولو عیش میں تو یاد آتا ہے مصیبت میں
غیروں سے التجا کی ضرورت نہیں صفیؔ — گھر بیٹھے بھیج دیتے ہیں اللہ میاں مجھے
اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے — بندے ہزار نام کا یہ ایک نام ہے
وقت کو اے صفیؔ برا نہ کہو — وقت پیغمبروں پہ آیا ہے
گویا وہ ایک تیرے کرم کی نگاہ تھی — جس زندگی پہ ہم کو بڑا اعتبار تھا

گو صفیؔ قدیم رنگ اور قدیم مکتب خیال کے شاعر تھے لیکن اردو شاعری نے جو موجودہ رخ اختیار کیا ہے اس کے متعلق انھوں نے کبھی کچھ نہ کہا۔ اگر وہ ترقی پسند شاعری کے حامی نہ تھے تو مخالف بھی نہ تھے۔ زمانہ کروٹ بدلتا ہے لیکن صفیؔ نے کروٹ نہیں بدلی۔ وہ ہر چیز کو اپنے ہی رنگ میں سوچتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر زمانے کے تقاضوں کو جدید شعرا اپنی طرز پر سوچتے ہیں تو سوچیں لیکن میں تو غزل کو غزل ہی کے رنگ میں کہوں گا۔ صفیؔ کی غزلوں میں جو سادگی، ندرتِ بیانی اور نزاکتِ خیال ہے اور جو روزمرہ کی بول چال استعمال کی گئی ہے۔ بہت کم شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ بعض اشعار کے پڑھنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ بات کر رہے ہیں۔

تمہارے واسطے کیا کیا نہیں کیا میں نے — تمہارے واسطے کس کس سے میں برا نہ ہوا
دل کو قربان کر دیا ان پر — اب مجھے عمر بھر کی فرصت ہے
وہ آئے اور ہو گئی تسکین لے صفیؔ — اتنی ہی بات کے لئے دل بے قرار تھا
ہم سے تو اس کے واسطے بھی بد دعا نہ ہو — دشمن برا ہی مگر اس کا برا نہ ہو

سادگی ہی شعر کی جان ہے اور جب اس میں دلچسپ اور موزوں تشبیہات اور محاورے استعمال کئے جاتے ہیں تو شعر کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ صفیؔ موقع اور محل کی نزاکت کے ساتھ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ سننے والا پھڑک اٹھے ؎

ایسے سے کیا ملاپ کی امید ہو صفیؔ — جو دیکھتا نہ ہو کبھی لڑنا نگاہ کا
یوں محبت ہے درد کو دل سے — جیسے لیلیٰ کو اپنے محمل سے
اچھے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ — سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے
تمہارے سنگِ در میں لعل ہیرے ہیں تو ہم کو کیا — پڑے چولی میں پتھر آئے خطرہ جس کی نیت میں
یہ دنیا خود غرض ہے جلوے مانڈے سے اسے مطلب — مرے کوئی تو مردہ جائے دوزخ میں کہ جنت میں
وحشت بھی ہو تو کیا ہمیں جنگل سے کام ہے — گھر میں اودھ کی صبح بنارس کی شام ہے
آنکھوں آنکھوں میں دل لیا اس نے — کانوں کانوں تجھے خبر نہ ہوئی

غرض کہ کلام کی ان تمام خوبیوں کے باوجود صفیؔ کی زندگی میں قدر نہیں کی گئی جس کی اصل وجہ اس کی غربت اور عسرت تھی جس کے باعث وہ کبھی خوش حال نہ رہ سکا۔ لیکن پھر بھی دکن میں صفیؔ کا کلام بے حد مقبول خاص و عام ہوا اور بچہ بچہ کی زبان پر صفیؔ

رسائی دیتے ہیں اور عورتیں بھی گھروں میں ڈھولک پر صفی کی غزلیں گاتی ہیں۔ دکن میں صفی کی شہرت کا اندازہ خود صفی کے شعر سے ہے ؎

شیطان سے زیادہ ہوں مشہور اے صفی سب جانتے ہیں کون نہیں جانتا مجھے

غزل کے سوا صفی نے نظمیں، قطعات اور کچھ رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ان میں بھی وہی سادگی، سلاست اور لطافت موجود ہے۔ یہ چند رباعیاں ہیں ؎

بدنام زیادہ نہ مجھے ہونے دے کچھ لوگوں کے دل سے تو بدی دھونے دے
او نیند کے مارے تیرے آرام کی خیر اس پچھلے پہر میں تو ذرا سونے دے

آرام کی کچھ شکل نکل جائے گی تکلیف کبھی اپنا بدل لائے گی
نیند اڑ گئی کچھ سونے کی چڑیا تو نہ تھی جو آج نہیں آئی تو کل آئے گی

وہ مہر و محبت و ملاقات گئی وہ لطف، وہ خاطر، وہ مدارات گئی
خاموش ہوئی شمع تو تم بھی خاموش یہ تو نہیں رات گئی بات گئی

اے مرد خدا تم بھی نہ رکھو روزہ یہ گلشن عالم ہے صفی دو روزہ
ہم کو یہ توکل نے پڑھایا ہے سبق مل جائے تو روزی ہے نہیں تو روزہ

اچھے کے لئے خراب ہونے والا اک روز ہے کامیاب ہونے والا
بیکار نہیں خدمت ارباب چمن پانی ایک دن گلاب ہونے والا

تن ڈھانپوں تو آگ پیرہن کو لگ جائے دیمک جنگل کی تن بدن کو لگ جائے
کپڑا عزت کی چیز ہے مگر دست جنوں تجھ سے جو بچاؤں تو کفن کو لگ جائے

صفی کو اردو کے سوا فارسی اور عربی پر بھی کافی عبور تھا اور ان زبانوں میں مہارت بھی تھی۔ اخلاق، تہذیب، مذہب، فلسفہ و عروض۔ بہرحال ہر شعبۂ فن میں انھیں کمال حاصل تھا اور ان کا دماغ معلومات کا مخزن تھا۔ انھوں نے کچھ غزلیں فارسی میں بھی کہی ہیں۔ ان کا سارا کلام ان کی زندگی کی طرح ہمیشہ منتشر ہی رہا۔

گو اس وقت صفی ہم میں نہیں ہیں لیکن صفی کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دکن کی سرزمین پر پریشان حال بھٹکتا ہوا ابھرنے والا مال شاعر یعنی صفی اورنگ آبادی زندگی کے تلخ گھونٹ پی پی کر جیا اور کس مپرسی کے عالم میں دل کا خون منہ سے اگلتے ہوئے ستانِ عالم سے گزر گیا۔ لیکن اس کے چھوڑے ہوئے نقوش، بکھرے ہوئے موتی، کھلے ہوئے پھول دکن کے لئے ہمیشہ باعث فخر رہیں گے اور سرزمین دکن اس برگشتہ حال باکمال پر ہمیشہ نازاں رہے گی جس کی درافشانیاں اردو کے گلے میں مالا پہنا رہی ہے۔

(منقول از مجلۂ عثمانیہ ۱۹۵۵ء)

# صفی کے شاگرد

از :- جناب نظیر علی صاحب عدیل

وَلی اور سراج کی سرزمین کے آخری مایۂ ناز فرزند حضرت صفی اورنگ آبادی جہاں ایک بلندپایہ اور باکمال شاعر تھے وہاں ایک مسلمہ اور عظیم المرتبت استاد بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں فطری شاعر پیدا کر کے سندِ استادی بھی عطا کر دی تھی۔ کیونکہ استاد بننے کے لئے علم و فن کے مدارج طے کرنے پڑتے ہیں اور اس کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف صفی اوائل عمری سے استادانہ صلاحیتوں کے مالک تھے اور یہ ایک خداداد بات تھی۔ یوں تو صفی نے ابتداءً ضیا گورگانی، عبدالولی فروغ اور کیفی کا تلمذ اختیار کیا لیکن یہ محض تکمیل رسم کے طور پر تھا۔ کیونکہ ان اساتذہ نے برائے نام ان کا کلام دیکھا اور بالآخر اپنی زندگی میں ان کی استادی کا اعلان کر دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے کئی دوسرے شاگرد بھی ان کے حوالے کر دیئے۔

شعراء کی تاریخ میں جن اساتذہ کا ذکر ہے ان میں داغ دہلوی کو ہی یہ فخر حاصل ہے کہ ان کے شاگرد سینکڑوں کی تعداد میں سارے ہندوستان و پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر انھیں "جہاں استاد" کہا جاتا ہے۔ داغ کے بعد پھر یہ فخر انھیں کے سب سے آخری علمبردار صفی اورنگ آبادی کو حاصل ہوا جن کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے۔

جہاں تک ان کی صحیح تعداد کا تعلق ہے اس کا علم کسی کو نہیں ہے۔ لیکن بعض قدیم شاگردوں اور قریبی حلقوں سے معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ (۴۱۰) شاگردوں تک پہنچی ہے جن میں بیشتر کا حوالہ صفی کے متفرق کاغذات سے بھی ملتا ہے۔

شاگردوں کی اس طویل فہرست میں (۲۹) شاگرد ایسے ہیں جو اپنے استاد کے استقبال کے لئے استاد سے پہلے ہی دنیائے عدم میں پہنچ چکے ہیں اور (۴۲) ایسے ہیں جو صفی کے شاگرد کی حیثیت سے منظرِ عام پر نہیں آئے جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:-

نواب معین الدولہ بہادر معین، نواب قدرت نواز جنگ قدرت، مبارز الدین رفعت ایم۔اے عثمانیہ، مولانا مظہر علی کامل (پاکستان)، مولانا ابوالفیض فیاض (مشرقی پاکستان)۔

باقی (۳۳۸) شاگرد جن کے نام فہرست میں درج ہیں اس وقت بقیدِ حیات ہیں لیکن جیسا کہ یہاں ان سب کا فرداً فرداً تعارف ممکن نہیں اور محض ناموں کی صراحت کوئی معنی نہیں رکھتی، اس لئے مشتے نمونہ از خروارے کے بمصداق چند شاگردوں کا سرسری تعارف اور کچھ نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے تاکہ اہلِ نظر صفی کی منفرد شخصیت اور ان کے فن کی معراج کا ایک عام اندازہ کر سکیں۔

**سعید اختر بی۔اے (عثمانیہ)**

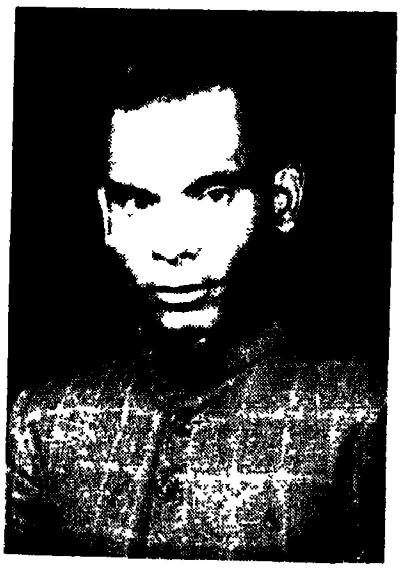
مکتب صفی کے جواں فکر شاعر ہیں۔ نثر سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ اصناف سخن میں غزل کی طرف میلان زیادہ ہے۔ شعر سلجھے ہوئے اور پُرسوز کہتے ہیں۔ جذبات کی رنگ آمیزی اور زبان کی سادگی تزئینِ شعر ہوتی ہے ؎



محمود عبد القدیر قدیر



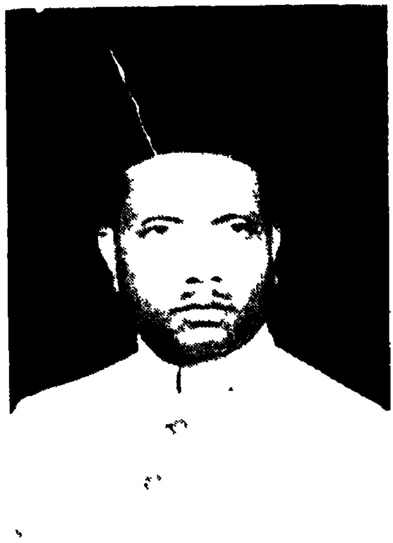
سید عبد الحفیظ محفوظ



ابن احمد تاب



محمد شمس الدین تاب



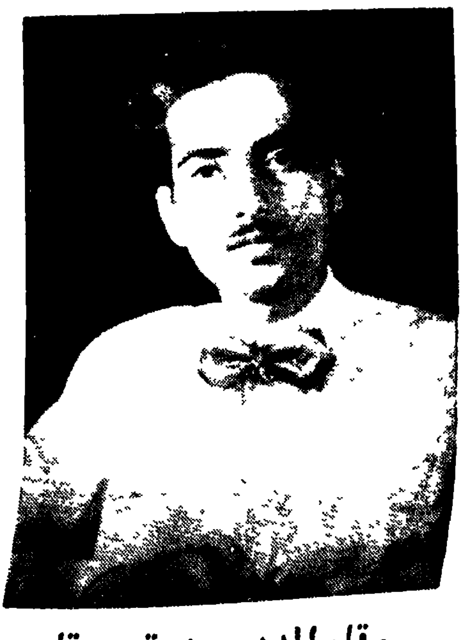
غلام محبوب خاں مسلم



عبدالرحیم فاروقی راغب



خواجہ حسین شریف شوق



وقارالدین صدیقی وقار

اک سکونِ حیات سے ہٹ کر — ہر طرح سے گزر گئی اپنی
گرے آنسو جو میری چشمِ تر سے — فسانے بن گئے وہ مختصر سے

## ...باندار افسر

...نہ صرف شاعر بلکہ ایک اچھے ادیب اور صحافی بھی ہیں۔ ادبی حلقوں اور صحافتی دنیا میں کافی متعارف ہو چکے ہیں۔ شعر بہت کم کہتے
...ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ شعر میں کچھ نہ کچھ ندرتِ خیال اور مسائل کی چاشنی ہو۔

ادھر وہ ہیں کہ ساحل پر بھی محرومِ مسرت ہیں — اِدھر ہم ہیں کہ طوفاں میں مزہ لیتے ہیں ساحل کا
ضبط کرنے سے تو رونا ہی بھلا ہے افسر — دل کی تسکین بھی ہے درد کا اظہار بھی ہے

## ...ن احمد تاب

پہلے سید حیدر پاشا حیدر سے وابستہ تھے۔ بعد میں حضرت صفی سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ یہ اپنی ادبی سرگرمیوں کے باعث
...ادبی حلقوں میں کافی متعارف ہیں۔ ان کی فکرِ شعر جواں ہے اور زیادہ تر مسائل کے گرد گھومتی ہے۔ شعر نئے زاویوں میں کہتے ہیں۔ جزئیات
...تنوع، برجستگی، طنز، اشاریت اور رجزیت ان کی شاعری کے اہم اجزا ہیں ؎

آنکھ جن کی واقف ہے صبح کے نظاروں سے — وہ بہل نہیں سکتے ڈوبتے ستاروں سے
بہ فیضِ ہمت خود اپنے قدموں سے راہ کے پیچ و خم سنوار — چلو کہ منزل بلا رہی ہے تعین رہ گزار کب تک
تخریب پسند ہٹ جاؤ تخریب کے ساماں رہنے دو — ہم فکر و نظر کی کاوش سے تعمیرِ جہاں تک پہنچے ہیں
وہ غم عطا ہوا ہے کہ اب کوئی غم نہیں — آنسو مرے جواب تبسم سے کم نہیں
کچھ دیر تو چمکا دیتی ہے ماحول کی تاریکی ان کو — یہ ڈوبتے تارے کیا جانیں ہنگامِ سحر کیا ہوتا ہے

## ...د شمس الدین تاباں

جامعہ نظامیہ کے منشی فاضل اور حضرت صفی کے مایہ ناز شاگرد ہیں۔ فطری اور پُرگو شاعر ہیں۔ اصنافِ سخن میں کسی صنف کے
...ق سے ان کا طبعی میلان معلوم کرنا مشکل ہے۔ غزل اس شان سے کہتے ہیں کہ تغزل کی حلاوت روح کی گہرائیوں میں اترنے
...ہے۔ نظم اس طور سے کہتے ہیں کہ اس کی روانی سے احساسات میں مد و جزر ہونے لگتا ہے۔ ویسے حسن و عشق ان کا خاص موضوع
...ہے لیکن اپنی طبیعت کی روانی اور ہمہ گیری کے باعث ہر مضمون میں اس سلیقے سے شعر کہتے ہیں کہ یہی ان کا اصلی موضوع معلوم ہوتا ہے۔ ان کے شعر جہاں طرزِ نگارش
...بیان کی لطافت کے باعث دلکشی اور جاذبیت رکھتے ہیں وہاں ان میں حقائق اور عرفان کی چاشنی اور سوز و گداز کی رنگ آمیزی سے استغراق اور وجدان بھی ہوتا ہے۔

وہ یاد آگئیں کیا عالم کے عالم یاد آتے ہیں — خوشی بھولی ہوئی، بھولے ہوئے غم یاد آتے ہیں
سب کچھ غمِ جاناں ہی تو نہیں عالم میں کئی غم اور بھی ہیں — آخر غمِ عالم بھی کب تک عالم بس عالم اور بھی ہیں
ہیں حسن و محبت کے فلک تحت تو زمیں ہم — جس سمت نظر کیجے تمہیں تم ہو ہیں ہم
جس پہ چتنی توجہ عنایت ہے — اس کو اتنا سرور ہے ساقی
کچھ سہل نہیں ہے چارۂ غم کچھ کھیل نہیں ہے پرسشِ دل — یہ بات نہایت نازک ہے یہ بات اشاروں سے پوچھو

## ...در علی جوہر

حضرت صفی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ حضرت صفی نے ان کو اول تعلیم میں لگانے کے لیے شعر کا چسکا لگایا اور ایسی تربیت

کی کہ عمدہ شعر کہنے لگے ۔ واقعی یہ حضرت صفیؔ کا فیضان اور ان کے فن کی معراج کا ایک بین ثبوت ہے ۔ شعر حضرت صفیؔ کے رنگ میں کہتے ہیں اور انھیں کا کلام پیش نظر رہتا ہے ؎

سمجھے میں ان سے عرض تمنا حجاب دل ۔۔۔ دریا چڑھاؤ پر ہے اتر جانے دیجئے
بکھر کے چھائی ہے آسماں پہ گھٹا ۔۔۔ بال ان کے بکھر گئے شاید
وہ اپنے عکس سے کیوں آئینے میں شرماتے ۔۔۔ یہ دوسرا کسی صورت سے دوسرا نہ ہوا

## غلام علی حادیؔ

حضرت صفیؔ کے (۵۰) سالہ شاگرد ہیں ۔ علمی استعداد بہت اچھی ہے ۔ اردو کی طرح عربی و فارسی پر بھی حاوی ہیں فن عروض کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ٹھوس معلومات رکھتے ہیں ۔ ذوق شعر علم کا پیدا کردہ ہے ۔ شعر زیادہ تر علم کے زور پر ہیں اور اس میں فلسفہ و تصوف کے ادق مسائل بیان کرتے ہیں ۔ بلاغت و جامعیت ، رموز و نکات اور درس و آگاہی ان کے کلام کی خصوصیات ہیں ؎

سجدہ ہے سر افگنی لیکن ہے ایسا قرب رب ۔۔۔ عرش پر ساجد ہے یا پھر فرش پر مسجود ہے
دل و حاصل آتا ہے آنا ہے محل علم ۔۔۔ سادہ سا یہ ورق ہی مکمل کتاب ہے
سمجھو تعینات میں ہر مرتبے کا فرق ۔۔۔ پانی ہی ورنہ قطرہ و موج و حباب ہے

## عبدالحمید خاں خیالیؔ

پہلے حضرت فردوسؔ کے شاگرد تھے جن سے حضرت صفیؔ کو بھی تلمذ حاصل تھا ۔ بعد میں حضرت فردوسؔ کی ایما پر حضرت سے مشورہ سخن کرنے لگے ۔ عمر میں حضرت صفیؔ سے دو سال بڑے ہیں ۔ مدرسہ نظامیہ میں مولوی فاضل تک تعلیم پائی ہے کہنہ مشق اور پر گو شاعر ہیں ۔ غزل میں جاگتی زبان اور حضرت صفیؔ کے رنگ میں ڈوب کر کہتے ہیں ۔ کلام میں حسن بیان اور شگفتگی ، محاورہ بندی اور روزمرہ کی چاشنی اس اہتمام سے ہوتی ہے کہ اکثر ان کے کلام پر حضرت صفیؔ کے کلام کا دھوکہ ہوتا ہے ۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

اے باغباں جو رہتا بلبل کا دوست بن کے ۔۔۔ پھولوں کے دام بکتے کانٹے ترے چمن کے
پہلے دشمن کی طرف ہاتھ نہ یوں بڑھتے تھے ۔۔۔ اور انداز ہے اب تو تری انگڑائی کا

ان کے اس مخصوص رنگ میں پچھلے دو سال سے ایک اور رنگ ابھر رہا ہے اور کلام میں سوز و گداز کروٹیں لے رہا ہے ممکن ہے اس کی وجہ حضرت صفیؔ کی رحلت کا صدمہ ہو ۔

بغیر درد لطف زندگی کیا ۔۔۔ سفر کے سب مزے ہیں راستے سے
عمر گذری ہے نگاہ مست ساقی دیکھتے ۔۔۔ کیا کریں اب امتیاز بادہ و پیمانہ ہم
شوق کیا چیز ہوا کرتا ہے اللہ اللہ ۔۔۔ وہ دکھائی نہیں دیتا ہے مگر دیکھتے ہیں

## عبدالرحیم راغبؔ فاروقی

جواں سال شاعر ہیں ۔ ذوق شعر ماحول کا پیدا کردہ ہے ۔ اس لئے فکر زیادہ تر ماحول کے گرد گھومتی ہے ۔ اصناف میں غزل بہت مرغوب ہے ۔ شعر سیدھے سادے کہتے ہیں اور موزوں الفاظ میں اپنے خیالات کی عکاسی کرلیتے ہیں ؎

اب ایسے موڑ پہ آئی ہے زندگی میری — کہ زندگی کو رلاتا ہے زندگی کا خیال

جنھیں ضبطِ غم کا شعور تھا جو امینِ رازِ و نیاز تھے
وہی اشک آج نکل گئے کسی رازداں کی تلاش میں

## رئیس جہاں شاداںؔ

مکتبِ صفیؔ کی خوش فکر شاعرہ ہیں۔ اعلیٰ ثانوی تک تعلیم پائی ہے۔ شعر کاوش سے کہتی ہیں۔ شعر میں فکر کی اڑان، مضمون کا تنوع، لفظی قرینہ اور کنائے ہوتے ہیں ؎

بہار آئی تو لائی سوختہ ساما نیاں شاداںؔ — لگا کے آگ رکھ دی بجلیوں نے آشیانوں میں

پورا ہی مانوسِ غم نہیں انساں — پھر تو دیرینہ آشنائی ہے

## خواجہ حسین شریف شوقیؔ

حضرت صفیؔ کے ممتاز شاگرد ہیں۔ منشی فاضل کی سند رکھتے ہیں۔ فطری شاعر ہیں۔ غزل بڑی دیدہ آفریں کہتے ہیں۔ تغزل اور سوز و گداز بھرپور ہوتا ہے اور یہی ان کا مخصوص رنگ ہے۔ ان کے شعر صرف سوز و گداز ہی لئے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ان میں تخیل کی بلند پروازی، لفظی حسن اور اسلوبِ بیان کی لطافت بھی بدرجہ اتم ہوتی ہے ؎

آنکھ جب آشنا ہوئی دید کی رسم و راہ سے — ہوش اڑا دیئے گئے جلوۂ بے پناہ سے

بیشا اوقات ان کی یاد میں ایسا بھی ہوتا ہے — نظر تاروں پہ ہوتی ہے گزر جاتا ہوں تاروں سے

اک نفس بمشکل تھم تھم کر اشکوں کی زباں تک پہنچی ہے
معلوم نہیں بربادیٔ دل ابھی تو کہاں تک پہنچی ہے

بعض لوگوں کا ان کے متعلق یہ خیال ہے کہ یہ اصغرؔ گونڈوی اور جگرؔ مرادآبادی کے کلام میں تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر وہ جگرؔ مرادآبادی اور شوقیؔ کے یہ شعر پیش کرتے ہیں ؎

ہجر شایاں نہ رہے وصل سزاوار نہ ہو — میں کہیں کا نہ رہوں تو جو طرفدار نہ ہو (جگرؔ)

اگر ان کا کرم ہر حال میں شامل نہیں ہوتا — کہاں کا وصل میں فرقت کے بھی قابل نہیں ہوتا (شوقیؔ)

انھیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کو تصرف نہیں کہتے بلکہ استخراج کہتے ہیں اور استخراج کو شاعری میں نہ صرف جائز بلکہ حسن سمجھا گیا ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کسی ایک بڑے سے بڑے شاعر کو پیش کیا جائے جس نے کسی دوسرے سے استفادہ یا استخراج نہ کیا ہو!

## سجاد علی صافیؔ

قدیم شاگرد ہیں۔ استاد کی خدمت کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ استاد کو نو سال تک اپنے گھر مہمان رکھ کر ان کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ (۴۵) سال واعظ سرکاری رہ چکے ہیں۔ لیکن اتنی طویل اور خشک مصروفیت کے باوجود طبیعت میں وہ کار رنگینی اور روانی ہے جو ابتدا میں تھی۔ شعر طبیعت کی اسی مناسبت سے کہتے ہیں ؎

کھلیں چمن میں تیری جوانی کو دیکھ کر — شاید اسی کو کہتے ہیں موسم بہار کا

جفا سہتے تو منہ ہوتا جو منہ ہوتا زباں ہوتی — زباں ہوتی دعا کرتے دعا کرتے اثر ہوتا

## دلاور علی ضابط

مکتب صفیؔ کے رباعی گو شاعر ہیں۔ علمی قابلیت اچھی ہے۔ کامل کی سند رکھتے ہیں۔ فکر میں تصوف و آگہی کا امتزاج ہوتا۔

وہ علم ہو جس سے دل پُر نور ملے ۔۔۔ عرفاں وہ ہو جس سے مرغرور ملے
بے فائدہ ہو حق سے خدا ہم کو بچائے ۔۔۔ ہر ذکر تو ایسا ہو کہ مذکور ملے

## احمد عبد الوہاب غنیؔ خالدی

دیرینہ ذوق شعر رکھتے ہیں۔ غزل کے دلدادہ ہیں۔ شعر طبع موزوں کے موقتی رجحان کے تحت کہتے ہیں۔ تصوف و معرفت ان کا مخصوص رنگ ہے ۔

نہیں معلوم یہ کیسا مقام بندگی آیا ۔۔۔ مری ہستی پہ طاری ہے مرا ذوق جبیں سائی
فرقِ جسم و جاں تبھی محسوس ہوتا ہے مجھے ۔۔۔ جب حدودِ عالم امکاں سے ٹکراتا ہوں میں

## غیاث صدیقی

شعر و ادب سے ایسی شیفتگی رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا دوسرا نام ادبی معروفیت ہے۔ حیدرآباد کی کئی ادبی انجمنوں کے اور مقبول رکن ہیں۔ چند سال پہلے ایک ادبی رسالہ ماہنامہ "سیوا" بھی نکالتے تھے۔ معلومات نظم و نثر دسیع رکھتے ہیں۔ اصناف میں غزل اور نظم کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شعر گہری فکر سے اور ترقی پسند اداروں میں کہتے ہیں۔ جدتِ تخیل، شکوہِ لفظی اور حسن ان کی شاعری کا امتیاز ہے ۔

بموجِ یاس گہر بار اک صدف آیا ۔۔۔ ترا خیال قفس میں بھی گل بکف آیا
غم جہاں میں ہے شامل غم محبت بھی ۔۔۔ یہ تیرا حسنِ تصرف نہیں تو پھر کیا ہے
کسی آشیاں سے دھواں اٹھا کوئی روح تن سے نکل گئی
یہ بہار کیسی بہار ہے جو چمن میں آ کے بدل گئی

## شرف الدین قاصد

جواں سال شاعر ہیں۔ غزل کا میلان زیادہ ہے۔ طبیعت المیہ پائی ہے۔ شعر حسیت اور دردمند پیرائے میں کہتے ہیں۔

کبھی جو دو گھڑی ہنس ہنس کے تم نے دل لبھایا تھا ۔۔۔ ہم اپنی زندگی کو زندگی بھر دو گھڑی سمجھے
ٹھہرتی ہے نظر ان پر تو پھر آگے نہیں بڑھتی ۔۔۔ یہی منزل نظر کی آخری معلوم ہوتی ہے

## محمود عبد القدیر قدیرؔ

وظیفہ یاب سشن جج ہیں۔ پہلے ضیا گور گانی کے شاگرد تھے جن سے حضرت صفیؔ کو بھی تلمذ حاصل تھا۔ ضیا گور گانی کے بعد حضرت صفیؔ ان کا کلام دیکھتے رہے اور اس شفقت سے کہ اپنے استاد بھائی کو کبھی احساس کمتری نہ ہونے دیا۔ یہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ بالخصوص عربی پر عبور رکھتے ہیں۔ شعر و سخن سے فطری لگاؤ ہے۔ شعر اپنے مخصوص رنگ میں بے پناہ کہتے ہیں ۔

طفیل نالہ و فریاد اک زمانے سے ۔۔۔ زبانہ ہم سے ہے بیزار ہم زمانے سے
تلاش کی گئی جس دم چمن میں بجلی کی ۔۔۔ تو دستیاب ہوئی میرے آشیانے سے

## بدالحفیظ (محفوظ)

حضرت صفی کے پاس شاعر کی حیثیت سے آئے لیکن انھیں ان کی شاعری سے زیادہ نثر نگاری پسند آئی اور انھوں نے شعرگوئی
ک کر کے نثر کو ترقی دینے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور ان کی فکر کو نثر کی طرف موڑ دیا جس کی وجہ سے نثر میں رعنائی
ئی اور قلم بہار دکھانے لگ گیا۔ ان کی تحریر میں عبارت آرائی کا حسن اور زبان کے چٹخارے ایسے ہوتے ہیں کہ بار بار پڑھنے کو جی
چاہتا ہے۔ اب تک کئی مضامین اور افسانے لکھے اور شائع کئے جا چکے ہیں۔ ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں جو "داستان" کے نام سے
ئع ہو چکی ہے۔ "یادگار صفی" میں ان کا ایک تازہ مضمون بھی شائع ہوا ہے۔

## غلام محبوب خاں مسلم

حضرت صفی کے آخری دور کے شاگرد ہیں۔ علم و ادب کے بے حد دلدادہ ہیں اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت علمی تحقیق و تجسس میں صرف کرتے ہیں۔ عروض سے گہری دلچسپی ہے اور فنی معلومات رکھتے ہیں۔ شعر سلیس اور سلجھے ہوئے کہتے ہیں ؎

اس کا بھی دستگیر ہوا ہے میر کارواں | اک پاشکستہ دور تر کارواں سے ہے
سفینے کو بچاؤ پہلے اس طوفان سے ممنو | پہنچ جاؤ تو کرنا بات پھر ساحل پہ ساحل کی
رواں ہونے کو ہے بس کارواں انجم کردو | تلاش جس کی ہے جس کو وہ اب بیدار ہو جائے

## سرفراز علی ناوک

شاعر گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے شعر سے گہرا اور فطری لگاؤ رکھتے ہیں۔ استاد سے پندرہ سال تک استفادہ کیا اور ان کی اتباع میں انھیں کا اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ غزل کہتے ہیں اور تغزل کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کلام میں زبان کی سادگی، روانی اور شگفتگی کافی ہوتی ہے ؎

کیا دکھاؤ گے منہ قیامت میں | مجھ سے منہ پھیر کر مصیبت میں
غم کے سائے میں جی رہا ہوں | گرتی دیوار سے کھڑا ہوں
اوروں کی طرح خوگر فریاد نہیں ہوں | اس واسطے شاید میں اسے یاد نہیں ہوں

## صاحبزادہ نظام الدین علیخاں نظمی

آصفجاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مبارز الدولہ کے پوتے اور نصرت جنگ کے نواسے ہیں۔ حضرت صفی کے قدیم شاگردوں میں سے ہیں۔ شعر اچھے اور سلجھے ہوئے کہتے ہیں۔ زبان بہت سادہ ہوتی ہے ؎

نہ تھا اس دہر میں کوئی بھی مجھ کو جاننے والا | مگر ہر ایک اب پہچانتا ہے تیری صورت سے
میرا مقصد جبیں سائی ہے نظمی | کسی کا نقش پا کیا سنگ در کیا

## وقار الدین وقار صدیقی بی۔ اے (عثمانیہ)

مکتب صفی کے ہونہار غزل گو شاعر ہیں۔ غزل بہت اچھی اور غزل ہی کے زاویں میں کہتے ہیں۔ تغزل بھرپور ہوتا ہے۔ تخیل کا بانکپن اور اسلوب بیان کی دلکشی اس اہتمام سے ہوتی ہے کہ شعر دل موہ لیتے ہیں ؎

ادھر تو دیکھئے کیا ایسی بات یاد آئی | جھکی جھکی ہے نظر مسکرائے جاتے ہیں
شش جہت سے تری آواز چلی آتی ہے | کتنی راہوں سے بیک وقت گزرنا ہے مجھے

روک نگاہیں او ستمانے — کوئی کہاں تک دل کو سنبھالے

## امان اللہ ارشد

علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوان اور ترقی پسند شاعر ہیں۔ ترقی پسند ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور سماجی معلومات رکھتے ہیں۔ زبان کے اصول اور شاعری کی تکنیک سیکھنے کے لیے حضرت صفی سے رجوع ہوئے اور ان کے آخری شاگرد ہیں۔ ادبی حلقوں میں اپنے جدید رجحانات کی وجہ سے کافی متعارف ہیں۔ شعر جدید زاویوں میں کہتے ہیں اور اس سلیقے سے کہتے ہیں کہ ان میں معانی کی اشاریت کے ساتھ ساتھ شعریت اور افادیت بھی ہوتی ہے ؎

کس منزل میں ذوقِ سفر ہے — ہر منزل اک راہ گزر ہے
ہمارے گریہ ہائے نیم شب سے — چمن منت کشِ شبنم نہیں ہے
بنا رہے ہیں ہم انساں کی اک نئی تصویر — ہمارے فن کا ابھی شاہ کار باقی ہے

## نظیر علی عدیل

حضرت صفی سے مجھے بھی دیرینہ تلمذ حاصل رہا ہے اور ان کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے کافی استفادہ کا موقع ملا ہے۔ میرا مطمح شعر سب سے مختلف ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اگر فطرت نگاری، مضمون آفرینی اور تحقیقاتی زاویہ ہائے نظر نمایاں ہیں تو یہی میرا رنگ ہے ؎

دکھائی دیتی ہے جو دور سے اک جھلملاہٹ سی — مہ تاباں کی محفل میں ستارے رقص کرتے ہیں
برستے ہوئے جھرنوں میں یہ پانی ہے کہاں کا — سینے میں زمیں کے کوئی چھالا تو نہیں ہے
کچھ ان پہ شب کی سیاہی تو جم نہیں جاتی — سویرے اوس میں کیوں برگ گل نہاتے ہیں
حسن ہے اصل میں فروغِ نظر — لوگ اپنی نظر پہ مرتے ہیں

دوسرے درجہ پر مجھے تغزل پسند ہے لیکن اسی جدت تخیل اور مضمون آفرینی کے لزوم کے ساتھ ؎

بلائیں میں تصویر کی لے رہا ہوں — اچانک وہ ایسے میں آئیں تو کیا ہو
کیوں نذرِ تلاطم مری کشتی نہیں ہوتی — ساحل پہ کوئی محوِ تماشہ تو نہیں ہے
رہے نہ درد آشنا مٹا دے عشق کا وجود — کہ پڑھنے والے سو گئے کھلی رہے کتاب کیوں

# صفی اورنگ آبادی پر ایک سرسری نظر

از: جناب پروفیسر خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

صفی اورنگ آبادی کی شخصیت اور ان کے کلام کی عظمت کا اعتراف کرنا دراصل دکن کے اردو غزل گو شاعروں کے ایوانِ تاریخ میں ایک سنہرے باب کا اضافہ کرنا ہے۔ موجودہ دور کے اردو غزل گو شاعروں میں صفی کا ایک خاص مقام ہے، وہ اپنے رنگ تغزل اور اسلوب بیان کے تنہا موجد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کلام کی شہرت ان کی انتہائی خودداری اور قناعت پسندی، لاابالی زندگی اور شان بے پروائی کی وجہ سے صرف دوستوں اور شاگردوں کے محدود حلقے میں ہی رہی۔ انھوں نے کبھی کسی رسالے میں اپنی غزل شائع نہیں کروائی۔ حیدرآباد کے صرف دو تین رسالوں میں کبھی کبھی ان کا کلام شائع ہوا ہے جو یا تو ان کے دوست احباب نے ان کے منشاء کے خلاف بھیج دیا یا خاص تعلقات کی بناء پر کسی رسالے کے مدیر نے ان سے اشاعت کی اجازت حاصل کر لی۔ مشاعروں میں بھی وہ بہت کم شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے شاعری کو اپنی شہرت اور نام و نمود کا وسیلہ نہیں بنایا۔ ذوقِ طبع کی تسکین ان کی شاعری کا مقصد تھا۔ وہ نہایت پرگو شاعر تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ہی زندگی میں ایک عرصہ قبل اپنا دیوان "پراگندہ" کے نام سے مرتب کر لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اس کو چھپا نہ سکے۔ دیوان نہ چھپنے کے بارے میں ایک جگہ اس طرح اظہار خیال کیا ہے ؎

یہ "پراگندہ" ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی        میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

دیوان کی اشاعت میں تاخیر کا سب سے بڑا سبب ان کی مالی مشکلات سے زیادہ ان کی طبیعت کا خاص انداز اور باریک بین نظر تھی۔ جو معیار ان کے پیش نظر تھا شاید اس کے مطابق حالات پیدا نہ ہو سکے۔ محترم ڈاکٹر زور صاحب نے کئی مرتبہ ان سے خواہش کی کہ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے کم از کم ان کے کلام کا ایک انتخاب ہی شائع ہو جائے۔ وہ ہمیشہ وعدہ کرتے ہی رہے لیکن کلام کا انتخاب مرتب نہ ہو سکا۔ خود میں نے کئی دفعہ ان سے درخواست کی تو وہ ہر وقت یہی فرماتے کہ کلام کا انتخاب کر لیا ہے اور فلاں شاگرد کو صاف خط میں لکھنے کو دیا ہے۔ اس طرح دس سال کا طویل عرصہ گذر گیا لیکن وہ کام تکمیل نہ پا سکا۔

انتقال سے چند مہینے قبل صفی نے مجھے کسی کام سے یاد فرمایا تھا۔ اثنائے گفتگو میں انتخاب کلام کا ذکر چھیڑا تو فرمایا کہ مجھے بے حد شرمندگی ہے کہ اب تک میں ادارے کو اپنا کلام اشاعت کے لئے نہ دے سکا اس کی وجہ میری صحت کی خرابی ہے اور میں خود اپنے کلام کو صاف نہیں کر سکتا اور مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس کام کو میری مرضی کے مطابق انجام دے سکے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا کلام غلط سلط چھپ جائے۔ اب اس کی ایک ہی صورت دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ آپ وقت نکال کر میرے ہاں آ جائیں۔ میں کہتا جاؤں اور آپ لکھتے جائیں۔ میں نے کہا کہ بخوشی میں اس کام کو کرنے کے لئے تیار ہوں۔ گرمی کی چھٹیوں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور جلد سے جلد اس کام کی تکمیل ہو جائے گی۔ یہ تو زمانے کی ستم ظریفی ہے کہ اس کام کے شروع کرنے سے پہلے ہی ان کی صحت بگڑ گئی اور وہ ہمیشہ کیلئے

ہم سے جدا ہو گئے۔

صفی مرحوم حیدرآباد کی قدیم تہذیب کا مکمل نمونہ تھے۔ شرافت نفس اور خودداری ان کی فطرت کے نمایاں جوہر تھے۔ بڑے یار باش اور دوستوں کے دلدادہ تھے۔ آداب مجلس کا ان کو بڑا خیال رہتا تھا۔ کبھی ایسی کوئی بات نہ کہتے جس سے دوسروں کو دکھ پہنچے۔ سی اور تعلی سے انھیں نفرت تھی۔ اپنے ہمعصروں حتیٰ کہ نوجوان شاعروں کے اچھے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے۔ رشک و حسد کو وہ گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ ہر نئے ملنے والے سے وہ خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کی گفتگو کا انداز بھی عجیب تھا۔ مختصر الفاظ میں اپنا مطلب ادا کر کے بات کو فوراً ختم کر دیتے تھے۔ عمر بھر کوئی مستقل ملازمت نہیں کی۔ ان کے ذریعۂ معاش کے بارے میں مجھے علم نہ ہو سکا لیکن کبھی انھوں نے کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ ان کی خودداری اور قناعت پسندی کو دیکھ کر ہمت نہ ہوتی تھی کہ ان کی خدمت میں کچھ پیش کیا جائے۔ بڑی آن بان سے ان کی زندگی بسر ہوئی۔ غم حیات کو بھلانے کے لئے شغل مے نوشی کا سہارا لیا۔ پولیس ایکشن کے بعد ان کی مالی حالت خراب ہو گئی تھی اور انھوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی ان کی زبان سے حرف شکایت نہیں سنا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ حکومت ہند شاعروں اور ادیبوں کو مالی امداد دینا چاہتی ہے اگر آپ کی طرف سے بھی ایک درخواست بھیج دی جائے تو مناسب ہوگا۔ انھوں نے میری اس تجویز کی مخالفت نہیں کی اور درخواست پر اپنے دستخط کر دیئے۔ ان کی یہ درخواست منظوری کے مرحلے طے کرنے بھی نہ پائی تھی کہ ان کا پیمانۂ زندگی لبریز ہو گیا۔

صفی مرحوم نے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کی لیکن غزل کو ان کی طبیعت سے خاص مناسبت تھی چنانچہ وہ ہمیشہ غزل ہی کہتے رہے اور رنگ تغزل میں ایسا نکھار پیدا کیا جو اپنی آپ نظیر ہے۔ وہ غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ اور غزل کی ساری خصوصیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ بالخصوص جذبات نگاری، معاملہ بندی، لفظ پرستی اور محاورہ بندی پر انھیں اتنا عبور تھا کہ اس خصوص میں انفرادیت پیدا کر لی تھی۔ الفاظ کے صحیح اور برمحل استعمال پر خاص مہارت رکھتے تھے۔ زبان کا چٹخارہ اور انداز بیان کا بانکپن ان کا حصہ تھا۔ شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی علمی قابلیت، وسیع مطالعہ اور بالخصوص فن عروض اور قواعد زبان سے کامل آگاہی ان کی شاعرانہ عظمت کا باعث ہوئی۔ صفی مرحوم نے اردو و فارسی کے قدیم دبستان شاعری کے بلند پایہ شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا لیکن کسی رنگ میں ڈوب نہیں گئے بلکہ ساری رنگینیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنا ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ یہی ان کے بڑے شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔ صفی مرحوم صحیح معنوں میں عوام کے شاعر تھے۔ زبان و انداز بیان اتنا سادہ و سلیس ہے کہ ہر آدمی بقدر ظرف ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی سادگی و شستگی کلام کی بے پناہ روانی اور خیالات کی ہمواری ان کے کلام کے نمایاں جوہر ہیں۔ مشکل سے مشکل اور بلند سے بلند خیال ان کے اشعار کے سانچوں میں ڈھل کر سننے والوں کے دل و دماغ میں ایک کیفیت پیدا کرتا ہے۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ دیکھا ہے کہ عام آدمی ان کی غزلوں کو مزے لے لے کر گاتے پھرتے تھے۔ موسیقی کی کوئی محفل ایسی نہ ہوتی تھی جہاں صفی کی غزلیں نہ گائی جاتی ہوں۔ اسی زمانے میں جو غزلیں میں نے سنی تھیں ان کے بعض اشعار اب تک مجھے یاد ہیں ؎

ادا پیدا نظر سے شان رخ سے آن تیور سے — ترے قربان آخر دل ہے کس کس کے لئے تڑپے

کسی کا رزق رکتا ہے دیا خلاق اکبر نے — صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

ارے ناداں سچا چاہنے والا نہیں ملتا — وہ لیلیٰ تھی کہ جس کو مل گیا مجنوں مقدر سے

ہمیں معشوق کو اپنا بنانا تک نہیں آتا — زمانے والے آئینہ بنا لیتے ہیں پتھر سے

صفی کو مسکرا کر دیکھ لو غصے سے کیا حاصل — ارے تم زہر کیوں دیتے ہو جو مرتا ہے شکر سے

اسے دیکھا ہے جس کے دیکھنے کو لوگ مرتے ہیں
نظر بازو ہماری بھی ذرا حد نظر دیکھو

خیال آپ کا جب ذرا آگیا
تڑپنے میں ہم کو مزہ آگیا

نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرے
زمانہ مگر دوسرا آگیا

کوئی مجبوب کی بھی ہے حد نامہ بر
ابھی کہ ابھی میں گیا آگیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو
یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا

وہ تشریف لائے تو میں رو دیا
حسینوں کا احسان کیا چیز ہے

فرشتوں نے سجدہ کیا ہے صفی
حقیقت میں انسان کیا چیز ہے

وہ ہم جو دل کے بیٹھیں تو اٹھتی ہیں انگلیاں
کیا دل کے بیٹھے نہیں دنیا میں بیمار لوگ

صفی مرحوم ایک فطری شاعر تھے۔ قدرت کی طرف سے جو دل و دماغ انھیں عطا ہوا تھا وہ داخلی شاعری کے لئے نہایت موزوں تھا۔ دلی جذبات، قلبی واردات اور شاعرانہ احساسات کے اظہار پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی۔ زبان و بیان کی ندرت سے کام لے کر معمولی سے معمولی خیال کو نئے رنگ روپ میں پیش کرتے تھے۔ زبان کی سلاست کے ساتھ مضمون آفرینی کا جوہر ان کے کمال شاعری کی دلیل ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

نشیمن کیا بچے گا فصل گل میں
چمن کی آگ لگ جائے گی گھر کو

رضائے دوست پر مرمٹنے والے
سمجھ کر کیا کریں گے خیر و شر کو

سب کو کیا کیا بندھی ہیں امیدیں
وہ ذرا بھی جو مسکرایا ہے

اس نے شرما کے منہ جو پھیر لیا
ہم نے سمجھا ادھر بلایا ہے

اے صفی وقت کو برا نہ کہو
وقت پیغمبروں پہ آیا ہے

الٰہی بندہ منشی کا بھرم رکھ لے قیامت میں
نہ کھلوا دشمنوں کے سامنے گٹھری گناہوں کی

اسے دیکھا ہے جس انداز میں اللہ شاہد ہے
بلائیں خود مجھے لینی پڑیں اپنی نگاہوں کی

اچھے گن دیکھ اچھی شکل نہ دیکھ
سنکھیا بھی سفید ہوتی ہے

جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے
اس سے دنیا مرید ہوتی ہے

اس کے وعدے پہ جی رہا ہوں صفی
اے کیا شئے امید ہوتی ہے

ہر ایک چیز پھر گئی آنکھوں کے سامنے
اس انجمن کا ذکر مجھے انجمن ہوا

اللہ کو پکار اگر کوئی کام ہے
غافل ہزار نام کا یہ ایک نام ہے

تسکین و اضطراب بھی ہے ان کے ہاتھ میں
دل پر رکھے تو کچھ نہیں تھوڑا سا کام ہے

کیا کہوں منہ سے کہ قرآن کا منہ ہے ورنہ
حمد کا لفظ تو ہونا تھا محمد کے لئے

ہر ذرہ کائنات کا سرمست عشق ہے
قربان جاؤں آپ کہاں ہیں کہاں نہیں

انتقال سے کچھ دن پہلے صفی نے یہ شعر کہا تھا ؎

چراغ زندگی مدھم ہے لیکن
چراغ آرزو مدھم نہیں ہے

غزل کی ساری ظاہری اور معنوی خوبیاں یعنی زبان کی شیرینی، الفاظ کی سجاوٹ، قافیہ بندی، تغزل، جذبات اور معاملہ بندی سب کچھ صفی کے کلام میں موجود ہے۔ اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان کی شاعری کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاسکے۔ آئندہ موقع ملے تو صفی کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا جائے گا۔

آخر میں ایک تلخ حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ یہ کہ ہم لوگ مردہ پرست ہیں اور یہ ایک قدیم المیہ ہے۔ زندوں کی قدر کرنا ہماری سرشت میں ہی نہیں ہے اور ہم نے اب تک زندہ قوموں سے یہ بات نہیں سیکھی ہے۔ نہ جانے کتنے باکمال ہماری بے اعتنائی اور ناقدرشناسی کی وجہ سے منظر عام پر نہ آسکیں اور کتنے گوہر آبدار سمندر میں دب کر ہی پڑے رہے۔ زندوں کی عیب جوئی اور مردوں کی مدح سرائی ہمارا شیوہ بن گیا ہے۔ خود صفی مرحوم نے بھی اپنے کلام میں کہیں کہیں اسی کی طرف اشارے کئے ہیں ؎

کسمپرسی ہے خاک ہونے تک — خاک ہوتے ہی کیمیا ہوں میں
صفی بھی کس قدر ناداں ہے شاعر ہوا تو کیا — اسے لوگوں سے جیتے جی امید قدردانی ہے
اسی بڑھ کر ملا شعر بھلا کیا ہو صفی — لوگ مر جانے پہ ہی تعریف تو کی جاتی ہے
صفی کیوں قدر کا طالب ہوا ہے اس زمانے میں — ارے کم بخت تیرے پاس کب ہے مال و زر اتنا

---

# رباعیات صفی

اچھوں کے لئے خراب ہونے والا
اک روز ہے کامیاب ہونے والا
بے کار نہیں خدمت ارباب چمن
پانی اک دن گلاب ہونے والا

کچھ دن تو حسینوں میں وفا کو ڈھونڈا
کچھ روز تو دوست آشنا کو ڈھونڈا
بے سود صفی نے عمر کھوئی اپنی
جب کچھ نہ ملا تو پھر خدا کو ڈھونڈا

# صفی کی شاعری

از: جناب ہاشم حسن سعید صاحب

دکنی اور سراج کے بعد اگر اورنگ آباد کسی پر فخر کر سکتا ہے تو وہ صفی ہیں۔ صفی نے ایک مدت سے سوئی ہوئی اس بستی میں ایک دیا جلایا۔ ایسا دیا جس کی روشنی نے اردو غزل کو چمکا دیا۔ لیکن افسوس ہے کہ صفی کو زندگی میں وہ مقام نہیں ملا جو کہ ملنا چاہیے تھا۔ زمانے نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ زمانے کی اس ناقدرشناسی نے انھیں کافی متاثر کیا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

زمانہ اور پھر ناقدردانی کس میرسی کا | رکھا ہے کیسے کیسے وقت ہم نے دل کو قابو میں
صفی ہم نے سنا تھا حشر میں اعمال کا تلنا | قیامت ہے یہاں انسان تلتے ہیں ترازو میں

صفی کی شاعری مقصدی شاعری تھی۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعہ موجودہ دور کی گری ہوئی ذہنیتوں اور اخلاقی قدروں کو بلند کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کے لئے بعض جگہ طنز کے نشتر بھی لگائے۔ نہ کہ ان کی شاعری محض سماج کا دکھڑا ہی کر رہ گئی تھی۔ بلکہ صفی کی شاعری نے زندگی کے چند دوسرے پہلوؤں کو بھی حقیقت سے روشناس کرایا اس کے لئے صفی نے اپنا مخصوص طرز بیان استعمال کیا۔

صفی کی سب سے بڑی خصوصیت روانی وسلاست ہے۔ شعر میں وضاحتِ تخیل کا عنصر اتنا رہتا ہے کہ اسے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے ـــــ روانی کا یہ عالم کہ ایک دریا موج زن ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے یہ صفی کی ذات سے وابستہ ہے۔ ہر کسی میں سلاست و روانی کا آجانا آسان بات نہیں۔ اس کے علاوہ صفی کی دوسری بڑی خوبی خیالات کی ہمواری اور زبان کی شستگی ہے۔ وہ خیالات کو اس طرح الفاظ کے سانچے میں ڈھالا کرتے تھے کہ حقیقت کا سماں بندھ جائے۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی بڑے ہی سلیقہ اور احتیاط سے کام لیتے تھے۔ غیر مروجہ اور متروک الفاظ کو کبھی بھی انھوں نے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ آسان اور عام فہم زبان میں شاعری کی۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری پڑھنے والے کے دل پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ صفی نے اپنی اسی زندگی سے اپنی شاعری میں دلکشی اور لطافت پیدا کی۔ صفی کی اس سادگی کو دیکھ کر بے اختیار میر کی سادگی یاد آجاتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ صفی کی سادگی میر سے کچھ مختلف بھی ہے۔ میر میں سادگی صرف حسن وعشق اور غم ومصیبت تک ہی محدود ہے۔ لیکن صفی کے پاس ہر چیز میں سادگی ہی سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ اسی سادگی میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جو دوسرے ثقیل سے ثقیل الفاظ میں ادا نہیں کر پاتے۔ صفی نے جو کچھ بھی کہنا چاہا وہ صاف کہا۔ وہ رعایت لفظی کے مطلق قائل نہیں تھے۔ ان کے نزدیک شاعری ایک بلند مقصد کا نام تھا جس کا مطلب ہر کوئی سمجھ سکے۔

صفی وہ شعر ہی کا ہے کہ رکھوں اپنے دیواں میں
سراسر جس کے مطلب سے انھیں انکار ہو جائے

اس کے علاوہ صفی کی ایک اور بڑی خوبی روزمرہ اور محاورات کا موزوں استعمال ہے۔ وہ اس کے ذریعہ سے مشکل اور اہم مضمون کو بہ آسانی سلجھا دیتے ہیں۔ دراصل یہ وہ جوہر ہے جس سے پڑھنے والے پر شاعر کے تخیلات واضح ہو جاتے ہیں اور ایک خاص اثر پڑتا ہے اور شاعری کے نقوش دیرپا ہو جاتے ہیں۔ ہر شاعر میں اس جوہر کا پیدا ہو جانا ایک مشکل امر ہے۔ فارسی شعراء میں سعدیؔ اور حافظؔ اس کے استاد تسلیم کیے جاتے ہیں اور اردو شعراء میں داغؔ اس حیثیت سے اول درجہ رکھتے ہیں۔ صفی نے داغ کی اس خصوصیت کی بڑی ہی عمدگی سے تقلید کی۔ اور نہ صرف روزمرہ اور محاورہ کا استعمال داغ سے لیا بلکہ داغ کی شستگی اور سلاست کو بھی اپنایا۔ اس لحاظ سے صفی داغؔ کے رنگ میں ایک کامیاب شاعر تھے۔ صفی نے اس خصوصیت کو اس کثرت سے استعمال کیا کہ ان کی کوئی غزل اس سے خالی نہیں ملتی۔ ان اشعار سے روزمرہ اور محاورہ کے برمحل استعمال کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے

مجھے احباب سے کیا کام بننے کا یقین ہوتا
یہ باتونی ہیں ان کے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا

الٰہی مجھ کو دل دینے میں آخر مصلحت کیا تھی
اگر یہ چار انگل گوشت کا ٹکڑا نہیں ہوتا

سخن سنجوں کے دل میں بھی ذرا سا چور رہتا ہے
یہ بنیے کچھ نہ کچھ پاسنگ رکھتے ہیں ترازو میں

خدا کی قسم کھا کے وہ ہنس پڑے
خدا کی قسم ہے مزا آگیا!

یہ سب تو صفی کی وہ عام فنی خوبیاں تھیں جو یک نظر ہی میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ صفی میں چند اور خوبیاں بھی ہیں۔

تشبیہ اور استعارہ یہ دو چیزیں شاعری کی جان ہوتی ہیں۔ ان سے مضمون میں نزاکت اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ صفی کو نادر تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں بڑا کمال حاصل تھا۔ وہ اس کے ذریعہ شاعری میں لطافت اور تخیل میں رفعت پیدا کرتے ہیں جس سے مضمون کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس لئے صفی اپنا ایک مخصوص اور انوکھا طرزِ بیان رکھتے ہیں۔

داغوں نے گل کھلائے ونگینے سے جڑ دیئے
عاشق کا دل نہیں یہ تمہارا مکان ہے اب

عاشقی میں وہم بڑھتے بڑھتے سودا ہو گیا
قطرہ قطرہ جمع ہوتے ہوتے دریا ہو گیا

کیسی کیسی خواہشیں سینے میں ہیں
سیکڑوں کچھ مرے سینے میں ہیں

ناروا تھی یہ تندی دل میرا سر کھا گیا
دل گیا میرا تو اس میں دوستوں کا کیا گیا

صفی کے کلام میں مضمون آفرینی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ اس جوہر سے ہر مضمون میں نو پیدا کرتے ہیں۔ کتنا ہی فضول اور فرسودہ مضمون ہو وہ اس کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ مضمون کی دلکشی کے ساتھ ساتھ مضمون کے اندازِ بیان کا حسن بھی نکھر جائے جس سے نہ صرف سلاست میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے بلکہ روانی میں پختگی اور لہجہ میں مٹھاس بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

صفی کی شاعری رومانی فضا میں بھی پرواز کرتی ہے۔ صفی نے جہاں دوسری چیزوں کو بیان کیا وہیں حسن و عشق کی رسیلی کہانیوں اور محبت کے پر درد نغموں کو بھی بکھیرا۔ جہاں جوانی کے جذبوں اور شباب کی انگڑائیوں کا تذکرہ کیا وہیں جوانی کے دنوں اور شباب کی پر کیف راتوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے

جوانی ابھی بن سنور نے کے دن
جھلک کی راتیں ہیں ... کے دن

زمخملیں کے جنت بدوش یہ سماں
کسی کا شباب اپنے جوبن کے دن

تمہارے نہ ملنے سے کیا ہو گیا
گذر ہی رہے ہیں گذرنے کے دن

جوانی گئی اور لے کر گئی
کسی بات سے جی نہ بھرنے کے دن

لیکن جب بڑھاپا آتا ہے ؎

بڑھاپے میں بیکار ہیں شوق و ذوق
یہ ہیں اللہ اللہ کرنے کے دن

اس طرح صفیؔ کی شاعری میں محبت کی داستانیں بھی ہیں۔ عشق کے بندوں کے ولولے بھی ہیں۔ حسن کی پرچھائیں بھی ہیں۔ ملک جونا بھی ہے۔ غرض وہ سب کچھ ہے جن کا مجسم تخیل کی تکمیل کے لئے حقیقت کی دنیا میں ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے صفیؔ کے پاس محبت کا کوئی معیار نہیں ہے۔ ان کی محبت بے انتہا ــــ اور اس کا وجود لا فانی ہے۔ انھیں کے الفاظ میں ؎

اگر قائم محبت کا کوئی معیار ہو جائے
محبت کرنے والا زندگی دشوار ہو جائے

کیونکہ ـــــــ

اگر سمجھے کہ عقبیٰ اور دنیا ایک راہ کی ہیں
تو پھر عقبیٰ کا ہر طالب بھی دنیا دار ہو جائے

نظر کیا وہ نظر محدود جس نظر کی آسماں ٹھہرے
نظر تو وہ نظر جو آسماں کے پار ہو جائے

صفیؔ کے عشق و محبت میں عہد و پیماں کی یادیں کچھ اور ہی درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی یاد، ان کی ایک بھول ــــ اور ان کی بھول ان کی ایک یاد ہے۔ ذیل کی غزل اسی خیال کی ترجمانی کرتی ہے ؎

وعدوں میں تمہاری یہ ذرا بھول ذرا یاد
واللہ مزہ آ گیا کیا بھول ہے کیا یاد

اس یاد کے پورے کو دلائے کوئی کیا یاد
میرا ہی کہا یاد نہ اپنا ہی کہا یاد

حاصل نہ ہوا عیش تو تکلیف میں گذری
تم یاد نہیں آئے تو آیا ہے خدا یاد

حیرت میں ہیں سب آپ سے بیگانے یگانے
ہر بھول الگ بھول ہے ہر یاد جدا یاد

مقطع میں صفیؔ بھول گیا مقصد آخر
تھا نیب کا جو بند وہ ہم کو نہ رہا یاد

صفیؔ کی شاعری میں بے ساختگی بہت زیادہ ہے۔ ان کے اشعار موقع و محل کے لحاظ سے اس قدر چست ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی اس بے ساختگی کو دیکھ کر منہ سے بے ساختہ "واہ، واہ" نکل جاتا ہے ؎

یا میری سن لیجئے یا قتل ہی کر ڈالیئے
یا مجھے آرام ہو یا آپ کو آرام ہو

آسماں سے بھی گذر جائیں مرے نالے مگر
کون چاہے گا کہ اپنا راز طشت از بام ہو

کیا تمہارے دوست رہنے میں یہی ہے فائدہ
ایک نہ ایک تہمت ہو مجھ پر ایک نہ ایک الزام ہو

زہر کھائے آپ کا عاشق! بڑا افسوس ہے
ایسے اچھے کام کا ایسا برا انجام ہو

وہ نہیں ملتے تو کیا اجارہ ہے صفیؔ
کیا پڑی ہے مفت کوئی کس لئے بدنام ہو

کہتے ہیں حسن غصہ میں بہت ہی بھلا معلوم دیتا ہے۔ اس کی تصویر صفیؔ نے یوں کھینچی ہے ؎

بگڑ کر مجھ سے کیا صورت بنی ہے آئینہ دیکھو
شکن ماتھے پہ غصہ آنکھوں میں ہے بل ہے ابرو میں

غرض صفیؔ کی شاعری خوبیوں اور مضمونوں کا ایک مجموعہ تھی جس میں عشق و محبت کے نالے بھی تھے۔ طنز کے تیر و نشتر بھی تھے۔ تشبیہ اور استعارے کا زیور بھی تھا، سلاست و روانی کا دریا بھی لیکن ان سب میں اصلاح کا ایک جھلکتا ہوا مقصد بھی تھا۔ ان تمام باتوں کے مد نظر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صفیؔ گوہر بے بہا تھے جنھیں قدرت کی ستم ظریفیوں نے نام سے محروم کر دیا۔

# حضرت صفیؔ کی خانگی زندگی

از:- جناب صابر عارفی صاحب

ایک زمانے سے آرزو تھی حضرت صفیؔ کی زندگی کے چند داخلی حالات سے عوام کو روشناس کرایا جائے اسی مقصد کے تحت میں نے مرحوم سے ان کی خانگی زندگی کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں اور ان کو مرتب بھی کر لیا تھا۔ لیکن پھر خیال ہوا کہ کسی خانگی زندگی سے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت مرحوم سے حیدرآباد کے تقریباً سب ہی لوگ واقف ہیں۔ اس لئے ان باتوں کا تذکرہ جو کسی سے چھپی نہیں ہیں تحصیل حاصل ہی تو ہے۔ چنانچہ میں نے مرحوم کی رحلت کے بعد ان کی سیرت اور حسن سلوک و عمل سے متعلق اپنے خیالات سپرد قلم کئے کہ آخر انسان فانی تو ہے مگر اس کی سیرت اور کردار اسے لافانی بنا دیتے ہیں۔ مگر اس مضمون میں میں نے جہاں تک ہو سکا ذاتی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ جو ممکن ہے دوسروں کے خیالات و تاثرات سے مختلف ہوں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں مبالغہ یا طرفداری نہیں ہے۔

دوست نواز اور کثیر الاحباب بالعموم پرخلوص اور ذی اخلاق ہوتے ہیں۔ اس کے لئے حضرت مرحوم کا نام بلا خوف تردید لیا جا سکتا ہے۔ ان کے اخلاق و خلوص کا یہ عالم تھا کہ ہر ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ مرحوم بطورِ خاص "مجھ ہی" کو چاہتے ہیں۔ کسی محفل میں ہوں اور کیسے ہی موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو۔ حاضرین ہر طرح کی گفتگو سے اپنی جگہ لطف اندوز ہوتے۔ تواضع و انکسار، دلجوئی و خاطر جمعی میں مرحوم کو خاص درک تھا۔ اپنی بذلہ سنجی اور شیریں بیانی سے وہ ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے۔ حالیؔ کا یہ شعر شاید انھیں کے لئے موزوں ہو گیا ہو کہ ؎

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے　　نہیں لگتی کچھ اس میں محنت زیادہ

لیکن کسی کے جاہ و رتبہ کی وجہ سے کسی کی تالیفِ قلب انھوں نے ہرگز ہرگز نہیں کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حکومت بنانے میں نفع یا نقصان کی پرواہ ہی نہ تھی۔ ان کے حلقۂ احباب میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ مشاغل اور نظریات کے لحاظ سے سب کے سب کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتے ہیں۔ ذی علم، شاعر، صوفی منش، صاحب باطن، صاحب کمال، معززا صحاب۔ بے کہہ یار باش، قلندر، بے بہرہ و بکواسی طالب علم تک ان کے حلقۂ احباب میں شمار کئے جاتے ہیں وہ یکساں طور پر خلوص و محبت رکھتے ہیں۔ اخلاق و انکسار کا عالم ملاحظہ ہو کہ مرحوم اپنے شاگردوں کو بھی دوست کہتے تھے۔ کسی نے ان کی زبانی یہ نہیں سنا کہ فلاں صاحب میرے شاگرد ہیں بلکہ یہی فرماتے تھے کہ میرے دوست ہیں۔ تلامذہ میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو مرحوم کے استاد بھائی رہ چکے تھے لیکن مرحوم ان کو استاد بھائی ہی فرماتے تھے۔ ایک دن میرے والد (مولوی محمد نظام الدین صاحب عارفؔ) کے متعلق فرمایا کہ یہ ان کی عنایت ہے جو مجھے اپنا استاد کہتے ہیں ورنہ حضرتِ فروغؔ کے پاس وہ اور میں دونوں اصلاح لیا کرتے تھے۔ یہ بات صرف زبانی ہی نہیں تھی بلکہ والد صاحب کے

تمام مرحوم کے جتنے بھی خطوط یا چٹھیاں آئی ہیں۔ ان میں "بھائی عارف" ہی سے مخاطب کیا ہے۔ حفظِ مراتب کا مرحوم نہایت خیال رکھتے تھے اور آخر دم تک اس کو نباہتے رہے۔ احباب و تلامذہ سے قطع نظر مرحوم نے جو سلوک اپنی والدہ سے روا رکھا وہی ان کی خوش خلقی اور بلندیٔ اخلاق کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ ناواقف لوگ سوتیلے رشتے کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ والدہ کی ذرا سی علالت مرحوم کو بے چین کر دیتی تھی۔

دوست و احباب سے ملنے میں کبھی پہلو تہی نہیں فرماتے تھے۔ ان کا دیوان خانہ دن بھر بلکہ رات ۸، ۹ بجے تک بھرا ہوا ہوتا۔ جہاں ہر شخص اپنے دل کی کہتا اور اپنے خیال کے موافق جواب پاتا۔ گفتگو کے معاملے میں حضرت صفی کو ترقی پسند کہا جا سکتا ہے جبکہ جناب رشید احمد صاحب نے ترقی پسند کی تعریف یوں کی ہے کہ جو جرأت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سنے وہ ترقی پسند ہے۔ بالکل یہی کیفیت حضرت صفی کی تھی۔ ان کے سامنے ہر شخص اپنے شبہات کا تذکرہ کر کے شافی جواب پاتا۔ ایسے وقت مرحوم اپنے پورے اعتماد کے ساتھ جو ان کی سیرت کا ایک گرانقدر پہلو تھا مخاطب کے شکوک کا جواب دیتے۔ ان کے آگے ہر شخص بے تکلف تھا۔ لیکن یہ بے تکلفی اسی حد تک ہوتی جہاں تک کہ اس کو حسن معاشرت کا جزو اعظم سمجھا جاتا۔ ان کی شخصیت اتنی متوازن تھی کہ کسی کو نہ اپنی حد سے متجاوز ہونے کی ہمت ہوتی نہ بالکل دو زانو بیٹھنے کی قید۔ مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ان کے ملنے والوں میں فرداً "فرداً" کوئی یکا ذہنیت نہیں لیکن جب یہی لوگ مرحوم کی محفل میں ہوتے تو یہ "گلدستہ" نہایت دلکش ہو جاتا۔ یہ بات افراد کی حد تک ہی نہیں تھی بلکہ دیوان خانے کی ہر چیز میں یہی کیفیت تھی۔ میں اب غور کرتا ہوں تو یہ بات نہایت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

بعض اوقات دوسروں کی غلطیوں سے افسردہ بھی ہو جاتے مگر اس حالت میں ان کی دل شکنی نہ فرماتے بلکہ کہتے دیکھو مجھے تمہاری حرکتیں پسند نہیں۔ میں مرحوم کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی میری غیر حاضری ایک طویل عرصے تک رہتی۔ اس پر فرماتے تھے کہ یا تو تم روز روز آتے رہتے ہو اور کبھی یہ امید ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی کام تمہارے ذمے کر دیا جائے تو پابندی سے کر لیا کرو گے۔ مگر آتے آتے اس طرح غائب ہو جانا کتنی اذیت کا باعث ہوتا ہے اس پر غور کرو۔" ایک مرتبہ حضرت اماں کی طبیعت ناساز تھی۔ دوا لانے کے لئے مرحوم نے مجھ سے کہا۔ گرما کا موسم تھا۔ دو ایک روز تو میں نے پابندی کی مگر اس کے بعد نہیں جا سکا ادھر حضرت انتظار ہی میں رہ گئے۔ آخر جب وقت بالکل نہ رہا تو خود دھوپ میں چل نکلے۔ دوسرے روز میں پہنچا تو غیر حاضری کی وجہ دریافت فرمائی۔ جواب میں میں نے کچھ غیر معقول اسباب بتلائے تو برہم ہو کر فرمایا کہ کسی کی صحت کا معاملہ تمہارے قبضے میں ہے اور تم ایسے اہم کام میں لاپرواہی برتو گے تو آگے کیا امید ہو سکتی ہے۔ نادم ہوا اور دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ یہ دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا "بابا! ہم اپنا بوجھ کسی پر ڈالنا نہیں چاہتے۔ یہ اک خلوص ہے جو ہم تم کو اپنے خانگی کاموں میں اپنا مددگار بنا لیتے ہیں۔ عارف سے ہمارے جو مراسم ہیں ان کو پیش نظر رکھو۔ یہ نہ سمجھو کہ حضرت تغافلی کرتے ہیں۔"

حضرت مرحوم میں ہمدردی اور جورددی کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم موجود تھا۔ کسی مفلوک الحال آدمی کو نہ دیکھ سکتے تھے۔ ان کے دروازے سے کوئی فقیر خالی نہ جاتا تھا۔ فقیروں کی گروہ بندی بھی عجیب تھی۔ روز آنے والے فقیر، آٹھواڑہ کو آنے والے فقیر، ماہانہ آنے والے فقیر۔ خیرات دینے سے پہلے دریافت کیا جاتا کہ روز آتے ہو یا جمعرات یا مہینہ کو؟ اور اسی حساب سے خیرات دی جاتی۔ میں نے دیکھا ہے کہ ایک ڈبیا میں صرف "خردہ" ہوتا جو یومیہ تقسیم کر دیا جاتا۔ آٹھواڑہ اور ماہواری فقیروں کے لئے الگ انتظام تھا۔ ایک دن میں نے پوچھا تو فرمایا: فی آمدنی میں سے ۵ روپیہ ایک آنہ نکال لیتے ہیں اور اسے مہینہ بھر تقسیم کرتے ہیں۔ مرحوم

کا یہ طریقِ تقسیم آخر دم تک جاری رہا۔ اس کے علاوہ چھوٹے بچوں کو بھی "تنخواہ" دی جاتی تھی مگر یہ خیرات کی مد سے علیحدہ تھی۔

وفات سے پہلے ایک بیوہ حیا نے جو کثیر العیال اور بیوہ تھی مرحوم سے اپنی حالت بیان کی۔ حضرت نے اس کے لئے اپنے ہاں سے کھانے کا انتظام فرما دیا اور اپنے مخلص دوستوں سے امانت کی خواہش کرتے رہے۔ اس کے رہنے کے لئے اپنے مکان سے قریب ایک جھونپڑی بنوادی۔ جھونپڑی کی زمین کے لئے حضرت نے بڑی کوشش کی۔ مالک سے اجازت لینے کے لئے خود بیماری کے زمانے میں تالاب انصاحب تک تشریف لے گئے اور اس طرح حالات و واقعات کا اظہار کیا گویا وہ ان کا اپنا ہی کوئی کام تھا۔ مالک جائداد نے اس ہمدردی اور عنایت سے متاثر ہو کر بخوشی رضامند ہو گئے اور ضمناً یہ بھی کہا کہ آپ اگر کسی کو روانہ فرما دیتے اور مجھے اطلاع ہو جاتی تو کافی تھا۔ شرمندہ ہوں اتنی سی بات کے لئے آپ کو زحمت اٹھانی پڑی۔

مرحوم شاعر ہونے کے علاوہ اچھے طبیب بھی تھے۔ محلے کے اکثر لوگ مرحوم سے کھانسی، بخار، نزلہ وغیرہ کی دوائیں لے جاتے۔ حضرت نے ان کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ دوا دیتے اور دوبارہ کیفیت سے مطلع کرنے کی تاکید کرتے تھے۔

صداقت پسندی اور بے ریا گفتگو میں حضرت مرحوم سے لوگ کم نظر آئے۔ سادگی ان کا خمیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سادگی ان کی زندگی کے ہر شعبے میں رچ گئی تھی۔ شہرت پسندی، نام آوری سے پرہیز فرماتے تھے۔ لیکن پھر بھی دکن میں مشہور آفاق شاعر تھے۔ نام کے آگے بڑے بڑے القاب سخت ناپسند تھے۔ ایک مرتبہ کسی شاگرد نے خط میں پوری ایک سطر القاب اور نام کے لئے نذر کردی تھی۔ مرحوم بہت برافروختہ ہو گئے۔ فرمایا نہیں معلوم لوگ کیوں اتنے لمبے چوڑے نام لکھ جاتے ہیں۔ اس سے عقیدت نہیں بلکہ بناوٹ اور چھچھورا پن ظاہر ہوتا ہے۔ حد سے زیادہ تعریف بھی نازیبا ہے۔

سادہ معاشرت اور سادہ مزاجی حضرت صفی کی نمایاں شان تھی۔ وہ لباس اور رہن سہن کے اعتبار سے معمولی آدمی سے بھی معمولی تھے۔ اس بارے میں ایک لطیفہ ہے کہ حیدرآباد میں ایک بہت بڑا مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں حضرت بھی مدعو تھے۔ انتظام کے لئے پولیس بھی موجود تھی جو صرف مدعو شاعر کو اندر جانے کی اجازت دیتی تھی۔ حضرت اپنے اسی سادہ لباس میں تشریف لے گئے۔ کسی کانسٹبل نے ان کو غیر مدعو سمجھ کر داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ بھی سمجھ گئے اور دعوت نامہ نہیں دکھلایا بلکہ اس کی منت سماجت شروع کر دی۔ آخر کار کانسٹبل اس پر شرط پر کہ وہ صرف دور ہی سے مشاعرہ سنیں گے اندر جانے کی اجازت دیدی۔ جب حضرت کی باری آئی تو یہ اپنا رومال جھٹکتے ہوئے اٹھے اور غزل شروع کر دی۔ یہاں اس کانسٹبل کی عجیب حالت تھی۔ وہ کبھی تو اپنی غلط فہمی اور کبھی خوف سے دل گرفتہ تھا مگر حضرت اس واقعہ کو ایک لطیفہ ہی کہتے تھے۔

حضرت صفی کے انتقال کے بعد تلامذہ صفی کی ایما و رضامندی سے جانشین مقرر کئے گئے۔ انہوں نے آج تک تذکرہ تک نہیں فرمایا اور نہ کبھی اس پر فخر کرتے پائے گئے۔ مرحوم کی تدفین کے وقت پورے تلامذہ جمع تھے۔ ان میں استاد بھائی بھی شریک تھے جو مرحوم کے ابتدائی زمانے کی سرگزشت کہہ رہے تھے۔ مزار کھدوائی میں دیری تھی۔ دھوپ سے پناہ لینے کے لئے مختلف جگہ ٹھنڈی چھاؤں میں لوگ گروہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی انکساری کی شاید سب سے عدیم النظیر مثال یہ ہے کہ جناب حاوی صاحب سے اپنے تلامذہ کو بعض اوقات رجوع ہوتے مشورہ دیتے بلکہ خود بھی مشورہ فرماتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ جو باتیں میرے ذہن میں مبہم ہوتی ہیں یا جو شبہ دل میں ہوتا ہے وہ حاوی سے دور کر لیا کرتا ہوں۔ غور کیجئے نہایت صاف الفاظ میں دوسروں کو ہدایت کی اور خود بھی اس پر گاہے گاہے عمل پیرا ہوتا۔ کتنی انکساری ہے؟ یہ باتیں صرف سلف میں پائی جاتی ہیں اور وہ بھی بہت جلد جلد اٹھتے جا رہے ہیں۔ نئے زمانے میں یہ باتیں کسرِ شان سمجھی جاتی ہیں۔

اپنے ہمعصر شعراء کے متعلق انھوں نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ایسے معاملے میں وہ بہت کورے تھے۔ نہ خود کچھ اعتراض کرتے نہ دوسرے سے ایسی بات گوارا فرماتے۔ ایک دن میں نے اسی مقصد سے کہ مختلف شعراء کے متعلق مرحوم کی رائے کیا ہے بعض حضرات کے نام لئے۔ مرحوم نے کہا بس بس اب خاموش ہو جاؤ۔ اساتذہ مرحومین میں ہر ایک اپنے اپنے مقام پر درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے مگر اب تم کو ان سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب سب موجودہ شعراء ان میں ہر ایک اپنے رنگ کا استاد ہے۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ تم اگر تقابلی مطالعہ کرنا چاہو تو یہ دیکھو کہ جس معیار سے تم جانچ رہے ہو وہ کس حد تک صحیح ہے۔ رائے زنی کرنے سے پہلے اپنے سراپا کا جائزہ لیا کرو۔ لیکن کبھی کبھی جس کے متعلق جو رائے رکھتے اس کا علی الاعلان اظہار بھی فرماتے۔ کسی محفل یا مجمع میں بند نہ تھے۔ کسی کی خاطر نہ کبھی اپنے نفس پر جبر کیا نہ دوسرے کو ایسے موقع سے دو چار کیا۔ مرنجاں مرنج 'آزادرو' بے لوث 'خوددار آدمی میری نظر میں حضرت مرحوم ہی تھے۔ وہ اس زمانے کے ساختہ پرداختہ تھے جب کہ زندگی خوش باشی کا نام تھا اور اب زندگی خوش باشی کے سوا سب کچھ ہے۔ رسم و رواج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ فرق بھی کیسا؟ جن قدروں پر اس وقت مرنے والے لاکھوں تھے آج ان پر رونے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن مرحوم کی حیثیت جداگانہ تھی۔ ان میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلی ہوئی۔ یہ ان کی زندگی کا نہایت اہم اور انسانی پہلو ہے۔ روزگار کی بہت سی کروٹیں دیکھیں ایسی کروٹیں جو دوسروں کا کیسر زیروزبر کر سکتی تھیں لیکن مرحوم میں اپنے فن کا ایسا اعتماد اور ایسی امید افزائیت تھی کہ ان کو تبدیلی کی بہت کم ضرورت ہوئی۔ وہ شروع سے آخر تک ایک شروع 'باوضع اور صاحب طرز شاعر رہے۔

مرحوم کا مالیہ نہایت کمزور تھا۔ سرکاری ملازمت نہیں تھی' کوئی وظیفہ یا منصب بھی نہیں پاتے تھے۔ گرانی کے باعث آج اچھے اچھوں کا حال پتلا ہو رہا ہے لیکن مرحوم اس وقت بھی جس آن بان سے زندگی گزاری ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ذرائع معاش کی طرف سے متردد ضرور رہتے مگر کسی سے اس کا تذکرہ نہیں فرماتے۔ اسی وجہ سے لوگ انھیں شاید آن بان اور وضع کو دیکھ کر کیمیاگر کہتے تھے۔

اس تنگ دستی اور پریشان حالی کے زمانے میں بھی مرحوم نہایت زندہ دل ثابت ہوئے تھے۔ بات میں بات پیدا کی۔ اس میں واقعیت کا رنگ بھر مرحوم کا خاص تھا مرض الموت کے آخر ایام میں خون کی قے شروع ہو گئی تھی۔ علاج ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کا تھا۔ وہ آئے اور کہا قبلہ ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے میں انجکشن دے دیتا ہوں۔ مرحوم نے آگے ہاتھ بڑھا دیا اور مٹھی بند کر دی۔ انجکشن دینے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا بس اب مٹھی کھول دیجئے آرام ہو جائے گا۔ مرحوم مسکرائے اور فرمایا اجی قبلہ یہ بند مٹھی لاکھ کی ہے اسے کیا کھولوں؟ ایسے پریشانی کے وقت بہت کم لوگ ایسا بے ساختہ اور پر لطف جملہ کہہ سکتے ہیں۔

جب مرض کی شدت خطرناک صورت اختیار کرنے لگی تو ڈاکٹر صاحب کے مشورہ سے مرحوم کو عثمانیہ دواخانہ میں رجوع کیا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹر مسز اسکوے نے مرحوم کو متواتر دس یا بارہ انجکشن دیئے۔ تکلیف سے مرحوم بے اختیار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا بس اب کچھ نہیں ہوگا۔ مرحوم نے فرمایا کیا کہا؟ کچھ نہیں ہوگا۔ اجی مسز آرام ہوگا۔ کچھ کیوں نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر اور حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔

مرحوم کی خوش مزاجی اور طباعی سے آس پاس کے مریض بہت جلد یعنی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی میں مانوس ہو گئے۔ دواخانے میں صرف ایک رات کے لئے جناب جوہر صاحب نے مجھے ٹھہرایا تھا۔ والد صاحب کو اطلاع ہوئی تو وہ آٹھ بجے دواخانہ آئے۔ مرحوم نے پوچھا اس وقت تم کو کس نے چھوڑا؟ کدھر سے آئے؟ والد صاحب نے کہا آنے کے ہزار طریقے ہیں۔ کسی طرح آ ہی گیا! یہ سن کر مرحوم متبسم ہو گئے اور دواغ کا یہ شعر پڑھا ۔

خواب میں تم کو کس نے روکا ہے ۔ آنے جانے کے ہیں ہزار طریق

اس موقع پر مرحوم کی قوت حافظہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ برمحل اشعار پڑھتے اور چشم زدن میں مرحوم کو تمام ... حاصل تھا ...

شعر بھی اگر یہ کسی موقع پر پیش کر دیا کرتے تو موقع و محل کی مناسبت اور استعمال کی برجستگی نے خود شعر کا پایہ بلند ہو جاتا۔

انجکشن کے بعد مرحوم کو کسی قدر آرام ہو گیا تھا۔ مجھ سے فرمایا لکھو اور خود ایک چٹکی نکال کر دی۔ یہ ان کی خاص عادت تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی چٹھیاں جو سگریٹ کی ڈبیوں کی ہوتی ہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

کہنے لگے اس ڈاکٹر کا نام کیا ہے؟ میں نے مسٹر اسکرے!! فرمایا ہاں! ؎

دوست جو بچ جائیں مسٹر اسکرے      حرص ہر بیمار کرنا بس کرے

بدیہہ گوئی اور بدیہہ آفرینی میں بھی مرحوم کو خاص درک تھا۔ مشاعرہ میں تحت اللفظ پڑھتے تھے مگر پھر بھی مشاعرہ مرحوم کے ہاتھ رہتا تھا۔ ان ہی کی غزل حاصل مشاعرہ قرار دی جاتی۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ ان کی شہرت و مقبولیت محض ان کی غزلوں کی وجہ سے تھی۔ ان کے شعر بلا مبالغہ بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ کسی مشاعرہ میں مرحوم شریک ہوں عوام کا ہجوم بے پناہ ہوتا تھا اور جب یہ اپنی غزل پڑھ چکے ہوتے تو مجمع بھی چھٹ جاتا۔ اس سے خود بھی واقف ہیں ؎

صفی کو شاعری سے مل گئی ہر دلعزیزی بھی      دروغ مصلحت آمیز بھی کیا ہنر دیکھو

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ ہر بڑے شاعر یا فن کار کی شہرت میں کسی نہ کسی بڑی ہستی کی کار فرمائی ہوتی ہے۔ مثلاً داغؔ اور جلیلؔ ہی کو لیجئے۔ حیدرآباد سے متوسل ہو جانے کے بعد ان کے اعزاز و شہرت میں ایک خاص اضافہ ہو گیا۔ مگر حضرت صفیؔ ان تمام اضافی وسیلوں سے بے نیاز فقط اپنے کلام کی وجہ سے مشہور و مقبول ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ابھی دیوان طبع نہیں ہوا اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ عوام کی نظروں سے اوجھل ہے۔

حضرت صفیؔ کی وفات ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء مطابق ۱۵ رجب ۱۳۷۳ھ کو ہوا۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کی ولادت رجب ہی کے مہینے میں یوم مابعد شب معراج ہوئی۔

متوسط قد، رنگ صاف، بڑی بڑی آنکھیں، تیز نظر، خمدار اور بھری بھری بھوئیں، سر بڑا، پیشانی بلند، سر پر بال کم تھے۔ سینہ کشادہ، دست و پا بلند۔ مرحوم فرماتے تھے کہ ہم ساتویں مہینے میں پیدا ہوئے اگر پورے (۹) مہینے میں پیدا ہوتے تو نہیں معلوم اعضاء کا کیا حال ہوتا۔

انداز میں بانکپن، آواز میں کڑک، لچک، دھمک، خط نہایت پیارا تھا۔ وہ بہترین خطاط بھی تھے۔ مرحوم کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ سر پر کبھی کپڑے کی ٹوپی یا تاج۔ معمولی مگر دیدہ زیب کپڑے کا کرتہ اور ہاف کوٹ ( ). کبھی تہمد اور کبھی پاجامہ۔ شیروانی کا خاص دستور نہ تھا۔ بڑھاپے میں بھی بھلے نظر آتے تھے۔ ان کو دیکھ کر کوئی بیماری کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا لیکن خود ان پر جو گزرتی تھی اس کا علم یا خدا ہی کو تھا یا وہ خود اس سے واقف تھے۔ میری والدہ کی وفات پر والد صاحب کے جو پرسہ نامہ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں ——

"ضیق النفس نے میرے دم پر بنا دی ہے۔ آمد و رفت نفس کا حال کوئی مجھ سے پوچھے۔ خدا جانے جو ہر دم گزرتی ہے۔ گھر کے گھر ہی میں ضروریات کے لئے آنا جانا ایک بڑی منزل طے کرنا ہوتا ہے۔ اور پھر آکر اپنی جگہ پر بیٹھنے کے بعد بھی پہلے سانس اور پھر اوسان کا درست کرنا آفت پر آفت ہوتا ہے۔"

اس مرض سے مرحوم اس قدر مایوس ہو گئے تھے کہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"غرض اب یہ جھگڑا تو میرے دم ہی کے ساتھ لگ گیا شاید مروں تو اس بلا سے چھوٹوں۔"

لیکن اس کے ساتھ ان کو خدا پر بھروسہ بھی تھا۔ اتنا لکھنے کے بعد فرماتے ہیں ـــــ

"یہ سب بھی قاعدے سے لکھ رہا ہوں ورنہ ؎

فضل اس کو کرتے نہیں لگتی بار                    نہ مایوس ہو اس سے امیدوار

دوستوں کی فرمائش کی تکمیل اس زمانے میں بھی جاری تھی۔ غزل کی اصلاح، مادۂ تاریخ اور دیگر فنی باتوں سے اب بھی واسطہ تھا۔ والد صاحب نے چند مادہ تاریخ روانہ فرمائے تھے۔ ان کے متعلق فرماتے ہیں:ـــــ

"ہاں تو یہ تاریخ کا پرچہ جو آپ نے بھیجا اسے میں نے رکھ لیا ہے۔ انشاء اللہ مطمئن ہونے کے بعد بھیج دوں گا اور مطمئن ہونے کی بہت جلد کوشش کروں گا۔"

سانس کے عارضہ سے مرحوم کو معمولی سی مشقت بھی بار تھی ـــ حتیٰ کہ اپنے دوستوں کو خط بھی بہت کم لکھتے تھے اور جو لکھتے بھی تو بہت مختصر۔ یوں تو مافی الضمیر کو مختصراً ادا کرنے میں حضرت مرحوم کی بڑی مشق تھی۔ بات مختصر اور جلد جلد فرماتے تھے مگر اب تو علالت اور مجبوری دونوں نے ان کو مختصر گو اور مختصر نویس بنا دیا تھا۔ چنانچہ اسی خط کے آخر میں فرماتے ہیں ـــ

"آج کئی مہینے بعد بیک قلم اتنا لکھا ہے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود ان میں چند خامیاں بھی تھیں۔ لیکن ان کی وہ خامیاں ایک اچھے شعر کی خامیاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں فرق نہیں آتا۔

وہ میرا بہت خیال فرماتے تھے۔ ان کو دیکھ کر میرے دل میں شگفتگی اور اعتماد پیدا ہو جاتا تھا اور جس کو دیکھ کر کسی کی یہ حالت ہوتی ہو تو پھر اندازہ لگائیے کہ اس کی وفات کا کیا غم ہوتا ہوگا۔ لیکن اس غم کا مقابلہ اس غم سے کیسے کروں اور کون کر سکتا ہے جو مرحوم کی والدہ کو ہوا ہے۔ ایسوں کا غم اور ایسا غم اس رحمت بیکراں کی طرف سے مغفرت کی بشارت ہے جس کے جوار میں مرحوم پہنچ گئے ہیں۔ میں کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہوں۔

# صفیؔ مرحوم کی یاد میں

(میری یہ نظم، ارضِ دکن کے اس عظیم شاعر کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت ہے جو زندگی بھر مرتا رہا اور
مرکے ہمیشہ کے لئے زندہ ہوگیا ———————— جامی)

نہیں ہے تو آج ہم میں لیکن ابھی ہے زندہ کلام تیرا
غزل کے سینے میں دل کی صورت دھڑک رہا ہے پیام تیرا

سمو کے حسنِ بیان میں اپنے حیات کی دردمندیوں کو
ترے خیالات نے جھکایا۔ کمال و فن کی بلندیوں کو

یہ فکر کا دلنشیں سلیقہ، یہ کیف، یہ طور، یہ قرینے
محاورے، شوخیاں، لطافت، حسین الفاظ کے نگینے

دکن کی محفل میں میرؔ و مرزاؔ کی عظمتوں کا نیا سویرا
بھلا سکے گی نہ بھول کر بھی ادب کی تاریخ نام تیرا

کئے ترے سوزِ جاوداں نے خیال و فکر و دماغ روشن
نہ جانے کتنے ہیں زخم تازہ، نہ جانے کتنے ہیں داغ روشن

یہ میں نے مانا کہ آج اتنی بدل گئیں وقت کی نگاہیں
نئے خیالات سامنے ہیں، نئی مذاقِ سخن کی راہیں

مگر جو پہلے ہی دے گئے ہیں ادائے حسنِ بہار تازہ
بنا کے خونِ جگر کو اپنے نگارِ اردو کے رخ کا غازہ

بڑھے گا یہ قافلہ ہمارا انھیں کے فیض و کرم سے آگے
نئے نشانات بھی ملیں گے ہر ایک نقشِ قدم سے آگے

عظیم ورثہ وہی ہمارا کسی کو انکار اس سے کب ہے
ہمارے ماضی کا ہر اجالا نشانِ مستقبلِ ادب ہے

خورشید احمد جامی

# غزل

تیرا نظام خاص ہے تیرا پیام خاص
طرزِ بیاں ہے وہ کہ سمجھتے ہیں عام خاص

مے خانۂ ادب کے اے ساقیؔ مے نواز!
تیری صراحی خاص سبو خاص جام خاص

محکوم ہیں جو لفظ تو تابع محاورے
بندش جو ہے کنیز تو مضموں غلام خاص

تو نے غزل کا ایسا سلیقہ سکھا دیا
سب مانتے ہیں تجھ کو غزل کا امام خاص

رطب اللساں ہیں تیری زباں پر شکر دہن
ہر شعر چاشنی میں شہد کا ہے جام خاص

ہیں پاسؔ[1] و فیضؔ[2] بھی ترے استاد سلسلہ
پہچانتے ہیں اہلِ دکن ان کو عام خاص

نورِ نگاہ ذوقؔ[3] تو دلبند شاہ نصیرؔ[4]
سوداؔ[5] و دردؔ[6] کا ہے تو قائم مقام خاص

گلزارِ داغؔ[7] کا ہے مہکتا ہوا جو پھول؟
کیفیؔ[8] کے آسمان کا ماہِ تمام خاص

تو نور ہے ضیاؔ[9] کا تو مظہر ظہورؔ[10] کا
تجھ کو دیا فروغؔ[11] نے دل میں مقام خاص

تیری دکن نے قدر نہ کی لیکن اے صفیؔ[12]
دنیائے شاعری میں ہے تیرا مقام خاص

مسلمؔ کی ہے دعا یہ خدائے غفور سے
مل جائے اُس جہاں میں بھی تجھ کو مقام خاص

محمد غلام محبوب خاں مسلمؔ حیدرآبادی تلمیذ حضرت صفیؔ

---

[1] حفیظ الدین پاسؔ تلمیذ حضرت فیضؔ استاد الکل و استاد کیفیؔ۔

[2] حضرت شمس الدین فیضؔ استاد الکل۔

[3] شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ خاقانی ہند۔

[4] حضرت نصیر الدین شاہ نصیرؔ استاد ذوقؔ۔

[5] مرزا رفیع سوداؔ۔

[6] حضرت خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمۃ۔

[7] فصیح الملک نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی۔

[8] حضرت سید محمد رضی الدین کیفیؔ حیدرآبادی، صفیؔ کے چوتھے اور آخری استاد۔

[9] محمد منیر الدین ضیاؔ گورگانی تیموری، صفیؔ کے پہلے استاد۔

[10] حکیم ظہور احمد ظہورؔ دہلوی، صفیؔ کے دوسرے استاد

[11] محمد عبدالولی فروغؔ حیدرآبادی شاگرد داغؔ دہلوی، صفیؔ کے تیسرے استاد

[12] محمد بہاء الدین پیرولی صفیؔ اورنگ آبادی۔

# یومِ صفی

صدیقیہ حزبِ سٹی کالج کا اولڈ بوائے
یوں اپنی درسگاہ میں آشفتہ حال آئے

بتلاؤں کیا ہے اس کی سراسیمگی کا راز!
ہے کس لئے عزیب یہ صد درجہ دل گداز؟

یومِ صفی ہے، یادِ صفی ہے، غمِ صفی
کرتے ہیں قدردانِ صفی ماتمِ صفی

تھی جس صفی کے دم سے زبان وادب میں جان
جس کا وجود حسن و محبت کی آن بان

جس کی ہر ایک بیت غزل کا سہاگ تھی
جس کی ہر ایک بات محبت کا راگ تھی

جس نے محاوراتِ دکن زندہ کر دیئے
اپنی ضیا نوازی سے تابندہ کر دیئے

جس کا وجود باعثِ صد امتیاز تھا
اردو پہ جس کی واقعی اردو کو ناز تھا

صبحِ ادب تھی مہرِ درخشاں لئے ہوئے
شامِ غزل تھی شمعِ شبستاں لئے ہوئے

اے اہلِ ذوق تلخ نوائی مری معاف
میں صاف گو بیان بھی میرا ہے صاف صاف

تھے قدرداں عزیب زیادہ امیر کم
ایمان کی یہ بات ہے اللہ کی قسم

بھیجا اجل کو جس گھڑی پروردگار نے
دیکھا پلٹ کے بھی کسی سرمایہ دار نے

گرمی سخن کی جس سے تھی بستر پہ سرد تھا
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

خواجہ عبدالعلی صدیقی حیدرآبادی

---

یہ ان کی باتیں کہاں اور وہ اس کی بات کہاں
یہ حادی ہو کہ خیالی کوئی صفی تو نہیں

سید محمد حسین آزاد

# نذرِ صفی

وضع داری کی آن بان گئی
آج دنیا صفی کو جان گئی

میر و مومن کا غم ہوا تازہ
شاعری کی قدیم شان گئی

مسکراتی تھی اس کی خودداری
غم دل سہتے سہتے جان گئی

اس کی طبعِ غیور کے آگے
باکمالی بھی ہار مان گئی

بے سہارا ہوئی غزل گوئی
ایک ہستی تھی نگہبان گئی

آج خالی ہے مسند یکتی
دل کے جذبات کی زبان گئی

تھا دکن میں ولی کا جو وارث
ساتھ اس کے غزل کی شان گئی

دفن کے بعد یہ صدا آئی
آبرو سے بلا سے جان گئی

اے بشیر اب کہاں وہ رنگ صفی
خون رو رو کے جس کی جان گئی

بشیر النساء بیگم بشیر

# نذرِ صفی

ہے بہارِ حسن کہ حسنِ بہار ہے
اف! کیا تبسمِ نگہِ عشوہ کار ہے

خونِ شہید غازۂ روئے بہار ہے
کیا دیدنی فروغِ گل و لالہ زار ہے

گلشن میں "دورِ دورۂ برق و شرار" ہے
سینہ سپر ہو جس کو نشیمن سے پیار ہے

یہ کیا فریبِ گردشِ لیل و نہار ہے
دل میں نہیں بہار، نظر میں بہار ہے

پھولوں کے اوٹ سے جو اڑائے مذاقِ غم
اس کی طلب تجھے دلِ حسرت شعار ہے

ایک وقفۂ حیات بھی ہنس کر گزار دے
مجبورِ عشق کو یہ کہاں اختیار ہے

ربطِ نہاں کا آئینہ ہے ظاہری بگاڑ
کتنی لطیف شوخیٔ بیگانہ وار ہے

نقشِ قدم سے تیرے منور ہے آج بھی
تاروں کی انجمن جو تری رہگذار ہے

ہنگامہ زارِ عشق میں سنتے ہیں ہم نشیں
جو کھیل جائے جان پہ وہ مردِ کار ہے

احساس کا ہے کھیل "الم کا، نشاط کیا"
احساس ہی کے ہاتھوں میں دل بے قرار ہے

خونِ جگر سے حسن کی تصویر کھینچ دی
برباد آرزو کا ہی شاہکار ہے

جس میں نکاتِ حسن ہیں ذوقِ جنوں کے ساتھ
یہ وہ نگارشِ قلمِ دل فگار ہے

آنسو ٹپک پڑے مرے دل کی تڑپ کے ساتھ
ہے یادِ دوست یا خلشِ نوکِ خار ہے

ہر لمحۂ حیات قیامت سے کم نہیں
اور کہنے کو فقط خلشِ انتظار ہے

تاریکیوں کے دور سے گھبرا گیا ہوں میں
اے صبحِ تابناک ترا انتظار ہے

پینا پڑے گا پھر بھی ہے زندگی ہی
گو ایک تلخ گھونٹ الم روزگار ہے

کیا کیا ستم کئے نگہِ فتنہ کار نے
کوئی وطن میں رہ کے غریب الدیار ہے

اے ہم سخن! یہ کہتے ہوئے چل بسے صفی
"میری خزاں ہے اور غزل کی بہار ہے"

تفریقِ نسل و رنگ نہیں عشق میں نظیر
جو دل پہ چوٹ کھائے محبت شعار ہے

سعادت نظیر

# غزل

دنیا نے کیا سلوک کیا ہے صفیؔ کے ساتھ
افلاس میں جیا تو مرا بے کسی کے ساتھ

رونق کے دم کی بازی ہے ہر زندگی کیساتھ
سب کی خوشی کے ساتھ وہ سب کی غمی کیساتھ

ہر غم ہے خوشگوار غمِ زندگی کے ساتھ
رونا بھی میں نے سیکھ لیا ہے ہنسی کے ساتھ

الزام ہم پہ ہے کہ چلے بے خودی کے ساتھ
کب آپ چل رہے ہیں سلامت روی کیساتھ

وہ ظلمتوں کی رات تھی تاریکیوں کے دن
پھر یہ سیاہی کیسی نئی روشنی کے ساتھ

جیسے کہ میں بھی کوئی غریب الدیار ہوں
ایسا سلوک جیسے کسی اجنبی کے ساتھ

خود ناخدا ہی کر گیا رختِ طرازیاں
کشتی گذر رہی تھی سلامت روی کیساتھ

آغاز ہی کیا تھا ابھی داستانِ غم
دامن جھٹک کے اٹھ گئے وہ بے رخی کیساتھ

سینہ سے اب نہ دستِ تسلی ہٹائیے
اٹھتا ہے درد اب بھی مگر کچھ کمی کے ساتھ

اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا
کیا ربط تھا نہ جانے کسی کا کسی کے ساتھ

او میرے چارہ گر غمِ دوراں کا کیا علاج
اک اور بھی تو غم ہے غمِ عاشقی کے ساتھ

ہر ایک کو سناتا ہوں یوں داستانِ غم
جیسے کہ واقعی ہے محبت کسی کے ساتھ

اب درد میں سرور ہے مستی ہے کیف ہے
ہر غم اٹھا رہے ہیں تمہارا خوشی کے ساتھ

سرمایۂ نشاط وہی حاصلِ حیات
کچھ ساعتیں خوشی کی جو گذریں کسی کے ساتھ

رونقؔ خدا شناس بھی ہے خود شناس بھی
ہے ذوقِ آگہی بھی اسے بندگی کے ساتھ

مرزا رونقؔ قادری

# صفیؔ کا کچھ کلام

خیال آپ کا جب ذرا آگیا — تڑپنے میں ہم کو مزا آگیا
نہ ہم دوسرے ہیں نہ وہ دوسرے — زمانہ مگر دوسرا آگیا
خدا کی قسم کھاکے وہ چپ ہوئے — خدا کی قسم ہے مزا آگیا
کوئی جھوٹ کی حد بھی ہے نامہ بر — ابھی کے ابھی میں گیا آگیا
انھیں بات کرنے کی فرصت کہاں — گیا ایک تو دوسرا آگیا
سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو — یہ دل ہے جدھر آگیا آگیا
صفیؔ کو بھی اچھا سمجھنے لگے
زمانہ اب ایسا بُرا آگیا

---

آدمی جلووں میں گم دن رات ہے — دیکھنے کو سامنے کی بات ہے
بدحواسی عشق میں دن رات ہے — زندگانی ہو بہو سکرات ہے
ہم نشیں خاموش! جی گھبرا گیا — یہ تری باتیں ہیں یا برسات ہے
مجھ کو چپ کی داد اچھی تو ملی — آپ بھی چپ؟ واہ وا کیا بات ہے
کچھ نہ کچھ الزام سائل کو دیا — یہ بھی ان کے پاس کی خیرات ہے
مختصر وعدہ کیا، ہاں کیوں نہ ہو — جتنا ان کا منہ ہے اتنی بات ہے
اشتیاقِ دید سے آنکھوں کا روگ — دیکھنے میں تو خوشی کی بات ہے
کیوں دلاسے دے رہے ہو بے طلب — بھیک ہے؟ انعام ہے؟ سوغات ہے؟
کیوں پڑھا تھا ان کی صورت پر درود — اب تو میرے نام پہ صلوات ہے
شیخ کو ہے دخترِ رز سے اجتناب — جیسی ہے پھر بھی یہ عورت ذات ہے
حسن سے خالی صفیؔ کی شاعری
عیب سے خالی خدا کی ذات ہے

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

# سب رس

حیدرآباد دکن

جلد نمبر ۲۰ مئی و جون ۱۹۵۶ء شمارہ (۵، ۶)

نگران: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ:
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

چندہ سالانہ:۔ چھ روپے سکۂ ہند
" ششماہی:۔ تین روپے آٹھ آنے "

قیمت ایک روپیہ

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "اعجاز پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا۔

# فہرست

# جوش ملیح آبادی کے نام

جانے والے! تیری بزمِ دوستاں تیرے بغیر
ایک کشتی ہے کہ ہے بے جسم و جاں تیرے بغیر

اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ ہے آئی ہوئی
نغمہ آرائی کے گلشن میں خزاں تیرے بغیر

تو کہاں ہے لے ہمارے یوسفِ بے کارواں
کس طرف کو جائے تیرا کارواں تیرے بغیر

کیا کہوں دہلی میں کتنی نامکمل رہ گئی
محفلِ شعر و سخن کی داستاں تیرے بغیر

جانے والے آج میری محفلِ شعر و سخن
ایک محفل ہے کہ ہے بے روح و جاں تیرے بغیر

اپنی منزل کی طرف کیسے چلے کیوں کر چلے
کارواں تیرا امیرِ کارواں تیرے بغیر

تیرے ہونے سے کبھی جس کا خیال آیا نہ تھا
اب مکمل ہے وہ احساسِ زیاں تیرے بغیر

آشنا جو شادمانی سے ہوئی تیرے طفیل
ہو نہیں سکتی وہ محفل شادماں تیرے بغیر

میں کہ تھا بزمِ سخن کی جان اب میرے لئے
شرکتِ بزمِ سخن ہے امتحاں تیرے بغیر

اب ہماری نثر کی تصحیح فرمائے گا کون
مطمئن کیسے ہو یہ شوقِ تپاں تیرے بغیر

شعر کے لاکھوں محاسن تھے پراگندہ نقاب
اب وہی جلوے ہیں پھر شرزِ نہاں تیرے بغیر

تیرے جانے سے دلِ شعر و سخن افسردہ ہے
نثر کے لب پر ہے آوازِ فغاں تیرے بغیر

کھولتی رہتی تھی جس کو تیری گفتارِ جمیل
کون کھولے گا وہ اب رازِ نہاں تیرے بغیر

اے ہمائے اوجِ معنیٰ طائرِ شاخِ خیال
منتظر ہے آج تیرا آشیاں تیرے بغیر

تو بھلا بیٹھا ہمیں ہم کو نہیں شکوہ مگر
ہم نہیں دلشاد یارو مہرباں تیرے بغیر

جگن ناتھ آزاد

# غزل

مری نگاہ میں برق شراب ہے ساقی
مگر یہ دیکھ ان آنکھوں میں آب ہے ساقی

نئے ہیں ساغر و خم مے مگر ہے دیرینہ
یہ میکدے میں عجب انقلاب ہے ساقی

پلا پلا مجھے پھر ان حنائی ہاتھوں سے
مجھے تو مجھ سے ابھی تک حجاب ہے ساقی

یہ تیرے جام خدا رکھے کتنے رنگیں ہیں
یہ رنگ نشۂ نمود سراب ہے ساقی

ابھی سے یہ غم دنیا کے تذکرے کیسے
ابھی تو رات ہے تو ہے شراب ہے ساقی

حریف کتنے ہیں جو پی گئے نگاہوں سے
خطا معاف مجھی پر عتاب ہے ساقی

نہیں یہ عارض رنگیں تو پھر شراب ہی لا
کہ اس میں بھی یہ مہکتا گلاب ہے ساقی

بہک چلا ہوں پہ اتنا نہیں کہ ہوش نہ ہو
یہ تو ہے اور یہ میں یہ شراب ہے ساقی

میں جانتا ہوں یہی موت کا اندھیرا ہے
ابھی تو جام میں عکس شباب ہے ساقی

جلالؔ آیا ہے للہ ناامید نہ کر
یہ اس کے شوق کا عہد شباب ہے ساقی

مرزا جلال الدین احمد جلالؔ

# غزل

کسی بہانے سہی تیرگی تو چھٹ جائے
دلوں کے داغ جلاؤ کہ رات کٹ جائے

ہم آج دار و رسن سے چلے ہیں ٹکرانے
تم اپنی یاد سے کہہ دو کہ وہ پلٹ جائے

جہاں کا ظرف کشادہ اگر نہیں ہے تو پھر
ہمارا ظرف بھی اے دوست کچھ سمٹ جائے

کوئی پکار رہا ہے بصد خلوص مجھے
غم جہاں سے کہو راستے سے ہٹ جائے

مری خوشی تو زمانے نے بانٹ لی اے دوست
میں چاہتا ہوں مرا غم بھی آج بٹ جائے

کوئی تو ڈال دے باہیں مرے گلے میں نظرؔ
جو زندگی نہیں، مجھ سے اجل لپٹ جائے

فیروز نظرؔ

# غزل

منزل تو کیا کچھ اس سے بھی آگے نکل گیا
یہ تھی تری کشش کہ گرا اور سنبھل گیا

میں اس کی انجمن میں تصور کے بل گیا
صد شکر بے چلے بھی مرا کام چل گیا

اب ہاتھ مل رہا ہوں، دیا کیوں نہ اس کا ساتھ
جب میری دسترس سے زمانہ نکل گیا

جس کے عمل ہیں نیک، اسے زندگی ہے موت
وہ کیا گیا جو تشنۂ سعیٔ عمل گیا

اللہ رے میرے تشنۂ غفلت کی وسعتیں
کھلتے ہی آنکھ نقشۂ عالم بدل گیا

کیا عیشِ آشیاں تھا ہوائے بہار میں
جھونکا جو آگیا وہ نیا عطر مل گیا

یہ تھا نظامِ آمد و رفتِ بساطِ دہر
آج آگیا جو کوئی مسافر تو کل گیا

ہر نخلِ زندگی تھا اسیرِ خزاں یہاں
اچھا رہا جو چار گھڑی پھول پھل گیا

جب جذب کو دکن میں نہ دادِ سخن ملی
سوئے مزارِ داغ سنانے غزل گیا

راگھویندر راؤ جذب عالمپوری

# غزل

جنھیں نور و نغمہ کی چاہ تھی وہ سیاہیوں سے گذر گئے
انھیں موت نے بھی جھڑک دیا جو غمِ حیات سے ڈر گئے

کبھی جس کے محض خیال ہی سے ہزار رنگ بکھر گئے
وہ بہار زیبِ چمن ہوئی تو گلوں کے چہرے اتر گئے

ہمیں اب شکستِ دل و نظر بھی عزیز ہے کہ اسی سے ہم
غمِ عیش و یاسِ امید کے کئی مرحلوں سے گذر گئے

وہی رقصِ رنگ کی جھن جھنن، وہی نکہتوں کی چھبی مگر
جنھیں دل سے نسبتِ خاص تھی وہ پیام جانے کدھر گئے

ترے التفاتِ ستم نما کا میں دل سے شکر گزار ہوں
مری زندگی کے سیاہ دن یہی زہر پی کے نکھر گئے

جنھیں آندھیوں نے نگل لیا وہ حریفِ دورِ خزاں تو تھے
مگر ان گلوں کا قصور کیا جو بہار ہی میں گذر گئے

غمِ زیست پھر غمِ زیست ہے اسے لطف و کیف سے کیا غرض
جو ملی نگاہ تو دو گھڑی کو فضا میں گیت بکھر گئے

انھیں راستے ہی میں ڈس لیا کبھی حسن نے کبھی عشق نے
ترے قیدیوں کو زماں مکاں کے پیام شام و سحر گئے

نہیں یہ نہیں کوئی مصلحت، اسے بزدلی ہی کہوں گا میں
غمِ زندگی سے نظر ملی تو نظر بچا کے گذر گئے

اختر کاشی پوری

# غزل

رہتی ہوں میں چمن میں بہاروں سے دور دور
ان زندگی نوازِ اشاروں سے دور دور

یوں ہر قدم پہ چیخ سی اٹھتی ہے زندگی
دامن بچا کے چلتی ہوں خاروں سے دور دور

مدت ہوئی کہ قافلۂ شوق تھا رواں
اب لٹ چکا ہے راہگذاروں سے دور دور

جب بھی خوشی ملی ہے ملی مستعار سی
پھر سوزِ غم بڑھا ہے حصاروں سے دور دور

یکبار تم نے چھیڑی تھی شاید حسین لے
نغمے بکھر کے رہ گئے تاروں سے دور دور

ناآ بہار اب ہے در پردۂ خزاں
کچھ دن سلگ چکے ہیں شراروں سے دور دور

کب تک کرو گے سوزِ تمنا سے اجتناب
کب تک رہو گے وقت کے دھاروں سے دور دور

پنہاں ہیں آج ساحلِ دریا میں شورشیں
سر پھوڑتی ہیں موجیں کناروں سے دور دور

سمجھے تھے بے شعور جنھیں وہ بضد ہیں آج
ڈالیں گے ہم کمند ستاروں سے دور دور

کیسے کہوں حیات ابھی مسکرائے
مجبوریاں وہی ہیں سہاروں سے دور دور

زبیدہ تحسین

# رُخِ گیتی

زیست کے ہر کسی شعبے پہ مسلط ہے ریا
خلق و اخلاص و مروّت کے عوض کر و دغا
عقل کل کھوٹ تصنع کی نمائش ہے محض
تنگ آداب و خلائق ہے زمانے کی فضا

اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ تجھے یاد کروں
یا تری انجمن عیش کو آباد کروں
غم ماحول کا رونا ہی بہت ہے مجھ کو
کیا ترے حسن شرربار سے دلشاد کروں

قاسم صحرائی

# غزل

[illegible]ں کے نرم سائے حائل رہے تھکن میں
تیری نگہہ کی شوخی ڈھلتی گئی چبھن میں
[illegible]ن ہے خراماں پھر عشق ہے غزلخواں
کس کی یہ یاد آئی اشکوں کی انجمن میں
زلف یار برہم پھر التفات باہم
نظر آ رہے ہیں جلوے گل و لالہ و سمن میں
واقف نہ تھا کہ کیا ہے انجام رسم الفت
سب کچھ لٹا کے آیا اک تیری انجمن میں

محبوب اللہ مجیب

# غزل

حسن کب آپ کا کامل نہیں پایا جاتا
باعث رونق محفل نہیں پایا جاتا
عصر حاضر نے سجائی ہیں دکانیں کیا کیا
عقل ملتی ہے مگر دل نہیں پایا جاتا
کام اس سے بھی نکلتا ہے مگر ہوش کبھی
وسعت دل کے مماثل نہیں پایا جاتا
صاحب دل نے لئے سلسلۂ راز حیات
اصل میں عقدۂ مشکل نہیں پایا جاتا
آپ کا درس عمل بھول گئے ہیں انساں
کارواں در خور منزل نہیں پایا جاتا
جلوہ مقصود ہے جب آپ کا پھر دنیا میں
کوئی بھی دید کے قابل نہیں پایا جاتا
ہیں گنہگار بہت سے مگر ان میں کوئی
آپ کی یاد سے غافل نہیں پایا جاتا
آپ کے در کے سوا کون مکاں ہے کوئی
آستاں زیست کے قابل نہیں پایا جاتا
تہنیت دور تو ہیں پھر بھی کرم کب ان کا
اپنے حالات کے شامل نہیں پایا جاتا

تہنیت

# پرجاراج

رات اندھیری بیت گئی اور نور فروزاں آیا ہے
چاند ستارے ماند ہوئے سب مہر درخشاں آیا ہے
شخصی طرز حکومت بدلی ہند کی قسمت جاگ اٹھی
جمہوری گھٹا سے گلشن میں اک چشمۂ حیواں آیا ہے
پرجا کے ذریعہ پرجا پر، پرجا کے لئے ہے راج رچا
پرجا راج ہی جنتا پر اب بن کے نگہباں آیا ہے
پورس، ہرش، اشوک اور اکبر شخصی راج کے تارے تھے
ہندوستاں میں بن کے قمر جمہور کا فرماں آیا ہے
صدر امین خشک و تر ہے، صدر کفیل امن و اماں
پرجا راجہ، راجہ پرجا ایسا ساماں آیا ہے
طرز شخصی و جمہوری میں اتنی اضافی نسبت ہے
موج ہے یہ وہ بحر وسیع اور بحر میں طوفاں آیا ہے
جو چاہے ترقی کرنے کا ہر ایک کو موقع ہے حاصل
آزادیٔ کامل کے کارن ہر طرح کا ایقاں آیا ہے
شاہ و گدا سب ایک ہوئے خرسند ہوئے آنند ہوئے
ہندو مسلم شیر و شکر ہیں کس کا فیضاں آیا ہے
اپنا ملک اور اپنی حکومت دور پرائے دور ہوئے
پھول کھلے سب آزادی کے جشن گلستاں آیا ہے
انسانیت نام اسی کا مہر و محبت خلق و وفا
جائے جہاں بھی ہندوستانی سب کہیں انساں آیا ہے
پی کے شراب جمہوریت مست ہوئے ہیں پیر و جواں
بھائی بھائی ایک ہوئے ہیں دور گل افشاں آیا ہے
آئین کہن جاتے ہیں بدل قدرت کا اٹل منشا ہے یہی
تاریخ میں باب نو ہے کھلا جمہور کا فرماں آیا ہے
ہے اپنی دعا جمہوریت پروان چڑھے ہر آن بڑھے
صد شکر کہ عہد جمہوری گلزار بداماں آیا ہے

محمد عبدالسلام ذکی

# سکونِ اعظم

سنو اے راکھشسو!
ظلم کی حد تھوڑی ہے
اور کچھ دیر سسکتی ہوئی لاشوں پہ حکومت کر لو
کار غیر و دکو شرمندہ احساں کر کے
عصمت مریم و رادھا کی تجارت کر لو
اور کچھ دیر یوں ہی رقص کناں ..... جام بکف
اس زر و سیم کی پوجا کر لو
سنو اے راکھشسو!
اس سیہ رات کی پیشانی کی تحریر پڑھو
جس کے سائے میں چڑھاتے ہو گناہوں کے ایاغ
تاج شاہی کے جواہر کی کرن کہتی ہے۔ عرصۂ راحت سلطانی
تھوڑا۔

اک نئی صبح کا آغاز ابھی ہوتا ہے
سینکڑوں سال کے مفلوک اپاہج انساں
عصمت مریم و رادھا کی تجارت نہیں ہونے دیں گے
اور سسکتی ہوئی لاشوں پہ حکومت نہیں کرنے دیں گے
چھین کر پھر عمل و کار کی باگیں تم سے
اک نئی زیست کی تعمیر میں لگ جائیں گے
اور پالیں گے سکونِ اعظم .........

نور

# تصانیف رازِ الٰہی

از: جناب شیخ فرید صاحب برہانپوری

حضرت برہان الدین رازِ الٰہیؒ (برہانپوری) عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ حدیث اور فقہ میں کامل دستگاہ رکھتے
۔ جمیع علوم عقلی و نقلی اور فن شعر و عروض میں ماہر تھے۔ علوم ظاہری کی تکمیل کے علاوہ باطنی تجلّی سے بھی مجلّی تھے۔ حضرت علم اللہ کمال
عبد القدوس اور حضرت شیخ الاولیا کی خدمت میں روحانیت کے اعلیٰ مراتب طے کر چکے تھے۔ وہ کئی تصانیف کے مالک ہیں۔ ان
حسب ذیل ہمارے علم میں ہیں:—

(۱) شرح آمنت باللہ[۱]

جو ۲۴ صفحات کا مختصر رسالہ ہے۔ آمنت باللہ کی صوفیانہ رنگ میں عربی آمیز فارسی میں تشریح کی گئی ہے۔ اصطلاحات
ر عربی آیات کے استعمال سے عام ذہن سے بالاتر ہو گئی ہے۔

خدا کی حمد و ثنا اور مختصر مناجات کے بعد رسالہ یوں شروع ہوتا ہے:—

"آمنت باللہ یعنی ایمان آورد دم بخدائے کہ او بے چوں و بے چگون است۔ اشارت
آمنت باللہ ہو حقیقت ساریۃ فی جمیع الموجودات۔ بل وجود الموجودات عینہ و ظہورہ و تعیناتہ
و ذات مطلقۃ یسمیٰ بلا تعین و ظہر من التعین الاول والثانی والحقائق الالٰہیۃ"

"آمنت باللہ" کے ہر ٹکڑے کو لے کر اس کی تشریح کی گئی ہے۔ جا بجا اشعار، مثنوی، ابیات وغیرہ نفس مضمون کے
بط و لحاظ سے منقول ہیں۔

آخر میں "ھو الاول ھو الآخر ھو الظاہر ھو الباطن" کی تشریح مندرج ہے۔ خاتمہ میں مناجات کے حسب ذیل اشعار
رج ہیں:—

یارب مرا گر ماں چناں از راہ لطف و رحمت — بے شک شمارم اغنیاء، شاہان نیام در نظر
باشم تونگر دل چناں از کس نخواہم حاجتے — فارغ نشینم شاد و خوش بیرون نیایم پیش در
گر یک سخن زیں جملگی یابد قبولے نزد حق — نازم چو حسان عجم گردم چو سحبان مفتخر

تاریخ تصنیف و کتابت کی کہیں صراحت نہیں کی گئی ہے۔

---

[۱] کتب خانہ درگاہ رازِ الٰہی میں شرح آمنت باللہ کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ سید ... الدین صاحب سجادہ نشین نے ازراہ کرم نوازی وہ نسخہ مرحمت فرمایا۔ اس کے علاوہ دو قلمی نسخے ہمارے تیار کردہ ہیں۔ ... میں بھی اس کا ایک نسخہ راقم السطور کی نظر سے گزرا ہے۔

(۴) وصیت نامہ ــــ شطاریہ اذکار و اشغال اور مختلف دعاؤں پر مشتمل ایک رسالہ ہے۔ فارسی عبارت آیات و احادیث کے ٹکڑوں اور عربی لغات سے بوجھل ہوگئی ہے۔ ہر وصیت کے آخر میں نفسِ مضمون کی رعایت سے اشعار دیئے گئے ہیں۔

مخطوطہ عمدہ حالت میں ہے۔ حواشی پر جا بجا سرخ روشنائی میں اصطلاحات و عبارت کی تفہیم کر دی گئی ہے یہ اضافے بعد کے ہیں ــــ ذیل میں صرف پہلی دو وصیتیں نقل کی جاتی ہیں۔

پہلی وصیت میں ھو الاوّل ھو الآخر، ھو الظاہر ھو الباطن کی تشریح کی گئی ہے۔

"یکے بیند و یکے داند و یکے داند و یکے گوید و یکے جوید و ہرچہ بیند ازو بیند و ہرچہ داند ازو داند۔ ھو الاول ....... الخ

وصیت دوم ــــ

"خواہش کلی برداردو خود را بحق سپارد"

بیت ــــ

طلب آفت است و ارادت وبال — وجودت حجاب است وجود آن محال

تمنائے قرب و خیالِ حضور — غرور ےست نفسانی۔ اے دور دور

محبت دنیا کی مذمت کے ذیل میں لکھا ہے کہ "طالب دنیا مخنث ہے"۔
دنیا کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جواب کو بھی نقل کیا ہے۔

"ما شغلک عن اللہ تعالیٰ فھو صنمک"

طالبانِ حق اور طالبانِ عقبیٰ کے لئے مختلف وصیتیں ہیں۔ شعراء کے اشعار کے علاوہ پیغمبروں اور بزرگوں کے اقوال بھی عبارت میں منسلک کر دیئے گئے ہیں۔ بعض مقامات پر تمثیل کے ذریعہ سے تفہیم کی گئی ہے۔ خاتمہ میں ذیل کی مثنوی درج ہے۔

یارب مرا گرداں چناں از راہِ لطف و رحمت — بے شک شمارم اغنیاء شاہاں نیارم در نظر

باشم توانگر دل چناں از کس نخواہم حاجتے — فارغ نشینم شاد و خوش بیرون نیایم پیش در

راضی بفقر و فاقہ ہم باشم بہ کنج اندرون — ممنون ز منت سفلگاں مارا مگرداں تا محشر

از بہر روزی رزق ہم وقتے پریشاں دل مکن — یارب بدہ صبرم چناں جز تو نخواہم کس دگر

یارب بحق مصطفےٰ ہم انبیا ہم اولیاء — گرداں چناں این تحفہ را مقبول گرد و بحر و بر

عاشق برو جملہ جہاں اندر درون جان خود — سازند پاکاں جائے او دارند بالا چشم سر

الفت چناں دہ خلق را جز ایں نخواہد ہیچ کس — ہر جاکہ بیند عالمی مردی تعویذ او ایں مختصر

اصحابِ علم و معرفت ہر کہ بیند سوئے آں — علیم نگیرد بہر حق ہم راست سازد زود تر

چوں لہ دارم بجز عیب در من ہیچ نہ — صد عیب یا لی بے شکے ہرگز نہ بینی یک ہنر

کرم ہم ہوئی ...........لہ — برباد شد رفتار من گشتم خجل چوں منکسر

---

لہ کرم عمدہ عبارت ہے۔

گر یک سخن زیں جملگی یابد قبولے نزد حق — نازم چو حسّان در عجم گردم چو سحبان مفتخر
دارم امیدے از خدا، خواند چو ایں صاحب دلاں — بکشند از دل ایں دعا، یابم نجاتے در قبر
سرّ نازک ترگویم بشنو! اے جان پدر — در خود نگر آں وجہ مطلق نگردد در بدر

ترقیمہ کی عبارت ہے ــــ

"رسالہ وصیت نامہ من تصنیفات حضرت سلطان المحققین شیخ برہان الدین محمد رازِ الٰہی محبوب حضرت رسالت پناہی"

مناجات مذکور میں کوئی ایسی صراحت نہیں ہے جس کی بنا پر اسے حضرت رازِ الٰہی کی فکر کا نتیجہ کہا جا سکے۔ مگر آخری شعر کے متعلق جو "ثمرہ" عاقل خاں رازی نے "ثمرات الحیات" میں بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے انتساب کے خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

ثمرات الحیات کے مولف ــــ عاقل خاں رازی ــــ سے ایک مرتبہ حضرت رازِ الٰہی نے کہا کہ ان کو علم عروض و قافیہ میں مہارت نہ تھی۔ حضرت شیخ الاولیاء نے اس فن کے استفادہ کی بھی اجازت دیدی۔ ایک مرتبہ عالتِ وجد میں ان کی زبان سے مذکورہ بالا شعر صادر ہوا ــــ

"بیتے موزوں کہ از حضرتِ ایشاں در حالتِ وجدان شرفِ صدور یافتہ ایں است:

بیت

سرّ نازک ــــ الخ[1]

(۳) شرح ہیم کہانی ــــ ہیم کہانی کی شرح کے تین مخطوطے راقم السطور کے علم میں ہیں۔

(۱) ادارۂ ادبیات کا نسخہ "شرح ہیم کہانی" ــــ

(۲) حضرت مولانا سید محمد مطیع اللہ صاحب راشد کا نسخہ

(۳) مخطوطہ کتب خانہ پیر محمد شاہ (احمد آباد)

حضرت راشد صاحب کا نسخہ مکمل ہے۔ مختصر حمد و نعت کے بعد بیساختہ و بلا تمہید ذیل کے دوہرے سے آغاز ہوتا ہے[2]

ہیم کہانی کہت ہوں سنو سکھی تم کے — پیو ڈھونڈن ہوں گئی آئی آپ گنوائے

اس دوہرے اور اس کی فارسی شرح سے شروع ہو کر اسی طرح کتاب اختتام کو پہنچی ہے۔

ترقیمہ کی عبارت یہ ہے ــــ

"تمت تمام شد کارِ من نظام شد۔ ہیم کہانی من تصنیف قدوۃ الواصلین زبدۃ العارفین متبع السالکین۔ حضرت شاہ برہان الدین رازِ الٰہ قدس سرہٗ العزیز۔ مورخہ ۱۲ رماہ رجب دوشنبہ ۱۲۰۶ھ مقدسہ صورت اتمام یافت۔"[2]

احمد آباد کے نسخہ میں صرف گیارہ دوہروں کی شرح ہے۔ حضرت راشد صاحب کے نسخہ میں تقریباً پچاس دوہوں کی شرح

---

[1] ثمرات الحیات (قلمی) ورق ۵۴ الف

[2] عبارت ترقیمہ منقول از کرم نامہ حضرت راشد صاحب ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۲ء

ہے۔ آغاز دونوں کا ایک ہے۔ مگر جلد ہی فرق شروع ہو جاتا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو (حیدرآباد) کے نسخہ میں بھی غالباً پچاس دوہوں کی شرح ہے۔ احمد آباد کا نسخہ یوں شروع ہوتا ہے ۔

بن کہانی کہت ہوں سنو سکھی تم آئے ۔۔۔ پی ڈھونڈن کو ہوں گئے آپ گنوائے

یعنی عاشق بیچارہ فریادی کند وراز درد می نالد و میگوید کہ افسانہ عشق می گویم و نیز از حال خود خبری دہم۔ یاران بیا آئید و بشنوید۔ عجیب افسانہ است کہ بعقل راست نمی آید۔ و علم ازاں نیز سکوت می نماید۔ چنانچہ حضرت میر حسن سادات قدس اللہ در نزہت الارواح می فرمائید ۔

عشق را بوحنیفہ درس نگفت ۔۔۔ شافعی را در و روایت نیست ۔۔۔ حنبل از کان عشق بیخبر است ۔۔۔ مالک آگہ ازیں حکایت نیست

لو العجب مذہب الیست مذہب عشق ۔۔۔ چار مصحف در و دیک آیت نیست

مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہی یہ فیصلہ صحیح طور پر ہو سکے گا کہ شرح پیم کہانی کس کی تصنیف ہے۔ سر دست حضرت راشد کے نسخہ کی ترقیمہ کی عبارت پر بھروسہ کر کے اسے حضرت راز الٰہی کی تصنیف قرار دے سکتے ہیں۔ پیم کہانی کے آخر میں ذیل کی مناجات درج ہے۔[1]

اے جمال تو کان محبوباں ۔۔۔ عکس حسن تو جملہ خوباں ۔۔۔ جلوۂ حسن تست در ہمہ جا ۔۔۔ از تو دارند جملہ نشو و نما

چشم آنکس کہ کردہ تو وا ۔۔۔ نظرش کے فتد بغیر سوا ۔۔۔ تا کہ حسن تو گشتہ است عیاں ۔۔۔ جذبۂ عشق تست در ہمہ جاں

ہمہ ذرات مست و بے خبرانند ۔۔۔ با امیدے کہ روئے تو نگرند ۔۔۔ از مے عشق تو ہمہ مستند ۔۔۔ از خود بہائے خویش بگذشتند

حسن لیلیٰ کہ زو [illegible] مجنوں ۔۔۔ برد از کوئے عشق سوئے جنوں ۔۔۔ ہوش وامق کہ زلف عذرا برد ۔۔۔ دل و جانش بہ بیخودی بسپرد

لب شیریں کہ بود شور انگیز ۔۔۔ رنج فرہاد و راحت پرویز ۔۔۔ آں ہمہ پرتوے جمال تو بود ۔۔۔ کہ دل ہر یکے از و بربود

گرچہ چیزے نبا [illegible] ۔۔۔ در ہر آئینہ روئے خویش نمود ۔۔۔ گشت کثرت نما در آئینہ ہا ۔۔۔ مختلف گشت در معانی ہا

گاہ [illegible] ۔۔۔ روئے [illegible] ہر لباس و دا اطوار ۔۔۔ ہر طرف جلوہ گر بہ شکل دگر ۔۔۔ تو بہر شکل روئے او بنگر

گاہ [illegible] ۔۔۔ گاہ در کافران کشاید موئے ۔۔۔ گہہ بہ کعبہ گہے بہ مسجد ہا ۔۔۔ پرتوے روئے تست ایں ہمہ ہا

گاہ در بتکدہ گہہ بہ [illegible] ۔۔۔ جلوۂ خود نموری لے جاناں ۔۔۔ بت پرست برہمن و ختار ۔۔۔ از تو دانند مو بمو اسرار

گہ زدہ [illegible] ۔۔۔ ہمہ را پیروی تو [illegible] ۔۔۔ چوں کہ در اصل شاہی نگرم ۔۔۔ ہمہ چار دے تست جلوہ گرم

[illegible] ۔۔۔ کردی [illegible] خود مفتوں ۔۔۔ دل وامق بہ ہستی بردی ۔۔۔ زلف عذرا بہانہ آوردی

[illegible] ۔۔۔ شہد [illegible] ۔۔۔ ایں ہمہ جز بہانہ بیش نمود ۔۔۔ کیست جز تو کہ ربہ خویش نمود

دام پرویز [illegible] ۔۔۔ [illegible] ایں فرہاد ۔۔۔ زد بہ ہر جا رہ سعادت مند ۔۔۔ ساختہ از زلف خویش عاشق بند

کمند زلف [illegible] ۔۔۔ کردہ از جملہ بندہا آزاد ۔۔۔ من ہم اے شہ یکے گدائے توام ۔۔۔ از دل و جاں خود فدائے توام

گہہ [illegible] ۔۔۔ صلح کردم ازیں نہ آرم جنگ ۔۔۔ پردۂ ما و من زپیش ربائے ۔۔۔ بہ رخ خویش چشم من بکشائے

چوں شوم [illegible] ۔۔۔ تو در آئی بچشم من ناگہ ۔۔۔ در بہ بیچ نہ مرد ایں ہوسم ۔۔۔ طلب شیر دکم ترا زکسم

بدل [illegible] ۔۔۔ بہ صف بے دلاں پناہم دہ ۔۔۔ سر من ساز خاک در دیناں ۔۔۔ تا بیایند و بگذرند ایشاں

---

[1] حضرت مولانا سید [illegible] اللہ صاحب [illegible] (کراچی) نے اپنے ذاتی نسخہ سے مثنوی نقل کر کے مرحمت فرمائی ہے۔ مولانا ضیاء الحسن ایم اے (امراوتی) نے اپنے لیے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے نسخہ سے مثنوی مذکور نقل کر کے ارسال کرنے کی زحمت گوارا کی ہے دونوں صاحبان کی اس [illegible] کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

حرز جانم نگاہ و ایشاں کن    دل و جانم براہ ایشاں کن    خاطرم رام کن ز صحبت شاں    وقت من ساز خوش قسمت شاں

پیم کہانی کے ہندی دوہوں کے متعلق یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ سنک گوہر کے مصنف نے ان دوہوں کو دوست محمد کی تصنیف بتلایا ہے۔ حضرت راشد صاحب کا خیال ہے کہ وہ راز الٰہیؒ کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ کتب خانۂ درگاہ راز الٰہی (برہانپور) میں محفوظ ایک بیاض میں چند دوہے "من تصنیف راز الٰہی" مرقوم ہیں۔

اس مقام پر حضرت موصوف کا ایک اور ہندی دوہا نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ——

ثمرات الحیات (قلمی ورق ۵۵ ب) میں یہ دوہا نقل ہے ——

جھتنہ جہتہ کھیلیں سچ مچ ہوئے    سچ مچ کھیلے برلا کوئے

اس بحث کے ضمن میں کہ سماع کے نتیجہ میں بے خودی سے نقض طہارت لازم ہوتا ہے یا نہیں۔ حضرت موصوف نے یہ دوہا کہا کہ درحقیقت بہت کم لوگ عشق حقیقی کی منزل میں ہیں اکثر مجاز سے حقیقت کی طرف جانے کی سعی میں مصروف ہیں۔

مندرجہ بالا منظومات، اشعار اور دوہوں کے علاوہ حضرت برہان الدین راز الٰہی کا اور زیادہ کلام نہیں ملتا۔ صرف ایک مثنوی اور ملتی ہے۔

مثنوی —— کتب خانۂ پیر محمد شاہ (احمد آباد) میں ایک مخطوطہ کے سرورق پر لکھا ہے ——

"مثنوی شیخ برہان برہان پوری"

مثنوی میں کہیں بھی آپ کا تخلص درج نہیں ہے۔ صرف ذیل کے شعر میں ایک اشارہ ہے۔

عیسوی را عشق اولے خود نمود    عشق را بے سو بداں اہل خرد

حضرت راز الٰہی کے پیر و مرشد حضرت شاہ عیسیٰ جنداللہ کے دوسرے فرزند حضرت بابا فتح محمد محدث کا تخلص عیسوی تھا۔ ان کی تصنیف "مفتاح الصلوٰۃ" میں "سایہ کے اقدار" پر ایک قطعہ ہے جس کے آخر شعر میں عیسوی تخلص ہے ——

باز از حمل دو نیم ہست گر عاقلی بشنو    بہر خدا گفتم بہ تو اے عیسوی ایں نظم را

اگر مثنوی میں عیسوی شاعر کا تخلص قرار دیدیا جائے تو اسے محدث موصوف کی تصنیف تسلیم کرنا ہوگا اس صورت میں یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کاتب نے غلط انتساب کر دیا ہے۔ مگر راقم السطور کی ناقص رائے یہ ہے کہ حضرت راز الٰہی نے شیخ محمد محدث کی عشق میں بے خودی کو تمثیلاً پیش کیا ہے۔ [۱۵]

زیر نظر مثنوی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ کل ایک سو چوبن اشعار ہیں۔ یہ مثنوی ایک ایسے بزرگ کے خیال کی آئینہ دار ہے جو تصوف میں وحدت الوجود مشرب کے قائل ہیں۔ مثنوی میں جا بجا الٰہی غوامض و رموز کی تشریح ہے۔ اساسی عقائد کی تشریح کے لحاظ سے مثنوی بالکل مکمل ہے ——

مثنوی کا پہلا حصہ "بیان تنزل حق جل و علا" ہے ——

عقیدۂ صوفیہ میں ذات الٰہی جملہ نعوت و صفات و جہات سے منزہ ہے۔ اس لئے ذات بحت کے لئے کوئی لفظ دائم بھی استعمال نہیں کر سکتے ——

ذات حق چوں بود اول بے نشاں    نے تعین داشت و نے نام و نشاں

از وجودِ صرف بود وُ ذاتِ بحت — زان محرّا از حقیقت بود و نعت
از ظهور و از بطون و از صفات — او مبرّا بود از جملہ جہات
نیست از نعت و نسب آں ذات را — تا کہ او را بے نشاں گفتن خطا است

ذات بحت کہ یکسر حسن و جمال ہے۔ اپنے نمود و اظہار کی طرف متوجہ ہوئی تو اس سے ایک نور منبعث ہوا۔ یعنی احد — ذاتِ بے تعین —— نے تعینات کی طرف تنزل کیا اور مقام تعین میں آکر احدیت سے واحدیت کی حیثیت اختیار کرلی ——

انبعاثے شد ازاں دریائے جود — تا کہ ظاہر گشت از وے ایں نمود
بے نشاں اندر نشاں ہا آمدہ — لاتعین در تعین ہا شدہ

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

وحدتے ظاہر شدہ اجمال وار — قابلِ تفصیل بود ست و شمار

آگے چل کر منزلِ دوم میں اجمالِ تعین کا ذکر ہے۔ احد شئے بشرطِ اور واحد لابشرط شئے۔ منزل دوم میں تعین اسی عالم غیب الغیب کا مظہر ہے۔ اس لئے کہ اس کے ظاہر پر بھی " جامعیت صفات " اطلاق تو ہوسکتا ہے مگر انفرادی اور تفصیلی صفت کا تعین نہیں ہوسکتا۔ یہ حقیقت دراصل حقیقت محمدی ہے جو باطناً حقیقتِ ذاتِ بحت سے منبعث ہوئی ہے۔ بعد ازاں جملہ اشیاو موجودات و ممکنات کا ظہور اسی درجہ ثانی سے ہوا۔ گویا حقیقت محمدی ہی تمام اشیاء کے وجود کا باعث ہوئی ——

لولاک لما خلقت الافلاک

حضرت —— بہاؤ راز الٰہی نے اس کو یوں نظم کیا ہے ؎

جملہ شان ہائے وجودِ خویش دید — عزّ او اندر بیان تا ید پدید
ایں حقیقت شد شہِ کونین را — زور سد ہر فیض بر ہر مو سرا
ہست اینہا ہیئتِ خیرِ جہاں — " قاب قوسین " است ایمائے لذاں
ملک او ادنےٰ اشارت زان بود — نزد اہلِ حق حقیقت زان بود
وحدتش را دو صفت کامل بود — زانکہ او را ظاہر و باطن بود
باطنِ او را احد گوئیند نام — ظاہرش واحد بود عند الکرام

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

وحدتے اولا بشرطِ شئے بود — لیک ہر دو قوس شرطِ شئے بود

اسمائے حسنیٰ مختلف شیون کا ظہور اور نمود و تخلیق اشیاء کا باعث ہیں۔ حقیقت ذاتِ محمدی بمنزلہ آفتاب ہے اور جملہ مکنونات عالم مثلِ ظل کے ہے۔ اسی طرف اشارہ ہے کہ

" اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ "

یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح سایہ کو پھیلایا یعنی سایہ اگر آفتاب سے پیدا ہوا اگر تفصیلی کیفیتوں میں بتائے کتنا عریض و بسیط ہے۔ باوجود اس وسعت کے مستقل اور قائم بالذات نہیں ہے۔ اسی طرح جملہ آب و گل اور عالم ماورائے ایں عالم بھی حقیقتاً ظل ہے آفتاب محمدی کا اور اس کا رہین منت ہے ——

کنت کنزاً مخفیاً از وے خبر　　　واد اہل علم را خیر البشر
زوز با طمع یک نفس رحماں ازو　　　آں صور علمی پدید آید از و
آں نفس باشد وجود ظل او　　　قائم است با حق چوں ظل شمس تو
ظل حق نور است وجود عام او　　　ز آنکہ ظل شمس باشد ظل او
شد "الم تر الی ربک" اور اباں　　　"کیف مد الظل" از قرآں بخواں

جملہ اسماء الٰہی جن کا شمار ناممکن ہے۔ "تخلیق اشیاء" کا باعث ہیں۔ مثلاً اسم القابض سے ملک الموت کا وجود۔ اسی طرح چونکہ ہر اسم کسی شئے کا خالق و مالک ہے۔ اس لئے ہادی جنت کی طرف لے جاتا ہے اور المضل دوزخ کی طرف۔

اسم ہادی سوئے جنت می رود　　　المضل خود سوئے دوزخ می رود

چونکہ اسرار الٰہی کی غایت نہیں۔ اس لئے کہا گیا کہ

این سخن پایاں ندارد گوش کن　　　سر اسرار خدا را ہوش کن

مثنوی کا دوسرا حصہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے ــــ

یا آمد در لباس دیگراں　　　این بود گر خدا خوش بنگر داں
بے نشاں آمد نشان بے نشاں　　　ہاں مشو غافل ز روئے دید آں

خدا کا جلوہ ذرے ذرے سے ظاہر ہے۔ اس کے جلووں کی دید کے لئے طور کی تخصیص نہیں۔ عاشق کو اس کا جلوہ چاروں طرف نظر آتا ہے۔ اس حقیقت سے اہل دل ہی آگاہ ہیں ــــ

جلوہ ہا دارد او ذرات جہاں　　　رونماید عاشقاں را بے گماں
سوئے او آمد دلیل روئے او　　　چشم بکشا دید بہ بینش چار سو

اہل دل ماسوا سے فارغ ہوتا ہے۔ وہ "فانی مطلق" ہے۔ اس کی صحبت خدا کا قرب ہے۔

ہر کہ او از ماسوا فارغ بود　　　او بہ نزد اہل حق ز اہل دل بود
اہل دل را کار وانے دیگر است　　　این جماعت را نشانے دیگر است
زانکہ ایشاں فانی مطلق شدند　　　محو دریائے وجود خود شدند
با خدا الیست ہر کہ با ایشاں نشست　　　چونکہ ایشاں با خدا پیوستہ ہست

"فرقہ حق" کا اعتقاد اختیار کرنے اور "عارف اسرار حق" ہونے کی ہدایت کی ہے۔ عارف کو چار سو "جلوہ اسماء" نظر آتا ہے۔

ع　جلوہ اسماء دهد در چار سو

صرف "لقائے حق" کی خواہش ہونا چاہئے۔ جب "لقائے حق" نصیب ہو جائے تو "رضائے حق" کی طلب کی تمنا کرے۔ تسلیم و رضا سے اعلیٰ مراتب روحانی تک رسائی ممکن ہے ــــ

خواہش اندر باطن از دنیا و دین　　　جز لقائے حق نباشد بالیقین
چوں نصیبے از لقا حاصل شود　　　بایدش طلب رضائے حق شود

از رضا حاصل شود عالی مقام　　تا فنا ایں شیوہ ماند والسلام

دل "حرم خدا" ہے۔ وہ اس کی محبت کا مقام ہے۔ "عشق" حاصل ہر دو جہاں ہے ؎

رو۔ طلب کن عشق او تا ہیچ شئے　　می نیاید اندرون تو زِ نے
زاں پیمبر گفت دل حرمِ خدا است　　غیر آید در حرم ایں کے رواست
عقل آمد راہِ ما را چوں عقیل　　عشق رہبر شد بما نعم الدلیل
حاصلِ ہر دو جہاں گویم تمام　　عشق باید، عشق باید، والسلام

عشق جب ماسوا سے فارغ کر دیتا ہے تو صرف "ذکر حق" ادا ہوتا ہے اور "ذکر حق" دل سے سب خواہشات کو جلا دیتا ہے ؎

ذکرِ حق از دل بسوزد جملہ را　　می نیاید اندروں ما را سوائے

مادمن کو پردہ بناکر "جمالِ حقیقی" نے خود اپنے کو آپ دیکھا۔ اصل میں "شہود۔ شاہد و مشہود" ایک ہے۔

مادمن را پردۂ خود ساختہ　　تا بہ خود بر خود نظر انداختہ
از انا الحق دم زند منصور وار　　در شریعت خود شدہ بالائے دار
عاشق و معشوق خود بودہ است و بس　　در میاں ناید بجز او ہیچ کس
ایں سخن آخر ندارد ختم کن　　عشق دے از مشربِ خود دم مزن

مثنوی کے آخری تین شعر ملاحظہ کیجئے ؎

اعتقادِ صوفیہ گفتم تمام　　در عمل آرید یاراں والسلام
من بگویم شرِ اسرارِ ازل　　خود چگوید پیش خود آن بے مثل
اوست اول اوست آخر در جہاں　　اوست ظاہر اوست باطن بے گماں

هو الاوّل هو الآخر هو الظاهر هو الباطن

# کیفی دہلوی

از:۔ جناب صمد حمیدی صاحب

۱۹۵۵ء کے محسن ادبی سال میں جن ادیبوں کی موت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ان میں بابائے اردو دتاتریہ کیفی دہلوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ بابائے اردو دتاتریہ کیفی دلی کے باشندے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ کبھی کشمیر یعنی جنت نظیر سے یہاں تشریف لائے تھے اور پھر یہیں متمکن ہو گئے تھے لیکن ان کی وفات غازی آباد یوپی میں واقع ہوئی جو دلی سے چند میل کے فاصلے پر ہے اور یہ اس وقت کا ذکر ہے جب چند مہینے پیشتر سیلاب نے دلی اور پنجاب کو تحس نحس کرنا شروع کر دیا تھا اور جس سے انسانی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔

ان کی موت کیا واقع ہوئی بلکہ "جن کے مرنے سے مر گئی دلی" کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ ایسا ادیب ایسا شاعر ایسا محقق صدیوں میں چند ایک ہی پیدا ہوتے ہیں اس لئے آپ کی موت نہ صرف ایک بڑے شاعر، ایک محقق، ایک فن شعر و شاعری اور رموز سے واقف انسان کی موت ہے بلکہ دلی کی ان پرانی اور نئی روایتوں کے سنگم کی موت ہے۔ اس تہذیب و تمدن کی موت ہے جن کے آپ امین اور رفیق تھے۔ نہ صرف امین و رفیق بلکہ زندہ جاوید تصویر تھے۔ ایسی تصویر جن پر ماضی کے سینکڑوں نقوش دھندلائے ہوئے تھے اور جن کا حال آفتاب کی مانند درخشندہ اور تاباں تھا اور جس پر اردو ادب کو کم فخر و ناز نہیں تھا۔ اسی لئے بابائے اردو بھی کہلاتے تھے اور کبھی ڈاکٹر مولوی عبدالحق بانی انجمن ترقی اردو ہند کے دست راست اور حکومت جموں و کشمیر کے وزیر بھی تھے لیکن وزارت کی کرسی زیادہ دنوں تک آپ کو راس نہ آ سکی بلکہ جس کرسی پر آپ تادم آخر براجمان رہے وہ ادب اردو کی کرسی تھی اور جس پر آج بھی آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کی حیات میں تھا اور یہ حق آپ کا کوئی چھین نہیں سکتا۔

بابا ہونے کے ناتے اردو ادب آپ کے سانحہ ارتحال سے یتیم ہو کر رہ گیا۔ اس وقت یتیم ہو کر رہ گیا جب اسے دیس نکالا ملنے کی آوازیں شروع ہو گئیں اور جس وقت آپ کے جیسے مربی اور سرپرست کی حد درجہ ضرورت تھی لیکن اب تو یہی کہا جا سکتا ہے ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ـــــ

دتاتریہ کیفی نانے قد کے منحنی سے انسان تھے اور انھیں کوئی بھی پہلی نظر میں دیکھ کر ان کے اندر چھپے ہوئے ادبی خزینے کا تب تک اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جب تک ان کی کوئی تحریر و تقریر نہیں سن لیتا اور تب ہی اس کو ان کی تبحر علمی، فن، تحقیق و تنقید کا بھرپور اندازہ ہو سکتا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے کیفی متین فٹ ہے اور اس سے علم و ادب، شعر و سیاست، فقہ و فلسفہ، نفسیات و عمرانیات کا دریا موجزن ہے جو تشنگان علم و ادب اور تحقیق و تنقید والوں کے کام آ رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آپ جیسے صاحب علم و فن کی پیدائش ایک ایسے دیس میں ہوئی جو ناقدر دانی کرنے میں درجہ اولیٰ رکھتا ہے اور جس کی روایت کرتے رہے۔

قدردانی کرنے کی شروع ہوتی ہے۔ اس لئے آپ کی بھی قدردانی آپ کی حیات میں آپ کے ہم رتبہ نہ ہوگی اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اکثر شکوہ سنج رہا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "دلی کے موجودہ ادیب و شاعر خیر خیریت تک لینے کیلئے نہیں آتے اور تو اور اخبار، رسالے تک نہیں بھجواتے"۔ پھر اس سے بڑھ کر بدنصیبی اس کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایسے ادیب و شاعر کی جو جیسوں کا ماویٰ و ملجا ہو، قطب ہو، اس کی یہ حالت کر دی جائے کہ وہ اخبار اور رسالوں کے لئے ترستا رہ جائے دو اچھے بول سننے کے لئے ترستا رہ جائے تو موجودہ حالت میں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہاں ادیب و شاعر ہونا جرم ہے لیکن پھر بھی پتہ نہیں لوگ جوق در جوق ادیب و شاعر ہونا فخر کیوں گردانتے ہیں؟ کیوں نہیں وہ ایسی حرکتوں سے باز آجاتے۔

یوں تو کہنے کو آپ کی زندگی میں آپ کی جوبلی بھی منائی گئی اور سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی بجائے آنسوؤں اور خوشیوں کے پھولوں سے تولا بھی گیا۔ باتوں کا گلدستہ اور آہوں کی سوغات پیش کی گئیں لیکن اس سے انھیں کیا ملا؟ بجز اس کے کہ وہ تماشہ بن کر رہ گئے۔ کیونکہ جس جوبلی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، ہم چند ایک لوگوں کے سوائے دلی کی غیر ادبی ہستیاں نابود تھیں تو پھر ایسی جوبلی کو جوبلی کہنا کہاں کی دانشمندی ہوگی ___ اور میرے خیال میں تو اپنا بخود یہ ... ان کی شخصیت پر حرف ہی آیا کیونکہ جیسی ان کی بڑی شخصیت تھی اس لحاظ سے یہ جوبلی کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور بہتر تھا کہ ایسی جوبلی نہیں منائی جاتی لیکن اب جبکہ منانے والے اللہ کو پیارے ہو گئے تو ضرورت ہے کہ ان کی شاندار یادگار قائم کی جائے اور ثابت کر دکھایا جائے کہ ہندوستانی بھی اپنے ادیب و شاعر کی اتنی ہی قدر و منزلت کرتے ہیں جتنا کوئی غیرملکی اپنے ادبا و شعرا کی کر سکتے ہیں۔ یوں تو کیفیہ، بھارت درپن، واردات، منثورات وغیرہم کے مصنف کی موت غازی آباد میں جس بیکسی کی حالت میں ہوئی وہ اردو والوں کو آٹھ آٹھ آنسو رلانے اور ہم سب کی شرم سے گردنیں نیچی کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن پھر بھی ہم ایسے بے حس ہیں کہ اپنے ڈھرے کو نہیں چھوڑتے بلکہ قطب کی لاٹ کی طرح اس پر ڈٹے رہتے ہیں اور اسی میں اپنی بڑائی سمجھتے ہیں لیکن جب کوئی داغ مفارقت دے جاتا ہے تو بیکار کا شور و غوغا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں اور ظاہر ایسے کرنے لگتے ہیں جیسے ہم ہی سب سے زیادہ اس کے غمگسار، بہی خواہ، مخلص اور درد دکھ بانٹنے والے ہوں۔ لیکن حقیقت میں جب ایسا نہیں ہوتا تو پھر ایسی دل ہمراری کی باتیں کرنے اور بیکار شور و غوغا مچانے کی ضرورت کیا ہے؟ ضرورت تو اس کی ہے کہ زندگی اور زندگی کے بعد موت سے شروع ہونے والی زندگی کے لئے تعمیری کام کئے جائیں تاکہ زندگی میں بھی ادیبوں کا گھرانا بھرا پڑا اور خوشحال رہے اور وہ مر کر بھی آسودگی اور خوشحالی کی نیند سو سکیں ورنہ جیسی وہ مضطرب اور پریشان حال زندگی گزارتے ہیں اس کے پیش نظر تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مر کر بھی ناآسودہ، پریشان حال اور مضطرب ہوں گے تو اس طرح اگر بابائے اردو کے ... کیفی دہلوی بھی مضطرب اور پریشان حال ہوں تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ اور بقول کسے ... تخلیقات ابھی منظر عام پر نہ آسکی ہیں تو ضرورت ہے کہ ان کو منظر عام پر لایا جائے اور ان کے نام کی ایک اکیڈیمی قائم کر کے ان کی ہر تخلیق کو محفوظ کر دیا جائے تاکہ موجودہ کے ساتھ آنے والی نسلیں بھی نہ صرف ان کے افکار و خیالات سے شناسائی پیدا کر سکیں بلکہ ان کو راہبر و رہنما بنا کر آگے بھی بڑھ سکیں تو آیئے کہیں اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو زندہ باد ___

# غالب کا طرز و اسلوب

از: جناب نثار احمد صاحب فاروقی

(یہ ایک ریڈیائی تقریر ہے جو معمولی ترمیم اور اضافے کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی
کے شکریے کے ساتھ شائع ہو رہی ہے ——————— "نثار")

ادب میں اسلوب یا طرز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کے اسلوب اور اندازِ بیان کا تعلق ہے اسی میں ہر شاعر اپنے رنگ سے پہچانا جاتا ہے لیکن غزل کی رمزیت اور تخیل کے اعتبار سے یا عشقیہ شاعری کے میدان میں تقریباً سب شاعر یکساں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ اردو کی عشقیہ۔ غزلیہ شاعری کا بیشتر ذخیرہ ایک مخصوص ماحول اور مخصوص ذہن سے بنا ہے اور اگر کسی شاعر کے طرز و اسلوب کی بات چھیڑ جائے تو ہم اندازِ فکر یا اسلوبِ بیان سے بحث کر سکتے ہیں۔ رمزیت یا معنوی تخیل سے نہیں۔

دراصل اسلوب و انداز کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے جس سطحِ فکر پر میر، سودا، انشا، غالب، مومن اور آتش یا ناسخ سوچتے ہیں جب بھی کوئی دوسرا شاعر اسی مقام پر پہنچتا ہے اور اسی زاویے سے سوچتا ہے وہ ان کے انداز کا ہمنوا اور جب ان کے قریب قریب ہو کر گزر جاتا ہے تو ان کے اسکول کا پیرو کہلاتا ہے۔

اس تمہید سے میرا مدعا یہ ہے کہ جس طرح سادگی اور سوز و گداز میر سے، نازک خیالی مومن سے اور بانکپن آتش سے مخصوص کر دیا گیا ہے غالب کو اپنے طرز یا طرف فارسی ترکیبوں کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور مجھے اسی بات سے اختلاف ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں غالب کی شاعرانہ عظمت اور فنی سربلندی کا راز فارسی ترکیبوں کے استعمال میں نہیں اس کے اندازِ فکر کی انفرادیت اور اس کے تخیل کی سحر آفرینی میں ہے۔ غالب نے کسی مضمون کو اپنے شعر میں نظم نہیں کیا جب تک اسے پوری طرح محسوس نہ کر لیا ہو اچھی طرح سمجھ نہ لیا ہو اور اس کے ہر پہلو کو ٹھونک بجا کر نہ دیکھ لیا ہو۔ اسی لئے غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ "جو مضمون کہ متقدمین نے باندھے گئے ہیں وہ میں نے ان سے اخذ نہیں کیا بلکہ وہ خیال تو مجھے مبداء فیاض سے ازل کے دن مرحمت ہو گیا تھا متقدمین اسے زبان سے لے اڑے اور اس بات کا فائدہ اٹھا گئے کہ وہ دنیا میں مجھ سے پہلے آ گئے اور میں بعد کو پہنچا"۔

غالب کی شاعری کے عناصر ترکیبی میں اس کے تخیل کی بلندی اور تفکر کی رنگینی کے ساتھ ہی اس کی رنگا رنگ شخصیت کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اس کے شعروں میں زندگی کے نشیب و فراز اور سرد و گرم کا عکس پوری طرح اتر آیا ہے۔ یہ شعر غالب کی زندگی اور مزاج کا آئینہ ہے ــ

ہمہ بر خویشتن ہمی گریم — ہمہ بر روزگار می خندیم

اس کے علوئے فکر اور بلندئ خیال کا یہ عالم ہے کہ ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ؏ عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یا ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا ؏ یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

لیکن بایں ہمہ وہ نہ صرف خاکدانِ ارضی کے باشندوں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے بلکہ ان راہوں سے بیچ کے بن گزر کر دیکھتا ہے جن سے بنی نوع کو گزرنا پڑتا ہے۔ غالب اپنی بلند ہمتی کے اعتبار سے ایک فرشتہ تھا جس نے انسان بن کر زندگی کا تجزیہ اور تجربہ کیا جس نے دنیا کو ایک طرف "بازیچۂ اطفال" اور حیات کو حرکت سمجھا اور دوسری طرف یہ بتایا کہ زندہ رہنا محض ایک فن نہیں اعجاز بھی ہے ؎

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر ؏ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

غالب عشق کی دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کے احساس میں بلا کی لطافت، تخیل میں قیامت کی بلندی اور نزاکت ملتی ہے۔ اس کا عشق عبارت ہے جگر سوختگی سے، نالہ و آہ سے اور بے قراری و بے اختیاری سے۔ لیکن جہاں زندگی کا تقاضہ ہوتا ہے وہاں وہ کبھی فرار نہیں کرتا۔ عزم و ثبات کے دامن کو مضبوط پکڑ کر حوادث کے سامنے چٹان بن جاتا ہے۔ ایک فارسی شعر میں زندگی اور عشق کے نازک رشتے کو کتنی صفائی سے بیان کر دیا ہے ۔

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح ؏ در کارِ زندگی صفتِ سنگ خارا ایم

غالب کے کلام کی خصوصیات میں ایک خصوصیت انھیں مرزا عبد القادر بیدل سے ملی ہے۔ بیدل غالب کا محبوب شاعر ہے اور غالب نے ابتدا میں اس کے تتبع کی کوشش کی ہے۔ بیدل کی شاعری میں سب سے اہم عنصر انسانی عظمت کا اعتراف ہے اور آج کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی بیدل کا کلام جن اعلیٰ و ارفع خیالات کو پیش کرتا ہے ان کی نظیر نہیں مل سکتی۔ غالب نے بیدل سے متاثر ہو کر اس بات پر یقین رکھا ہے کہ یہ تمام مصائب اور دنیاوی آفات انسانی عظمت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں ۔

اس سوال پر بہت غور کیا گیا کہ غالب فلسفی تھے یا نہیں۔ غالب نامہ کے مصنف نے غالب کو فلسفی ماننے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ غالب کے خیالات میں تضاد ہے اور وہ کوئی عالم نظریہ نہیں رکھتے تھے اس لئے فلسفی کی اس تعریف سے خارج ہیں۔ فلسفہ کلام غالب کے مصنف نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن انھوں نے بھی غالب کو فلسفی نہیں فلسفی شاعر بتلایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے پرستار شاعر کی رنگا رنگ شخصیت میں ڈوب گئے ہیں ابھر نہیں سکے۔ غالب کو سمجھنا صرف اس کی شخصیت اور زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھ لینا ہی نہیں بلکہ اس کے افکار و خیالات کو جاننا اور اس کے ذہن کی سرحد آخر تک پہنچنا ہے۔ اس کی زندگی میں رکھ رکھاؤ، تکلف، وضع داری، بے نیازی اور قلندری کے نشانات ملتے ہیں۔ یہی اس کی شاعری کا مزاج ہے۔ اس نے زندگی کو ایک ہشت پہلو آئینہ بنایا اور اس میں کائنات کی ہر تصویر کے ہر رخ کا مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔

حیات و کائنات کے مطالعہ کی اسی کوشش نے غالب کے کلام میں مشابہ الفاظ پیدا کر دیا ہے اور خیالات کے اظہار کی کوشش نادر ہے کی۔ پیچیدگی تراکیب میں ظاہر ہوتی ہے ورنہ غالب کی توجہ الفاظ سے ہٹ کر ہمیشہ معانی کی طرف رہتی ہے۔ فنون کی نیرنگیوں میں کھو کر راستے سے باہر آنے کا راستہ نہیں ملتا اور وہاں تصوف ہاتھ آ جاتا ہے۔ اس کے سہارے وہ

وہ اس بحرِ ناپیداکنار کی شناوری کرتا ہے۔ حیات و کائنات کے بارے میں ان کے نظریئے کی تائید ان اشعار سے ہوتی ہے ۵

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرّہ بے پرتوِ خورشید نہیں
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے ۵
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے ۵

روح کیا ہے؟ سائنس، فلسفہ، طب اور مذہب نے اس گتھی کو سلجھانے میں اپنے ناخن نوچ لئے ہیں۔ غالب نے بھی روح کی ماہیت پر غور کیا ہے۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ روح ایک لطیف ترین شئے ہے، اتنی لطیف کہ وہ منظرِ مشاہدہ میں نہیں آسکتی اور کائنات اس کا آئینہ ہے۔ یہ مضمون بہت بلیغ اور دور رس ہے، تشبیہ کی ندرت دیکھئے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہار ۵

غالب نے "غمِ عشق" اور "غمِ روزگار" کو گڈمڈ نہیں کیا۔ دونوں کو سطحِ امتیاز پہ رکھا ہے۔ "غمِ عشق" انسان کی لطیف اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہے تو غمِ روزگار اس کے جذبات و احساسات کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کا وسیلہ۔ غمِ روزگار ہی جینا سکھاتا ہے، غالب اگر دہائے مرض پر اس لئے تف بھیجیں کہ وہ ایک روز مرنے اور پڑے پڑے نقشِ ہستی کو مٹائے بغیر ہی گزر گئے تو یہ غمِ عشق نہیں، غمِ عشق میں غالب جینا چاہتے ہیں۔ غمِ روزگار [illegible]

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی

یہ تمنائے مرگ غمِ روزگار سے عاجز آنے پر ہے ورنہ غمِ عشق میں جو برجستگی اور بلند تنادگی ہے وہ غالب کو "رونقِ ہستی" نظر آتی ہے اور یہاں غمِ شیریں میں فرہاد کے تاب نہ لانے پر وہ اسے مرتبۂ عشق سے کم سمجھتے ہیں ۵

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا ۵

ایک شعر میں عشق کی تعریف یوں کرتے ہیں ۵

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

اور وہ تضاد جو ہمارے ناقدوں کو غالب کے فلسفے میں نظر آتا ہے، یہاں ختم ہو جاتا ہے۔

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

عشق بھی عزیز ہے کہ رونق اسی کے دم سے ہے، زندگی بھی پیاری ہے۔ برق کی عبادت کرتے ہیں کہ اس سے زندگی میں سوز و ساز ہے اور حاصل کا افسوس بھی، وہ بہرحال حاصل ہے۔ غمِ عشق اور غمِ روزگار۔ جام و سنداں کی مثال ہے اور شیشہ و سنگ کو ایک ساتھ لے چلنا ہر ہوسناک کا بل بوتا نہیں۔ یہاں تک گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اگر غالب کے فلسفۂ عشق، فلسفۂ حیات، یا فلسفۂ کائنات میں کوئی تضاد ہے تو وہ یا ان کے احساسات کی بدلتی ہوئی حالتوں کا تضاد ہے یا غمِ عشق اور غمِ روزگار میں غالب نے جو نازک فرق قدم قدم پر ملحوظ رکھا ہے اس کے سبب سے ہے یا وہ تضاد اس لئے ہے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور ایک بڑے مفکر کے علاوہ ایک انسان بھی تھا، گوشت پوست کا انسان۔ دنیائے آب و گِل میں رہنے بسنے والا انسان!

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ غالب کا اسلوب ان کے تفکر سے عبارت ہے، الفاظ کی ظاہری شکل سے نہیں۔ اور واقع میں کسی ادیب یا شاعر کی یہ خوبی نہیں ہو سکتی کہ اس نے کسی بات کو کس طرح کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا کہا ہے۔

ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے لکھا ہے کہ کوئی بڑا شاعر الفاظ و قواعد کا پابند نہیں ہو سکتا۔ یہ الفاظ اور قواعد کی ذمہ داری ہے کہ وہ شاعر کے خیال کے پابند ہوں۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اسلوب کا تعلق مواد سے رہ جاتا ہے۔ ہیئت کی حیثیت ثانوی ہوگی۔ طرز، اسلوب یا انداز بیان کے لئے مرادف انگریزی لفظ اسٹائل (Style) ہے اور بقول حضرت اثر لکھنوی مدظلہ اس کا ماخذ ایک یونانی لفظ (Stilus) اسٹائلس رہا ہے۔ یونانی میں (Stilus) ایک آلہ کا نام ہے جس سے موم کی تختی پر حروف و الفاظ کندہ کئے جاتے تھے اور (Style) کے لغوی معنی انگریزی میں خود اس عمل کے ہو گئے ہیں جو اس آلے سے کیا جاتا تھا۔ پھر ایک مادی عمل کی تعریف سے نکل کر یہی لفظ تخیل کی تخلیق کے محاسن پر اطلاق کرنے لگا۔ اب اسٹائل کا مطلب نوک پلک سے عبارت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلوب یا طرز یا اسٹائل سے فنکار کی شخصیت ابھرتی ہے لیکن اگر وہ فنکار محض تخیل کی سرحدوں سے گذر کر تفکر اور تعقل کے میدان میں داخل ہو چکا ہے تو یہاں الفاظ یا اسلوب اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ غالب کی عظمت کو اسٹائل کی محدود تعریف محیط نہیں کر سکتی۔ اگر وہ الفاظ و علامات اور اسلوب و انداز کے چکر میں پڑ جاتے یا قواعد زبان کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دیتے تو فکر کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا کیونکہ شاعر اور بالخصوص ایک مفکر اور فلسفی کے خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ الفاظ سے اس کے خیالات مرتب نہیں ہوتے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ غالب کی شاعری میں کوئی مخصوص انداز بیان نہیں ہے لیکن اس کی انفرادیت کو شاید ان خیالات کے ادا کرنے کی ظاہری اور صوتی خوبیوں سے بھی بڑھ کر ان خیالات کی اہمیت اور ان کی دقیقہ سنجی نے بنایا ہے۔ مختصر اور واضح الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ غالب الفاظ کا نہیں معانی کا شاعر ہے۔ اس کا اسلوب بھی انداز بیان کا نہیں، بیان کا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بقول پروفیسر حامد حسن قادری "غالب نے وہ سب غلطیاں کی ہیں جو شاعری میں ہو سکتی ہیں اور شاعر سے نہیں ہونی چاہئیں" لیکن اس کے کلام کی مقبولیت میں ان باتوں سے کوئی فرق نہیں آیا اور قادری صاحب ہی کے لفظوں میں "غالب حلقۂ شام و سحر سے نکل کر جاودانی ہو گیا"۔

اس مختصر سی صحبت میں دو باتوں کی طرف اور اشارہ کروں گا۔ پہلی بات یہ کہ غالب اردو کے پہلے شاعر ہیں جس نے غزل کے امکانات سے فائدہ اٹھایا اور اسے مالا مال کیا۔ اگر غالب نے فلسفہ و تصوف کے [illegible] مسائل سے غزل کا دامن وسیع نہ کر دیا ہوتا تو ۱۸۵۷ء کے بعد آنے والی ادبی تحریکوں میں غزل کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ غالب ان شاعروں میں سب سے بڑھ گئے ہیں جنھوں نے ہماری تہذیبی زندگی سے غزل کا رشتہ مضبوط کر دیا اور اس کی جڑوں کو دور دور تک پھیلا دیا۔ غالب کے کلام کی روشن مثال سامنے نہ ہوتی تو سوا [illegible] کے کوئی بھی غزل میں حیات و کائنات کے آفاقی مسائل اتنی دیدہ وری سے باندھنے کی کوشش نہ کرتا۔

دوسری بات یہ کہ غالب نے اپنی ذہنی آزادی، انفرادیت یا "انا" کو کہیں مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ شاعری میں بھی اپنا رستہ ذرا تیز رو نکال لیتے ہیں اور دوسروں سے بچ کر نکلنے کی ادا بھی ان کی [illegible] کلام میں بھی غالب کا کوئی شعر جس میں انھوں نے کسی پرانے مضمون کو باندھا ہو [illegible] کے گھسے پٹے ہوئے مضمون میں بھی غالب کی انفرادیت نے نئی جان ڈال دی ہے۔ مثال میں یوں سمجھئے کہ قفس، دام اور مرغ اسیر اردو شاعری کے بہت پرانے (Symbols) ہیں ایسے ہی زندگی کی تلخی اور انسان کی مجبوری

مسئلہ جبر و قدر ہمارے شعرا کا لاکھوں بار آزمایا ہوا موضوع ہے۔ انھیں اشاروں میں اسی رمزیت سے غالبؔ نے بالکل نیا مضمون پیدا کر لیا۔ یعنی عام روش سے ذرا بچ کر نکلنے کا نقصان ہے سہ

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر    کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

غالبؔ کے کلام کی خوبیاں اتنی مختصر نہیں کہ انھیں دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں گنا دیا جائے میں نے صرف دو تین خصوصیات کی طرف ہلکے ہلکے اشارے کئے ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے ـــ

سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کے لئے

(ریڈیو نئی دہلی سے نشر)

---

# ادارہ ادبیات اردو کی چند مطبوعات

**اعظم الامراء ارسطو جاہ** از پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ دکن کے ایک عظیم الشان وزیر اور مدبر تھے۔ (دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

**مختار الملک سالار جنگ اعظم** از فیض محمد صدیقی۔ نواب مختار الملک دکن کے احیائے ثانیہ کے بانی ہیں۔ چھوٹی تقطیع (۴۸) صفحات۔ قیمت مجلد ۸ر

**عماد الملک** از فیض محمد صدیقی۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی عالم و فاضل ہونے کے علاوہ مدبر اور مصلح تھے۔ چھوٹی تقطیع صفحات (۶۰)۔ قیمت ۸ر

**ہندوستانی تمدن** از ڈاکٹر ایشورا ٹوپا ایم اے۔ پی ایچ ڈی رجسٹرار جامعہ عثمانیہ۔ دراوڑیوں اور آریاؤں کے تمدن کو نہایت تحقیق کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ صفحات (۲۴۰) قیمت تین روپے آٹھ آنے

**ہندوستانی قومیت کا مسئلہ** از ڈاکٹر ایشورا ٹوپا۔ سیاست اور تمدن کی بحثوں کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے بے حد مفید۔ صفحات (۵۲)۔ قیمت ۱۲ر

**اشوک اعظم** از سیدہ مہدی جعفری ایم اے۔ اس مشہور فرمانروا کے حالات زندگی اور کارنامے۔ صفحات (۵۶)۔ قیمت ۸ر

**یورپ جنگ سے پہلے** از پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ جنگ سے قبل یورپ کے چشم دید حالات اور رجحانات دلآویز پیرائے میں باتصویر۔ صفحات (۲۱۸) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

**تاریخ سیاسیات** از پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ عہد حاضر تک سیاسیات نے کیا کیا مدارج طے کئے اور مختلف ممالک اور قوموں نے اس کے ارتقا میں کیا کیا حصہ لیا۔ صفحات (۲۷۲) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

# ادب اور مذہب

از:- جناب وفا راشدی صاحب

(بزم ریاض الادب کوٹری وسندھ کے ایک پندرہ روزہ جلسہ منعقدہ ۲۳ جولائی ۱۹۵۵ء میں پڑھا گیا)

"ادب اور مذہب" اس قدر عمیق اور گہرا عنوان ہے کہ اگر اس پر کچھ تفصیل سے گفتگو کی جائے تو شاید ایک دفتر درکار ہو اور پھر بھی بات ادھوری رہ جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اتنے وسیع موضوع کو مختصر سے مضمون میں پیش کر دینا کم از کم میرے لئے تو بالکل ہی محال ہے۔ یہ چند سطریں محض ایک خفیف سی جھلک ہیں اور ان کی بھی تخلیق صرف اس لئے کی جا رہی ہے کہ اکثر و بیشتر بزرگوار اس مغالطے میں مبتلا ہیں کہ ترقی پسند ادب مارکس کے اشتراکی نظریوں کو عام کرنے کا ذریعہ ہے اور یہ نظریے مذہب کی مخالفت پر آمادہ ہیں اس لئے نوجوانوں میں بے دینی، الحاد اور کفر سامانیاں پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ بعض انتہا پسند حضرات نے اپنی لاعلمی کے باعث مذہب کو ارتقاء کا ہمنوا نہ سمجھ کر اپنا دامن بچا لیا ہے اور بڑے فخر و مباہات سے دوسروں کو بھی دعوت آزادی دے رہے ہیں لیکن یہ قطعی طور پر اس کا ذاتی فعل ہے۔ انھیں دیکھ کر "ادب جدید" کی عظیم الشان اور کامیاب تحریک سے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی اور نہ مارکس کے اشتراکی نظریوں کو دشمن دین و ایمان قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے کہ انھیں سمجھنے میں متعدد لوگوں نے دھوکا کھایا ہے اس لئے آج یہ مغالطہ پیدا ہو رہا ہے۔ عموماً خوش اعتقاد لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ جس کو ہم اپنا رہنما بنا رہے ہیں وہ دنیا کے علوم و فنون کا طالب علم ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز بالکل ناممکن ہے۔ زندگی کی مدت اس قدر قلیل ہے کہ ایک انسان کسی ایک ہی Subject میں کچھ مہارت پیدا کر سکتا ہے اور اس کے متعلق مطمئن انداز میں کوئی رائے پیش کر سکتا ہے۔ اس سے اگر یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ موضوع پر اظہار خیال کرنے والا شخص دنیا کے تمام دیگر موضوعات کا مخالف ہے تو اس سے معتقدین کی جہالت تصور کیا جائے گا اور اس رہنما کے کمال پر کوئی حرف نہ آئے گا۔

مارکس کے اشتراکی نظریوں کے ساتھ بھی یہی ستم ہوا۔ وہ دنیا میں اس وقت پیدا ہوا جب سرمایہ داریت اپنے پورے عروج پر تھی اور اس نے جس سرزمین میں جنم لیا تھا جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ باوجود متمدن ہونے کے تفریق و امتیاز کی لعنت میں شدت سے گرفتار تھی۔ لہٰذا اس کے تمام قوائے فکر اس گتھی کو سلجھانے میں مصروف ہو گئے اور اس نے اقتصادیات کے طالب علم کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ایک بے نظیر معاشی نظام پیش کیا۔ مگر اس عمارت نو کی بنیاد ہیگل کے فلسفہ پر رکھی گئی تھی مگر دونوں کے چند نقطوں میں اس قدر فرق تھا کہ بڑے بڑے صاحب نظر کو بھی پہچاننے میں مشکل پیش آئی۔ اول الذکر کے فلسفہ

کا میدانی تصور تھا اور وہ خیالات کی جنگ کو زندگی پر حاوی محسوس کرتا تھا۔ آخرالذکر تخیل کے بجائے فعل و عمل کی جنگ کا قائل تھا لیکن بنیادی طور پر دونوں میں یگانگت تھی۔ جس طرح ہیگل کا یہ خیال تھا کہ جب ایک تصور اپنی آخری حد تک پہنچ جاتا ہے تو وہیں سے اس کی ضد میں دوسرا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح مارکس بھی یہی محسوس کرتا تھا کہ جب ایک نظام کسی طور پر مسلط ہو جاتا ہے تو اس سے اس کے مخالف نظام کی تخلیق ہوتی ہے اور یہی ردعمل معاشی گتھیاں سلجھانے میں معین و مددگار ثابت ہوتا ہے۔

مذاہب عالم نے بھی اسی خیال کو ضرورت زمانہ کے لحاظ سے مختلف رنگ روپ میں پیش کیا اور ان دونوں حکما کے تحت الشعور میں انھیں کے اثرات مجتمع تھے۔ لیکن مذاہب اپنے حالات کی ناسازگاری کے باعث پوری کامیابی نہ حاصل کر سکے تھے۔ ارتقائے زمانہ نے حکمائے متاخرین کو زیادہ موقع دیا اور ان کا مشن بڑی حد تک کامیاب و کامران رہا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے حالات تھے جنھوں نے مذہب کو ابھرنے سے روکا اور دوسرے نظریوں کو کچھ سرسبز ہونے، پھلنے پھولنے کا موقع دیا تو اس کے متعلق تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مذاہب عالم کی آمد کا سلسلہ اس دور میں شروع ہوتا ہے جب انسان عقل و شعور کے اعتبار سے بالغ نہ ہوا تھا اور اس کے سوچنے سمجھنے کا میدان اس قدر محدود تھا کہ جامع تصور کائنات بھی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے تعلیم مذہب عوام الناس میں باقاعدہ طور سے فوراً نہ پھیل سکی اور کچھ بعد بگڑ گئے مذاہب اور وہ عقائد جو بعد میں آتے رہے پھر بھی بعض نکتے مبہم ہی رہے اور اب تک مبہم ہیں۔ مثلاً بدھ مت کو لیجئے گوتم نے عقل انسانی کی وسعت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی تعلیم کو دو حصوں میں منقسم کیا۔ ایک حصہ تو ان عام لوگوں کا تھا جو فلسفہ الہیات کی گتھیوں کو سلجھانے سے قاصر تھے۔ دوسرا حصہ اُن اہل نظر کا تھا جن کا شعور پختہ ہو چکا تھا اور ان کو رموز حقیقت کی باقاعدہ تعلیم دی جا رہی تھی چنانچہ یہ جماعت اب تک "مہایان" کے نام سے موجود ہے اور توحید کے متعلق بالکل وہی اعتقاد رکھتی ہے جو کسی توحید پرست مذہب کی ایجاد ہو سکتا ہے لیکن اس کی تعداد بے حد مختصر تھی۔ کثرت عوام الناس کی تھی اور انھیں گوتم نے دس تعلیمات دیئے تھے جن پر عمل کرنا سب سے مقدم تھا۔ دم آخر بھی ان سے فطرت کے راز سربستہ نہ کہے گئے بلکہ پوچھنے پر جواب دیا گیا تم اسے پوچھ کر کیا کرو گے۔ یہ آسان چیز نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ برسات کی بھیگی اور کالی رات میں اندھیری کوٹھری میں لوگ کالی بلی کو تلاش کر رہے ہیں اور وہ وہاں موجود نہیں ہے بالکل یہی حال تمہارے لئے تلاش فطرت کا ہے۔ لیکن اس جواب سے کسی کی تسلی نہ ہوئی اور بڑے بڑوں نے گوتم کو منکر وحدانیت تصور کر لیا۔ آپ نے محسوس فرمایا یہ کس بات کا نتیجہ تھا؟ عقل و شعور کی ناپختہ کاری کا۔ مسیح کے ساتھ بھی یہی ستم ظریفی ہوئی۔ اکثر و بیشتر مقامات پر انھوں نے کہا کہ انسان اور خدا کے تعلق کو بالکل باپ اور بیٹے کا تعلق سمجھو۔ اگر تم باپ کو خوش کرنا چاہتے ہو تو بیٹوں سے محبت کرو لیکن اس تشبیہ کو گہرائی کے ساتھ تو محسوس نہ کیا گیا بلکہ باپ بیٹے کے الفاظ پر زور دیا گیا اور اس قدر زور دیا گیا کہ تمام افکار اسی ایک مرکز پر سمٹ کر آ گئے۔ اسلام کے ساتھ بھی کم و بیش یہی ہوا اور خلافت بنی امیہ اور خلافت بنی عباسیہ کے دوران حکومت میں بعض اوقات ایسا شدید ردعمل ہوا جسے یاد کر کے انسانیت کانپنے لگتی ہے اور انھیں چیزوں کو دیکھ کر ہم رائے قائم کرتے ہیں کہ مذاہب عالم ناکام ثابت ہوئے۔ حقیقتاً یہ ہماری سخت غلطی ہے۔ کوئی تحریک لیجئے اس کے تمام افراد تو اپنی کمزوریاں نہیں سمیٹ سکتی اور نہ بانیان مذاہب کا یہ منشاء تھا کہ وہ مختصر سی مدت میں رسل و رسائل کی دشواریوں اور آمد و رفت کی دقتوں کے باوجود ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی تعلیم کو پھیلا دیں گے بلکہ وہ بنیاد رکھنے والوں میں تھے اور ان پر عمارت تعمیر کرنا آنے والی نسلوں کے فرائض میں شامل تھا۔ نتیجہ ایسا ہوا بھی۔

اس کے بعد ایک دور وہ آیا کہ تصوف نے انگڑائی لی اور صوفی مشرب فنکاروں نے فروعات سے گریز کر کے اصل مقصد پر زور دینا شروع کیا۔ اس دور کی تخلیق ملاحظہ فرمائیے :-

میخوار و مصحف بسوز آتش اندر کعبہ زن ساکن بتخانہ باش و مردم آزاری مکن

یہ انسان نوازی کا پہلا درس تھا اور آگے بڑھے تو دوسرا شاعر کہتا ہے۔

بہ تسبیح و عمامہ و دلق نیست عبادت بجز خدمت خلق نیست

انسان کی خدمت کو اصلی عبادت تصور کیا گیا۔ یہ تخیل کہاں سے آیا ان کی اصل مذہب ہے جو ارتقاء علم کے ساتھ ظاہر ہو۔ انسان انفرادیت کے دائرے سے نکل کر اجتماعیت کے وسیع میدان میں آیا۔ ہزاروں اشعار اس موضوع پر لکھے گئے اور آج سے بہت پہلے انسان کو بیدار کر دینے کے سامان فراہم کر دیئے گئے تھے مگر اس کے اثرات مرتب ہونے میں دقت یہ لاحق ہوئی کہ عوام الناس میں علم کی روشنی نہ پھیل سکی۔ متوسط درجہ اور اول درجہ بیشک دولت علم سے مالامال تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر ان تخلیقات کو اپنے صحیح خد و خال میں پیش کر دیا جائے گا تو ہماری لفرتی دنیا کا سارا بھرم کھل جائیگا اس لئے متوسط درجہ کے لوگوں کو برسر اقتدار کرنے کی لالچ دے کر اسی درس اخلاق کو مستقل پیشے کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ ارباب تصوف الگ الگ اپنی خانقاہیں قائم کر کے باقاعدہ دوکانداری کرنے لگے۔ فارغ البالی کا دور دورہ تھا مریدوں سے جو کچھ نذریں وصول ہوتی تھیں وہ شان و شوکت سے زندگی بسر کرنے کے لئے کافی تھیں۔ بے خبری اور بے فکری کے ساتھ وقت گذر رہا تھا۔ سائنس کی ترقی کے بعد کرامات و معجزات کا بازار ٹھنڈا ہوا۔ خانقاہوں کی آمد کم ہونے لگی۔ سرمایہ دارانہ نظام متزلزل ہوا۔ وابستگان برطرف کئے جانے لگے اور سب سے شدید دقت مڈل کلاس کے لوگوں کو پیش آنے لگی۔

اب وہ اپنی ناکامی سے پریشان ہو کر ایک نئے نظام کی تخلیق پر کمربستہ ہوئے۔ یہ کام تنہا ان سے ممکن نہ تھا۔ عوام الناس کے تعاون کی شدید ضرورت تھی۔ لہٰذا درمیانی درجہ والوں نے نہایت سیدھی سادی زبان میں نچلے طبقے کے حالات کی ترجمانی شروع کی۔ وہ تو پہلے ہی سے اپنی کیفیت موثر انداز میں بیان کرنے کے لئے مضطرب تھے۔ انداز بیان پر قدرت نہ رکھنے کے باعث مجبور ہو رہے تھے۔ جب انھوں نے متوسط طبقے کو اپنی طرف مخاطب دیکھا تو اس کی طرف کھنچے اور صدیوں سے جو تفریق چلی آ رہی تھی وہ تیزی سے مٹنے لگی۔ سوئی ہوئی جنتا نے بیدار ہونے کے بعد ہر امتیاز کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ یہیں سے ایک مشترکہ اور مساویانہ نظام کا تخیل عام ہوا۔ لیکن یہ تخیل کوئی نیا نہ تھا۔ صدیوں پہلے پیش ہو چکا تھا۔ ہاں حالات کے ماتحت پھیلنے نہ پایا تھا۔ جب فضا موافق ہوئی اور حالات سازگار پائے گئے تو ضرورت زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے وقت کے اعتبار سے تجدید ہوئی۔ ابتدا میں انسان ایک نہیں سینکڑوں طاقتوں کا پرستار تھا۔ اس سے کوئی بہتر کام محض بہتر کہہ کر نہ لیا جا سکتا تھا بلکہ ہر فعل کا بدل دینے کے لئے کسی نہ کسی نامعلوم طاقت کا تصور پیش کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ اخلاق کی درستگی، مجلسی زندگی کی خوبی وغیرہ تو بتائی گئی مگر یہ بھی کہہ دیا گیا کہ دیکھو ان کا بہترین معاوضہ تمہیں ایک طاقت سے ملے گا۔ جب تک لوگوں کے لئے اس تخیل کی ضرورت محسوس ہوئی اس وقت تک بار بار ذکر بھی ہوتا رہا اور ممکن ہے بعض خام کار لوگوں میں ہمیشہ ہوتا رہے لیکن جو لوگ جاگ چکے اور خود مجلسی و اجتماعی زندگی کی اہمیت کو سمجھ کر اسے سنوارنے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے لئے اس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ کوئی طاقت مرعوب کرنے والی پیش کی جائے یا بدلے کا لالچ دیا جائے۔ لہٰذا ادب جدید نے اپنی تمام تر قوت معاشی، ثقافتی، سماجی اور مجلسی و اجتماعی نظام کی تعمیر میں صرف کرنا شروع

.دیا مگر اس جدو جہد سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ ترقی پسند فنکار ظاہرہ پرست ہو کر بے دین ہو گئے ہیں ۔ ان کا
ق چونکہ عام ظاہر سے ہے وہ یہیں کے پروردہ ہیں ۔ یہاں کے ماحول اور یہاں کے گردوپیش سے آنکھیں چرا نہیں سکتے
ہ یہاں کے سرد و گرم سے متاثر ہو کر یہیں کی باتیں کرنا ان کا فطری تقاضہ ہے اس لئے وہ لوگ یہی کر رہے ہیں ۔ وہ ادیبا
.ر زندگی کی قدروں سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں ۔ اب وہ اپنے گردوپیش اور ماحول سے بے خبر ہو کر ایک لمحہ کیلئے
ی ہوائی قلعہ کی تعمیر میں بیجا وقت صرف نہیں کر سکتے ۔

اگر اس آپ بیتی کو الحاد ، بے دینی اور فکر سامانیاں تصور کر لئے جائیں تو سراسر ظلم ہے ۔ مذہب سے تو انسان
یا دامن بچا بھی نہیں سکتا ۔ سب سے پہلے اس نے اجتماعیت کا تصور پیش کیا ۔ اشتراکیت کی اصل بھی اس تصور کا دوسرا
ام ہے جو ارتقاء عالم اور ذہنی شعور کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے ذریعہ ترقی پذیر ہوتا گیا اور آج بھی ہمارے ادب کے
پس منظر میں پورے تنوع کے ساتھ موجود ہے اور شاید ہمیشہ موجود رہے گا ۔

---

# ادارۂ ادبیات اردو کی چند مطبوعات

**تاریخ گولکنڈہ** از پروفیسر عبد المجید صدیقی ۔ سلاطین قطب شاہیہ کی مستند اور مبسوط تاریخ ۔ گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات ۔ دکن کا تمدنی ارتقاء ۔ بادشاہوں اور امیروں کے حالات ۔ علم و فضل کی سرپرستی ۔ دوسرا ایڈیشن زیر ترتیب و طبع ۔

**مقدمہ تاریخ دکن** از پروفیسر عبد المجید صدیقی ۔ دکن کے (۲۵) ہندو و مسلمان حکمران خاندانوں کا آغاز ، ارتقا عروج اور زوال کے متعلق تاریخی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور تاریخیں بھی ہیں ۔ متوسط تقطیع ۔ (۱۴۴) صفحات ۔ قیمت ۱۲ / ۱

**میر محمد مومن** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۔ عہد محمد قلی قطب شاہ کے پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق ۔ نیا ایڈیشن زیر طبع ۔

**مال والوں کی تاریخ** از مولوی سید مراد علی صاحب طالع ۔ حیدرآباد کے ایک مشہور ہندو خاندان کا تذکرہ ۔ صفحات (۸۰) قیمت ۸ / ۱

**حیدرآباد** از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ۔ عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے سرسری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کئے گئے ہیں ۔ صفحات (۸۸) ۔ قیمت ۱۰ / ۱

**سلسلہ سوانح سلاطین آصفی** از مولوی سید مراد علی صاحب طالع ۔ حسب ذیل سلاطین آصفی کے مجمل حالات و مستند واقعات زندگی ۔

نظام الملک آصفجاہ اول ۔ نظام علیخاں آصفجاہ ثانی ۔ سکندر جاہ آصفجاہ ثالث ۔ ناصر الدولہ آصفجاہ رابع ۔ افضل الدولہ آصفجاہ خامس ۔ محبوب علیخاں آصفجاہ سادس ــــ ہر کتاب کی قیمت ۲ / ۱ مکمل سٹ (۶) کتابوں کا

# اردو شاعری میں فن پرستی کا میلان

از۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل

یہ کچھ اردو شاعری ہی پر منحصر نہیں ہے۔ ہر زبان کی شاعری ابتدا میں بہت سادہ اور رواں ہوتی ہے۔ سیدھے سادے تجربات روزمرہ استعمال کی زبان میں بیان کئے جاتے ہیں۔ جب زبان ترقی کرتی ہے اور زبان کے ساتھ اہل زبان کی قدرتِ اظہار ترقی کرتی ہے تو زبان کا استعمال فن بننے لگتا ہے۔ اس لئے کہ بڑی سی بڑی زبان کا لفظی سرمایہ بھی مشاہدہ و حقائق کی گتھیوں میں کام نہیں دے سکتا۔ زبان تو محض چند عامۃ الورود تجربات کے اظہار کی حد تک کام آسکتی ہے۔ تخیل اور انفرادی تجربوں اور افکار و احساسات کی پیچیدگیوں کے اظہار کے لئے فن اظہار کا ایسا طلسم باندھنا پڑتا ہے کہ لفظ سحر سامری کی طرح بولنے لگے۔ اس فن کو فن بلاغت کہا جاتا ہے۔ جس کے کچھ اسالیب متعین ہو گئے ہیں اور صنائع بدائع کہلاتے ہیں۔ ان صنعتوں میں سے بیشتر رسمی اور روایتی بن گئے ہیں لیکن اس فن کے بیسیوں اسالیب ایسے بھی ہیں کہ فن کے ان گوشوں کا اب تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا۔ بلاغت گویا فن قوتِ اظہار کو ترقی دینے کی غرض سے بنا اور بنتا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ ہر بڑا شاعر اپنی شیوا بیانی سے اس فن کو ترقی دیتا جاتا ہے۔ لیکن نقادان بیان نے یہ تمام فنون جن کو نادر الکلام شعراء نے اظہار کی معاونت کے لئے اختراع کیا ہے کم سوادوں نے اس فن کو مقصد بنا کر رٹنا شروع کر لیا اور ادب برائے ادب کا نظریہ اسی کوتاہی کی پردہ پوشی کے لئے وضع کیا گیا۔ فن پرستی کا یہ میلان کبھی انفرادی طور پر ظاہر ہوتا ہے اور کبھی اجتماعی طور پر جیسے داؤد اورنگ آبادی یا سودا کی فن پرستی کا رجحان انفرادی تھا۔ اس کے برخلاف لکھنؤ اسکول کی فن پرستی اجتماعی تھی۔ یہ ادبی رجحان جب کبھی اجتماعی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو اس کے متعدد اسباب پس پردہ کام کرتے رہتے ہیں جیسے عیش پسندی، حیات گریزی، تہذیبی انحطاط، تکلف پسندی، ظاہر پرستی وغیرہ۔ ویسے دیکھئے تو لکھنؤ اسکول کی شعری روایات کا واحد سرچشمہ سودا کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر لکھنؤ کی معاشرت اس درجہ تکلف پسند نہ ہوتی تو شاید سودا کا اثر اس قدر ہمہ گیر نہ ہوتا۔

فن پرستی کا یہ میلان ہر صورت میں شاعر کی کم سوادی کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اکثر صورتوں میں تو یہ میلان شاعر کی بزدل جیسی طبیعت کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایسی طبیعت خارجی موضوعات کی شاعری میں اور خصوصاً رجائی جذبات و احساسات کی ترجمانی میں اندھی ہوتی ہے مگر داخلی دنیا کی باتیں اس سے بن نہیں پڑتیں۔ مگر وہ جو اردو شاعری پر غزل کا قبضہ رہا ہے تو اس غزل معاملہ بندی نے بہت سوں کو بگاڑا۔ یعنی ایسے بہت سے شاعر جو طبعاً خارجیت پسند تھے۔ مذاق عامہ کی خاطر

جوڑ توڑ پر صرف کرنے لگے۔ اس کی ایک داخلی شہادت یوں بھی ملتی ہے کہ ایسے صنعت پسند شعرا کی غزل میں بیشتر خارجی زندگی کے تجربات ہی ملتے ہیں۔ محبوب حسن سے اپنی اثر پذیری کا حال بیان کرنے کے بجائے وہ محبوب کے آب و رنگ، خط و خال، قد و قامت زلف و گیسو اور انگیا کرتی کی ایک ایک جزوی تفصیل بیان کرتے جاتے ہیں۔

**داؤد** | فن پرستی اور لفظ پرستی کا یہ رجحان ایک مستقل ادبی رجحان کی حیثیت سے پہلی مرتبہ داؤد اورنگ آبادی (وفات ۱۱۶۸ھ) کے یہاں ملتا ہے۔ یوں تو محمد قلی قطب شاہ نے بھی تمام لفظی اور معنوی محاسن برتے اور اپنا زور دکھانے کے لئے صنعتوں کو ساتھ برتتے ہیں اور محمد قلی سے داؤد تک تقریباً سبھی شعرا نے صنعتوں سے شاعری کو زینت دی ہے مگر کسی نے بھی شاعری کے کمال کو صنائع بدائع پر منحصر نہیں کیا۔ داؤد نے پہلی مرتبہ لفظی بازیگری کو شاعری کا مقصد بنایا۔ اسی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ داؤد پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعری شاعری کے لئے کی اور فن کو فن کے لئے برتا اور اس طرح ایک نئے ادبی رجحان کا آغاز کیا جو ہر زمانے میں کسی نہ کسی روپ میں اردو شاعری کے ساتھ چمٹا رہا۔ داؤد سے اردو غزل میں صرف فن پرستی کا آغاز ہوتا ہے بلکہ داؤد ہی کے ہاتھوں غزل میں خارجیت کو بھی جگہ ملی اس لئے کہ یہ دونوں میلانات ایک ہی انداز طبع سے جنم لیتے ہیں۔ داؤد کے فنی وضاحت کے لئے ان کی ایک پوری غزل پیش کی جاتی ہے۔

جب سوں دل محو زلف یار ہے — چشم میری ابر گوہر بار ہے

دل اور چشم میں مراعاۃ النظیر ہے۔ زلف اور ابر میں تشبیہی ربط ہے۔ گوہر بار میں ابر اور زلف دونوں کی رعایت ہے۔

جس نے دیکھا دور پیو کی چشم کا — مست ہے، بے ہوش ہے، سرشار ہے

دور میں دور ساغر کی رعایت رکھی ہے۔

اے سجن مجھ درد سر کا کر دوا — سر پہ تیرے صندلی دستار ہے

دستار کا رنگ صندلی ہے اس لئے صندل کی رعایت سے درد سر کا مضمون پیدا کیا ہے۔

گرد تیرے صفحۂ رخسار کے — سبزۂ خط جدول زنگار ہے

پورا شعر ایک تشبیہ پر مبنی ہے اور صرف اسی تشبیہ کی خاطر کہا گیا ہے۔

تجھ گلی کی خاک اے گل رو مجھے — باغ ہے، فردوس ہے، گلزار ہے

گل رو کی رعایت سے گلی کی خاک کو باغ فردوس اور گلزار کہا ہے اور گل گلی و گلزار میں تجنیس ہے۔

کیونکہ ترشے چشم کی پرہیز کوں — چشم تیری اے صنم بیمار ہے

چشم کی صفت بیمار ہے اور بیمار کی رعایت سے پرہیز کا مضمون تراشا ہے۔

توتیا ہے چشم کو خاک کو تجھ — نور ایماں گر تجھے درکار ہے

توتیا، خاک، چشم، نور، ایمان میں مناسبات ہیں۔

گوش رکھ سنتا ہے اے داؤد یار — ہر سخن تیرا در شہوار ہے

گوش کی رعایت سے سخن کو در شہوار سے تشبیہ دی ہے بلکہ استعارہ بنانے کا جواز شعر کہا گیا ہے۔

آخری دو دو شعروں کو چھوڑ کر بقیہ پوری غزل میں زلف یار، پیو کی چشم کا دور، صندلی دستار، چشم بیمار وغیرہ کے مضامین ہیں شاعر کی نظر حسن کے مادی اور خارجی پہلو سے آگے بڑھ کر حسن کا ہے پایانی میں گم نہیں جاتی۔

**ایہام گوئی** سراج اور داؤد کے بعد دکن میں شعر و سخن کا غلغلہ کم ہوتا گیا اور دکن کی بجائے شمالی ہند میں اردو شاعری کو فروغ ہونے لگا۔ شمالی ہند کے سیاسی اور سماجی حالات غزل کو بہت راس آئے۔ اس لئے وہ صناعت کاری اور لفظ پرستی کا رجحان جو داؤد سے شروع ہوا تھا شمالی ہند کی غزل نے اس رجحان سے کوئی اثر قبول نہیں کیا البتہ شمالی ہند میں غزل کے رواج پاتے ہی ایہام گوئی کے ایک نئے رجحان سے غزل دوچار ہوئی۔ شعرائے دہلی نے اپنے داخلیت پسند مزاج کے باوجود اس صنعت کے استعمال میں اتنا مبالغہ کیا کہ شاعری ایہام گوئی کی مترادف ہو کر رہ گئی۔ لیکن مظہر جان جاناں اور شاہ حاتم جیسے پختہ مشق اور صاحب ذوق اساتذہ نے بہت جلد زبان کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ترک ایہام گوئی کی تحریک بھی شروع کی۔ اس لئے شاعری کے آغاز کے دس پندرہ سال کے اندر ہی یہ صنعت ترک کر دی گئی۔

**سودا** دِلّی اسکول محض اپنی داخلیت، جذبات نگاری، اپنی سبک زبان اور رواں دواں اسلوب بیان کی وجہ سے ایک اسکول بنا۔ میر اس اسکول کا سب سے بڑا شاعر ہے لیکن حیرت ہے کہ میر کا ہمعصر شاعر سودا بھی دلی ہی کی سرزمین سے اٹھتا ہے۔ دلی ہی کی ادبی فضا میں پروان چڑھتا ہے لیکن اپنی خارجیت پسند طبیعت کی وجہ سے مرثیہ، قصیدہ، ہجو اور مثنوی کی طرف زیادہ توجہ کرتا ہے۔ مگر مذاق عامہ کی خاطر وہ غزل کہنے پر بھی مجبور ہوتا ہے اور غزل چونکہ اس کے بس کی شاعری نہیں تھی اس لئے غزل کو اپنی طبیعت پر ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے یہی نہیں بلکہ اپنی غزل کا سکہ جمانے کے لئے فنی داؤ پیچ سے کام لینے لگتا ہے جیسے مشکل قوافی کا انتخاب اور مشکل قافیہ کے ساتھ ایسی انمل بے جوڑ ردیف کا التزام کہ قافیہ اور ردیف میں مشکل سے ربط پیدا کیا جا سکے اور ایسی مشکل زمین میں قدرت بیان دکھانے کے لئے دو غزلہ سہ غزلہ کہنے کا رجحان جو بعد کو دبستان لکھنؤ کی خصوصیت بن گیا تھا اس کی ابتداء بھی سودا ہی نے کی۔ شب چار دن ایک، سب چار دن ایک، تنگ اور نمک، رنگ اور نمک، حباب در تہہ آب، نقاب در تہہ آب (خشت شکست، زشت شکست) جیسے بے ربط قافیہ و ردیف میں ربط پیدا کرنے کی کوشش سودا سے پہلے نہ دکن میں نظر آئی ہے نہ دلی میں اور طرفہ یہ کہ ایسے فنی پینتروں کے بل پر وہ میر جیسے سادہ و پرکار شاعر کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ میر کی طرح پر غزل کہتے ہوئے اس کے مقطع میں غیر شعوری طور پر اپنے تصور شعری کو واضح کیا ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ — ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

دیکھا آپ نے سودا کو وہ میر کا مقابلہ غزل در غزل سے کرنے چلے ہیں یعنی وہ جادو کا توڑ پھری گت کے سے کرنا چاہتے ہیں۔ سودا نے فارسی کے شعرائے متاخرین صائب، کلیم اور غنی کاشمیری کے اتباع میں تشبیہی یا تمثیلیہ طرز بیان کو بھی رواج دیا جو عموماً اخلاقی اور حکیمہ مضامین کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس صنعت کو صنعت مذہب الکلامی بھی کہا جاتا ہے جس میں پہلے ایک دعویٰ کیا جاتا ہے اور پھر اس کو ایک مثال سے ثابت کیا جاتا ہے۔ جیسے ــــ

کریم وہ یہ تواضع کرم جو کرتے ہیں — ثمر نہ پھیر کے دے ہے جو ہو ثمر در شاخ

استقامت ہے عجب شئے نہیں جس کو لغزش — نخل کا پاؤں زمیں پر نہ پھسلتے دیکھا

ایسے شعر سن کر سامع تھوڑی دیر کے لئے دو مختلف اشیاء کی وجہ شبہ کے علم سے متحیر تو ہو جاتا ہے لیکن ایسی تحیر خیزی شاعر کا کام نہیں شعبدہ گر کا کام ہے۔ اردو غزل میں اس صنعت کا استعمال بھی پہلی مرتبہ سودا ہی نے کیا ہے۔ ان کے بعد اور غالباً انہیں کے اثر سے ناسخ اور ذوق نے خصوصیت کے ساتھ اس طرز کو فروغ دیا۔

**دبستان لکھنو** | اردو شاعری میں فن پرستی کا جو میلان سوداؔ نے پیدا کر دیا تھا اس نے بڑھتے بڑھتے دبستان لکھنو کی صورت گری کی۔ خارجیت پرستی، لفظ پرستی، صنعت پرستی اور فن پرستی کے وہ تمام رجحانات جن کو ہم لکھنؤ اسکول سے تعبیر کرتے ہیں یہ سب سوداؔ ہی کا فیضان ہے۔ مگر سوداؔ پھر بھی ہمہ رنگ شاعر تھا۔ اس کی غزل پر میرؔ و دردؔ کی داخلیت کی پرچھائیں بھی پڑی ہیں۔ لیکن شعرائے لکھنو نے سوداؔ کی شاعری کو پھٹک پھٹک کر دلی اسکول کی ہر روایت کو الگ کر دیا اور سوداؔ کی ان تمام بدعات کو چھانٹ لیا جو دلی کی شعری روایات کے منافی تھیں اور اپنی طرف سے فحش جذبات کی کثافت، بیجا مبالغہ اور حد درجہ کی رعایت لفظی کا اضافہ کر لیا۔ اس طرح لکھنؤ میں اردو شاعری سب کچھ بن گئی مگر شاعری باقی نہیں رہی۔

**ذوق** | مغلیہ دربار کے زوال کے ساتھ ساتھ دلی میں اردو شاعری کا غلغلہ بھی کم ہوتا گیا اور لکھنو کی لکھ لٹ لوا لی نے دلی کے تمام اہل کمال کو سمیٹ لیا تھا اور یہاں میرؔ و میرزاؔ کی زندگی میں ایک نئے انداز سخن کی نیو پڑ گئی تھی۔ ناسخؔ اور آتشؔ کے زمانے تک یہ انداز سخن ایک مستقل اور منفرد دبستان سخن بن گیا اور اس دبستان کی روایات شعری کا ایسا سکہ بیٹھا کہ دلی کے بچے کچے شعرا بھی ناسخ کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ نے تو لکھنو سے بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ بگڑے۔ مگر انتہا تو یہ ہے کہ غالبؔ جیسا (          ) بھی ابتدا میں ناسخؔ کے اثر سے بچ نہیں سکا۔ شاہ نصیرؔ کی طرح ذوقؔ نے بھی لکھنو اسکول سے استفادہ کیا لیکن ذوقؔ کی طبیعت میں بڑا گداز اور بڑی شرافت تھی۔ وہ ناسخؔ سے استفادہ کرتے ہوئے بھی ناسخؔ نہیں بن سکتے تھے۔ اس لئے لکھنو کی خارجیت اور فن پرستی اور ان کی طبیعت کے امتزاج نے ذوقؔ کے فن کو ایک نیا رنگ دے دیا یعنی فن پرستی کا جو میلان شعرائے لکھنو کے یہاں سنگلاخ زمینوں، بسیار گوئی اور صناعت کاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اسی میلان نے ذوقؔ کو زبان کے حسن کی طرف متوجہ کیا اور وہ روزمرہ اور محاورہ کی شاعری کرنے لگے جیسے ایک غزل کی ردیف ہے "اٹھاتے"۔ اس ردیف کے ساتھ دوسرے الفاظ ملانے سے جتنے محاورے بن سکتے ہیں یہ تمام محاورے ذوقؔ نے اپنی غزل میں کھپائے ہیں اور اس کی ممکنہ کوشش کی ہے کہ کوئی محاورہ گندھنے سے نہ رہ جائے۔ اسی طرح وہ روزمرہ کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ اسی لئے تو آزادؔ ذوقؔ کی شاعری کو اردو زبان کا دستور العمل کہتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے یقیناً ذوق کی شاعری بڑی قیمتی متاع ہے۔ اس کے علاوہ ذوقؔ نے آیت، روایت، کہاوت، ضرب المثل اور تلمیحات سے بھی خصوصیت کے ساتھ اپنی شاعری کو زینت دی۔ شعرائے لکھنو کا فن پرستی کا میلان جو سنگلاخ زمینوں میں ٹھوکریں کھاتا اور صنائع بدائع کے کھلونوں سے دل بہلاتا رہا تھا ذوقؔ کے یہاں آ کر کسی قدر سنبھل گیا ہے۔ جو فن پرستی محض بے جان صناعی بن کر رہ گئی تھی ذوقؔ نے اس کو روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی دے دی اور روزمرہ زندگی سے ضرب الامثال اور تلمیحات لے کر غزل کے مردہ جسد میں زندگی کے کچھ آثار پیدا کر دیئے۔

**سوزؔ** | لکھنؤ اسکول کے رجحانات ابھی متعین نہیں ہوئے تھے کہ اس زمانے میں میرسوزؔ نے غزل گوئی کا ایک نرالا اسلوب نکالا۔ جس کو معاملہ بندی کہا جاتا ہے۔ وہی ہوس کارانہ جذبات اور بازاری معاملات محبت جو لکھنوی شاعری کے پسندیدہ موضوعات ہیں وہی موضوعات سوزؔ کے بھی ہیں لیکن انھوں نے بول چال کی زبان اور بول چال کے تیور کے ساتھ شعر گوئی کا ایسا دلکش اسلوب اختراع کیا جس کو جراءتؔ اور داغؔ نے ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بات یہ ہے کہ سوزؔ دلی سے آئے تھے اور جذبات نگاری کا مزاج لے کر آئے تھے اور یہاں لکھنؤ میں مذاق سخن کا جھکاؤ صنعت پرستی اور فن پرستی کی طرف تھا وہ یہ کچھ تو اختیار نہیں کر سکتے تھے البتہ وہ اپنی جذبات نگاری کو لکھنوی تہذیب کی سطح پر لے آئے اور بجائے فن پر زور صرف کرنے کے

بولی چال کی زبان کے چٹخارے سے اہل لکھنؤ کی ضیافت کرنے لگے۔

اک کہنے کہ بس بس چونچ بند کر / وفا لایا ہے دت تیری وفا کی

سوز نے دامن جو نہی پکڑا تو وونہی چھین کر / کہنے لاگا ان دنوں کچھ زور چل نکلا ہے ہشت

بس جی کھاؤ نہ قسم جانتے ہیں / جیسے تم ہو تمہیں ہم جانتے ہیں

غرہ یہ اپنا بڑا ہے گھمنڈ ناصح کو / جو اس کے روبرو بولے تو میں سلام کروں

جرأت | یہی معاملہ بندی اور مکالماتی اسلوب جرأت کے یہاں اور بھی شوخ اور رنگیلا ہوگیا ہے۔ زبان بھی زیادہ منجھی ہوئی ہے۔ سوز کی معاملہ بندی بولی ٹھولی ہے۔ آگے نہیں بڑھ سکی مگر جرأت فنی دکھاؤ اور اسلوب کے بانکپن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اس لئے ان کو سوز اور داغ کے درمیان کڑی کہنا چاہئے۔

منہ نہ کھلواؤ مرا چپ کے رہو جانے دو / آپ چپ چپ کے نہیں جاتے ہیں اغیار کے پاس

گالی کسی کو دے کے کہا وہ کہتا تھا مجھ سے شوخ / میں کیا کروں کہ تو نے بگاڑا ہے خو میری

داغ | داغ دہلوی نے لال قلعہ میں آنکھیں کھولیں جہاں استاد ذوق کی زبان شاعری کی مترادف ہوگئی تھی۔ داغ کے سرچشمہ فیض بھی وہی تھے لیکن داغ کی طبیعت میں استاد کے برخلاف شوخی شگفتگی تھی اس لئے انھوں نے قلعہ معلی کی کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان میں معاملہ بندی شروع کر دی۔ یہ وہی طرز سخن ہے جو پہلی مرتبہ سوز کی غزل میں ملتا ہے۔ جرأت نے اس طرز کو جلا دی بہت ممکن ہے کہ داغ نے تمام و کمال جرأت سے استفادہ کیا ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ داغ نے اپنی چٹیلی زبان سے اس طرز کو اس قدر مقبول بنایا کہ یہ طرز ان کا طرز خاص سمجھا گیا۔ داغ کی زبان اس قدر شوخ، طرار، گاتی ناچتی اور تھرکتی ہوئی زبان ہے کہ سننے والا فقط زبان کے اسی جادو میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ ذوق نے روزمرہ اور محاورہ کو اس طرح برتا جیسے وہ روزمرہ اور محاورہ ہی کی خاطر شعر کہتے ہیں۔ داغ بھی وہی فن برتتے ہیں مگر اس طرح کہ روزمرہ اور محاورہ ان کی زبان کا زیور معلوم ہوتے ہیں اور پھر ان کے بولنے کا انداز اس قدر رنگیلا اور البیلا ہوتا ہے کہ " از کمین گاہ جستجوئی غزال" کی تشبیہ غالب سے زیادہ داغ کے اشعار کے لئے معلوم ہوتی ہے۔ سننے والا ان کی زبان کی لٹک ہی میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ ان کی فن پرستی کی طرف توجہ جانے ہی نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ داغ کے سینکڑوں شاگرد ہوئے اور ان میں بیشتر نامور بھی ہوئے مگر کوئی داغ کی شہرت کو ماند نہ کرسکا۔ اس لئے کہ شاگردوں نے استاد سے سب کچھ سیکھا مگر زبان و اسلوب کو معشوق کی ادائیں دینے کا یہ فن کسی نے نہیں سیکھا۔ تاہم داغ کے فیضان سے برجستہ گوئی، شوخی، ادا بندی، محاورہ بندی، روزمرہ کا التزام یہ تمام خصوصیات آج تک ان کے سلسلۂ تلامذہ کی غزل کے محاسن ہیں۔

صفی | داغ کے نامور شاگردوں کی فہرست بھی بہت طویل ہے جن میں غالباً سوائے نوح ناروی کے اب کوئی بقید حیات نہیں ہے اور نوح بھی شاعر کی حیثیت سے داغ کے سربرآوردہ شاگردوں میں کچھ ایسا امتیاز نہیں رکھتے بلکہ جس طرح داغ کے اکثر شاگردوں کے یہاں داغ کے طرز سخن کی نقالی ہے۔ یہی انحطاط پذیر طرز نوح کا بھی ہے۔ البتہ صفی اورنگ آبادی مرحوم داغ کے سلسلۂ تلامذہ کے آخری بڑے شاعر تھے۔ ان کو داغ کا فیضان کیفی کے توسط سے پہنچا اور بقول پروفیسر سرور داغی کو ... ... تک پہنچا۔ شاید اسی بالواسطہ اثر پذیری نے صفی کو داغ کا چربہ بن جانے سے بچا لیا یعنی صفی داغ سے مستفید ہوتے ہوئے بھی صفی کی غزل معلوم ہوتی ہے۔ صفی کی اس انفرادیت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود کیفی داغ کا

جذبہ نہیں تھے۔ ان میں داغ کے البیلے پن کے ساتھ فکر و احساس کی ایک انفرادیت بھی تھی اور یہ وہ شعرا ادب کے نئے تصورات سے بے بہرہ نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ صفی کے توسط سے داغ کا جو فیض صفی تک پہنچا وہ ان کی انفرادیت کو محو نہیں کر سکا۔ سب سے بڑی وجہ تو یہی تھی کہ صفی کی شخصیت داغ سے مختلف تھی۔ داغ بڑے شوخ و شنگ اور تیز و طرار آدمی تھے مگر داغ کے برخلاف صفی کی شخصیت صاف گوئی، صاف دلی، صاف معاملگی، بے تکلفی، احساس کمال سے پیدا ہونے والی بے دماغی اور طبیعت کی بے اعتدالی جیسی خصوصیات سے عبارت تھی۔ ایسی انفرادی شخصیت کے ساتھ وہ صرف صفی بن سکتے تھے اور صفی ہی بنے۔ اسی لیے فن پرستی کا وہ میلان جو مختلف روپ بدلتا ہوا داغ کے یہاں فقط زبان کا تیر چٹخارہ بن گیا تھا۔ صفی کے یہاں یہ چٹخارہ ذرا ماند پڑ گیا ہے۔ داغ کے اثر سے وہ بھی روزمرہ اور محاورہ پر زور صرف کرتے ہیں لیکن ان کا اسلوب بیان داغ کے اسلوب سے مختلف ہوتا ہے۔ صفی کی طرز میں سنجیدگی، گہرائی اور کسی قدر شگفتگی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس طبیعت کا ایک ذرا نقصان یہ ہوا کہ فن پرستی کا جو میلان داغ کی جادو بیانی میں چھپ گیا تھا پھر صفی کے یہاں پوست کندہ ہو گیا ہے۔ وہ روزمرہ اور محاورہ کے علاوہ ذوق کی طرح ضرب المثل، کہاوت، رسومات اور معتقدات کا سہارا بھی لیتے ہیں لیکن یہ ممکن تھا کہ اس سے بھی ان کا فن پرستی کا میلان اتنا زیادہ واشگاف نہ ہوتا مگر ان کے یہاں رعایت لفظی برتنے کا وہ میلان بھی آ گیا ہے جو داؤد اورنگ آبادی کے یہاں پہلی مرتبہ اس قدر شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ ابتدا میں داؤد کی ایک پوری غزل اور اس کے فن کا تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے۔ اب صفی کی ایک طویل غزل کے ابتدائی چند شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

عاشق رکھیں گے آنکھ تیری ہر نگاہ پر      گمراہ آہی جائیں گے اک روز راہ پر

آنکھ رکھنا محاورہ ہے۔ آنکھ رکھنا اور نگاہ میں رعایت لفظی ہے۔ دوسرے مصرع میں راہ پر آنا محاورہ ہے۔ گمراہ اور راہ پر آنے میں رعایت لفظی ہے۔

عاشق نہیں سمجھتے یہ معشوق آہ پر      بے دید آنکھ رکھتے ہیں ہر دم نگاہ پر

عاشق اور معشوق میں تضاد ہے۔ بے دید آنکھ اور نگاہ میں رعایت لفظی ہے۔

اس انجمن میں ایک کو ہے ایک تاکتا      جب دیکھیے نگاہ لگی ہے نگاہ پر

نگاہ لگنا محاورہ ہے۔ تاکنا دیکھیے نگاہ میں رعایت لفظی ہے۔

عاشق نے ان سے آنکھ چرائی برا کیا      پکڑا گیا یہ چور فقط اشتباہ پر

آنکھ چرانا محاورہ ہے۔ آنکھ چرانا اور چور میں رعایت لفظی ہے۔

ممکن نہیں کسی سے علاج اس کی چوٹ کا      جو گر گیا ہو چڑھ کے کسی کی نگاہ پر

نگاہ پر چڑھنا محاورہ ہے۔ علاج، چوٹ، چڑھنا اور گرنا میں رعایت لفظی ہے۔

پوری غزل کا یہی رنگ ہے۔ داؤد اورنگ آبادی اور صفی اورنگ آبادی کی غزلوں کے تقابلی مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فن پرستی کا میلان آج بھی صفی کے یہاں اسی روپ میں ہے جس روپ میں وہ دو سو برس پہلے ظاہر ہوا تھا۔ لیکن صفی اس ادبی تحریک کے آخری بڑے علمبردار تھے۔ اس طرح اردو شاعری اورنگ آبادی کے ایک شاعر سے فن پرستی اور لفظ پرستی کے میلان سے روشناس ہوئی اور دو سو سال کے بعد اورنگ آبادی کے ایک شاعر پر یہ میلان ختم ہو گیا۔

# لفظ شماری

از جناب حسن الدین احمد صاحب

کسی زبان کا ادب بے شمار شعبہ جات پر حاوی ہوتا ہے اور ہر ایک شعبہ میں الفاظ کا ذخیرہ شمار سے فزوں تر ہوتا ہے۔
اس لئے کسی زبان کے جملہ ادب کی حد تک لفظ شماری ناممکن امر ہے۔ اور اگر یہی لفظ شماری جزوی ہو تو نتائج ناقابل اعتبار
ہونے کا احتمال رہتا ہے۔ لفظ شماری کو زیادہ سے زیادہ سائنٹفک اور حقیقت سے قریب لانے کے لئے ادب کی شعبہ بندی
کی جاتی ہے اور ہر ایک شعبہ کے نمائندہ ادب کا انتخاب کیا جاتا ہے اور پھر اس انتخاب شدہ ادب کی حد تک لفظ شماری کی جاتی ہے۔
لفظ شماری کی بڑی اہمیت ہے ظاہر ہے۔ موجودہ زمانہ اس امر کا متقاضی ہے کہ ہر کام کی بنیاد تحقیق پر ہو اور
ہر بیان دلیل سے آراستہ ہو۔ ہر زبان میں ہزاروں الفاظ ہوتے ہیں۔ ہم کو ان کی صحیح تعداد سے معنی اندازہ ہونا چاہئے
اور ہمیں یہ معلوم ہے بعض الفاظ زیادہ اہم ہوتے ہیں اور بعض کم اہم۔ بعض کم استعمال ہوتے ہیں اور بعض زیادہ۔ ہم کو اس سلسلہ میں
یہ بھی جاننا چاہئے کہ اس لفظ کی کیا حیثیت ہے۔ عام طور پر چند ہی الفاظ ہوتے ہیں جو تکرار کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں
ہم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں، ان کی کیا تعداد ہے اور ہر لفظ کا کیا مقام ہے۔ اگر ان بنیادی امور
سے متعلق ہم کو آگاہی محض قیاسات ہوں اور یہ معلومات کسی ظن یا قیاس کی بنیاد پر نہ ہوں بلکہ کسی باقاعدہ سائنٹفک تحقیق کا نتیجہ
ہوں تو اس سے دور رس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور آئندہ ہر قسم کی تحقیقات کے لئے وسیع بنیادیں قائم ہوتی ہیں۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ بچوں کی درسی کتب میں غیر مانوس اور ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے تھے جو عام طور
پر کم استعمال ہوتے ہیں، نیز لفظ شماری کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تقریباً ہر یورپی زبان کی حد تک ایسی فہرستیں
مرتب ہوئی ہیں جن سے ہر لفظ کی تکرار (Frequency) ظاہر ہوتی ہے۔

انگریزی زبان کی حد تک کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر تھارنڈک (Thorndike) نے سنہ ۱۹۲۲ء
میں ایک فہرست مرتب کی جو بہت زیادہ مشہور رہی ہے۔ اس فہرست کی ترتیب کے سلسلہ میں ڈاکٹر تھارنڈک نے ایک کروڑ
الفاظ (جو ان شعبہ جات، بچوں کی کتب، معیاری کتب اور مراسلت پر مشتمل تھے) کا شمار کیا اور پہلے بیس ہزار اہم الفاظ
کی فہرست مرتب کی۔ ایسی فہرستوں سے نصابی کتب کی تیاری میں انقلابی تبدیلیاں ہوئیں اور اس مسئلہ کی حد تک لغات
اور ذخیرہ میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ نیز لسانی تحقیقات اور علمی ریسرچ کے لئے بنیادیں قائم ہوئیں۔ اس کی بنا پر
ایسی کتابیں لکھی جانے لگیں جن میں بتدریج نئے الفاظ کا اضافہ ہوتا تھا اور ایسے ہی الفاظ کا انتخاب ہونے لگا جن سے
واقف ہونا ضروری سمجھا گیا اور جو ناگزیر تھا۔

یہ تو رہا انگریزی کا حال۔ ترکی زبان کی حد تک ایک امریکی مشنری ڈاکٹر Bigge نے لفظ شماری کا بیڑا اٹھایا اور جیسا کہ مقصود تھا [illegible] اس کام کی تکمیل کی۔ موصوف نے ۲ لاکھ لفظ شمار کئے۔ یہ تین قسموں کی کتابوں سے لئے گئے تھے [illegible] تاریخی، درسی کتب، دیوان، اخبار [illegible] اخبار، اور ہر قسم کا ماخذ [illegible] لفظ [illegible] کارڈ [illegible] کیا گیا تاکہ بنیادی تحقیق کا کام [illegible] جس طرح چاہیں [illegible] بنیادی کام سے مدد لیں۔

ہندوستانی زبانوں کی حد تک [illegible] طریقہ [illegible] یہ کام [illegible] لورنز سان [illegible] Hoeness [illegible] الفاظ [illegible] ۱۹۵۳ء میں شائع کی جس میں [illegible] (Frequency) بھی ظاہر [illegible] ہے۔

موصوف [illegible] تحقیقاتی کام کے نتیجہ کے طور پر [illegible] (۱۲۵۰۰) [illegible] frequency [illegible] (۲۰۰) الفاظ کی تکرار frequency [illegible] کی فہرست مرتب کی۔ [illegible] الفاظ [illegible] (frequency) [illegible]

[illegible] لفظ شماری کے دوران میں اسم خاص (proper noun) [illegible] الفاظ [illegible] استعمال ہوتے [illegible] [illegible] اپنے کام [illegible] فہرست [illegible]

اسی طرح [illegible] ۱۹۳۰ء میں فہرست شائع کی جو [illegible] (frequency [illegible]) [illegible] ہے۔

میتزلی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ [illegible] اشخاص [illegible] (۲۰) [illegible] کے لئے متعین کیا گیا [illegible] الفاظ [illegible] تکرار [illegible] (۳۰) فہرستیں [illegible] گئیں۔ [illegible] الفاظ [illegible] اس طرح ان کی فہرست تیار کی گئی [illegible] آسان ہو سکتا۔

اس کے بعد اردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لئے [illegible] ۱۹۴۷ء میں [illegible] الفاظ کی فہرست شائع کی [illegible] مقصد [illegible] [illegible] (۲) فہرست [illegible]

اردو زبان کی حد تک [illegible] ہمارے اردو کے زیادہ استعمال ہونے والے الفاظ کی ایک فہرست [illegible] صاحب نے اردو اور ہندی کے مشترک الفاظ [illegible] تحقیق [illegible]

مجھے ایک زمانہ سے ایک خیال تھا کہ اردو زبان سے متعلق ایسے تحقیقاتی کام انجام پانے کی ضرورت ہے جو بنیادی حیثیت رکھتے ہوں۔ اسی خیال کے تحت لفظ شماری کے کام سے مجھے دلچسپی رہی۔ اس کے بعد جب سرکاری کام کے ضمن میں مجھے سمندر پار جانا پڑا تو ترکی میں مجھے زبان ترکی کی لفظ شماری کے کام سے واقف ہونے کا موقع ملا جو امریکن مشنری (Dr Birge) نے نہایت محنت اور خلوص سے انجام دیا تھا۔ میں نے (Dr. Birge) صاحب سے تبادلہ خیال کیا اور ان کے طریقہ کار کا قریبی مطالعہ کیا۔ واپسی کے بعد میں نے اردو میں لفظ شماری کی اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے مختلف اشخاص سے تبادلہ خیال کیا اور اس کام کو شروع کرنے کی خواہش کی لیکن مجھے زیادہ کامیابی نہ ہوئی بلکہ بعض اوقات یہ دیکھ کر بڑی حد تک مایوسی ہوئی کہ جن لوگوں سے متعلق اردو کی خدمت کی توقع کی جا سکتی ہے ان کے پیش نظر بھی کسی ٹھوس اور بنیادی کام کرنے کا مقصد نہیں ہے۔ اگر مجھے لفظ شماری کے کام کی مشکلات کا پورا پورا اندازہ نہ ہوتا تو " اردو دوست" احباب کی ہمت شکن باتوں سے میں ہمت ہار جاتا۔ برخلاف اس کے جب میں نے ڈاکٹر زور صاحب سے اس کام کا ذکر کیا تو صاحب موصوف نے نہ صرف اس کام کی اہمیت اور افادیت کو فوراً تسلیم فرمایا بلکہ اپنے اس مخصوص طریقہ پر میری حوصلہ افزائی فرمائی جو ڈاکٹر زور صاحب ہی کا حصہ ہے اور جس کی وجہ سے ان کے ساتھ کام کرنے میں مسرت ہوتی ہے۔ چنانچہ ادارہ ادبیات اردو کی سلور جوبلی کے موقع پر اس کام کو ادارہ کی سرپرستی میں آغاز کرنا طے پایا اور (۱) پروفیسر خواجہ احمد صاحب فاروقی دہلی (۲) پروفیسر احتشام حسین صاحب لکھنؤ، (۳) پروفیسر اختر اورینوی صاحب پٹنہ، (۴) پنڈت مدن موہن کالیہ صاحب بمبئی، (۵) علی سردار جعفری صاحب بمبئی، (۶) ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور اور دیگر مقامی اردو دوست اصحاب پر مشتمل ایک کل ہند کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ چنانچہ سال گذشتہ تمام اراکین سے مراسلت کی گئی۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ تمام اراکین نے کام کی افادیت کو تسلیم کیا اور اس سلسلے میں اپنے تعاون عمل کا یقین دلایا چنانچہ ابتدائی کام آغاز کر دیا گیا ہے۔ طریقہ کار سے متعلق ایک لائحہ عمل تیار کیا جا رہا ہے جو عنقریب مکمل ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کام کو شروع کر دیا جائے گا۔

میں خوب واقف ہوں کہ یہ لفظ شماری کا کام اتنا آسان نہیں جتنا عمارات تعمیر کرنا یا جلسے اور مشاعرے منعقد کرنا ہے۔ لفظ شماری کے کام کیلئے روپے کی ضرورت ضرور ہے، روپیہ بہت کچھ ہے لیکن سب کچھ نہیں ہے۔ روپیہ سے زیادہ محنتی اور پرخلوص کارکنوں کی ضرورت ہے۔ یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہماری توجہ ایسے کاموں کی جانب ہو جس سے اردو کی حقیقی خدمت ہو سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم میں سے جو لوگ اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور اپنا وقت دے سکتے ہیں وہ آگے بڑھیں اور اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق ہاتھ بٹائیں۔

---

# ملک الشعرا مہدی علیخاں ذکی

سنہ ۱۲۰۸ھ تا سنہ ۱۲۸۳ھ

از:۔ جناب ظفر حسین خاں صاحب

ذکی کا شجرۂ نسب ددھیال کی جانب سے خلیفہ اول تک اور ننھیال کی جانب سے خلیفہ دوم تک جاتا ہے۔ ان کے خاندان میں کثرت سے سلاطین، محدثین اور شیوخ الاسلام کے نام ملتے ہیں۔ ذکی کی چار نسبت اوپر سے سلسلۂ نسب یہ ہے۔ شیخ الاسلام شیخ محمد نافع بجنوری کا عقد زاہدہ بی بی (بنت نواب عظمت اللہ خاں ولد امیر قاضی عصمت اللہ خاں الملقب بہ غفران پناہ تاجدار بیجاپور، اورنگ آباد دکن و فاتح اعظم ملک دکن و اجین ملک مالوہ) سے ہوا۔ ان کے بطن سے ذکی مرحوم تک سلسلہ نسب یہ ہے۔ شیخ محمد واسع ولد شیخ فضل علی ولد شیخ کرامت علی ولد شیخ مہدی علیخاں ذکی ملک الشعرا۔ بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ ذکی کی سکونت زیادہ تر مراد آباد رہی۔

ذکی نے ابتدائً نواب محمد سعید خاں والیٔ ریاست رامپور کے زمانے میں دربار رامپور سے داد سخن لی۔ پھر غازی الدین احمد بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ چلے گئے۔ لالہ سری رام صاحب خم خانہ جاوید نے لکھا ہے کہ وہاں جاکر ناسخ کے شاگرد ہوئے۔ امیر مینائی نے بھی اپنے تذکرہ انتخاب یادگار میں ذکی کو ناسخ کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ذکی طبع زاد شاعر اور کسی استاد کے شاگرد نہ تھے۔ نیز یہ امر قرین قیاس بھی نہیں ہے اس لئے کہ ذکی جب لکھنؤ گئے ہیں ایک مسلم الثبوت شاعر کی حیثیت سے ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ذکی ناسخ کے ہاں شعر و سخن کے محفلوں میں ضرور شریک ہوتے تھے اور داد سخن لیتے اور دیتے تھے۔ نواب زین العابدین خاں برادر خورد ذکی مرحوم جنھوں نے 'کلیات ذکی' شائع کیا ہے اپنی تقریظ میں لکھتے ہیں "میرے استاد کہ فخر شعرائے سابقین و حال جناب شیخ امام بخش ناسخ علیہ الرحمۃ تھے وہ ان کے (ذکی کے) فضل و کمال کی کیفیت سے خوب آگاہ تھے اور رابطہ و اتحاد بھی شعرا میں ایسا نہیں دیکھا جیسا ان دونوں صاحبوں میں تھا۔ جناب شیخ صاحب اپنی زبان فیض ترجمان سے اکثر فرماتے تھے کہ مولوی مہدی علی خاں ذکی فن شاعری میں بے بدیل ہے۔ علی الخصوص تاریخ گوئی میں از سابق تا حال ایسے صنائع و بدائع کسی شاعر کی تصنیفات سے نہیں دیکھے اور نہیں سنے۔ اور ایک شعر کو برادر صاحب کے جناب شیخ صاحب اکثر پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا یہ سیدھا سادھا شعر آپ کو کس باعث سے نہایت پسند آتا ہے۔ میرے استاد نے فرمایا کہ اس شعر میں بہت کیفیتیں ہیں۔ از انجملہ ایک یہ لطف ہے کہ اگر کوئی شاعر اس شعر کے مضمون کو کسی اور عبارت نظم و نثر میں بیان کرنا چاہے گا تو ہرگز بیان نہ ہو سکے گا حسن کا بنی جا ہے (؟) از انتش کر لے اور وہ شعر یہ ہے ؎

اک ذرا تیغ نگہ کو جو اشارہ ہو جائے — آپ کا نام ہو اور کام ہمارا ہو جائے

[illegible] ذوقی [illegible] دہرے تو زین العابدین عماد صاحب اس تقریظ میں جہاں انھوں نے ناسخ کو اپنا استاد بتایا ہے [illegible]
بتاتے [illegible] انھوں نے دونوں استادوں کے درمیان ہم پلہ استادوں کی طرح کے روابط و تعلقات کا ذکر کیا ہے

[illegible] عرصہ قیام کر کے دہلی آئے اور نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے ہاں بزم مشاعرہ میں شرکت [illegible]
[illegible] شہزادہ [illegible] بہادر [illegible] اپنے تذکرہ گلستان سخن میں اس مشاعرہ کے سلسلہ میں ذکر [illegible]
[illegible] ذوقی کے متعلق لکھتے ہیں۔ مرد شیریں سخن، ظریف طبع، خوش کلام، تیز فکر، طرز سخن اس کا پسندیدہ [illegible]
[illegible] بے مثل و مانند [illegible] ایک مرتبہ ہوا نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے مکان میں بزم شعر خوانی منعقد ہوئی تھی
[illegible] سخن سنج بھی دلی میں وارد تھا راقم نے ایک دو مشاعرے میں اس کی [illegible] آشنائی [illegible] اس کے سخن سے
[illegible] ایک مدت سے اس محل [illegible] قدم رکھا نہیں گیا۔

[illegible] میں دہلی بقول [illegible] مولف خم خانۂ جاوید "اچھا حال میں بستا تھی۔ یہاں سے دل برداشتہ ہو کر
[illegible] حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں دن رات چاندی ہوتی [illegible] تھا۔ وہاں ان کے کھانے
[illegible] استاد مسلم الثبوت تھے [illegible] امیر الدولہ نظام الملک بہادر [illegible]
[illegible] قصائد [illegible] پیش کئے [illegible] کر دربار [illegible]
[illegible] آنے لگے۔ (خم خانۂ جاوید ص ۲۵۴ [illegible] ۲۶۱)۔

[illegible] حیدر آباد سے [illegible] آئے کچھ روز وہاں قیام کر کے لکھنؤ آئے۔ واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ یہاں [illegible]
[illegible] "ملک الشعرا شیخ مہدی علی خاں" [illegible] کندہ ہے۔

[illegible] بعد تھا۔ [illegible] ہوئے تھے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم والی رامپور نے ذوقی کے کمال کا شہرہ سن کر اپنے
[illegible] ۱۲۷۳ھ میں اجازت گورنر جنرل سے غدر کے زمانے میں ضبط شدہ جائداد کی دلدار [illegible] کے متعلق گفتگو
[illegible] بزرگوں سے سنا کہ جو کلام [illegible] اور ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ میں اس دنیا سے رحلت
[illegible] انتخاب یادگار مولفہ امیر مینائی میں تاریخ وفات ۱۲۸۱ھ درج ہے جو منشی امیر احمد صاحب مذکور خم خانۂ جاوید
[illegible] ان کے خیال میں ۱۲۸۳ھ ہونا چاہیئے۔

[illegible] عروض پر ایک رسالہ [illegible] لکھا تو ملتان میں مطبع ریاضی نور میں چھپا ہے۔ یہ رسالہ دراصل [illegible]
کا خلاصہ ہے جو فن عروض پر ذوقی کی ایک بسیط تصنیف ہے جو محقق طوسی کے معیار الاشعار کی تشریح ہے اور جس میں
مولوی [illegible] اللہ صاحب کے شرح معیار الاشعار میں محقق طوسی پر جو اعتراض کئے گئے ہیں ان کا جواب دیا گیا ہے [illegible]
[illegible] رامپور کے کتب خانہ میں [illegible] داستانوں کے دفتر دیکھے۔ چار داستانیں تو نواب سید محمد سعید [illegible]
[illegible] جنت آرامگاہ والی ریاست رامپور کی فرمائش پر ۱۲۷۰ھ میں لکھی گئی ہیں۔ یہ داستانیں [illegible]
[illegible] تحریر ہیں۔ یہ سارا دفتر ایک سال کے اندر لکھا ہوا تھا۔ پانچویں داستان نواب کلب علی خاں بہادر [illegible]
[illegible] تقطیع پر ۱۲۶ صفحوں کی داستان ہے۔ [illegible] داستانیں جن کو لکھے ہوئے تقریباً [illegible]
[illegible] جنگل کی بھی ہوئی زبان میں تحریر ہیں۔ [illegible] کی زبان [illegible] الفاظ [illegible]
[illegible] سید نفس علی ما لسان حکمت [illegible] تو ان کا سمجھنا مشکل ہو گا۔ [illegible]

ذوقِ سلیم کے پیش بینی کا پتہ چلتا ہے۔

ذکی کے کلام کا بیشتر حصہ زمانۂ غدر میں گھر کے اسباب کے ساتھ تلف ہو گیا تھا۔ ذکی مرحوم کے برادر خورد نواب زین العابدین خاں مرحوم نے بڑی کاوش سے جو کچھ دستیاب ہو سکا اس کو اول تا آخر اپنے ہاتھ سے لکھ کر "کلیاتِ ذکی" مرتب کیا۔ بہت کچھ اچھی یادسے لکھا، اگر پھر بھی بہت سے فارسی قصائد اور مثنویات کلیات میں شامل نہ ہو سکیں۔ نواب زین العابدین خاں مرحوم نے کلیات کے تقریظ میں لکھا ہے کہ ذکی مرحوم نے ایک مثنوی میر تقی مرحوم کی مثنوی "دریائے عشق" کے طرز پر لکھی تھی جس کا ایک شعر ان کو یاد رہ گیا تھا جو انھوں نے تقریظ میں لکھا ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

غم سے بلبل کو نوحہ زن دیکھا — گل کو سر سے کفن بندھا دیکھا

بہر طور ذکی کا کلام جو اس وقت میسر ہے وہ یہی کلیات ہے جو نولکشور پریس میں چھپا ہے۔ اس میں غزلیات، مثنویاں، مخمس، مسدس، قطعات، رباعیات اور وہ معرکۃ الآرا قصائد شامل ہیں (۱) جن کے ہر مصرع سے جدا جدا تاریخ نکلتی ہے۔ (۲) ہر بیت کے حروف منقوط اور غیر منقوط بھی جداگانہ تاریخ کے حامل ہیں۔ (۳) اور ہر بیت کے مصرع اول کے حروف منقوط اور مصرع ثانی کے حروف منقوط سے تاریخ نکلتی ہے۔ (۴) ہر بیت کے مصرع اول کے حروف غیر منقوط اور مصرع ثانی کے حروف منقوط تاریخ بہم پہنچاتے ہیں۔ (۵) صرف یہاں تک بس نہیں بلکہ نواب ناصر الدولہ کے مدح میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس کے متعلق لکھا گیا کہ "ایں امر منحصر بہ جہات منفقہ بست بیت مختصر نیست بلکہ از مصرع اول تا مصرع توشیح بہ ہر مصرع کہ ربط دہد مادہ تاریخ برمی آید" اسی کے ساتھ چونکہ جلوس ممدوح ستر ہواں تھا، زبر و بینات کے قاعدہ سے وہ بھی مادہ تاریخ میں نکلتا ہے۔ (۱۲۷۴)

کلیاتِ ذکی نولکشور پریس میں چھپا ہے جو ۲۰×۲۶ کے تقطیع پر (۳۵۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں غالباً غدر کے چار پانچ سال بعد یعنی ۱۸۶۱ء یا ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا ہوگا۔ ذکی کے نتائج فکر سے کچھ انتخاب کلام ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

میرے دل کی نگاہ سے خوں نہ بہا تجھے اپنے ہی جلوہ گری کی قسم — تجھے نشۂ بے خبری کی قسم تجھے شوخیٔ جاں بر دماں کی قسم
تجھے عارضِ رشکِ قمر کی قسم تجھے شعلۂ داغِ جگر کی قسم — تجھے شوخیٔ برقِ نظر کی قسم تجھے گرمیٔ جلوہ گری کی قسم
تجھے دیدۂ شعلہ فشاں کی قسم تجھے خندۂ زخمِ نہاں کی قسم — تجھے لالۂ سوختہ جاں کی قسم تجھے داغ کی شعلہ وری کی قسم
تجھے کچھ بھی خیال ہے رشکِ قمر کہ ہوا ترے غم میں یہ خستہ جگر — کوئی دم مری خاک پہ آ کے ٹھہر تجھے شمعِ دمِ سحری کی قسم
مرے دیدۂ تر میں یہ شعلہ فشاں ترے عکسِ جمال کا ہے نشاں — غمِ عشق سے دل میں ہے داغ نہاں ترے چہرۂ رشکِ پری کی قسم
نہ کر اتنا ذکی دلِ زار کو خوں کہ یہ ذوقِ سخن ہے مذاقِ زبوں — تری طرز سے آتی ہے بوئے جنوں مجھے تیری بے جگری کی قسم

---

مسی لبِ گلگوں پہ جو تصویر نظر آئی — یاقوت میں ظلم کی تحریر نظر آئی
بیٹھی نظر اس رخ کی تو تصویر نظر آئی — پرواز تصور سے تصویر نظر آئی
یہ بھید جو اس خط کی تحریر نظر آئی — سونے کی لنک سو بھی زنجیر نظر آئی
دل میں جو مکرر کا باتوں میں مزا پایا — آنو وہ جو رکت میں تقریر نظر آئی
ہستی کا نشاں دیکھا تو خواب پریشاں تھا — جب عمر بسر آئی تعبیر نظر آئی
نقشہ کا ہر اک جیدی دل بھائی کھڑا ہنس کر — ہر آن میں بجلی کی تحریر نظر آئی
جگنی میں اڑا ہے شوخی سلطان شرت — انگلی سب کا فری گگا پہ زنجیر نظر آئی
بیمار دو عالم کا ہر پہنچ میں ذکی دیکھا — معشوق کے غمزہ میں تحریر نظر آئی

---

ایک دزدیدہ نگہ کر جو اشارہ ہو جائے — آپ کا کام ہو اور کام ہمارا ہو جائے
جلوہ آرا ہو جو بت کدہ میں عکس — آپ آئینہ مجھے کیا ہے جو پیارا ہو
ماہتابی سی بچھی چاند کے تماشے پہ — چاندنی میں یہ مہ انجمن آرا ہو جائے
نکہتِ زلف جو لے جائے وہاں موجِ نسیم — خاکِ صحرائے جنوں عنبر سارا ہو جائے
بوسہ مانگے جو لبِ شیریں کا مزا یاد آئے — تلخ کامیِ دلِ عاشق کو گوارا ہو جائے

جلوہ نور معانی ہے اثر ہے تو ذکی
حسن تا رہے منطقہ بھی تماشا ہو جائے

واقعی قابلِ سزا ہیں ہم یعنی دیرینہ آشنا ہیں ہم
اے صنم یہ ستم خدا سے تو ڈر عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
قافلہ والو اک ذرا ٹھہرو پھر کے دیکھو شکستہ پا ہیں ہم
عینِ غفلت ہے زیست شکلِ حباب آنکھ کھولی تو بس ہوا ہیں ہم
تم کو چاہا بڑا گناہ کیا ہاں سزاوارِ ہر سزا ہیں ہم
عاشقانہ مزاج رکھتے ہیں حال میں اپنے مبتلا ہیں ہم

ایک دل اور چاہتے ہیں ذکی
عاشقِ طرۂ دوتا ہیں ہم

دیر سے کچھ خبر خاطرِ ناشاد نہیں دل کہاں جوں اٹھا ہو مجھے کچھ یاد نہیں
وہ بہ یار ہے داغِ دلِ ناشاد نہیں جانِ شیریں ہے یہ روح تنِ فرہاد نہیں
ہم گرفتار ہیں بے بال و پرے کے پابند ہے نصیبوں کا گلہ شکوۂ صیاد نہیں
اب وہ باقی نہ رہے جلوہ گریٔ شیریں پر شرر سنگ تو ہیں تیشۂ فرہاد نہیں
عمرِ صد سالہ گذرتی ہے بس اک دم کی مثال خاک اس ہستیٔ موہوم کی بنیاد نہیں
اپنے وحشت کا مزا کچھ نہیں یار دیکھے تو دل افسردہ نہیں خاطرِ ناشاد نہیں
شمع کا داغ ہے ماتم نہیں پروانے کا جانِ شیریں کا قلق ہے غمِ فرہاد نہیں
خلش ناخنِ غم ہے رگِ جاں کو در کار کارگر یہاں اثرِ نشترِ فصاد نہیں
کیوں یہ فوارۂ خوں دیدۂ تر سے چھوٹا رگِ مژگاں تو کہیں نشترِ فصاد نہیں

اے ذکی آن کا شیدا ہوں بقولِ حافظ
کچھ میں دیوانہ خوباں پریزاد نہیں

بارِ غم منزل نہ پہنچا خاطرِ ناشاد کا لٹ گیا رستے میں شاید قافلہ فریاد کا
دام کے پھندے قفس کی تیلیاں توڑیں تو کیا کاش رشتہ ٹوٹ جاتا الفتِ صیاد کا
کوچ ہے دارِ فنا سے ہستیٔ جاوید کو کوس رحلت شادیانہ ہے مبارکباد کا
دشتِ مجنوں میں ہے اب تک حلقۂ ماتم کی دھوم خانۂ زنجیر میں ہے غلغلہ فریاد کا
حلق بسمل پردہ میں چل کر ٹھہر جاتا ہے کیا تھک کے دم لیتا ہے دم اس خنجرِ بیداد کا
گر سوادِ طرۂ طرزِ سخن سے رنگ اڑائیں ہاتھ شانہ سے قلم ہو مانی و بہزاد کا
دل کے آجانے سے ہے یاں دھوم شادی مرگ کی مژدۂ واشوخت ہے نغمہ مبارکباد کا
آرزو اصلاً نہیں سیرِ پرستاں کی ذکی آنکھوں میں چھایا ہے عالم ہند حسنِ یار کا

تیار ہوں حمد و نعت و منقبت گرتاج غزلوں کا دکھاؤں مطلعِ انوار مطلع اپنے دیواں کا
ہوا ہے آفتابِ صبح شعلہ داغِ پنہاں کا تیا تارِ شعاعی تار تار اپنے گریباں کا
غبارِ قیس میں جان آگئی ٹھوکر سے لیلیٰ کی اٹھا آتا ہے بگولہ بن کے ہر ذرہ بیاباں کا
کھلا کھلنے میں گل کے مدعا رخصت کا گلشن سے صدائے الفراق آئی جو ٹوٹا زخم کا ٹانکا
سمجھ کر ساقیٔ دریا دل اپنے دو لبِ لیلیٰ کو چھاؤں گا زباں سوکھی کھا آتا ہی پھر اک کانٹا بیاباں کا
رہا تھا کچھ دنوں دل میں کبھی زلف کا سودا فسانہ ہے پریخانوں میں اب تک آپ پریشاں کا
بہار آئی ہے قاصد جی میں رہ رہ کر یہ آتا ہے بجائے نامہ بھیجیں یار کو پرزہ گریباں کا
نشہ نے شوق کے جوبد شرابی کا اثر بخشا کچھ ایسا ہوش بگڑا شب دل مشتاق جاناں کا
بلائیں شمع کی لیں اس سخن تاباں کے جو کہیں لب ساقی سمجھ کر لے لیا بوسہ نمکداں کا
مقابل اس کی ظلمت قبر کی ہے روشنی دل کی معاذ اللہ منہ کالا شبِ دیجورِ ہجراں کا
یہ اپنی تیلیاں پیدا ہیں نظر آئیں نہ نکھارہ تصور کا تماشا ہی پریشاں کا
خیالِ زلف میں شوریدہ خاطر تھا میں اے ذکی پھر اس اور اک طرہ ہو حال پریشاں کا
ذکی گرہ دو کھی گردش اپنے دل کے گرد رہتی ہی مگر خالِ سویدا نقطہ ہی پرکارِ دوراں کا

## مخمس ذکی ملک الشعرا (ملخص)

رات ساماں پریخانہ رہا آنکھوں میں ذوقِ دیدار نے کیا رنگ بھرا آنکھوں میں
شعلۂ نورِ نظر برق ہوا آنکھوں میں جلوہ دستِ نگاریں جو بسا آنکھوں میں
شمع فانوس ہوا رنگِ حنا آنکھوں میں

کیا یہ نیرنگ ہیں مبتلا مجھے رشکِ پری اچپلاہٹ میں غضب ہے کہ تڑپ میں بجلی
روح قالب میں ہے یا آن وادا میں شوخی بو ہے غنچہ میں نہاں یا ترے ہونٹوں میں ہنسی
بند شیشہ میں پری ہے کہ حیا آنکھوں میں

# پن چکی اورنگ آباد

از:۔ جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت ایم اے

**اورنگ آباد کی تاریخ**

اورنگ آباد ریاست حیدرآباد کا شمال میں سب سے آخری ضلع ہے۔ حیدرآباد میں پولیس ایکشن سے پہلے یہ ریاست چار صوبوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک صوبہ تھا اورنگ آباد جو مرہٹواڑی کے اضلاع کا صدر مقام تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد صوبے ختم کر دیئے گئے تو اورنگ آباد کی صوبہ داری بھی ختم ہو گئی۔ اب یہ اپنے نام کے ضلع کا صدر مقام ہے۔ سنٹرل ریلوے کی چھوٹی پٹری (میٹر گیج) منماڑ سے حیدرآباد جاتی ہے۔ اس پر منماڑ سے (۷۰) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آبادی چھاؤنی کو ملا کر اسی ہزار کے قریب ہے۔

اورنگ آباد کا پرانا نام کھڑکی ہے۔ موجودہ اورنگ آباد احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہوں کے حبشی وزیر ملک عنبر کا بسایا ہوا ہے۔ لیکن یہ بستی اس سے بھی پرانے زمانے کی ہے۔ ملک عنبر سے پہلے کی کھڑکی کی پوری تاریخ معلوم نہیں۔ لیکن اس کی شمالی پہاڑیوں میں بدھ مت اور برہمن مت کے جو غار کھدے ہیں انہیں دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہاں کافی آبادی ہوگی۔ شہر کے اندر قدیم زمانے کا ایک مندر کھڑکیشور کا ہے۔ اس مندر کی تاریخ بھی ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ لیکن ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یہ مندر ملک عنبر سے بھی پہلے زمانے کا ہے۔

کھڑکی مراٹھی لفظ ہے۔ اس کا ترجمہ پتھریلی یا پہاڑیوں والی زمین ہوتا ہے۔ اس بستی کے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ غالباً اسی لئے اس بستی کا نام کھڑکی پڑ گیا۔ یہ شہر کھام ندی کے کنارے بسا ہے۔ اس ندی کا دوسرا نام گنڈا بھی ہے۔ یہ ایک پہاڑی ندی ہے اور ہرسول پورہ اور موسیٰ آباد کے قریب کی پہاڑیوں سے نکلتی ہے جو ہرسول سے شمال میں کوئی دس میل دور ہیں۔ ہرسول سے کوئی دو میل دور ایک اور پہاڑی نالہ اس میں آکر مل جاتا ہے۔ اورنگ آباد سے آگے (۱۸) میل بہنے کے بعد یہ ندی اورنگ آباد کے جنوب میں جوگیشور کے پاس گوداوری ندی سے جا ملتی ہے۔ اصل بستی دو دریاؤں کی خوبصورت وادی میں بسی ہوئی ہے۔ یہ وادی کوئی دس میل چوڑی ہے۔ اس کے شمال میں لائین داڑہ اور جنوب میں ستارہ کی پہاڑیاں ہیں۔ یہ بستی ذرا اونچی زمین پر بسائی گئی ہے۔ قدیم شہر کا نقشہ مستطیل ہے۔ اس کی لمبائی ڈھائی میل اور چوڑائی سوا میل ہے اور اس کا رقبہ چھ میل سے کچھ زیادہ ہے۔ لیکن موجودہ شہر اس دور سے کافی دور تک پھیل گیا ہے۔

کھڑکی کی ٹھیک ٹھیک تاریخ ہمیں ۱۶۱۰ء سے ملتی ہے۔ اسی سال والیٔ احمدنگر مرتضیٰ نظام شاہ ثانی کے وزیر ملک عنبر نے اسے اپنی راجدھانی بنا کر اس میں بھی نئی نئی عمارتیں بنانا شروع کیں۔ ملک عنبر اصل میں ایک حبشی غلام تھا اور عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ بعد میں اس نے اسلام قبول کیا اور نظام شاہوں کی ملازمت میں آنے کے بعد اس نے کافی ترقی کی۔ اپنی محنت اور اپنی قابلیت سے وہ بتدریج اتنا اونچا ہوا کہ چاند بی بی سلطانہ کے دور حکومت میں اس کا وزیر بنا اور چاند بی بی سلطانہ کے مارے جانے کے بعد خود بادشاہ ہو گیا۔ کھڑکی کو اس نے اپنی راجدھانی بنایا تو اس کے ساتھ جو بڑی فوج تھی وہ یہاں بس گئی۔ اس فوج کے لوگوں نے اپنے رہنے کے لئے یہاں مکان بنائے۔ پھر دس سال کے اندر کھڑکی کا چھوٹا سا گاؤں ایک بڑا آباد شہر بن گیا۔ کہتے ہیں ملک عنبر کے زمانہ میں اس کی آبادی دو لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ کھڑکی کا شہر بسے کوئی گیارہ سال ہوئے تھے کہ یکایک شاہجہاں نے اس پر ۱۶۲۱ء میں حملہ کیا۔ شاہجہاں کی مغل فوج نے اسے لوٹا اور جلا ڈالا لیکن ملک عنبر کی کوشش سے جلد ہی یہ شہر سنبھل گیا اور پھر سے آباد ہو گیا۔ ۱۶۲۶ء میں ملک عنبر نے انتقال کیا۔ اس کے مرنے پر اس کا بیٹا فتح خاں اس کی گدی پر بیٹھا۔ اس نے اپنے نام پر کھڑکی کا نام فتح نگر رکھ دیا۔ اسی سال مغلوں کے ایک سردار خان جہاں لودھی نے اس شہر پر چڑھائی کی۔ لیکن نظام شاہی فوج کے سپہ سالار حامد خاں نے رشوت دے کر اسے برہان پور کی طرف ٹال دیا۔ لیکن جب ۱۶۳۳ء میں نظام شاہی بادشاہوں کے دوسرے تمام علاقوں کے ساتھ دولت آباد بھی مغلوں کے ہاتھ آ گیا تو فتح نگر بھی آپ ان کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۶۵۳ء میں شہزادہ اورنگ زیب کو دوسری بار دکن کی صوبہ داری ملی۔ اورنگ زیب نے فتح نگر کو اپنی راجدھانی بنایا اور اس شہر کا نام بدل کر اپنے نام پر اورنگ آباد رکھا۔ لیکن اس عہد کے مورخ اسے "خجستہ بنیاد" لکھتے ہیں جس سے تاریخ نکلتی ہے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جو انتشار سلطنت میں پیدا ہوا اس میں نواب قمرالدین خان نظام الملک آصف جاہ اول کو ریاست حیدرآباد کی بنیاد ڈالنے کا موقع ملا۔ پہلے تو وہ دکن کے صوبہ دار بن کر اورنگ آباد پہنچے گئے۔ اس کے بعد جب انھوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد مضبوط کر لی تو اورنگ آباد سے اپنا پایہ تخت حیدرآباد منتقل کر لیا۔ اس کے بعد سے اب تک یہ ریاست حیدرآباد کا ایک صوبہ بنا رہا۔

ملک عنبر نے اپنے دنوں میں اس شہر کی کوئی فصیل بنائی تھی یا نہیں اس کا ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ اب جس فصیل کے کھنڈر شہر کے چاروں طرف دکھائی دیتے ہیں وہ اورنگ زیب کے عہد کی فصیل کے ہیں۔ یہ فصیل مرہٹوں کے اچانک حملوں سے شہر کو بچانے کے لئے خان جہاں نے بادشاہ کے حکم سے بنائی تھی۔ یہ فصیل بڑی مضبوط تھی۔ اس میں مورچے بنے ہوئے تھے اور ان پر توپیں چڑھا دی گئی تھیں۔ یہ فصیل چودہ فٹ اونچی تھی۔ اس میں چار بڑے دروازے اور کئی کھڑکیاں تھیں۔ چاروں دروازے اور کچھ کھڑکیاں اب بھی باقی ہیں۔ شمال میں دہلی دروازہ، جنوب میں پیٹھن دروازہ، مشرق میں جالنہ دروازہ اور مغرب میں مکی دروازہ۔

جانے کب سے اورنگ آباد اور اس کے آس پاس کی سرزمین شعر و نغمہ، آرٹ و مصوری، علم و ادب اور حکمت و ہنر کی سرپرستی کرتی رہی ہے۔ یہ سرزمین ہے جہاں اجنتا کی لازوال تصویریں ہیں۔ اسی سرزمین میں ایلورہ کی

بادہ بھری تعمیر کاری نے جنم لیا۔ اس سرزمین پر دیوگری کا پراسرار قلعہ اپنا سینہ تانے کھڑا رہا۔ اس سرزمین پر ایک ناتھ اور پنت تپشن نے بھگتی کے گیت گائے۔ اسی سرزمین پر خواجہ منتخب الدین رحؒ۔ خواجہ برہان الدین غریبؒ شاہ نور حمویؒ حضرت نظام الدین اولیاء اورنگ آبادیؒ۔ شاہ علی پہری رحؒ اور کتنے ہی صوفیائے عظام نے علم و عرفان کے موتی بکھیرے۔ اس سرزمین پر اردو شاعری کے بابائے اول ولی اورنگ آبادی نے اور اس کے بعد سراج اورنگ آبادی نے ایک نئی لَے میں محبت کا ترانہ گایا اور اردو شاعری کا راستہ ہی بدل دیا

شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن کی صوبہ داری اور اس کے بعد شہنشاہ ہونے کے بعد اپنی زندگی کا بڑا حصہ اورنگ آباد میں بسر کیا اور اورنگ آباد ایک عرصہ دراز تک مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت بنا رہا۔ یہی زمانہ اورنگ آباد کے شباب کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے امراء، علماء اور مشائخین جن کا اس سلطنت سے تعلق تھا اورنگ آباد چلے آئے اور یہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کے دم قدم سے اورنگ آباد علوم و فنون اور حکمت و عرفان کا مرکز بن گیا۔ مغلوں کے دور انحطاط میں بھی اورنگ آباد کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے پائی اس کی بڑی وجہ ریاست حیدرآباد دکن کے بانی نواب قمرالدین خاں نظام الملک آصفجاہ اول کا ایک عرصہ دراز تک یہاں قیام تھا۔ اسی دور میں اورنگ آباد کے سرمایہ ناز مقام پر پن چکی کی داغ بیل پڑی۔

**پن چکی کا محل وقوع** اورنگ آباد کی اندرونی شہرپناہ کے سب سے شاندار دروازے "بھڑکل" سے نکل کر اس راستے پر جو ریلوے اسٹیشن جاتا ہے آدھ فرلانگ چلیے تو جوبلی پارک سے متصل ایک سہ راہا ملتا ہے۔ مغرب کی طرف اس راستے پر جو چھاؤنی کو جاتا ہے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر کھام ندی کے کنارے پن چکی واقع ہے۔ اس کے مشرق میں کھام ندی بہتی ہے جس کے مشرقی کناروں پر اورنگ آباد کی ٹوٹی پھوٹی شہرپناہ اپنے اقبال مندی کے دنوں کی مرثیہ خواں کھڑی ہے۔ اس سے کچھ پہلے شمال مشرق میں پھیلے ہوئے ملک عنبر اور آصفجاہ اول کے بنائے ہوئے محلوں کے کھنڈر ہیں جو "نوکھنڈ" کہلاتے ہیں۔ اسی شہرپناہ سے لگی ہوئی جمیل بیگ خاں کی بنائی ہوئی خوبصورت مسجد ہے۔ اس کے بعد شاندار محمود دروازہ ہے اور دروازے کے بعد کھام ندی پر بنا ہوا چھوٹا سا سنگین پل ہے۔ مسجد جمیل بیگ کے مقابل دوسرے کنارے پر وسیع قبرستان ہے اور اس سے آگے قطب پورہ اور بیگم پورہ کے محلے ہیں۔ جنوب مغرب میں ابھی کچھ سال ہوئے اس درسگاہ سے متعلق وسیع زمین پر (جو اب فروخت کردی گئی ہے) پیوپلس ایجوکیشنل سوسائٹی کالج کی شاندار عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ یہ کالج بھارت کے مشہور ماہر قانون اور ہریجن لیڈر ڈاکٹر امبیڈکر صاحب کی کوششوں سے قائم ہوا ہے اور اس کی مرکزی عمارت کا بنیادی پتھر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ہاتھوں رکھا گیا ہے۔ کالج کی عمارتوں کے بعد ہی اورنگ آباد کی چھاؤنی کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے۔ قدیم و جدید کے اس دلکش امتزاج کے درمیان پن چکی کا خوبصورت باغ اور اس کی دلکش عمارتیں واقع ہیں۔ یہاں کا نواحی نظارہ اورنگ آباد کے دلکش ترین مناظر میں گنا جاتا ہے۔

پن چکی کا یہ فردوسی مقام اور یہ جنت ارضی اصل میں حضرت بابا شاہ سعید پلنگ پوشؒ اور ان کے مرید اور خلیفہ حضرت بابا شاہ محمد عرف بابا شاہ مسافرؒ کی آخری آرام گاہ اور ان کے سلسلے کے مریدوں کا تکیہ ہے۔ ان مبارک اور مقدس بزرگوں کے حالات زندگی ہی سے اس مقام کے بیان کا آغاز کیا جاتا ہے۔

## حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش نقشبندیؒ

باباشاہ پلنگ پوش کا اصل نام محمد سعید ہے۔ وسط ایشیا کے مشہور شہر بخارا کے قریب ایک مردم خیز قصبہ ہے غجدوان۔ یہیں دسویں صدی ہجری کے اوائل یا نویں صدی کے آخر کے ابتدائی سالوں میں آپ کی ولادت باسعادت عمل میں آئی۔ اسی غجدوان کی خاک سے نمود آپ سے کہ پیر خواجہ بزرگ خواجہ عزیزاں ہے۔ اسی خاک سے خواجہ نقشبند نے اویسیہ کے سلسلے کے چھٹے پیر خواجہ عبدالخالق غجدوانی کو جنم دیا۔ یہی قصبہ کبھی شہنشاہ بابر کی آبائی سلطنت فرغانہ میں داخل رہا اور اسی مقام پر وہ ۱۵۱۱ء میں اپنے ... شیبانی کی حیثیت سے سریر آرائے سلطنت ہوا اور اسی غجدوان کے قریب ۱۵۱۲ء میں اپنے آبائی دشمن شیبانی خان اور اس کے بیٹے کے مقابلے میں آخری لڑائی میں اسے شکست اٹھانی پڑی اور ہمیشہ کے لئے اپنی آبائی سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یہیں سے مایوس ہو کر نکلا تو ابوالفضل نے اکبرنامہ میں "الہام غیبی" سے ... ارادہ ترک اور ممالک ہند کی تسخیر کا قصد کیا۔ ہندوستان پہنچا تو ... مادی شہنشاہیت نے اس کے قدم چومے۔ اسی غجدوان کی سرزمین سے حضرت بابا سعید پلنگ پوش اور ان کے مرید باصفا محمد عاشور باباشاہ مسافر اٹھے اور یہاں سے ارض ہند کا رخ کیا تو ولایت الٰہی کا تاج ان کے مبارک سروں پر رکھا گیا۔ کیسی مبارک تھی موجودہ روسی ترکستان کے علاقے میں شمالی غجدوان کی یہ سرزمین کہ اس کے سپوتوں میں ایک کو مادی شہنشاہیت بخشی گئی تو دوسروں کے سروں پر اس ... روحانی بادشاہت کا تاج رکھا گیا۔

حضرت بابا سعید پلنگ پوشؒ اپنے عہد کے ایک صاحب ثروت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کے والد بزرگوار دولت سے سرفراز تھے۔ لڑکپن ہی میں مروجہ نصاب کی تکمیل فرمالی۔ اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت کی بدولت اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے رہتے تھے۔ ایک دن اپنے ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ میں مصروف تھے کہ راستے میں دیکھا راستے سے قلندروں کا ایک گروہ گزر رہا ہے۔ اس گروہ کے درمیان ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے چہرے پر نور ہی نور برس رہا تھا۔ دیکھتے ہی اس شخص پر آپ سو جان سے فدا ہو گئے۔ یہ بابا قل احمد کی ذات مبارک تھی۔ آپ کو عام طور پر لوگ بابا قل فرید یا بابا قل مزید کہا کرتے تھے۔ آپ اپنے زمانے کے قطب تھے ملامتی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ زبان پر بے معنی اور بے تکی باتیں ہوتی تھیں ظاہر میں تو دیوانگی کی سی کیفیت طاری لیکن باطن میں دریائے معرفت کی موجیں جاری۔ بابا قل احمد کی کشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت محمد سعید درویشوں کے اس گروہ کے پیچھے پیچھے ہو لئے اور سایہ کی طرح بابا قل مزید یا بابا قل فرید کے ساتھ رہنے لگے۔ حضرت محمد سعید نے ان سے بیعت کی التجا کی قبول نہ ہوئی۔ فرمایا "درویشی کار دشوار است۔ ابھی تمہاری عمر سات سال کی ہے۔ ابھی تحصیل علم میں لگے رہو۔" حضرت سعیدؒ تو اور عالم کی جھلک دیکھ چکے تھے۔ اس عالم سے واپس ہونا گوارا نہ ہوا۔ ایک مدت تک درویشوں کے گرد وہی رہے۔ ایک رات بابا قل فرید کا قیام بخارا کے کسی مدرسے کے حجرے میں تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ حضرت محمد سعید اس حجرے کے دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ بڑی رات گئے اندر سے آواز آئی کون ہے جواب دیا

حضرت کا فقیر۔ بابا قل احمد عرف بابا قل فرید نے شفقت و مرحمت سے دروازہ کھول دیا اور انھیں اندر بلا لیا۔ اس کے بعد ملامتیوں کی طرح کچھ مستانہ باتیں کیں۔ حضرت محمد سعید پر ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ انہیں باباصاحب سے ارادت میں اضافہ ہی ہوگیا۔ پھر تو بابا صاحب نے آپ کی طرف توجہ فرمائی اور درویشی کی خلعت سے سرفراز فرمایا۔

سات آٹھ سال کی عمر دیکھئے اور طلب حق کی یہ لگن دیکھئے۔ مرشد کامل نے کچھ سمجھ کر ہی خلعت درویشانہ سے سرفراز فرمایا ہوگا۔ خرقۂ درویشی کا پہنا تھا کہ آپ پر جذب کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ، کپڑے پھاڑ برہنہ جنگل کی طرف نکل گئے۔ اسی برہنگی کی حالت میں قریب گیارہ سال صحرا نوردی کرتے رہے۔ بخارا کے محلہ قرشی میں ہفتہ میں دو بار بازار ہوتا تھا۔ کبھی کبھار آپ بھی بازار میں آجاتے۔ لوگ کپڑے پیش کرتے۔ قبول نہ فرماتے۔ لوگوں میں "دیوانے سعید" کے نام سے مشہور ہوگئے تھے۔ گیارہ سال بعد جذب کی یہ کیفیت قرشی کے اسی بازار میں آپ سے گم ہوگئی۔ بازار بھرا ہوا تھا۔ آپ نے کسی شخص سے لباس لے کر پہنا۔ لوگ خوش ہوگئے کہ "دیوانے سعید" کو ہوش آگیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے لباس کے لئے مستقل طور پر چیتے کا چمڑا انتخاب فرمایا۔ یہی چمڑا آپ کے جسم مبارک سے لپٹا رہتا تھا اور اسی چیتے کے چمڑے کی وجہ سے آپ کا لقب "بابا پلنگ پوش" یعنی چیتے کا چمڑا پہننے والا بابا ہوگیا۔

حالت جذب سے واپسی کے بعد آپ پھر بخارا سے نکلے اور اپنے پیر حضرت قل احمد کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بابا قل احمد ہی کے ساتھ آپ نے حرمین شریفین کی زیارت فرمائی اور آپ ہی کے ساتھ بخارا واپس آئے۔ حضرت بابا قل احمد نے اپنی وفات کا وقت قریب آتا دیکھ کر حضرت بابا سعید پلنگ پوش کو مرید تربیت باطنی کے لئے اپنے ایک پیر بھائی شیخ درویش عزیزان کے حوالے کیا اور فرمایا یہ میرا بیٹا ہے اس کی تربیت اب تمہارے سپرد ہے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد بابا صاحب نے انتقال فرمایا۔

بابا قل احمد کے انتقال کے بعد بابا سعید پلنگ پوش مدتوں اپنے شیخ حضرت درویش عزیزاں کی خدمت میں کمربستہ رہے اور ان کے فیض روحانی سے درجہ کمال پر فائز ہوئے۔ بابا قل احمد اور شیخ درویش عزیزاں دونوں سلسلہ عالیہ نقشبندیہ میں منسلک تھے اور صاحبان خرقہ سے تھے۔ سلسلہ نقشبندیہ کے بانی حضرت محمد بن محمد الملقب بہ بہاء الدین نقشبندی (متوفی ۳ ربیع الاول ۷۹۱ھ) آٹھویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ آپ کا مزار انور قبۃ الاسلام بخارا میں ہے۔ جو صدیوں تک علوم و فنون کا گہوارہ رہا اسی لئے آپ کا سلسلہ وسط ایشیا میں کافی پھیلا ہے۔ آپ کے مزار مبارک ہی کی وجہ سے بخارا کی تعریف میں مولانا عبدالرحمن جامی فرما گئے ہیں۔

سکہ کہ در یثرب و بطحا زدند — نوبت آخر بہ بخارا زدند
از خط آں سکہ نہ شد بہرہ مند — جز دل بے نقش بہا نقشبند
آں گہر پاک نہ ہر جا بود — معدن او خاک بخارا بود

حضرت بابا پلنگ پوش کا سلسلہ ساٹھ واسطوں سے حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی تک پہنچتا ہے اور ایک نسبت سے (۱۳) واسطوں کے بعد حضرت علی سے ہوتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے اور دوسری نسبت سے (۲۴) واسطوں کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے ہوتا ہوا آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے آپ کے سلسلہ بیعت کی تفصیل یہ ہے۔

بابا محمد سعید پلنگ پوش مرید شیخ عزیز درویشاں مجدد دانی مرید مولانا پائندہ رخصی مرید میر خورد بلخی مرید مخدوم اعظم مرید مولانا محمد قاضی مرید خواجہ عبداللہ احرار مرید حضرت یعقوب چرخی مرید خواجہ بہاؤالدین نقشبندی مرید امیر کلال مرید بابا سماسی مرید خواجہ علی رامیتنی خواجہ عارف مرید خواجہ عبدالخالق مجدد دانی مرید ابو یوسف ہمدانی مرید خواجہ ابو علی فارمدی قوسی مرید خواجہ ابوالحسن خرقانی مرید خواجہ بایزید بسطامی مرید امام جعفر صادق رضؓ مرید امام محمد باقر رضؓ مرید امام زین العابدین رضؓ مرید امیرالمومنین حضرت علی رضؓ مرید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

دوسری نسبت حضرت امام جعفر صادق رضؓ کو حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضؓ سے بھی رہی ہے جو آپ کے نانا ہوتے تھے آپ مرید تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضؓ کے اور حضرت سلمان فارسیؓ کو فیض باطنی حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے ملا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے سرچشمہ نور ہدایت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اکتساب فیض کیا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے باطنی تعلیم کی تکمیل کے بعد غالباً اپنے مرشد کے حکم سے حضرت بابا پلنگ پوش نے ہندوستان کا رخ کیا۔ ہندوستان میں آپ کی آمد کی تاریخ معلوم نہیں۔ قیاساً آپ کا ورود ہند گیارھویں صدی ہجری کے ربع آخر میں ہوا ہوگا۔ مختلف مقاموں کی سیر کرتے ہوئے آپ کابل پہنچے۔ بہت دنوں تک یہاں مقیم رہے۔ پھر کشمیر جنت نظیر میں آپ نے کئی سال اقامت اختیار کی۔ فارسی کے مشہور کشمیری شاعر غنی کشمیری کو آپ سے بڑی ارادت پیدا ہوگئی تھی۔ حسن ابدال کشمیر میں ایک عرصہ تک قیام کے بعد آپ نے دوبارہ حرمین شریفین کی زیارت کا ارادہ کیا۔ حرمین شریفین کی زیارت سے فارغ ہوکر آپ پھر حسن ابدال آئے۔ کچھ دن قیام فرمانے کے بعد دہلی تشریف لائے اور دہلی سے اورنگ آباد پہنچے۔ ان دنوں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ہندوستان کی مسند سلطنت پر متمکن تھے اور شہزادہ محمد معظم بہادر شاہ اورنگ کے ناظم یا گورنر تھے۔ اورنگ آباد آکر بابا پلنگ پوش نے قطب پورہ کے نالہ کے قریب درویش شاہ عنایت کے تکیہ میں قیام کیا۔

اس کے بعد حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش کا مستقل تعلق ریاست حیدرآباد دکن کے بانی حضرت آصفجاہ اول کے والد نواب میر شہاب الدین خاں المخاطب بہ غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ کے لشکر سے ہوگیا۔ اورنگ آباد سے آپ سیدھے اس لشکر میں چلے گئے جو اس وقت دکن کی کسی مہم میں مصروف تھا۔ آپ خود فرمایا کرتے تھے کہ غیب سے انھیں اس لشکر کی محافظت کا حکم ملا ہے۔ اس کے بعد فیروز جنگ کا لشکر جہاں جاتا آپ بھی اس کے ہمراہ وہیں چلے جاتے۔ اس طرح ہندوستان میں آپ

قیام مختلف مقامات پر رہا۔ کبھی دہلی میں رہے کبھی اورنگ آباد میں کبھی برہانپور میں اور کبھی نوساری میں۔ آپ کی زندگی کے آخری دن گلبرگہ میں گزرے۔

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ کو بھی آپ کی ذات مبارک سے بڑی گہری عقیدت تھی۔ وہ آپ کا بڑا ادب کرتے تھے۔ آپ کے حضور میں حاضر ہوتے تو دور ہی سے پالکی سے اتر پڑتے اور منکسرانہ پیدل چلتے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ اپنے لئے دعائے خیر کی استدعا کرتے۔

نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے صاحبزادے نواب میر قمرالدین خاں تھے۔ نواب میر قمرالدین خان نے آگے چل کر محمد شاہ سے نظام الملک آصفجاہ کا خطاب پایا۔ آپ ہی سلطنت آصفیہ حیدرآباد دکن کے بانی ہوئے ہیں۔ جب آپ کی عمر (۷) سال کی ہوئی تو آپ کے والد نواب فیروز جنگ نے ایک جشن کیا۔ اس جشن میں نواب قمرالدین خاں نے آفتابہ لے کر حضرت بابا محمد سعید پلنگ پوش اور دو چار بزرگوں کے ہاتھ دھلائے۔ کھانے کے بعد نواب غازی خاں نے حضرت بابا پلنگ پوش سے درخواست کی کہ حلقہ ذکر ہو اور اس کے بعد بچے کے لئے دعا کی جائے۔ حلقہ شروع ہوا۔ بیچ حلقہ میں ایک بڑا چراغ جو گویا بچے کی خوش نصیبی کی علامت تھی رکھا گیا اور اس چراغ کے قریب بچے کو بٹھایا گیا۔ ذکر کے تیز سانسوں میں چراغ یکایک بجھ گیا۔ نواب غازی الدین خاں نے چراغ کے بجھ جانے کو برا شگون جانا۔ حضرت بابا پلنگ پوش کی عادت تھی کہ وہ حلقہ کے اطراف "ہو۔ ہو" فرماتے ہوئے گھومتے جاتے تھے۔ جب چراغ بجھا آپ اس سے کافی دور تھے۔ چراغ بجھتے ہی آپ نے وہیں سے "ہو" کا نعرہ لگایا اور چیزوں پر ہوا کا۔ بجھا ہوا چراغ فوراً ہی جل اٹھا۔ نواب غازی الدین خاں نے یہ دیکھ کر اپنا سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا اور بچے کو بھی آپ کے قدموں میں ڈال دیا۔

حضرت بابا پلنگ پوش کے کشف و کرامات کے اور بھی کئی واقعات ملفوظات نقشبندیہ اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی کتاب مآثر الکلام میں درج ہیں۔

بابا صاحب کے ساتھ ساتھ ہمیشہ قلندروں، مریدوں اور ارادت مندوں کا ایک انبوہ رہا کرتا تھا۔ جہاں کہیں قیام فرماتے ہر طرح کے لوگوں کا تانتا لگ جاتا۔ آپ لوگوں کو قہوہ پلاتے، حلوہ کھلاتے اور دعوتیں دیا کرتے تھے۔ آپ کی محفلیں بھی عجیب ہوتی تھیں۔ ایک طرف شاعر ہوتے، ایک طرف ادیب ہوتے، ایک طرف علماء۔ ایک طرف تو علمی اور ادبی بحثیں جاری رہتیں تو دوسری طرف مطربان خوشنوا اپنے نغمے۔ ... سے اہل نفس کو وجد میں لاتے۔ آپ کی سواری نکلتی ... تماشا ... نکلتی کہ سواری کے ساتھ خوش رنگ پھولوں سے لدے ہوئے ستر اسی گملے آدمی اپنے سروں پر لئے ساتھ ہوتے۔ جہاں کہیں قیام ہوتے ان ہی گملوں سے ایک گلستان ترتیب دے لیا جاتا۔ ولایتی فقیروں میں ... فقیر ... چلتے۔ وہ سر ... برہنہ بدن پر صرف ایک لنگ، گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ساتھ رہتے ... نعمت اللہی فقیر آپ کی سواری کے آگے ... کے پروں کا بنا ہوا ایک وزنی آفتاب گیر لئے چلتے۔

بابا پلنگ پوش کا طریقہ قلندرانہ تھا۔ تمام لوگوں سے چاہے آشنا ہوں یا بیگانہ ... ہو کر ... آتے تھے۔ بچوں اور ... پر خاص شفقت فرماتے۔ آپ پر ایک طرح کی وجدانی کیفیت طاری رہتی تھی۔ کبھی کبھی ... کا اظہار ہو جاتا تھا لیکن عام رنگ شفقت اور محبت ہی کا تھا۔ ... نقشبندیہ میں ... ایک ...

یہ واقعہ آپ کے مسلک اور قلندرانہ نقطۂ نظر کی بڑی اچھی تفسیر ہے لکھا ہے۔

جن دنوں حضرت باباشاہ پلنگ پوش اورنگ آباد میں مقیم تھے حضرت کے گروہ کے فقرا میں شاہ عبداللہ نامی ایک فقیر بھی تھے جو ہمیشہ حق اللہ اور حان اللہ کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ اورنگ آباد کے محلہ نواپورہ میں واصل بیگ قندیل نامی ایک صاحب جمال لڑکا رہتا تھا۔ اس لڑکے پر شاہ عبداللہ کا بے اختیار دل آگیا۔ ہمیشہ اس کے کوچے سے گذرتے اور وہی حق اللہ اور حان اللہ کا نعرہ لگایا کرتے۔ اس لڑکے کے ہمجولی شاہ عبداللہ کو دیکھتے ہی مذاق سے کہتے کہ تیرا عاشق آپہنچا۔ یہ بات اس کو بڑی ناگوار گذرتی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ عاشق تماشا اپنے دلبر کے انتظار میں اس کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دو گھڑی دن اسی انتظار میں گذار دیئے۔ ایک گھڑی دن رہے جب لڑکا گھر سے نکلا تو ساتھی لڑکوں نے کہا تیرا شیفتہ کھڑا ہے۔ اس پر لڑکے کا پارہ چڑھ گیا۔ فقیر کو سخت سست کہنے لگا۔ فقیر نے کچھ نہ کہا۔ پھر غصے کے مارے لڑکا پاگل ہوگیا اور خنجر کھینچ کر اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ فقیر نے وہیں جان دے دی۔ لڑکا اور اس کے دوست ڈر کر کہیں چھپ گئے۔ ناظمِ شہر نے اس کے گھر پر چوکی پہرہ لگا دیا۔

اس حادثے کے وقت حضرت باباپلنگ پوش برہان الدین غریبؒ کے روضے کی زیارت کے لئے خلدآباد تشریف لے گئے تھے۔ آپ کے گروہ کے فقیروں نے وہیں آپ کو اس حادثے کی اطلاع دی۔ حضرت لوٹ کر شہر آئے۔ شہیدِ عشق کی لاش پر تشریف لا کر فرمایا "لوگو! دل بنگاہ عاشقی ... عاشق ایسے جاتے ہیں۔" بہت سے مغل فقیروں نے قصاص کا مطالبہ کیا اور ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ حضرت نے فرمایا "ملت سے اور ... اور حاکم" یہ کہہ کر اپنے گھوڑے اٹھوا دیئے۔ اس کے بعد کسی نہ کسی طرح لڑکے اور اس کے لوگوں کو بلایا۔ لڑکے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اسے اور اس کے لوگوں کو دلاسا دیا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا اس شہید کا جنازہ اٹھایا جائے گا۔ ... آپ خود بھی جنازے کے ساتھ چلے۔ لڑکے اور اس کے لوگوں سے فرمایا ... آگے آگے جنازے کے ساتھ ساتھ فقیروں، عالموں، مشائخوں، امیروں، غریبوں، ہر طرح کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ جنازے کے جلوس کا اہتمام کیا تھا حضرت بابا یہ دو شعر گا گا کر روتے جا رہے تھے۔

عالم ز جمال تو جمیل است و جمیل — وز فرقت تو جہان قتیل است و قتیل

مادیت خون خود نرگس مستانیم — خون ہمہ عاشقان سبیل است و سبیل

جنازے کے ساتھ جتنے لوگ تھے سب زار و قطار رو رہے تھے۔ حضرت کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ لڑکا برہنہ سر اور ساتھی روتے سر پر خاک ڈالتے آگے آگے جا رہے تھے۔ جس راستے سے جنازہ گذرتا تھا اس پر کچھ ایسا دکھائی دیتا تھا جس کو دیکھ کر بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہوں۔ تدفین کے بعد حضرت نے لڑکے کو خلعت سے سرفراز فرمایا اور اس کے لوگوں کو بھی خلعت بخشی۔ لڑکے سے ارشاد فرمایا ہر شب جمعہ عاشق کے مزار پر جاکر فاتحہ پڑھا کرو۔

حضرت باباسعید پلنگ پوش کی زندگی صد درجہ درویشانہ تھی۔ جو کچھ امرا اور صاحبان ثروت نذر کرتے آپ اسے دردمندوں اور حاجت مندوں میں بانٹ دیا کرتے۔ بعض وقت تو اصرار کرکے مدد لیتے۔ فرماتے تھے ہمارا کام ہے امیروں سے لینا اور فقیروں میں بانٹنا۔ آپ نے عمر بھر تجرد کی زندگی بسر فرمائی اور خانہ داری کے جھگڑوں سے آزاد رہے۔

حضرت محمد سعید باباپلنگ پوش نے ۔۔ رمضان المبارک ۱۱۱۰ھ میں نواب غازی الدین خان فیروز جنگ کے لشکر ہی میں وفات پائی۔ اس وقت نواب غازی الدین خان کا یہ لشکر گلبرگہ کے نواح میں پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ انتقال کے بعد آپ کے مرید اور جانشین حضرت باباشاہ مسافرؒ کے اہتمام سے آپ کا جسد مبارک اورنگ آباد لایا گیا اور پن چکی کے احاطہ میں دفن کیا گیا۔ حضرت باباشاہ مسافرؒ کے گنبد میں مسجد کی دیوار سے متصل دوسرا مزار آپ ہی کا ہے۔

حضرت باباپلنگ پوشؒ کے انتقال پر کسی ہم عصر شاعر نے حسب ذیل فارسی قطعہ تاریخ کہا۔ یہ قطعہ تاریخ پائیں مزار کی دیوار پر باہر کی طرف پتھر میں کندہ کر دیا گیا ہے۔

قطب روئے زمیں و غوث زماں — اختر برج سعد شاہ سعید

سال تاریخ وصل گفت خرد — قصر جنت بود مکان سعید

۱۱۱۰ھ

# سوناگاچی کا بازار

افسانہ:۔ جناب جے موہن دمو صاحب

وہ آج بے حد خوش تھا۔ پہلی تاریخ تھی۔ جیب میں سکے کھنکھنا رہے تھے اور دس دس روپے کے نوٹ ہاتھوں میں آتے لکش آواز پیدا کر رہے تھے۔ وہ کلکتہ کے سب سے حسین بازار "سوناگاچی" سے گزر رہا تھا۔ یہ وہ بازار تھا جہاں انسان ما۔ جہاں عصمت کی قیمت صرف چند سکے تھی۔ وہ آج اپنی شام یہیں گذارے گا۔ اس کے قدم یک لخت رک گئے۔ منے کھڑی سوناگاچی کی عظیم عمارت کو اس نے کنکھیوں سے دیکھا۔ ایک پارسی لڑکی چوٹی کے آخر میں نقلی موتیوں کی سبز سبز لیاں گوندھے قریب سے گذر گئی۔ شاہد نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا ہاں یاد آیا۔ ان کے محلے میں نئی نئی آئی تھی۔ نے جوان لڑکے کچھ عرصے بعد ہی اس سے مانوس ہو گئے تھے گو وہ دلکش نہ سہی ایک دھلی دھلائی لڑکی ضرور تھی۔ عمر بھی ، اٹھارہ، انیس سال کی۔ رخساروں پر سرخی، آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی ہوئی۔ ہونٹ موٹے اور نمکین۔ یہ لڑکی ں میں چاندی کی بالیاں اور ناک میں سبز لونگ پہنتی تھی۔ شاہد بھی اسے ایک مرتبہ دیکھ کر مسکرا پڑا تھا۔ لیکن وہ ناک پھلا کر س کے قریب سے اس طرح گذر گئی تھی جیسے اس نے شاہد کو دیکھا ہی نہ ہو۔ شاہد اس پارسی لڑکی کو جب تک دیکھتا رہا تب تک ہ چوک کے موڑ سے گذر نہ گئی۔

شاہد کے لئے یہ شہر نیا تھا۔ نوکری بھی نئی تھی اور تنخواہ بھی نئی۔ وہ ان چند خوش قسمت آدمیوں میں سے تھا جن کی شادی نہ ہوئی ہو اور جو ہر پرائی عورت کو تعریفی نگاہوں سے دیکھ لیتے ہوں۔ مقدس جذبے کے ساتھ بھی اور برے دے کے ساتھ بھی۔

شاہد کی خوش قسمتی کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ نوکری اسے کسی دوسرے شہر میں ملی تھی۔ یہ شہر اس کے شہر سے پانچسو میل فاصلے پر تھا۔ یوں وہ بڑا خوش مذاق تھا۔ حسین اور طرحدار لڑکیوں کی خوبصورتی اور حسن کو شباب کی کسوٹی پر رکھ کر طرح پرکھ سکتا تھا جس محلے میں وہ رہتا تھا اس محلے میں اس پارسی لڑکی کے علاوہ ایک سندھن بھی عین اس کے کمرے کے نے رہنے لگی تھی۔ سندھن پتلی چھریری سی لڑکی تھی اور کسی دفتر میں سٹینو گرافر۔ وہ خراماں خراماں چلتی تھی اور اس کی اٹھان ہلکا سا غرور، حیا اور شوخی تھی۔ چند روز تک شاہد اسے دیکھتا رہا۔ خاص طور پر وہ اس سندھن لڑکی کو اس دن ضرور دیکھتا ب وہ گہرے سرخ نیم عریاں گاؤن میں اسے کمر کا زہریلا لوچ دکھاتی ہوئی نکل جاتی۔ وہ گھورتا رہتا ٹکٹکی لگائے اور پھر ایک ہلکی سی کے ساتھ نظریں نیچی کر لیتا۔ شاہد نے ایک بار پھر سوناگاچی کے حسین جسموں کا تصور کیا وہ پہلے بھی کئی مرتبہ یہاں آیا تھا۔ لیکن جب ں کی جیب اتنے روپوں سے بھری ہوئی نہ ہوتی تھی۔ اسے رہ رہ کر شیلی، اگرتا، شیلا اور کرسچی تھیوکری کا خیال

آنے لگا۔ آج وہ کس کے پاس جائے؟

شام ڈھلنے لگی تھی۔ دیئے جل چکے تھے۔ سوناگاچی کی کھڑکیاں دکانوں کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ قہقہوں کی آواز نیچے سڑک پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ سوناگاچی کی تمام عورتوں کی ہنسی ان قہقہوں میں پوشیدہ تھی۔ انہی قہقہوں کے پیچھے شاہد کے سامنے سوناگاچی کے ننگے جسم رقص کرنے لگے۔ سب سے پہلے جو لڑکی تخیل میں ابھری وہ شیلا تھی۔ ایک مراٹھی حسن۔ نکھری ہوئی چاندی کی طرح گوری گوری۔ چہرہ چراغ کی مانند منور جو دیکھے پروانے کی طرح فدا ہو جائے۔ چال میں فطری آوارگی۔ کمر میں لوچ اور آنکھوں میں ہلکا ہلکا کاجل۔ حسن و جمال ایسا کہ قدرت بھی ششدر رہ جائے۔ اور پھر اس پر مراٹھی نقش و نگار۔ شاہد مسکرا دیا۔ کیا شیلا کے لئے زندگی کی آگ میں کود جائے؟

وہ مسکراتا رہا اور اس کے سامنے سوناگاچی رقص کرتا رہا۔ کیٹی ایک کرسچن چھوکری جسے اسلم دلال بمبئی سے چھڑا سوناگاچی کی زینت بنانے کے لئے لے آیا تھا۔ شاہد کو کیٹی کا اپنے کٹے ہوئے اور آراستہ بالوں کا بار بار گھما کر دیکھنا بیحد پسند تھا۔ پہلی بار جب شاہد نے کیٹی کو دیکھا تھا تو اس کے اندر ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ابرو کمان کی طرح جھکے ہوئے تھے اور مژگاں سینہ فگار کرنے والے تیر کی طرح تیز اور نوک دار تھے۔ سینہ کی اٹھان میں بے حد شوخی تھی اور شبنمی تبسم کے ساتھ ساتھ اس کی غزالی آنکھیں ہر شخص کو دعوت دیتی تھیں۔

لوسی کا دھیان کافی دیر تک اس کے ذہن میں ابھرتا رہا۔ لوسی کو پہلی بار اس نے ایک رقاصہ کے روپ میں دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں خطرناک حد تک شاہد کو پسند آنے لگی تھیں۔ لوسی کو اپنی آنکھوں پر بڑا ناز تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں میں محبت نہ تھی۔ بس وہ گاہکوں کو تکا کرتی تھیں۔ اس کی ناک ستواں اور رخسار گل گلاب کا جواب تھے۔ لوسی کو فخر حاصل تھا کہ پہلی بار اس نے شاہد کے مقدس اور پاک جذبہ میں لغزش پیدا کر دی تھی۔ اس کے ہونٹ یاقوت اور لعل بدخشاں کا جواب تھے۔ پیشانی چودھویں کے چاند کی مانند منور اور مسجد کے محراب کی مانند حسین تھی۔ لوسی کو دہلی کے انڈیا گیٹ سے اٹھایا گیا تھا جبکہ شام کے اندھیرے سائے بڑھنے لگے تھے۔ پہلے پہل اس کو جی بی روڈ پر رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ اس جگہ کے لائق نہ تھی اور اس رنگ شہابی کو سوناگاچی کے حسین محلوں کی زینت بنا دیا گیا۔ اس کے جسم میں ہرن کی سی مستی تھی۔ سینہ بلند اور بخارا کے اناروں کے مانند ابھرا ہوا تھا۔

شیبو ایک اور عورت تھی جو جوانی کی حد سے نکل کر ادھیڑ پن میں جا رہی تھی لیکن اس کے جسم کا تناؤ ابھی کچھ حد تک باقی تھا اور کئی گورے کالے ہندوستانی عاشق اس کے ہاں آتے رہتے تھے۔

اسی عرصہ میں سوناگاچی کے کمروں کا شور، خوشبوئیں اور تیز ہو گئے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو گیا اور شاہد کے خیالات ٹوٹ گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور لبوں پر تبسم بکھیرتا ہوا تیز تیز قدموں سے سوناگاچی کی عظیم عمارت کی سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

ایک کمرے کے سامنے وہ رک گیا۔ ٹھٹھک گیا۔ لوسی پلنگ پر بالکل ننگی پڑی تھی۔ نکھری ہوئی چاندنی کی طرح گوری گوری۔ اور دوسرے ہی لمحے کمرے کے دروازے بند تھے اور لوسی شاہد کی آغوش میں مچل رہی تھی۔

• (حلقۂ ارباب ذوق، دہلی میں پڑھا گیا)

# افسانہ کی بھیک

افسانہ:- جناب صابر کوسگوی صاحب

روفی دوا کی بوتل لئے مکان میں داخل ہوا۔ ایک خوش رنگ لفافہ وہ ماں کے ہاتھ میں دیکھ کر جھپٹ پڑا۔

"کس کا خط ہے، ماں!" لفافہ چاک کرکے مضمون پڑھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں اس کے کھلتے ہوئے چہرے پر مسرت کی پری ناچنے لگی۔

"خیریت تو ہے بیٹا" ماں نے استفسار کیا "کس کا خط ہے؟"

"وہ آرہے ہیں ماں!" روفی جیسے مسرت سے جھول گیا۔

"کون آرہے ہیں بیٹا؟" ماں نے سوال کیا۔

"وہ ماں، وہ سب کے سب آج شام کی ٹرین سے۔ میں انھیں لینے اسٹیشن جاؤں گا۔"

"ارے پگلے!" ماں مسکرا کر بولی، "تو نے بتایا نہیں کون آرہا ہے آج شام کی ٹرین سے۔"

"اوہ!" وہ بے خودی کی حالت میں بول اٹھا "وہ لوگ ماں! ہمارے پڑوسی جن کے گھر میں ٹیوشن لیا کرتا تھا۔"

"ڈپٹی افتخار علی کے گھر والے، کتنے اچھے ہیں وہ سب کے سب۔"

"ہاں ماں! ان کا سارا کنبہ مجھے کتنا چاہتا ہے۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی تو مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتی ہیں۔ مسعود اور جاوید سب مجھے اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ اور تنویر تو بڑی نیک لڑکی ہے۔" ماں نے جملہ کی تکمیل کی۔

"نیک اور بڑی اچھی لڑکی ہے" — زیر لب گنگنایا۔

روفی اپنے کمرے میں چلا آیا اور حالت انبساط میں خود کو پلنگ پر گرا دیا۔ وہ سوچنے لگا۔ ماضی کے دھندلے نقوش اس کے ذہن کے سطح پر آکر تھرکنے لگے۔ جاوید اور مسعود کی پڑھائی کے دوران میں تنویر کی موجودگی بڑی صبر آزما ہوتی۔ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ وہ یونہی کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگتی۔ اس کے سوالات سنجیدگی لئے ہوئے معنی خیز ہوتے۔

ایک دفعہ — جغرافیہ کا درس دیتے ہوئے بچوں سے سوال کیا گیا۔ ہندوستان کا نقشہ بناؤ اور اس میں پہاڑ دریا ظاہر کرو۔ ایک لطیف قہقہہ چھوٹ پڑا۔ واہ ماسٹر جی ذرا سے کاغذ کے پرزے پر اتنے بڑے دریا اور پہاڑ، غور تو کیجے۔ ایک آدھ پانی قطرہ اگر کاغذ پر گر پڑے۔ تو سکڑ جاتا ہے اور ایک چھوٹے سے پتھر کے پڑنے پر کاغذ پھٹ جاتا ہے۔ جواب بڑا مضحکہ خیز تھا۔ بچے تالیاں پیٹنے لگے — اور ایک دفعہ — ایک رومانی واقعہ روفی کے ذہن سے آکر ٹکرا گیا — بچے گھوم کر دیر سے لوٹے۔ تنہائی سے اکتا کر وہ کچھ لکھنے لگا۔ نظم کا کوئی مصرعہ اس کے نوک زباں تھا۔

"شعر کہہ رہے ہیں آپ" فضا معطر سانسوں سے مہکنے لگی۔ روفی غیر متوقع سوال کیلئے تیار نہ تھا۔ کبھی کبھی تھوڑا [illegible]

"دو چار چھینٹے ناشوق کے ادھر بھی ہو جائیے۔"

"تشنگی کم نہ ہو گی ان چند چھینٹوں سے۔"

"کچھ تو سنائیے ہمیں۔" التجائی لہجہ میں کہا گیا "یقین مانئیے! میں بڑے دھیان سے آپ کے افسانے پڑھتی ہوں۔"

"شکریہ۔"

"کل جو آپ افسانہ لکھ رہے تھے مکمل ہو چکا ہو گا۔"

"جی نہیں!"

"کیا عنوان ہے اس کا۔"

"افسانے کی بھیک۔"

تنویر ہنس پڑی، "نیا خیال ہے؟ تب تو ضرور سنائیے اسے۔ آپ افسانے خوب لکھتے ہیں۔ مجھے بھی سکھا دیجئے نا۔"

ردفی مسکرایا "افسانہ سیکھنے سکھانے کی چیز نہیں۔ خود بخود آ جاتے ہیں۔"

"خود بخود کیسے؟ کیا اللہ میاں دلوں میں افسانے اتار دیتے ہیں۔"

"ہاں جب دل و دماغ حساس ہوں، حادثات زندگی کے ہر موڑ پر نئے نئے خاکے پیش کرتے ہیں یہ حادثات حادثات کیفیات قلب کو ظہور میں لاتے ہیں۔ حادثات کے ٹکراؤ سے زندگی میں ہل چل پیدا ہو جاتی ہے احساسات اور جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔"

"معاف فرمائیے! حادثات کا ٹکراؤ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

جس طرح سمندر کی پرسکون زندگی میں ایک لنگر کا حادثہ ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح نظر کے تصادم سے قلب کے احساسات جاگ اٹھتے ہیں اور ان جذبات اور تاثرات کا اظہار جو بڑی شدت کے ساتھ آپ کے قلب و دماغ میں کار فرما ہیں۔ بڑی آسانی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر پیش کرنے کا موقع ملتا ہے۔"

"کیا میرا قلب بھی ایسے حادثات کو جذب کر سکتا ہے۔"

ہاں یہ فطری امر ہے۔ وہ جو جذبہ آپ کے دل میں موجود ہے لہٰذا ایسی کیفیت دنظر سے متاثر ہو سکتا ہے۔"

"تب تو میرا دل ان کیفیات کو ضرور محسوس کر سکتا ہے۔ ایک دفعہ کسی بھکارن کے بچے کے سر سے رستا ہوا خون دیکھ کر میں تمام دن بے چین رہی تھی۔"

"تب تو آپ کے دل و دماغ میں افسانہ نگاری کی کافی صلاحیتیں موجود ہیں۔"

اور کتنی باتیں اس کے ذہن میں آ آ کر خاکے بناتی چلی گئیں۔ وہ سوچتے سوچتے تھک سا گیا۔ ردفی شاعرانہ صفات کے قطع نظر بلند و پاکیزہ افسانوں کا مالک تھا۔ دفتری مصروفیات کے باوجود ادبی صلاحیتیں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ متوسط خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے اسے بھی زمانے کے حالات کا شکار ہونا پڑا۔ مگر پڑوسی کی سچی ہمدردی سے ماں بیٹے کو تھوڑا بہت جینے کا سہارا مل گیا۔ دو سال تک وہ ڈپٹی صاحب کے بچوں کو پڑھاتا رہا۔ اور جب وہ یہاں سے جانے لگے اپنے ہی محکمہ میں ملازم کروا دیا۔

"ارے بیٹا!" ماں نے آواز دی "دفتر جانا ہے تجھے۔"

"ہاں!" وہ ایک دم پلنگ سے اچھل پڑا۔ آج دفتر نہیں، بس چھٹی، چار بجے ٹرین آتی ہے۔ مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔"

وقت سے دس منٹ پہلے وہ پلیٹ فارم پر موجود تھا۔ گاڑی کے انجن کی طرح اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ٹرین سے اترتے ہی ڈپٹی صاحب نے اسے گلے سے لگا لیا اور ان کی بیوی کھڑی کھڑی بلائیں لے لیں۔ بچے آ کر اس سے لپٹ گئے۔ لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا۔ دو بڑی بڑی، خوشی سے لبریز آنکھیں ذرا سی دیر کے لئے نقاب کی اوٹ سے باہر نکل آئیں جس میں بیک وقت پیام و سلام کی دنیا جھکولے کھا رہی تھی۔

رات کا زیادہ تر حصہ شاطر نے حسین تصورات کی آغوش

بسر کیا۔

---

عید کی خوشیاں اپنے جلو میں ہزارہا رنگینیاں
لہتیں لیے ہوئے نمودار ہوئیں۔ رونی کے لمحات زندگی
ات سے بھرپور، بیم و رجا کی حالت میں گذر رہے
۔ عید کا سارا دن وہ گھر پر رہا۔ بالآخر یاس کے
رار یہ و یاس و حرماں کا مجسمہ بنا ہوا ڈپٹی صاحب
گھر پہنچا۔ میاں بیوی اور بچوں نے پر خلوص استقبال
۔ بچے گھسیٹ کر اسے تنویر کے کمرے میں لے آئے ۔
ید مبارک کا تحفہ" دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ پیش
گیا۔

فاخرہ لباس میں وہ افسانوں کی ہیروین معلوم
رہی تھی

"آپ تو افسانہ بن کر رہ گئیں"۔ نہ جانے رونی
نے یہ کیسے کہدیا۔

"افسوس ہے کہ افسانہ نویس نہ بن سکی"۔ جواب
ا دلکش تھا۔

ایک ادیب اور شاعر کے شایان شان کیا تواضع
ہوسکتی ہے۔

جواب بڑا مایوس کن دیا گیا "قطرۂ خون جگر"
بڑا رندا ہوا جملہ ہے یہ ——

اسے اختلاج سا ہونے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا
ور چپ چاپ اجازت لئے بغیر گھر چلا آیا۔ رات
افسانہ نویس کے سر پر پہاڑ بن کر نازل ہوئی۔ پہلی ہی
منزل گذار کر وہ لق و دق میدانوں میں بھٹکنے لگا۔ روشنی کی
دھندلی کرن مستقبل کے تاریک راہوں میں گم ہو کر رہ گئی۔
زندگی کے افسانے کو وہ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کر رہا تھا۔
اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کا افسانہ سسک سسک کر خاموش
ہو جائے۔ اس کے اپنے افسانوی خاکوں میں رنگ آمیزی

کیلئے "آنسو اور تبسم کی ضرورت تھی اور یہ دو چیزیں اسے
اپنے افسانوی ہیروین سے بھیک مانگنی پڑے گی۔

"ارے بیٹا!" بوڑھی ماں نے پکارا ——

"کیا ہے ماں" رات کی بے خوابی کا خمار لئے ہوئے
وہ باہر نکل آیا۔ بالوں کی ایک لٹ اس کی پیشانی پر
جھول رہی تھی

"اوہ! آپ" خوشی سے بھرپور کلمہ اس کی زبان
سے نکلا۔ ڈپٹی صاحب کی بیوی کو اس نے سلام کیا۔
بچوں کو پیار —— کل آپ ناراض ہو کر چلے گئے۔
تنویر ہمہ تن سوال بن کر رہ گئی۔ آپ کی تشریف آوری
کا شکریہ —— ڈپٹی صاحب کی بیوی سے اس نے کہا۔
تمہارے چچا ناراض ہو رہے تھے۔ کل تم بغیر کھائے پیئے
چلا گئے۔

اس نے ناسازی مزاج کا عذر پیش کیا ——
ماں نے بھی بیٹے کی تائید کی۔

رونی کمرے میں پہنچ کر میز پر پڑے ہوئے بے ترتیب
اشیا کو ٹھیک کرنے لگا۔

"میں کچھ مدد کر سکتی ہوں"۔ وہ اچانک مداخلت
کے لئے تیار نہ تھا۔

"نہیں شکریہ"۔

میز کے کاغذات سمیٹتے ہوئے، تنویر نے ایک
پیاڈ اٹھایا ——

یہ افسانہ —— جسے اسے بہت دنوں پہلے کی
بات یاد آگئی۔ مکمل ہو چکا ہوگا

"جی —— نہیں، افسانے کبھی کبھی نامکمل ہی رہ
جاتے ہیں"۔

بڑا خوش نصیب ہے یہ کمرہ"۔ تنویر نے بات کا
رخ بدل ڈالا۔ "یہاں کی فضا میں بڑے اچھے اچھے
رومان پروان چڑھنے لگتے ہیں"۔

"اور کبھی کبھی آہوں اور آنسوؤں کو بھی سمو لیتا ہے"
یہ کرہ؟ جملے نے کافی متاثر کیا۔
"آپ کی تو اصلاح" ـــ کل والا جملہ دہرایا گیا۔
"شعر اور افسانے گھول کر پلا سکتے ہیں آپ؟"
"پیٹ تو نہیں بھر سکتا۔"
"کچھ ہو، میری درخواست آج ٹھکرائی نہیں جا سکتی
آج میں آپ کا انکار سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"
"سنئے بانو، افسانہ زندگی کا ایک جزو ہوتا ہے
وہ افسانہ جو زندگی کے رگ و پے میں مدغم ہو کر کبھی
تڑپ اور کبھی کبھی رنگینی پیدا کرتا ہے۔ کبھی کامیاب اور
کبھی نامکمل بھی رہ جاتا ہے۔ اس کی کامیابی کا انحصار
اس کے پلاٹ اور کردار پر موقوف ہے اور یہی وجہ ہے
کہ افسانہ نگار کو افسانہ کی تکمیل کی خاطر بعض وقت دوسروں
کا دست نگر بھی رہنا پڑتا ہے۔
آپ بات کو بڑی گہرائی میں لے جاتے ہیں۔ کچھ
ہو۔ آپ ناامید نہ کیجئے۔ وہی نامکمل افسانہ ہی سنا دیجئے۔"
افسانہ کا آغاز بڑا دلچسپ اور متاثر کن تھا
ایک ہی سانس میں اسے ختم کیا گیا۔
"پلاٹ بڑا اچھوتا اور کردار بڑے حوصلہ مند
ہیں۔ جانے اس کا انجام کتنا دلفریب ہو گا۔"
"دلفریب!" وہ زیرِ لب دہرایا "کچھ نہیں ـــ
اس افسانہ میں ذرا بھی جان نہیں۔ کوئی زندگی نہیں، کوئی
تڑپ نہیں، محض کھوکھلا، بے جان، نامکمل ـــ آپ
نہیں جانتیں اس کی تکمیل کا انحصار ـــ میری ذات
سے نہیں ـــ بلکہ ایک اور ہستی سے ہے جیسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔"
سوال کیا گیا ـ "آپ اپنی افسانوی ہیروئن سے
کس چیز کا ایثار چاہتے ہیں۔"
"اس بے جان افسانے میں روح دوڑا دے کوئی،
تڑپ پیدا کی جائے اس میں، موت کی خاموشی کو زندگی

میں بدل ڈالے ـــ ورنہ آپ جانتی ہیں یہ افسانہ یونہی
یوں ہی ادھورا رہ جائے گا۔ یوں ہی بے موت مر جا
ـــ وہ جذبات کی رو میں کہیں سے کہیں بھٹک گیا
اور کہنے لگا "اس طرح سسک سسک کر مرنے سے بہتر
تو یہ ہے کہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ ختم ہو جائے۔
اس کاغذ کے پرزے کی کوئی قیمت نہیں، کوئی وقعت
نہیں، کوئی زندگی نہیں" ـــ افسانہ جو اس کے ہاتھ
میں تھرتھرا رہا تھا، چاہا کہ پرزہ پرزہ کر ڈالے۔
"ٹھہرئیے!" تنویر چیخ اٹھی ـــ "خودکشی نہ کیجئے
اپنی اور دوسرے کی ـــ آپ جانتے ہیں اس افسانے
کے ساتھ کتنی زندگیاں وابستہ ہیں" یہ کہتے ہوئے تنویر
پر دو متضاد کیفیتیں طاری ہو گئیں ـــ لبوں پر تبسم۔
اور آنکھوں میں آنسو"ـــ
"آنسو ... اور تبسم" نوجوان ادیب چلایا۔
"افسانہ کی تکمیل کے لئے" ـــ تنویر نے بڑھ کر
افسانہ کے کاغذ کو روفی کے ہاتھ سے چھین لیا ـــ
آنکھوں سے آنسو ٹپک کر اس کے افسانہ میں جذب
ہو رہے تھے۔
"تنویر!" ـــ وہ تقریباً خوشی سے پاگل ہو گیا
ـــ تم اپنی لازوال محبت کی بھیک دے کر میرے مردہ
افسانہ میں جان ڈال دی ـــ روح دوڑا دی اس
میں ـــ لازوال، لافانی بن کر رہ گیا یہ افسانہ"
یہ افسانہ، تنویر چپ چاپ اس کے ہاتھوں
میں تھما کر باہر چلی گئی۔
"تنویر" ـــ اس کی آواز میں مسرت کارفرما
تھی، نخوت اور کامرانی کا جذبہ آنکھوں میں امنڈ آیا۔
ـــ جذبات کا ایک طوفان دل میں ابل پڑا، تکمیل
افسانہ کی خاطر وہ میز پر آ بیٹھا ـــ
"تنویر تمہاری مسکراہٹ نے میرے مردہ افسانے

جان ڈال دی۔ رنگینی پیدا کر دی اور ان آنسوؤں کی
ــــ نے بےچینی کی روح پھونک دی۔ تمہارے رنج و خوشی
انگیز کیفیات میری زندگی کے رنگ دیے ہی مدغم ہو کر
ری کا جانب پروانہ کرنے لگے ہیں۔ جب میں دن بھر
ں فائلوں کے انبار میں گھرا ہوا عرق عرق ہو جاؤں گا۔
مجھے اپنی پیشانی سے ٹپکنے والی پسینے کی بوندوں میں تمہاری
بت درخشاں نظر آئے گی۔ تمہاری آنکھوں سے ٹپکا ہوا
نسو کا قطرہ ــــ۔ افق پر چمکنے والے روشن ستارے
ماند میری تاریک راتوں میں صبح کا پیام لے آئے گا۔
ت کی تنہائیوں میں تمہارے تبسم کی جھلکیاں میرے کمرے
ربعہ نور بنا دے گی ــــ اب میری ضعیف ماں کی بیماری
ود بخود دور ہو جائیگی ــــ اس لئے کہ میرے ہونٹوں پہ

اور آنکھوں میں طمانیت دیکھ کر انھیں چین کی نیند سلا
دے گی۔ ڈپٹی صاحب کو اب میرے بغیر کھائے بنے چلے
کی کوئی شکایت نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اب مری خوشیوں کا مرکز
وہی گھر مقصود ہوگا جہاں صرف تمہارا تبسم اور آنسو میرا استقبال
کرنے کے لئے موجود رہے گا"۔ ــــ شدت جذبات سے روفی
کانپ اٹھا اور قلم اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑا ــــ میز کا سہارا
دیئے ہوئے وہ جھک پڑا ایک ملائم محبت کا ہاتھ ــــ اس کی
طرف اٹھا ــــ دفعتاً وہ رک گیا۔ تنویر نے میز پر پڑے ہوئے
کاغذ کے پلندے کو اٹھایا ــــ ایک ہی سانس میں اس نے مختلف
کیفیات لئے ہوئے افسانے کے آخری حصہ کو ختم کر ڈالا۔
غیرارادی طور پر اس کے سینے سے آہ نکلی ــــ افسانہ نگار خوابوں
کی دنیا سے چونک پڑا۔ "اوہ! تم ــــ" "اف کتنا حسین دلکش
اور اچھوتا ہے آپکے افسانہ کا آغاز اور اس کا انجام بھی ــــ

# ادارۂ ادبیات اردو کی چند کتابیں

**اسلامی عدل گستری** از محمد عبدالحفیظ صاحب صدیقی۔ دس ابواب کے تحت اسلامی تصور قانون اور طریقۂ عدل پر نظر ڈالی گئی ہے۔ صفحات (۹۶)۔ قیمت ۱۲؍

**مسلمان شاہی خاندان** از محمد عبدالرحمن خاں صاحب سابق پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ۔ یہ کتاب مشہور انگریز مورخ اسٹینلی لین پول کی مستند تاریخ سے ماخوذ ہے اور فاضل مرتب نے اس میں جگہ جگہ اپنی طرف سے اضافے کئے ہیں اور بعد کے زمانے کے تاریخی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح یہ مسلمانوں کی تاریخ کے متعلق یہ کتاب ایک مستند اور مکمل حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو خاص اہتمام سے مع نقشوں اور شجروں کے مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ صفحات (۳۱۲) قیمت پانچ روپے

**دادابھائی نوروزجی** از محمد ظہیرالدین احمد صاحب صفحات (۱۶) قیمت ۴؍۔ ہندوستان کے پارسی قوم پرست کے حالات زندگی۔

**ریاض مختاریہ** از دلاور علی دانش۔ دکن اور خاص کر مختار الملک کے خاندان کی تاریخ۔ صفحات (۴۰۴)۔ قیمت پانچ روپے۔

**بلقان** از حفیظ صدیقی صاحب۔ بلقان کے سیاسی حالات اور دوسرے ممالک سے اس کے تعلقات۔ قیمت ۴؍

# ادارے کی جدید مطبوعات

## معاصرین کی نظر میں

### تاریخ بالکنڈہ

**"الفاروق" ہفتہ وار (کامٹی - ایم، پی) اپریل ۱۹۵۶ء**

ادارہ ادبیات اردو قابل مبارک باد ہے کہ جس کی کوششوں سے حیدرآباد اور اس کے نواح ومضافات کی تاریخ کے مختلف گوشے روشنی میں آجاتے ہیں۔ اس ادارہ نے مقامی، شخصی اور قومی تاریخوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں زیر نظر کتاب "تاریخ بالکنڈہ" کو ایک اچھا خاصہ اضافہ قرار دیا جائیگا۔ حیدرآباد اور گولکنڈے کی شہرت اور اہمیت نے بالکنڈہ کو اب تک نظروں سے اوجھل رکھا۔ لیکن اب اس کتاب نے بالکنڈہ کے ماضی کو کافی شرح وبسط سے ہمارے سامنے رکھ کر اس کی اہمیت کو اجاگر کر دیا ہے۔ مولوی منشی محمد فیض الدین احمد صاحب صدیقی نے ایک طویل عرصہ کی محنت اور عرق ریزی کے بعد بالکنڈے سے متعلق جو تاریخی مواد جمع کیا ہے اس کو پوری قابلیت اور متانت کے ساتھ تاریخ بالکنڈہ کے نام سے مرتب فرمادیا ہے۔

---

**برہان (دہلی) اپریل ۱۹۵۶ء**

بالکنڈہ حیدرآباد دکن کا مشہور قصبہ ہے جہاں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے سے اب تک بڑے بڑے نامور امراء، نواب، جاگیرداران، اولیاء اور علماء پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لائق مصنف نے پندرہ سال کی عرق ریزی اور محنت کے بعد اس قصبہ کی تاریخ مستند مآخذ کی مدد سے لکھی ہے۔ اگرچہ یہ صرف ایک قصبہ کی تاریخ ہے لیکن اس سلسلہ میں جن نامور شخصیتوں کا ذکر آگیا ہے اس کی حیثیت صرف مقامی نہیں تھی۔ بلکہ ان کے فیوض وکمالات کی شہرت دکن کے علاوہ ملک کے دوسرے گوشوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اثرات شمالی ہند میں بھی نظر آتے تھے۔ اس بنا پر اس کا مطالعہ اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کے لئے مفید ہوگا۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کی ہمت وجوانمردی لائق داد ہے کہ وہ موجودہ ناسازگار اور حوصلہ شکن ماحول میں بھی دکن کے ادب اور تاریخ سے متعلق ایسی قابل قدر کتابیں برابر شائع کر رہا ہے اور اپنی روایات سابقہ کو بہر طور قائم رکھے ہوئے۔

---

عطیہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

ادارۂ ادبیات اردو کا ترجمان

ماہنامہ

# سب رس

حیدرآباد دکن

نگران

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ

رمن راج سکسینہ

نصیر الدین ہاشمی

جانکی پرشاد


جلد (۲۰) شمارہ (۹، ۱۰) ماہ ستمبر و اکتوبر سنہ ۱۹۵۶ء

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی " تین " "
قیمت:- ایک روپیہ

مہتم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "مطبع ابراہیمیہ" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا۔

# فہرست

# یاد کرو

حیدر آباد کے احباب کے نام
مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ وصول ہونے پر

کس طرح سیلِ طرب کا تھا رواں یاد کرو　　تھا کوئی تلخیِ حقائق کا گماں؟ یاد کرو
افقِ فکر پہ الفاظ و معانی کا طلوع　　وہ مرے چاکِ گریباں کا سماں یاد کرو
مرے اشعار میں وہ سوزِ مسلسل کی نمود　　مری آواز کا وہ کیفِ نہاں یاد کرو
صبح ہوتی ہے تو ہر بزم اجڑ جاتی ہے　　دوستو! بزمِ شبانہ کا سماں یاد کرو
مجھ سے اب شرکتِ محفل کی توقع ہے فضول　　مرا بھولا ہوا اندازِ بیاں یاد کرو
آج خاموش ہوں اے اہلِ چمن! میں لیکن　　کل جو اتری تھی دلوں میں وہ فغاں یاد کرو
جو نہ مشرق میں تھا اور نہ مغرب میں رکا　　مرے اشعار کا وہ سیلِ رواں یاد کرو
جو گلستاں پہ چھائی تھیں خزاں سے پہلے　　وہ بہاریں، وہ بہاروں کا سماں یاد کرو

اپنے ناوک کا ہدف آپ ہوں میں آج مگر
دور وہ جس میں کشیدہ تھی کماں یاد کرو

جگن ناتھ آزاد

# غزل

یہاں تلاش نہ کر حکمت و ہنر کے چراغ
نفس نفس کے بجھے ہیں نظر نظر کے چراغ

بھٹک رہے ہیں انھیں منزلوں میں آج بھی ہم
ہمارے کام نہ آئے یہ رہگذر کے چراغ

دلوں میں روشنی پیدا نہ کر سکیں تو فضول
مری نظر کے ہوں یا آپ کی نظر کے چراغ

سنبھل سنبھل کے بڑھیں اہل قافلہ کہ ابھی
بجھے ہوئے ہیں ابھی دستِ راہبر کے چراغ

وہ جن کو آج کوئی منزلت نہیں حاصل
انھیں سے آج بھی روشن ہیں بام و در کے چراغ

کسی طرح بھی اجالیں گے ہم نشیمن کو
اگر ہوا تو جلائیں گے بال و پر کے چراغ

ہر اک مقام سے نکہتؔ گزرتا جاتا ہوں
مری نگاہ میں ہیں عظمتِ بشر کے چراغ

نکہتؔ بریلوی

# غزل

وہی دھندلکے وہی اداسی سحر یہ کوئی سحر نہیں ہے
شکست کی اطلاع ہے نادان نویدِ فتح و ظفر نہیں ہے

مرے رفیقو، مرے عزیزو تمھیں یہ شاید خبر نہیں ہے
جہاں لٹا کارواں ہستی وہ عشق کی رہگذر نہیں ہے

بشر ہوں درکار ہے کمالِ وجود و معراجِ آدمیت
مرے تخیل کو جستجوئے فرازِ نجم و قمر نہیں ہے

یہ تشنگیٔ جمالِ جاناں خود اس کی گردن مروڑ دیگی
اسی کی خاطر غمِ زمانہ پہ چیں کی اب تک نظر نہیں ہے

شباب پر ہوں اگر عزائم تو کھینچ لیتی ہے خود ہی منزل
انھیں ضرورت ہے راہبر کی جنھیں خود اپنی خبر نہیں ہے

اخترؔ کاظمی پوری

# غزل

سال و ماہ و روز و شب
چکراتے ہیں سب کے سب

صاحبِ دل! دنیا طلب
شرمِ دلِ نذرانہ طلب

احمق کا علامہ لقب
خاتمۂ تہذیب و ادب

شانہ بشانہ رنج و تعب
تازہ بہ تازہ قہر و غضب

عشق کا ڈھب ہے حسن طلب
عشق طلب ہے حسن کی چھب

عشق و حسن بحالِ رقص
سینہ بہ سینہ لب بر لب

ابنِ آدم ہوش کی لے
ہوش ربا ہے بنتِ عنب

اس سے ہمیشہ بچ کر رہ
اقرب بھی ہے کالعقرب

آگ لگا کر آگ میں ہیں
ابن الوقت اور ابولہب

سید محمد حسین آزاد

# غزل

اسیرِ وحشتِ دل بن گئے ہیں
ہم اب جینے کے قابل ہو گئے ہیں

بھلا ایسے غموں کا غم ہی کیا ہو
جو جزوِ ہستیٔ دل بن گئے ہیں

بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے
تہِ گرداب ساحل بن گئے ہیں

جنوں پرور عزائم بڑھتے بڑھتے
چراغِ راہِ منزل بن گئے ہیں

جنھیں حاصل ہوا ہے قرب تیرا
وہ ذرے ماہِ کامل بن گئے ہیں

جو تھے وابستگانِ زلفِ پیچاں
سزاوارِ سلاسل بن گئے ہیں

دعا ہم اہلِ محفل ہی کو دیجے
حضور اب جانِ محفل بن گئے ہیں

فقط اک جذبۂ پنہاں سے منشاؔ
ہزاروں کارِ مشکل بن گئے ہیں

محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ

# غزل

یہ سبک ٹھنڈی ہوائیں، یہ کنارِ آب جو
چھیڑ دے چھیڑے سے مطرب! زندگی کا راگ تو
ہر گھڑی رکھتا ہے مجھ کو مثلِ سیماب تو
اے دلِ بےتاب کہہ دے کیا ہے تیری آرزو
ہے تڑپ سینے میں نکلوں آسمانوں سے پرے
اک قفس میرے لئے ہے یہ جہانِ رنگ و بو
ڈال دے کشتی بھنور میں جانبِ ساحل نہ دیکھ
گر ہے جینے کی تجھے بحرِ جہاں میں آرزو
لے رہا ہے کروٹیں روئے زمیں پر انقلاب
لایا آخر رنگ دنیا میں غریبوں کا لہو
بزم ہائے عیش و عشرت کا نہیں ہنگام یہ
پھینک دے مے ساقیا! اور توڑ دے جام و سبو
ہوگا انجامِ محبت کیا ارے ظالم بتا!
پیکرِ مہر و وفا میں! بےوفائی تیری خو
کھل نہ جائے دیکھنا! محفل میں رازِ دل کہیں
اے دلِ بیتاب رکھنا عاشقی کی آبرو
دوست اس دم تو مری تنہائی کا عالم نہ پوچھ
کر رہا ہوں خامشی میں یار سے میں گفتگو
پیچ و خم ساجد بہت ہیں راہِ الفت میں مگر
جھومتا گاتا چلا چل سوئے منزل گاہ تو

رحمان ساجد

# غزل

یوں تہہ دریا سے طوفاں بن کے اٹھے ہیں حباب
جو الٹتے جا رہے ہیں صفحۂ گیتی کے باب
اے مہ و خورشید میرے صبحِ آزادی کے نور
کس قدر پرکیف ہیں تیری تمناؤں کے خواب
مفلسی کی لاش ہے یا اہرمن کے دوش پر
زر پرستی بن گئی ہے حق پرستوں پر عذاب
خود ہی انساں رنگ رہے ہیں خونِ انسانی سے ہم
سازِ زر پر بج رہا ہے زندگانی کا رباب
موج بن پاتے نہیں ساحل سے ٹکراتے نہیں
سینۂ دریا پہ کتنے ٹوٹ جاتے ہیں حباب
عصمتوں کو لوٹتے ہیں چند سکوں کے عوض
اپنی عیاری پہ ڈالے زر پرستی کے نقاب
کس طرح دامن میں لاکھوں عیب کو سمیٹے ہوئے
کس طرح معصوم ارمانوں پہ بنتے ہیں عتاب
جب سے ٹوٹنے جا رہے ہیں وہ حجاباتِ دوئی
کتنے دل کش بن گئے ہیں اپنے مستقبل کے خواب
کیا کوئی تجدیدِ الفت دل سے ہے دل نے کیا
کیوں سکونِ دل پہ چھائے جا رہے ہیں اضطراب
سوزِ دل، سوزِ جگر، سوزِ دروں کو کیا کہوں
کتنی تلخیوں سے بھر کر دی ہے ساقی نے شراب

زبیدہ تحسین

# غزل

رلیں ہے افلاک کی خاک نشیں ہوں مگر
تو خس و خاشاک کی حوصلہ افزائی کر

پاس ہے کچھ زادِ رہ اور نہ رختِ سفر
کچھ نہ کیا جیتے جی، کچھ نہ ہوا عمر بھر

حسن کا صدقہ سہی کر لے کونین سر!
عشق کو حاصل ہوئی مملکتِ بحر و بر

دے مرے اللہ اگر کاوشِ دل کا ثمر
"میری نوا میں اثر، میری فغاں میں اثر"

راہِ محبت طویل، منزلِ الفت بلند
عقل و خرد سست رو، عشق و جنوں تیز تر

میری جبیں سائیاں باعثِ صد فخر ہیں
نام لیا تک نہیں، جھک گیا چوکھٹ پہ سر

آدمی کا آدمی، ہوگیا دشمن ہے اب
دیکھئے ہوتا ہے کیا میرے وطن کا حشر

پایہ زمیں ہے خرد سر بفلک عشق ہے
اصل سے دونوں کی ایک بُعد ہے کیوں اس قدر

تاج نہ بن آئی کچھ تھک گئے لقمانِ وقت
اڑ گیا افلاک پر طائر لیے بال و پر

تاج کریمنگری

# غزل

اپنے سلوک پر وہ پشیماں ہوئے تو ہیں
آثارِ زندگی کے نمایاں ہوئے تو ہیں

پھر ہم حریفِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں
قسمت کے جاگنے کے پھر امکاں ہوئے تو ہیں

ہم بھی تباہ ہوگئے، ہم پر بھی ہم نشیں
آزادیٔ وطن کے کچھ احساں ہوئے تو ہیں

ان کو بھی دو سبق اے زمانے کی گردشو
کچھ لوگ زیست پہ یہاں نازاں ہوئے تو ہیں

کیا گل کھلائے دیکھئے اب کے بہارِ نو
گلشن میں پھر بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

واقف نہ تھے جو میری حقیقت سے اے نظر
وہ لوگ اب انگشت بہ دنداں ہوئے تو ہیں

فیروز نظر

# غزل

جہل کی توقیر و عزت عام ہے
علم کی عزت برائے نام ہے

شاعری افلاس کا اک نام ہے
اور شاعر خوگرِ آلام ہے

صبح سمجھا ہے جسے وہ شام ہے
خوابِ غفلت کا یہی انجام ہے

دیس میں بیروزگاری عام ہے
حریت کا کیا یہی انجام ہے

ایسے ہاتھوں میں سیاسی باگ ہے
کوئی ڈھولی ہے، کوئی حجام ہے

کھانے والوں کا کوئی شاکی نہیں
پینے والا مفت میں بدنام ہے

چل رہے ہیں وہ جو سیدھی راہ پر
رہنما کو ان سے پھر کیا کام ہے

زیست کی دعوت ہے موسیقار کو
شاعروں کو موت کا انعام ہے

حسن خود ہے دامِ وارفتگی
عشق ناحق موردِ الزام ہے

وصل کی شب بیمِ فرقت الاماں
کیا مسرت کا یہی انجام ہے

وہ ستائش کی تمنا کیا کرے
جس کو حاصل لذتِ دشنام ہے

طاقتِ رفتار کب زائل ہوئی
جب کہ منزل رہ گئی دو گام ہے

ابو سعد سید اسمٰعیل سید

# غزل

غنچہ غنچہ گلشن گلشن
پھول بہ کثرت خرمن خرمن

گوشہ گوشہ فتنہ فتنہ
کوئی نہیں ہے وادیٔ ایمن

کانپ رہی انسانیت
جہل و حسد ہیں دشمن دشمن

صنعت و تجارت ترساں ترساں
قدم قدم پر رہزن رہزن

نرگسِ فتنہ ساز کا ایما
دست و گریباں شیخ و برہمن

نذرِ چشمک برق تپاں ہو
کاش کھلے تقدیرِ نشیمن

ابرِ گریہ آہِ سوزاں
کیسے ہوا ابر و برق میں اَن بن

پڑ گیا رنگیں عکسِ مہ رو
دنیا ہے ذرہ ذرہ درشن

آئی عروسِ فصلِ بہاراں
مور کا جیسے رقص ہو بن بن

رہ رہ کے اک محشر اٹھا
جب وہ ٹہلے باغ میں بن ٹھن

مد و جزرِ کیف و کم ہے
حسنِ عریاں چاند کا جوبن

اس کی عطا اور یہ انداز
میں ہوں اور کوتاہیٔ دامن

دہر کی رنگا رنگی جواں ہے
دیکھو ذکی وہ پیاری چتون

محمد عبد السلام ذکی

# علامہ رضا علی وحشت

از:۔ جناب صمد حمیدی صاحب

۵ جولائی ۱۹۵۶ء کو ایک چراغِ شب تاب بجھ گیا جس کا پورا نام علامہ رضا علی وحشتؔ کلکتوی تھا۔ بعض لوگ انھیں بلبلِ بنگال بھی کہتے ہیں اور یہ کہنا صحیح بھی ہے کیونکہ بنگال کے چمن میں جس بلبل کی چہکار نے دور دور تک دھوم مچائی تھی ان میں سرِفہرست علامہ وحشتؔ کا بھی نام لیا جا سکتا ہے۔

سنہرے ریشے اور زرتار لڑیوں اور ہرے بھرے پودوں کی سرزمین — بنگال ہر زمانے میں علم و ادب، شعر و موسیقی اور آرٹ و مصوری کا گہوارہ رہی ہے۔ اس لئے یہاں ہر زمانہ اور ہر صدی میں علم و ادب کے شیدائیوں اور شعر و موسیقی کے دلدادگان کی ایک جم غفیر دیکھنے میں آئی ہے۔ آج بھی بنگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ فنونِ لطیفہ، شعر و موسیقی اور مصوری کے معاملے میں اس کا ثانی نہیں اور یہی چیز اسے ہر زمانہ و ہر صدی میں ممتاز، باعثِ افتخار اور امر بنائے رکھتی ہے۔

بنگال کی سرزمین سے جہاں رام موہن رائے جیسے مصلح قوم راما کرشن اور وویکا نند جیسے مذہبی پیشوا، سی آر داس اور اسوتوس مکرجی جیسے قانون داں، سر جگدیش چندر بوس جیسے سائنس داں اور سوباش چندر بوس جیسے سیاسی رہنما ابھرے وہیں ٹیگور، بنکم چندر چیٹرجی، سرت چندر چیٹرجی، قاضی نذر الاسلام اور رضا علی وحشتؔ جیسے ادیب و شاعر بھی ابھرے جن کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا — ۹ موخر الذکر کو چھوڑ کر بقیہ سب ادبا و شعرا و بنگالی ادب، کلچر، شعر و سیاست کے دلدادہ نمائندہ اور تصویر کشی کرنے والے تھے لیکن رضا علی وحشتؔ میں یہ خوبی تھی کہ وہ نہ صرف بنگالی ادب و کلچر، شعر و موسیقی اور مصوری سے گہرا ربط رکھتے تھے بلکہ گنگا جمنی کلچر، ادب و تہذیب اور شعر و سیاست کے بھی دلدادہ، نمائندہ اور جیتا جاگتا پیکر بھی تھے۔ ساتھ ہی موجودہ دور کے بڑے شاعر اور استاد بھی تھے جن کا اخلاقی برتاؤ، جود و سخا، کرم و بخشش اور دوست پروری مثالی تھا اور جس پر جتنا فخر و غرور نہ کیا جائے کم ہے اور انھوں نے اس ریاست بنگال میں جہاں کے بنگالی ادب و کلچر، شعر و سیاست اور موسیقی کا اس درجہ غلبہ اور چرچا تھا موجود دور میں اردو شعر و شاعری کی وہ بھرپور شمع جلائی اور اس کو اس درجہ تابناک بنا دیا کہ اسی کی لو سے ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا چراغ ہوا یہ جلتا چلا گیا جس کا سلسلہ آج بھی دراز ہے اور آج شاید اس کی برکت سے اس ریاست میں اردو ادب و شعر و صحافت کا اس درجہ غلبہ اور چرچا ہے کہ اچھے سے اچھا اردو داں ریاست میں دیکھنے میں نہیں آتا — ویسے دیکھا جائے تو یہاں اردو کی باضابطہ طور پر بنیاد اس وقت پڑی جب فورٹ ولیم کالج کا اجرا عمل میں آیا جہاں کمپنی کی حکومت نے اپنی حق آسانی اور ذوقِ حکومت پوری کی ہی اس کی ترویج و اشاعت اپنا فرض گردان کر اس کے ذریعے انگریز افسروں کو تعلیم و تدریس کا

عام رواج شروع کیا اور یہ شاید اٹھارھویں صدی کی بات ہے کہ فارسی کے ساتھ اردو بھی ہندوستان کی عدالتی زبان قرار پائی تھی جس میں ولی دکنی، امیر خسرو اور نظیر اکبرآبادی جیسے لوگوں نے اپنے شعر و شاعری کا باضابطہ آغاز کر دیا تھا تو اسی طرح یہاں اردو فورٹ ولیم کالج کے ساتھ پھلنے پھولنے اور ترویج و اشاعت پانے لگی اور ادب و شعر کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کی جو کا سلسلہ آج وحشت مرحوم سے آکر مل جاتا ہے، یہ بات نہیں کہ اس درمیان میں یہاں اردو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد میں معتدبہ کمی رہی ہو بلکہ بعض وقت تو ایسا ہوا ہے کہ اس کی کثیر تعداد نے تنقید نگاروں کے لئے سوالیہ نشان ڈال دیئے ہیں اور اردو ادب کے محتسب اور تنقید نگار حضرات تو اس سے بخوبی واقف ہوں گے کہ کلکتہ کے بعد مرشدآباد اور پھر ڈھاکہ اس دبستان شعر و شاعری اور اردو کا گہوارہ رہا ہے جہاں کے ادب و شعر کے دلدادگان نے اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق کلام موزوں کئے ہیں اور داد و دہش اور خلعت فاخرہ سے نواب شاہی دربار میں نوازے گئے ہیں اور ایک وقت وہ آیا ہے کہ حضرت غالب کے بھی کچھ یہاں شاگرد پیدا ہو گئے ہیں جہاں کہ وہ جب اپنی بھی مزدوریوں کے تحت تشریف فرما ہوتے ہیں تو اس کی دلفریبی، رنگینی، دلکشی اور حسن سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ انھیں اپنا تاریخی شعر کہنا پڑتا ہے ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے اے ہم نشیں  اک تیر میرے جگر پہ مارا کہ ہائے ہائے

ہو سکتا ہے بعض لوگ اس کی تاریخی حیثیت سے ناواقف ہوں لیکن جس لحاظ سے تحقیق و تنقید اور انکشاف سے کام لیا جا رہا ہے اس کے پیش نظر یہ امید کی جاتی ہے کہ اس کا بھی سراغ کر رہے گا اور اس طرح حضرت غالب سے لے کر حضرت وحشت تک سبھی بنگالی ادباء و شعراء نے اس کی دلپذیری، خوش سلیقگی اور حسن سے متاثر ہو کر ایسی شاعری کی ہے کہ گاہے خوشی و مسرت کی تیز و تند لہر اور گاہے درد و کسک اور یاس و حرمان کی بلند و بالا کیفیت ہمارے رگ و ریشے اور ذہن و دل میں پیدا ہوتی چلی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم بعض وقت بے قابو سے ہو کر رہ جاتے ہیں جس کا ثبوت دیگر کے ساتھ حضرت وحشت کے کلام بلاغت نظام کے مطالعہ سے ملتا ہے جو بڑی وصف کے ساتھ بڑی خرابی بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ میری ان آراء سے اختلاف ظاہر کریں تو ان کو اختیار ہے کہ وہ جس طور سوچیں، سمجھیں اور ان کے شعروں کا تجزیہ اور تحلیل نفسی کریں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کی جلائی ہوئی شمع شعر و شاعری آج اتنی روشن اور ترقی پذیر ہے کہ کوئی بھی طوفان تیز و تند اور باد مخالف اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی۔ یوں تو حضرت وحشت کو اس کے لئے کتنے بھی پاپڑ نہ بیلنے پڑے ہوں، ناز برداریاں اور عشوہ طرازیاں اٹھانی پڑی ہوں، کم ہیں اور شاید اسی عرق ریزی، دماغ سوزی اور درس و تدریس اور اصلاح کا اثر ہے کہ آج اس سرزمین بنگال میں نت نئے گل و لالہ و نسترن کھل کر اپنی اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور لوگوں کے دلوں کو معطر اور مشام جان بخش کر مسخر کر رہے ہیں ورنہ کہاں یہ دور پر آشوب اور کہاں یہ خطۂ بنگال جہاں کے بنگال نواسی صرف بنگالی ادب دیگر، شعر و سیاست اور موسیقی کا نعرہ لگانا اور اور ان پر جان چھڑکنا اپنا فرض اور فخر گردانتے ہیں اس میں اس ادب اردو اور شعر و شاعری کا بول بالا اور چرچا ہو جانا کم تعجب خیز امر نہیں ہے جس کے لئے انھیں دیگر کے ساتھ ہدیۂ تبریک و تہنیت اور عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر سب سے تعجب خیز امر اگر ہے تو یہ کہ وہ اس پیران سالی اور ضعیفی میں ترکِ وطن کر کے کلکتہ سے ڈھاکہ جا رہے ہیں جہاں سے کہ وہ بقول شاعر

؎ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

کے مصداق وہیں پیوند خاک ہو گئے جس کے نتیجے میں اس دبستان بنگال کی شعر و شاعری کا جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ اک چراغ عضب تاب بجھ گیا اور تشنگان علم و ادب اور شعر و شاعری کو بہت بڑے چرکے دے گیا جن کی خصوصی امیدیں اور ارتباط آپ کے دم قدم سے وابستہ تھیں اور جو آپ کی تلمیذی اختیار کر کے اپنے فن کو جلا بخشنا اپنا فخر گردانتے تھے۔ ویسے دیکھا جائے تو اس شہر کلکتہ میں اور اس کے باہر اب بھی آپ کے چاہنے والوں اور شاگردوں کی تعداد نہ پہلے کم تھی نہ اب ہے تو پھر یہاں سے ڈھاکہ جا بسنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی جہاں کے آپ کس مپرسی اور بیچارگی اور بیماری کی زندگی سے دو چار ہوئے تو پھر کیا ضرورت تھی کہ ایسی فضیحت اٹھائی جاتی۔ ان کی بیماری، ضعیفی اور کس مپرسی جانشین داغ حضرت بیخود دہلوی سے ملتی جلتی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ حضرت بیخود نے قالب وحشت میں دوبارہ جام مرگ پیا ہو تو اب ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں پر لازم آتا ہے کہ وہ ان کی شخصی روایات اور شعری خصوصیات کو لے کر آگے بڑھیں اور ان کے نام کو چار چاند لگا کر ان کا صحیح معنوں میں جانشین اور شاگرد ہونے کا ثبوت بہم پہنچائیں اور تب ہی ان کی روح کو دائمی امن و سکون اور راحت نصیب ہو سکتی ہے۔

## ۱۷۔ جناب فارا شدی صاحب

"علامہ رضا علی وحشت کلکتوی ۷۵ سال کی عمر میں بمقام ڈھاکہ انتقال فرما گئے"۔ یہ روح فرسا خبر اخبارات میں نہایت غم و اندوہ کے ساتھ پڑھی اور ریڈیو کے ذریعہ سنی گئی۔ موجودہ بحرانی اور انقلابی دور میں جبکہ اساتذہ سخن ایک ایک کرکے اللہ کو پیارے ہو رہے ہیں اور اردو شاعری باعتبار فن و زبان آغوش فنا میں سسکتی نظر آتی ہے علامہ وحشت مرحوم جیسی عظیم شخصیت، بلند مرتبت شاعر، یکتائے روزگار استاد، جلیل القدر نقاد اور سب سے بڑھ کر عدیم المثال انسان کا دم غنیمت تھا۔ لیکن آہ! دست اجل نے عیدالضحیٰ کے مبارک موقع پر اس کے تیسرے دن انھیں ہمیشہ کے لئے ہم سے چھین لیا۔ بلاشبہ وحشت کی وفات حسرت آیات نہ صرف اہل بنگال بلکہ ساری دنیائے ادب کے لئے سانحہ عظیم ہے جس کی تلافی بہت مشکل ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ وحشت کے والد بزرگوار حکیم مولوی شمشاد علی ہوگلی (مغربی بنگال) کے رہنے والے تھے۔ وحشت کی تاریخ پیدائش ۱۸ نومبر ۱۸۸۱ء بمقام کلکتہ ہے۔ ۱۹۰۸ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے انٹرنس پاس کیا۔ کچھ عرصہ تک پرشین آفس امپیریل ڈپارٹمنٹ میں چیف مولوی کے عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۹۲۷ء میں حسن خدمات کے صلہ میں سرکار برطانیہ کی طرف سے خطاب "خان بہادر" تفویض ہوا۔ پنشن کے بعد دوبارہ ۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء لیڈی برابورن کالج کے عہدۂ پروفیسری پر مامور رہے۔ تقسیم بنگال کے بعد ڈھاکہ عظیم پورہ میں ہجرت کی اور آخرکار ۲۱ جولائی ۱۹۵۶ء کو دارالبقا میں ہمیشہ کے لئے جا بسے۔

علامہ وحشت ڈاکٹر اقبال، حسرت موہانی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی، بیخود دہلوی وغیرہ جیسے

اکابرِ سخن کے ہمعصر تھے۔ ایک غزل گو استاد کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ عصرِ حاضر میں وحشت کا شمار ان منفتم اساتذہ میں ہوتا تھا جن کے دم سے اعتبارِ فن باقی اور حسنِ تغزل زندہ ہے۔ وحشت کی شاعری کا تمام تر حصہ ندرتِ مضامین، پرواز تخیل، حسین استعاروں کے دلفریب نقوش کی فراوانی سے نگار خانۂ چین بنا ہوا ہے۔ ان کی فطری متانت کا اثر ان کے کلام میں بھی نمایاں ہے۔ ۱۹۱۰ء میں وحشت کا پہلا دیوان شائع ہوا تو مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی، شرر لکھنوی، وقار رامپوری، نظم طباطبائی، ظہیر دہلوی، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور محشر لکھنوی جیسے ماہرین فن اور نقادانِ سخن نے تحسین آمیز مکتوبات لکھے اور وحشت کی بلندیِ فکر، اسلوب خاص اور انفرادی رنگ تغزل کا اعتراف کیا۔ وحشت فارسی ترکیبوں سے اکثر کام لیتے تھے جس سے کلام میں ایک دلکشی اور رعنائی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس خاص روش میں انھیں وہ کمال حاصل تھا جو غالب کے بعد اور کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ وحشت نے جس خوبی اور کمال کے ساتھ غالب کا تتبع فرمایا تھا وہ ان کے غالب ثانی ہونے کی زندہ شہادت تھی۔ ۱۹۵۰ء میں مکتبہ جدید لاہور سے وحشت کا دوسرا مجموعہ کلام "ترانہ وحشت" بڑی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ جس کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ وحشت ایک ہمہ گیر اور بے پناہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری نے غزل میں ہم کو وہ دلکش ترانے خود آگاہی، درس اخلاقیات، حق بینی، حقیقت بیانی اور فطرت شناسی عطا کی ہے۔ جو فلسفۂ حیات کا ایک روشن پہلو ہے یعنی زندگی کے جس فلسفہ کو سنائی، عطار، رومی، جامی، غالب اور اقبال نے شعر کے دلکش، وجد آور اور زود اثر پیرائے میں ادا کیا تھا وہی زندگی کے معارف و حقائق وحشت کی غزل میں بھی پیدا و ہویدا ہیں۔ غزل جو موجودہ دور انحطاط میں انتہا پسند نظریات کے مقابلہ میں اب تک کھڑی ہے اس میں وحشت جیسی عظیم شخصیت کا خاص حصہ ہے۔

دنیا کے بہت سے بڑے فنکاروں کی طرح وحشت مرحوم کی زندگی کے آخری لمحات بھی بڑی عسرت اور کسمپرسی کی آغوش میں گذرے۔ مرحوم گذشتہ تین چار سال سے نہایت نحیف و ناتواں ہوتے جا رہے تھے۔ بینائی بھی رفتہ رفتہ جواب دے رہی تھی اور نشست و برخواست مشکل تھی۔ ان کی وفات سے دو تین ماہ پیشتر چند "بہی خواہان وحشت" اس بارے میں کوشاں تھے کہ وحشت کو ان کی زندگی بھر کی اردو نوازی اور علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر صوبائی و مرکزی حکومتوں کی طرف سے "لائف پنشن" عطا کی جائے۔ اس تحریک میں ان کے شاگرد رشید حضرت عبدالمعبود [illegible] پیش پیش تھے۔ بزم ریاض الادب کوثری نے بھی ایک خاص جلسہ میں اس تحریک کی تائید میں قرار داد پاس کی تھیں۔ لیکن ۔۔۔ حق و انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اس تحریک اور قرار دادوں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وحشت مرحوم کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے اور برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وحشت اپنے شاگردوں کو شاگرد نہ سمجھتے تھے بلکہ دوست ہمدرد اور عزیز تصور فرماتے تھے۔ ان میں متعدد حضرات ایسے بھی ہیں جنھیں وحشت جیسی عظیم شخصیت کے عقیدت کیش، خوشہ چین اور نیاز مند ہونے کا فخر و ناز ہے اور مالی طور پر اچھی حیثیت کے مالک ہیں۔ اگر وہ تھوڑی سی توجہ دیتے اور حکومتوں سے مطالبہ کی بجائے خود مشترک طور پر کوئی کمیٹی یا فنڈ قائم کرتے تو نہایت خاموشی کے ساتھ وحشت کی امداد کر سکتے تھے لیکن افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ علامہ وحشت دوسروں کی ناقدر شناسی اور بے التفاتی سے اپنی زندگی ہی میں اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اکثر اسے محسوس کیا لیکن دوسروں کو کبھی محسوس نہ ہونے دیا۔ ان کا یہ شعر جو آج سے

پندرہ سال پیشتر کہا گیا تھا اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ؎

خیال تک نہ کیا اہل انجمن نے کبھی　　تمام رات جلی شمع انجمن کے لئے　　(وحشتؔ)

حکیم ابوالعلا ناطقؔ لکھنوی مرحوم (جن کی زندگی کا بیشتر حصہ بنگال کی فضا میں بسر ہوا) چونکہ خود باکمال اور جلیل القدر استادِ سخن تھے وحشتؔ کے مقام کو بھی بخوبی پہچانتے تھے اور ان کی شخصیت و عظمت، اخلاص و اخلاق کے معترف تھے۔ اپنی ایک رباعی میں فرماتے ہیں ؎

اس شمع کے قربان ہو لے پروانو　　یہ جوہر قابل ہے اسے پہچانو
اس رنگ کے سرمست نہ پاؤ گے کہیں　　وحشتؔ کی کرو قدر اے دیوانو

ہمارا ملک ہمیشہ سے مردہ پرست رہا ہے۔ وحشتؔ مر چکے اب ان کی خدمات کا جائزہ لیا جائے گا۔ گوشہ گوشہ میں تعزیتی جلسے ہوں گے۔ خراجِ عقیدت پیش کئے جائیں گے۔ لیکن اب سر پیٹنے سے کیا حاصل!

راقم الحروف سے مرحوم کو بے حد شفقت و محبت تھی لہٰذا یہ لکھتے ہوئے دل غمزدہ اور آنکھیں اشکبار ہیں کہ وحشتؔ کی موت ایک بے مثل استاد کی موت ہی نہیں بلکہ شفیق باپ کی موت ہے۔ خدائے بزرگ و برتر مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور اعزاء و احباب کو صبرِ جمیل کی توفیق بخشے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

وحشتؔ مرحوم کے عزیز شاگرد امیر شرقی ایم۔ اے نے اپنے تعزیتی خط کے ذریعے ڈھاکہ سے دو قطعات تاریخ ارسال فرمائے ہیں۔ پڑھیے اور سر دھنیے! ؎

۱ـه　اے شہنشاہ تغزل پُراثر غالب بیاں　　آں فرشتہ، آں شفیق بے بدل درآنہفت
فکر در تاریخہائے رحلتش شرقی چو کرد　　گوہر فردوس، ارحمن اِنّ وحشتؔ سال گفت
　　۱۳۷۵ھ
　　۱۹۵۶ء

۲ـه　شاہِ تغزل، مخزنِ شفقت　　بود فرشتہ خصلت وحشتؔ
شرقی سال وصالش، ہاتف　　گفت بہار جنت وحشتؔ
　　۱۳۷۵ھ

# اقبال کا مردِ مومن

اسعد رشید موسوی صاحبہ

فارسی اور اردو کے تمام شاعروں نے یہی تعلیم دی کہ اپنی ہستی کو ختم کر دو۔ ان کے نزدیک ہستی سراسر فریب ہے۔ چنانچہ غالب نے بھی تو کہا ہے ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ  عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہی عقیدہ پوری قوت کے ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی اسی کو اپنا لیا۔ ان حالات کو دیکھ کر اقبال کا حساس دل تڑپ اٹھا اور انھوں نے انسان کو پستی کی طرف جانے سے روکنے کے لئے بیڑا اٹھایا اور "خودی" کا نعرہ لگایا تاکہ پست ہوتی ہوئی انسانیت کو کچھ اوپر اٹھایا جائے۔

خویش را چوں از خودی محکم کنی  تو اگر خواہی جہاں برہم کنی

عشق و وجدان سے خودی مستحکم ہوتی ہے۔ چنانچہ اقبال عشق کی راہ پر گامزن ہوا۔ اقبال کا مردِ مومن خودی کا تیز تلوار اٹھاتے ہوئے خالق کی تخلیق شدہ کائنات میں شرکت کے منصوبے باندھنے لگتا ہے اور اس کا خالق خود اس سے پوچھنے لگتا ہے "بتا تیری رضا کیا ہے؟"

اقبال کا مردِ مومن ایک مخصوص راستے کا پابند ہے۔ وہ قہاری و جباری اور ستیز اندر ستیز گرم ہو رکھنا چاہتا ہے اور کہتا ہے ؎ زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ ستیز ۔۔۔ تاکہ کائنات کے دوسرے بتوں کو "لا" کی تیغ سے گرا سکے لیکن وہ اپنے روحانی ارتقاء میں اس قدر سرگرم ہے کہ اس خاکداں سے پرواز کر جاتا ہے ؎

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی  خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

اور بعض دفعہ تو اس کا شاہین اس قدر بلندی تک پرواز کر جاتا ہے کہ جبریل کی برابری کرنے لگتا ہے۔ ایک مرتبہ اس کا رتبہ جبریل کا ہم پلہ ہو جاتا ہے۔ کہتا ہے ؎

امیں راز ہے مردانِ حر کی درویشی  کہ جبریل سے اس کو ہے نسبت خویشی

احساس خودی اور سخت کوشی اقبال کے پیام کے دو اہم اجزا ہیں۔ اقبال عشق کی دنیا کو سب سے بڑی قوت اور حیات انسانی کا سب سے اہم ضرورت خیال کرتا ہے ؎

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر  نئے زمانے نئے صبح و شام پیدا کر

اقبال کے کلام میں ایک مخصوص پیام ملتا ہے۔ تخیل بہت بلند ہے۔ ان کی شاعری کا ایک مقصد ہے جو ایک آغاز

سے انجام کی طرف لے جانے ہیں۔ ہستی کے ثبوت کے لئے وہ حرکت عمل اور پیکار کا فلسفہ سناتے ہیں۔ شاہین زادہ، شاہین، مردِ مومن اور قلندر ــــ یہ سب اقبال کے ایک مخصوص آئیڈیل ہو کر مختلف ناموں کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اقبال سعدی کی طرح مردِ مومن یا مردِ آزاد کو زمان و مکان، ملک و قوم (وطنیت) اور مذہب ہر ایک محدود دائرے سے پیش کرتا ہے۔ سعدی نے بھی تو کہا تھا ؎

مردِ خدا بہ مشرق و مغرب غریب نیست  ہر جا کہ می رود ہمہ ملکِ خدائے اوست

اقبال مردِ مومن کو رسم و رواج زماں و مکاں کی پابندیوں سے آزاد کرتے ہوئے کہتا ہے ؏ درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں  کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

اقبال کا شاہین زادہ بلندیوں کی طرف پرواز کرتا ہے۔ وہ عشق کے بازوؤں پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کرتا ہے۔ فضا میں اڑنا ہی کا محبوب مشغلہ ہے۔ گنبدِ نیلوفری میں اپنا نشیمن بنانا چاہتا ہے اور ستاروں سے آگے نئے جہاں بسانے کی خواہش کرتا ہے۔ اس کا عشق سپند کی طرح زور و شور کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم  رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

جب اس دنیا میں انسان کی تخلیق ہوئی ہے تو کائنات کے نظام میں حیرانی و استعجاب کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا کہ کائنات اس کے وجود سے متحیر ہو گئی ہے۔ چنانچہ ہوتا بھی ایسا ہی ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد  حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور  خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

مردِ مومن کی تعریف بیان کرتا ہے۔ دل ایمان کی سوزش سے کبھی ٹھنڈا نہیں پڑتا۔ پابندی میں بھی آزاد رہے۔ خیالات، تصورات اور دل ــــ ہمیشہ ہر حالت میں آزاد رہے۔ مفلس ہو کر بھی مطمئن رہے۔ کہتا ہے ؎

پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار  آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ایک اور مقام پہ اپنے تصور کو چنگاری کی طرح پیش کرتا ہے۔ خس و خاشاک کے لئے یہ چنگاری نہیں۔ اس کا کام تو نیستان کے لئے ہے۔ اگر یہ چنگاری (شاہیں۔ مردِ مومن) جلا سکتی ہے تو نئے کے جنگل ہی کو خاکستر کر سکتی ہے۔

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری  میرے لئے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

اقبال کا شاہین مردِ قلندر ہے۔ وہ الفاظ کی تکرار نہیں کرتا۔ لیکن قلندر، مردِ مومن اور شاہین جیسے الفاظ سے کھیلتا ہے۔ آجکل کی طرزِ تعلیم اقبال کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ چنانچہ اعتراض کرتا ہے ؏

سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

شاہین کبھی مردہ جانور پہ نہیں جھپٹتا۔ اسلام کا اصول ہے کہ بچوں، عورتوں اور بڈھوں پہ ہاتھ نہ اٹھائیں۔ مردِ مومن کبھی مالِ غنیمت پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اپنے زورِ بازو سے مال جمع کرتا ہے۔ "Simple living and high Thinking" ــــ اس خیال کو بھی اقبال نے مردِ مومن کی صفات میں شامل کیا ہے۔ فقیری میں بلند ارادے، بلند عزائم رکھ کر نام پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ دوسرے کے ہاتھ اپنے آپ کو فروخت کر دینا اقبال کے نزدیک گناہ سے بدتر ہے۔

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر　　یہاں فقط سر شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

خود شناسی، جہاں شناسی اور خدا شناسی تین مدارج سے گذر کر اقبالؔ کا مردِ مومن حقیقت تک پہنچتا۔ اس سے غفلت بہراں موت سے قریب کرتی ہے۔

تو مردِ میداں تو میر لشکر　　نوری، حضوری تیرے سپاہی

اقبالؔ نے اپنے کلام میں اپنے مقصد کو اپنے تخیل کی مدد سے ایک ایسی بلند تر حقیقت کو بیان کیا ہے (جو ... خیالی ہو گئی ہے) اور جس کی کشش سے متاثر ہو کر ان کے پیرو اس دنیا میں ایک جہانِ تازہ کی بنیاد رکھتے ہیں ... کلام میں ہمیں اقبال کے پاس صرف عمل پرستی کی دعوت ملتی ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ اقبالؔ کا مردِ مومن خودی سے ... آسمانی پہنائیوں میں محوِ پرواز نظر آتا ہے اور انتقال سے چند لمحے قبل ہی شاعرِ مشرق کا دماغ مردِ مومن کا مقام اور ... کے صفات متعین کرتا رہا اور جسم سے روح عالم بالا کی طرف پرواز کرنے سے قبل علامہ کی زبان پر یہ شعر تھا۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

---

# ادارۂ ادبیات اردو کی چند مطبوعات

**تاریخ گولکنڈہ** از پروفیسر عبدالمجید صدیقی۔ سلاطین قطب شاہیہ کی مستند اور مبسوط تاریخ۔ گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات۔ دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، علم و فضل کی سرپرستی۔ دوسرا ایڈیشن زیر ترتیب و طبع۔

**ہندوستانی تمدن** از ڈاکٹر ایشور ٹوپا ایم اے۔ پی ایچ ڈی رجسٹرار جامعہ عثمانیہ۔ دڑاوڑیوں اور آریاؤں کے تمدن کو نہایت تحقیق کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ صفحات (۳۲۰) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

**تذکرۂ اردو مخطوطات** از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ادارۂ ادبیات اردو میں اب تک جو قلمی کتابیں محفوظ ہو چکی ہیں ان میں سے صرف دو سو بہتر اردو مخطوطات کا تفصیلی تذکرہ۔ نیز دوسرے زیادہ اداریات علم کتب و آثار قدیمہ زیر بحث رہے ہیں۔ قیمت پانچ روپیے۔

**تذکرۂ مخطوطات جلد دوم** از ڈاکٹر زورؔ۔ کتب ... ادارۂ ادبیات اردو۔ (۵۰۰) عربی، فارسی، اردو اور ہندی قلمی کتابوں کا تذ... صفحات (۱۸۰) قیمت پانچ روپے۔

**رات کا بھولا اور دیگر افسانے** پروفیسر عبدالقادر سروری کے افسانوں ... مجموعہ۔ (دوسرا ایڈیشن زیر طبع)۔

**لیلیٰ** از عظیم النساء بیگم۔ ایک دلچسپ ناول۔ اس کا مقدمہ قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے۔ صفحات (۱۱۲)۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

**فہرست مطبوعات ادارہ** ادارہ کے کتب خانہ ... کا فن وار تذکرہ مرتبہ ... صدیقی صاحب و غلام ... صاحبہ۔ صفحات ... قیمت تین روپے۔

# منشی میاں داد خاں سیاح

از :- جناب ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب مدنی

منشی سیاح کا نام میاں داد خاں اور اصلی وطن اورنگ آباد تھا ۔ ان کے والد عبداللہ خاں اورنگ آباد کے باعزت اور آسودہ حال باشندوں میں تھے ۔ سیاح کا سنہ ولادت ان کی عمر اور سنہ وفات کے پیش نظر سنہ ۱۸۳۰ء قیاس کیا جاسکتا ہے[1]۔ سیاح کے سن شعور کو پہنچنے تک ان کا خاندان گردش روزگار کے چکر میں پھنس چکا تھا ۔ جب انھیں اپنا وطن تیرہ و تار نظر آنے لگا تو پندرہ سولہ سال کی عمر میں وطن مالوف کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر سنہ ۱۸۴۵ء سے سنہ ۱۸۴۷ء کے درمیان سورت پہنچے[2]۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سیاح دکن سے ہجرت کر کے قسمت آزمائی یا اکتساب علم کے خیال سے سورت آئے کیونکہ اس زمانے کا سورت دونوں حیثیتوں سے اہم مرکز تھا ۔ ایک طرف سورت کی علمی ، ادبی فضا اور دوسری طرف بیرونی ممالک سے اس کے تجارتی تعلقات کی بناء پر باہر سے آنے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے ۔ سورت کو اس زمانے میں وہی حیثیت حاصل تھی جو آج شہر بمبئی یا دہلی کو نصیب ہے ۔ غرض سیاح کسی نیت سے سورت آئے ہوں اس منزل پر دلبستگی کے سامان مہیا ہو گئے اور یہاں انھوں نے مستقل اقامت اختیار کر لی ۔

سیاح کے ابتدائی دور کے حالات سے ہم لاعلم ہیں لیکن جہاں تک ان کی تعلیم و تربیت کا تعلق ہے یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ان کے اپنے وطن میں ہی ہوئی ہوگی اور یہ قرین قیاس ہے کہ سورت کے علمی ماحول کے پیش نظر سلسلۂ تعلیم جاری رکھا ہوگا چونکہ ورود سورت کے وقت ان کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی ۔

سیاح نے سورت کو ثانی وطن تو بنا لیا تھا لیکن شوق سیاحت نے انھیں ہمیشہ وطن کی قید سے آزاد رکھا ۔ سورت آنے کے بعد کسی طرح موقع مل گیا اور یہ عرب و عجم کی سیر کے لئے چل پڑے ۔ اپنی ایک تصنیف "سیر و سیاح" میں اس طرح رقمطراز ہیں :—

"سیروا فی الارض نے دل تماشا گداز کو گدگدایا ۔ ادھر جوانی دلولہ جوش ادھر خود کاوی
جلوہ فروشی سیر جزائر عرب و عجم نے بے پر اڑایا[3]"

---

[1] سیاح کی عمر (۷۷) سال تھی اور ان کا انتقال سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوا ۔ اس حساب سے ان کا سنہ ولادت سنہ ۱۸۳۰ء قیاس کیا گیا ہے ۔
[2] میر غلام بابا خاں کے پوتے میر حفیظ الدین خاں ، سید حمید الدین سورتی جمعدار اور حکیم محمد قاسم کا بیان ہے ۔
[3] محققین کا خیال ہے کہ لطائف غیبی دراصل غالب کی تصنیف ہے جو سیاح کی طرف منسوب کی گئی ہے ۔ اس لحاظ سے یہ یقین ہے کہ سیاح نے اپنی سیر و سیاحت کا احوال غالب کو سنایا ہوگا ۔

انتہا ہی نہیں بلکہ اسی دوران سیاحت بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند، سندھ، کابل، کشمیر، قندھار وغیرہ دیکھ آئے۔ لطائف غیبی میں یہ فقرہ ملتا ہے:۔

میں نے بعد تحصیل علوم رسمیہ سیاحت اختیار کی۔ بنگالہ، دکن، پنجاب، وسط ہند، بلاد و قرا کے کہاں تک نام لوں قلمرو ہند میں سرتاسر پھرا ہوں بلکہ سندھ و کابل و کشمیر و قندھار بھی دیکھ آیا ہوں۔[4]

یہ زمانۂ سیاحت جو بارہ[12] سال سے کم نہ ہوگا ۱۸۴۶ء سے ۱۸۶۰ء کے درمیان کا ہے۔ اسی دوران سفر میں منشی صاحب کو غالب سے نیاز حاصل کرنے کا موقع میسر آیا۔[5]

۱۸۶۰ء میں یہ ستارہ لکھنؤ کے افق پر نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کی ویرانی و تباہ حالی سے سیاح نے متاثر ہوکر اپنے استاد کو اس مقام سے ایک خط لکھا ہے جس کے جواب میں غالب نے بھی اظہار افسوس کیا ہے۔[6] لکھنؤ سے یہ بنارس گئے۔[7] بنارس میں نہ جانے کتنا قیام رہا اور کہاں کہاں گئے لیکن ۱۸۶۱ء کے اکتوبر کے مہینے میں سیاح کلکتے میں پائے جاتے ہیں[8] اور ۱۸۶۲ء اپریل یا مئی میں سورت پہنچتے ہیں۔ سورت پہنچنے پر غالب نے انھیں لکھا ہے:۔

"سورت کا پہنچنا بہر صورت مبارک ہو۔"[9]

سیاح کا سورت پہنچنا واقعی مبارک ثابت ہوا۔ سفر سے لوٹنے کے بعد ان کی رسائی نواب میر غلام بابا خاں کے دربار میں ہوئی اور نواب موصوف کے زمرۂ مصاحبین میں شامل کر لئے گئے۔ سیاح نے اپنے استاد کو یہ خوش خبری لکھ بھیجی ہوگی اور نواب صاحب کی تعریف میں کچھ لکھا ہوگا جس کے جواب میں غالب ۱۸۶۲ء کی ۱۰ر جون کو لکھتے ہیں:۔

"میر غلام بابا خاں واقعی ایسے ہیں جیسا تم لکھتے ہو۔ سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گذرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو بے شک وہ ہزاروں میں ایک ہے۔"[10]

سیاح نے اس خط کے ذریعہ غالب سے غلام بابا خاں کا تعارف کرایا۔ اس تعارف کے بعد غلام بابا اور غالب کے خط و کتابت بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میر جعفر علی خاں رئیس سورت (خسر میر غلام بابا) کا ۳۱ر اگست ۱۸۶۳ء میں انتقال ہوگیا۔ نواب غلام بابا خاں کی جانب سے غالب کو جو پہلا خط ملا وہ جعفر علی خاں کی وفات سے متعلق تھا۔ غالب نے اس خط کا جواب اور قطعہ تاریخ وفات لکھا ہے۔[11]

---

[4] ص۱۔ محققین کا خیال ہے کہ لطائف غیبی دراصل غالب کی تصنیف ہے جو سیاح کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ اس لحاظ سے یقینی ہے کہ سیاح نے اپنی سیر و سیاحت کا احوال غالب کو سنایا ہوگا۔

[5] اودھ اخبار کے ایک بیان سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ دیکھئے تکملہ۔ اسی طرح غالب کے جولائی ۱۸۶۱ء کے خط سے اس بیان کو تقویت ملتی ہے۔ اس خط میں سیاح کو برخوردار لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۸۶۰ء سے پہلے ہی سے ان کے تعلقات گہرے اور بےتکلفانہ تھے۔ مالک رام نے فسانۂ جاوید، اور مرزا محمد عسکری نے ادبی خطوط غالب میں استاد و شاگرد کے تعلقات کا ۱۸۶۴ء بتایا ہے جو صحیح نہیں۔

[6] ضمیمہ نمبر۳ خط ۱۲۔ [7] ضمیمہ نمبر۲ خط ۶۔ [8] ضمیمہ نمبر۲ خط ۱۱۔ [9] ضمیمہ نمبر۲ خط ۸۔

[10] غالب کے اس خط سے ظاہر ہے کہ سیاح نے غلام بابا خاں سے پہلی ملاقات کے بعد کوئی خط لکھا ہوگا جس کا یہ جواب ہے۔ واضح رہے کہ نواب میر جعفر علی خاں اس وقت زندہ تھے۔ ان کا انتقال ۳۱ر اگست ۱۸۶۳ء میں ہوا ہے۔ ان کے مصاحبین میں منشی لطف اللہ مرزا علی اکبر وغیرہ تھے۔ سیاح کا تعلق غلام بابا خاں سے تھا، نواب جعفر علی خاں کی سرکار سے نہیں تھا۔ سیاح نے بھی کسی جگہ نواب صاحب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ضمیمہ ۲ خط ۱۰۔

[11] ضمیمہ ۱ خط ۱۔

غلام بابا خاں کے مصاحبین میں شامل ہونے کے بعد قریب آٹھ نو سال یعنی ۱۸۶۷ء تک سیاح کے صرف ایک سفر کا پتہ چلتا ہے[۱۱] اس سفر کی تفصیلات آگے بیان کی جائیں گی۔ ۱۸۵۹ء میں سیاح نے سورت کے ایک شریف خاندان کی عارض بی نامی لڑکی سے عقد کر لیا تھا۔ کئی اولادیں بھی ہوئیں لیکن کوئی بچہ زندہ نہ رہا۔ ایک بچے کے انتقال پر غالب نے اس طرح تعزیت کی ہے:

"تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہوا ...... تم ابھی جوان ہو حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم البدل دے[۱۲] والسلام"

اولاد زندہ نہ رہنے پر سیاح نے آخر عمر میں محلہ سید واڑہ کے ایک شریف گھرانے کی بچی کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ اس کی شادی سوداگر واڑہ کے عبدالرشید نامی ایک شخص سے کر دی تھی[۱۳] اس طرح ایک لڑکے کو بھی پرورش و پرداخت میں بہت دلچسپی لی تھی لیکن یہ اوباش نکلا تو تنگ آ کر گھر سے نکال دیا تھا۔

غالب کے ایک خط کے مضمون سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاح ۱۸۶۶ء کے نومبر یا دسمبر میں اپنے وطن اورنگ آباد اپنے عزیزوں سے ملنے کی غرض سے گئے تھے۔ غالب کے خط کا مضمون دیکھئے:-

"...... تم اندیشہ نہ کرو اور قصیدہ نذر گزرانو اور مع الخیر وطن کو جاؤ۔ لیکن بھائی وطن پہنچ کر ضرور مجھ کو خط لکھنا اور اپنے گھر کا پتہ لکھنا تاکہ میں اس نشان سے تم کو خط بھیجوں ......"[۱۴]

غالب کا دوسرا خط اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:-

"صاحب میں خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ تم اپنے وطن گئے اور عزیزان وطن کو دیکھ کر خوش ہوئے اور مع الخیر و عافیت اپنے محسن و مربی کی خدمت میں پھر آ پہنچے ........"[۱۵]

ان دونوں خطوں کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب سیاح کو سورت میں سکون نصیب ہوا اور ملازمت کی وجہ سے اعزاز ملا تو سرخروئی کے ساتھ چھ ڈیڑھ مہینے کے لئے اپنے وطن گئے۔ اس سفر کے بعد معلوم ہوتا ہے چار پانچ سال سیاح اپنے آقائے ولی نعمت کی حضور میں رہے۔ ۱۸۷۱ء میں پھر سورت ہی گیا اور اس جہاں گرد نے رخت سفر باندھا۔ منشی نولکشور سیاح کے پرانے دوستوں میں تھے[۱۶] منشی صاحب آغاز سال ۱۸۷۱ء میں میر غلام بابا خاں کے بچوں کی کسی تقریب میں بمقام سورت شریک ہوئے تھے[۱۷] اس وقت سیاح سے ان کا ماہ جولائی میں سیر کشمیر کے لئے جانا طے پایا تھا[۱۸] چنانچہ جولائی میں منشی صاحب نے سیاح کو کانپور طلب کیا۔ سیاح

---

[۱۱] ضمیمہ ۱ خط (۱۲)

[۱۲] اردوئے معلی ص... خط ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء

[۱۳] راقم نے انھیں دیکھا ہے۔ یہ سورت کی بلنی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ اجمیر میں بحیثیت پوسٹ ماسٹر تھے۔ ریٹائر ہو کر سورت چلے آئے تھے۔ ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء کے درمیان انتقال کیا۔

[۱۴] اردوئے معلی ص۲۲ خط مورخہ نومبر ۱۸۶۶ء۔ رام نرائن ایڈیشن میں اس خط کے نیچے نومبر ۱۸۶۲ء لکھا ہے جو غلط ہے۔

[۱۵] اردوئے معلی ص۲۱ اس خط میں ۲۲ جنوری ۱۸۶۹ء ہے لیکن یہ تاریخ غلط ہے۔ لاہور ایڈیشن میں ۲۲ جنوری ۱۸۶۸ء ہے مگر یہ بھی غلط ہے۔ صحیح تاریخ جنوری ۱۸۶۷ء ہونی چاہئے کیونکہ نومبر ۱۸۶۶ء میں سیاح وطن گئے اور یہ قرین قیاس ہے کہ ڈیڑھ مہینہ رہ کر جنوری ۱۸۶۷ء میں لوٹ آئے۔ دیکھئے ضمیمہ ۱ خط ۱۳

[۱۶،۱۷،۱۸] سیر سیاح ص۳ آغاز سال ۱۸۷۱ء میں سراپا خلق و مروت صاحب محبت و فتوت، احباب نواز اخلاق پرور منشی نولکشور (بقیہ نوٹ ص۲ پر)

وعدے کے مطابق ۱۴ اگست کو سورت سے روانہ ہوئے اور بمقام سچین[20] نواب سیدی[21] ابراہیم خاں محمد یاقوت خاں والی ریاست سچین سے نیاز حاصل کرتے ہوئے بمبئی گئے[22] بمبئی میں دو روز قیام کرکے پندرہ اگست کو صبح کی گاڑی سے کانپور روانہ ہو گئے۔ ۱۸ اگست کو کانپور پہنچنے پر سیاح کو معلوم ہوا کہ منشی نولکشور ان کا انتظار کرنے کے بعد تنہا عازم سفر ہو گئے۔ اتفاق سے بارش اور سیلاب کی وجہ سے ریلوں کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ اس سبب سے منشی صاحب کو کشمیر کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ منشی صاحب گھر لوٹے تو سیاح سے ملاقات ہو گئی جو چند گھنٹے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ سیاح نے کانپور میں چار روز قیام کیا اور وہاں سے لکھنؤ پہنچے جہاں منشی صاحب کے مہمان رہے۔ سیاح کے اعزاز میں شب و روز محفل رقص و سرود منعقد ہوتی اور اہل ذوق نیز دیگر اکابرین کی صحبتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ لکھنؤ میں ایک بزم مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ سیاح نے مصرعہ طرح دیا "اس بھرنے زمین سے کیا آسماں مجھے"۔ ۱۲ رجب ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۸ء) بروز شنبہ دن کے چار بجے قدیم چوک میں مشاعرہ ہوا۔ سیاح اس کے صدر نشین تھے۔ لکھنؤ میں کچھ دن گزار کر یہ آگرہ گئے۔ آگرہ میں مجو خاں اور صوفی صاحب نے بڑے تپاک سے ان کے اعزاز میں دعوت کی۔ آگرہ کی دعوتوں سے فارغ ہو کر سیاح دہلی پہنچے۔ دہلی میں بھی اہل ذوق نے بڑی گرمجوشی سے سیاح کا استقبال کیا۔ قربان علی سالک، بدر الدین خاں مترجم بوستان خیال، مرزا محمد حسن، حکیم محمود خاں، حکیم محمد رضا، سید محمد فخر الدین وغیرہ سے صحبتیں رہیں۔ اولیاء کرام کے آستانوں پر حاضری دینے کے بعد اپنے استاد کی آخری آرام گاہ پر فاتحہ پڑھا اور عقیدت کے پھول چڑھائے۔ دہلی میں نواب ضیاء الدین نے بھی سیاح کے اعزاز میں دعوت کی۔ دہلی سے یہ ایک دن کے لئے میرٹھ بھی ہو آئے۔ چونکہ سیاح کو لکھنؤ سے بڑی دلبستگی تھی۔ لہٰذا دہلی سے پھر لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ میں اس دفعہ کونی رام پرشاد نے نہایت پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا۔ اس موقع پر چند طوائفوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ ان میں ایک شیریں نامی طوائف بھی مدعو تھی۔ یہ شعر بھی کہتی تھی۔ سیاح نے سرمجلس شیریں کو چند قافیے دیئے۔ شیریں نے ان قافیوں کو موزوں کر کے اسی مجلس میں شعر سنا دیئے۔ شیریں کی ایک غزل "سیر سیاح" میں شامل ہے جو یہاں درج کی جاتی ہے۔

غزل شیریں

فصل گل آتی ہے لے دست جنوں دھیان رہے — ٹکڑے دامن ہو سلامت نہ گریباں رہے
دل پسا جاتا ہے قدموں کے تلے صاحب کے — پاؤں آہستہ سے رکھنے کا ذرا دھیان رہے
تیری صورت پہ نظر ہو ترے قدموں پہ ہو سر — تیری الفت میں مروں یہ مرا ایمان رہے
خانۂ چشم سے یہ کہہ کے سدھاری مری روح — اپنے گھر جاتے ہیں تھوڑے یہاں مہمان رہے
آرزو کوئی نہ بر آئی فلک کے ہاتھوں — دل بے تاب میں لاکھوں مرے ارمان رہے

---

(بقیہ سلسلہ ص ۱۹) مشہور و معروف روزگار نولکشور مالک مطبع اخبار اودھ کے بارہ برس سے یعنی سفر اولین سے ہمیں حالی پر توجہ فرماتے ہیں۔۔۔ وعدہ سیر کشمیر کو جولائی میں قرار دے کر نہ دیدہ کو چشمک لگائی۔ راقم نے والد مرحوم کی زبانی سنا ہے کہ منشی صاحب کے اس قیام میں غلام بابا خاں نے سورت کے ایک ان پڑھ شاعر بنو میاں کو منشی صاحب سے ملایا تھا۔ بنو میاں ازبنگ تخلص کرتے تھے (گجراتی اردو میں ازبنگ اوٹ پٹانگ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے) منشی صاحب نے بنو میاں سے کلام سنا اور نہایت سلجھا ہوا پایا تو انھیں ذکا تخلص کرنے کا مشورہ دیا۔ بنو میاں نے اسی روز سے ذکا تخلص اختیار کر لیا۔ ہم نے اپنی کتاب سخنوران گجرات میں بنو میاں کے حالات اور کلام کا نمونہ دیا ہے۔

[20] سورت سے نو میل کے فاصلے پر ایک ریاست ہے۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے ضمیمہ ۲

[21] دیکھئے ضمیمہ ۲

[22] اس سفر کے حالات سیر سیاح میں موجود ہیں۔

لکھنؤ میں کوئی دو ماہ کے قیام کے بعد سیاح نے بہ قصد سورت کانپور کا رخ کیا۔ منشی نولکشور بھی ان کے ہمراہ تھے۔ اب کی بار کانپور میں سیاح کی آمد پر ایک مجلس مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا لیکن ماہ صیام اور سیاح کی علالت کی وجہ سے یہ مشاعرہ منعقد نہ ہو سکا۔ اگرچہ مشاعرہ نہ ہو پایا لیکن شعراء نے غزلیں کہی تھیں وہ سیاح نے جمع کر لیں۔ اس مشاعرہ کی غزلیں سیر سیاح میں درج ہیں۔ کانپور سے سیاح الہ آباد گئے۔ اس جگہ کوئی میر ظہور حسین صاحب نے انھیں دو دن کے لئے ٹھہرا لیا۔ تیسرے دن بمبئی کے لئے ریل پر سوار ہوئے اور بمبئی ہوتے ہوئے سورت پہنچ گئے۔

اس دفعہ سورت میں دو ایک سال گذارے اور پھر سیاحت کی ٹھانی۔ ۱۸۷۳ء میں سیاح نے میر جعفر علی کے چھوٹے بھائی میر باؤ علی خاں کے ہمراہ بمبئی اور پونا کا ایک چھوٹا سا سفر کیا[۱۲۳] لیکن ۱۸۷۵ء میں ان کا کاروانِ حیات دکن میں سرگرم سفر پایا جاتا ہے۔ ۱۸۷۴ء کے اواخر میں مدراس جانے کی نیت سے بمبئی گئے۔ بمبئی میں نواب سیدی عبد الغنی سے نیاز حاصل کرنے کے بعد ۳ جنوری کو پونا گئے۔ پونا سے بیجا پور گئے اور کڑپا کی سیر کرتے ہوئے مدراس پہنچ گئے۔ مدراس میں سیاح کی بڑی آؤ بھگت ہوئی مگر فساد کی وجہ سے جھگڑے جھمیلے بھی رہے اور نوبت اخباروں تک پہنچی۔ فتنے کے اٹھنے کی بڑی وجہ مدراس کے گورنر کی اہلیہ سے ملاقات تھی۔ حاسدوں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ مدراس پہنچنے کے بعد لیڈی ہوبرٹ (اہلیہ گورنر مدراس) سے ملاقات کی تقریب نکل آئی۔ لیڈی ہوبرٹ بڑی تکریم سے پیش آئیں۔ اس نے تاڑ لیا کہ یہ شاعر ضرور ہوں گے۔ اس نے سیاح سے کچھ کلام سنانے کی فرمائش کی۔ سیاح نے اس وقت آئندہ کے وعدہ پر ٹال دیا۔

مدراس میں بھی اہل ذوق نے سیاح کا بڑا پرتپاک استقبال کیا۔ مجلس رقص و سرود اور اہل علم کی صحبتوں میں رات دن گذرتے رہے۔ مدراس سے موقع نکال کر بنگلور، میسور، سرنگا پٹن بھی گئے اور واپس مدراس آ گئے۔ اس دفعہ گورنر مدراس کی شان میں مدحیہ قصیدہ کہہ کر گذرانا۔ قصیدہ لیڈی ہوبرٹ نے بہت پسند کیا اور انھیں بہت عزت بخشی۔ اس قصیدے کے انعام میں ایک طلائی لاکٹ بھی عنایت ہوا تھا۔ ۱۸۷۵ء کے مارچ کے مہینے میں مدراس سے حیدرآباد آ گئے۔ حیدرآباد میں بھی اکابرین نے ان کا استقبال کیا۔ یہاں سالار جنگ، وقار الامراء اور شمس الامراء سے بھی ملاقات کا موقع مل گیا۔ سیاح ۲۰ کو سفر دکن سے بمبئی لوٹ گئے۔ بمبئی میں اتفاق سے منشی نولکشور موجود تھے۔ منشی صاحب نے سیاح کو مہاراجہ جے پور سے ملایا۔ یہاں کی صحبتوں سے فارغ ہو کر ۳۱ مارچ کو سورت پہنچ گئے۔

سیاح نے سورت آ کر ابھی دم لیا تھا کہ شہزادہ ایڈورڈ (ایڈورڈ ہفتم) کے ورود ہند اور مختلف مقامات پر اس کے استقبال کی دھوم دھام دیکھنے کے شوق نے انھیں بے تاب کر دیا۔ یہ سورت سے بمبئی اور بمبئی سے ۴ دسمبر ۱۸۷۵ء کو الہ آباد پہنچے۔ وہاں سے عظیم آباد ہوتے ہوئے کلکتہ گئے۔ کلکتہ میں ان کے کئی شناسا موجود تھے۔ کلکتہ میں سیاح ایک تاجر ضیا ضیائی کے مہمان رہے۔ یہاں مہاراجہ پٹیالہ اور کوئی مولوی عبد اللطیف خاں سے ملاقات کے بعد مہاراجہ جے پور اور مہاراجہ کشمیر سے بھی نیاز حاصل کیا۔ اسی موقع پر سالار جنگ سے بھی ملاقات ہونے والی تھی لیکن پتہ نہ چلا کہ ملاقات وقوع میں آئی یا نہیں[۱۲۴]۔

---

[۱۲۳] دیکھئے کھنڈالہ۔ بیج گئی بمبئی سے ۸۰ میل کے فاصلے پر ہوا خوری کا ایک بلند مقام ہے۔ یہاں دق کے مریضوں کے لئے اسپتال اور مکانات کا انتظام ہے۔ گرمی کے موسم میں اہل بمبئی اکثر دو چار ماہ کیلئے جاتے ہیں۔ تکملہ میں اس سفر کی تفصیلات ہیں لہٰذا ہم نے یہاں اعادہ مناسب نہیں سمجھا۔

[۱۲۴] کشف الاخبار بمبئی جلد ۲۱ ، ۲۹ دسمبر ۱۸۷۵ء۔

کلکتہ سے یہ پٹنہ، بنارس ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے اور تین چار روز قیام کے بعد ۱۲ر جنوری کو مراد آباد اور رامپور گئے۔ قرینِ قیاس ہے کہ یہ دہلی بھی گئے ہوں گے۔[25] ۲۳ر فروری کو پھر یہ لکھنؤ میں پائے جاتے ہیں۔[26] شہزادے کے خیر مقدم اور استقبال کے جشنوں کی رونق دیکھ کر نہ جانے سیاح کب سورت لوٹے مگر ۱۸۸۵ء میں پھر یہ شہابِ ثاقب بمبئی میں پایا جاتا ہے۔ ان کے لئے یہ سال منحوس تھا۔ ان کے اوجِ اقبال کی حد آ چکی تھی۔ پاؤں کے چکر نے بدبختی کے چکر میں ڈال دیا۔ قصد سفر کہیں کا تھا اور قسمت کہیں اور لے گئی۔ سیاح کو قلب سازی سے دلچسپی تھی۔ تعجب کی بات نہیں کہ عہد جوانی ہی سے اس فن میں انھیں مشق حاصل ہو کیونکہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاحی میں گذرا۔ غلام بابا خاں کی سرکار سے بھی انھیں صرف پندرہ روپے ماہانہ ملتے تھے جو رقم چھوڑنے سے سفر کے لئے بھی کافی نہیں اور سیاحی بغیر زر و مال کے دشوار ہوتی ہے۔ غرض یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عرصۂ دراز تک سیاح نوٹ بناتے رہے اور راز کھلنے نہ پایا۔ سال مذکور میں سیاح نے حیدرآباد جانے کے لئے وکٹوریہ ٹرمینس (بوری بندر اسٹیشن) پر دوسرے درجے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے سو روپے کا نوٹ بھنایا۔ بدقسمتی دیکھئے کہ ان کے جانے کے بعد فوراً ہی دوسرا مسافر بھی سو روپے کا نوٹ لے کر کسی جگہ کا ٹکٹ خریدنے آیا۔ جیسے ہی ایک نمبر کے دو نوٹ یکجا ہو گئے تفتیش شروع ہوئی۔ سیاح اس وقت تک جا چکے تھے۔ پولیس نے حیدرآباد اطلاع کر دی۔ سیاح کو حیدرآباد کے اسٹیشن پر حراست میں لیا گیا اور یہ بمبئی لائے گئے۔ بمبئی میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور اقبالِ جرم کے بعد انھیں ۱۸۸۵ء کے آس پاس (۱۴) سال کی سزائے قید ہو گئی۔[27]

خوش قسمتی سے جیل خانے کا افسر (جیلر) ایک زرتشتی تھا۔ اس نے سیاح کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے انھیں اپنے بچوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ اس وجہ سے سیاح کو قید خانے میں ہر قسم کی رعایتیں حاصل ہو گئیں اور قید کی صعوبتوں سے بچ گئے۔ دورانِ قید میں ملکۂ وکٹوریہ کی سلور جوبلی کا موقع ۱۸۸۷ء میں آ گیا۔ سیاح نے اس تقریب پر ایک مدحیہ قصیدہ لکھا۔ جیلر نے یہ قصیدہ اپنی پرزور سفارش کے ساتھ حکومتِ ہند کے توسط سے ملکہ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس قصیدے کے صلے میں سیاح کے زمانۂ حبس میں کئی سال کی تخفیف کر دی گئی۔[28] الغرض جہاں سیاح کے فنِ قلب سازی نے انھیں عالم عالم کی سیر کرائی اور آخر میں ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بھی لگا دیا وہاں ان کے فنِ شاعری نے انھیں روحانی کوفت سے بھی نجات دلائی۔ رہائی کے بعد سیاح نے سورت میں بہر صورت اپنی زندگی کے دن گزارے اور کہیں باہر جانے کا نام نہ لیا۔ سیاح پر آخری چند سال بڑے کٹھن گذرے۔ نہ آمدنی کا کچھ ذریعہ تھا نہ اچھے دنوں میں کچھ پس انداز کیا تھا۔ مالی مشکلات نے انھیں اتنا تنگ کر دیا تھا کہ اہلِ دُوَل کے سامنے دستِ سوال بڑھانے تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ سیاح نے قصبۂ راندیر

---

[25] تکملہ (اودھ اخبار)۔
[26] کشف الاخبار اور اودھ اخبار (تکملہ)۔
[27] و [28] بروایت سید حمید الدین صدیقی جمعدار۔

کے سیٹھ اعظم بھام اور دوسرے حضرات سے مالی امداد کے لئے تحریراً استدعا کی تھی[۴۹] یہ پتہ نہ چلا کہ ان لوگوں نے کس حد تک سیاح کی دستگیری کی لیکن سیاح کے ایک مداح و خیر خواہ حکیم شیخ محمود میاں ان کے کفیل ہوئے تھے اور محلہ رائی تلاؤ میں اپنے مکان کے برابر دوسرے مکان میں سیاح کی رہائش کا انتظام کر دیا تھا[۵۰] اور حتی المقدور سیاح کی خدمت کرتے رہے۔ حکیم صاحب کی دستگیری کی وجہ سے سیاح کی کلفتوں کی ایک گونہ تلافی ضرور ہو گئی۔ زندگی کے باقی دن برے بھلے طریقے پر گذار کر پچاسی سال کی عمر میں ۱۹۰۱ء میں اس سیاح جہاں نورد نے سفر آخرت اختیار کیا۔ بڑے خان کے چکلے میں خواجہ سید جلال الدین نقشبندی قدس سرہٗ (خواجہ دیوانہ صاحب) کے قبرستان میں ان کی آخری آرامگاہ ہے[۵۱] سیاح کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ عارض بی کو نواب غلام بابا خاں کے صاحبزادے میر مظفر حسین خاں نے اپنے محل میں بلا لیا تھا۔ نواب صاحب موصوف ان کو بہو کے نام سے پکارتے تھے۔ عارض بی نے ستر سال کی عمر میں ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔ میر مظفر حسین کے پوتے میر غلام غوث (حال مقیم بمبئی) کا بیان ہے کہ انھوں نے انہیں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ ان کا بیان ہے کہ یہ بہت حسین تھیں اور بڑھاپے میں بھی ان کے حسن و جمال کو زوال نہیں آیا تھا۔

سیاح سرخ و سفید اور وجیہہ شخص تھے۔ قد، بدن، چہرے وغیرہ کا انداز انؔ کی تصویر سے ہو جاتا ہے۔ بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ ضعیفی میں بھی چہرے سے نور ٹپکتا تھا اور تمکنت و وقار آشکار تھے۔ دوران گفتگو میں ہر لفظ اور ہر فقرہ اس قدر نرم لہجہ میں آہستہ آہستہ ادا کرتے کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے۔ بحث میں غصہ کو قریب نہ آنے دیتے۔ اس زمانے میں سورت شاعروں سے بھرا ہوا تھا۔ ایسے مقامات پر ادبی رقابت ناگزیر ہوتی ہے لیکن سیاح کسی سے کبھی نہ الجھے۔ صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے جب کہ سورت کے ایک شاعر شیخ لعل شانہ گر متخلص یکتا کی غزل پر غزل کہی۔ اس غزل کا مقطع ہے ؎

بہت غیروں کو ہم سیاحؔ ہزار روز پاتے تھے     لیا جب آڑے ہاتھوں ہم نے سارا بانکپن جھڑ لے

یہ غزل مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ یکتا کا پیشہ شانہ گری تھا۔ سید علوی العیدروس علویؔ شاگرد محمد منظورؔ منظور کا شاگرد تھا۔ اگرچہ ان پڑھ تھا لیکن شاعری کے لئے طبیعت موزوں پائی تھی۔ اس کی غزل اس موقع پر لطف سے خالی نہیں لہٰذا درج کی جاتی ہے ؎

تصور تھا سراپا حور کا پر جان من بھولے     لکھا تجھ کو پری کا روہم نے اے رشک چمن بھولے
سراپا عالم تنہائی میں شہر و وطن بھولے     ترے وحشی بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا و بن بھولے
خیال سایۂ پاں ہما آنکھوں میں کھٹکے ہے     کمر کی جستجو میں مو میاں یاد دہن بھولے
ثبات آسا عزیزو یوسف مصری کی چاہت سے     جھنکاتی ہے زلیخا کو کنویں چاہ ذقن بھولے

---

[۴۹] راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔
[۵۰] حکیم محمد قاسم صاحب کا بیان ہے۔ مکان مذکور اب تک حکیم صاحب کی ملکیت ہے۔
[۵۱] مرزا عسکری نے سیاح کا انتقال بمقام بمبئی لکھا ہے جو صحیح نہیں۔

خطا میں   جھکے ہیں کس کے عنبریں گیسو ‌ ‌ ‌ ‌ جو بوسے نافۂ مشکیں غزالان ختن بھولے
جو چاہوں نالۂ جانکاہ سے گردوں کو چکر دوں ‌ ‌ ‌ ‌ ابھی گردش میں لانا نوجوانوں کا کہن بھولے
غنی ہو کر فقیروں سے کرے ہیں عشق کا سودا ‌ ‌ ‌ ‌ ہماری نقد دل لے کے پونجی سیم تن بھولے
خدا حافظ ہے یکتا اب ہمارے دین و ایماں کا ‌ ‌ ‌ ‌ بتوں کے عشق میں جلتی کا سب عشق دھمی بھولے [33]

سیاح کی وضع داری اور نفاست شہر میں ضرب المثل تھی۔ خوش پوشی اور خوشبو کا شوق آخر عمر تک نہ گیا۔ پانچ ہاتھ کا صافہ، ململ کا پیرہن، چھوٹی مہری کا پائجامہ، انگرکھا اور اس پر چوغہ ان کا لباس تھا۔ وضع داری کے اس قدر سختی سے پابند تھے کہ کسی کو بھی اگر خلاف وضع کپڑے پہنتے دیکھ پاتے تو اچھے انداز میں سمجھا دیتے۔ لباس کے بارے میں ذوق و نفاست کا یہ عالم تھا کہ کپڑے دہلی میں سلواتے تھے۔ راقم کے والد نے ایک دفعہ سیاح سے گذارش کی کہ قبلہ سورت میں بھی اچھے درزی موجود ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ کپڑے دہلی میں سلوائے جاتے ہیں۔ سیاح نے والد کا دل رکھنے کے لئے ایک پیرہن کا ٹکڑا اور ناپ کا پیرہن دیا اور کہا کہ یہ سلوالاؤ۔ دیکھیں یہاں کیسے سیتے ہیں۔ چند روز بعد جب سلا ہوا پیرہن حاضر کیا گیا تو اسے غور سے دیکھنے کے بعد کہا میاں! ہمارا کپڑا ابھی خراب ہوا۔ درزی نے کلی کے ٹانکے چھوٹے بڑے کر دیئے۔ والد کے پاس اس باریک بینی کا کوئی جواب نہیں تھا۔[34] اگرچہ آخری عمر میں تقدیر میں شکن پڑ چکا تھا لیکن کپڑوں پر کبھی شکن گوارا نہ کیا۔ اگر آدھ گھنٹے کے لئے مکان سے کہیں باہر جاتے تو گھر لوٹنے کے بعد آدھ گھنٹہ کپڑوں کے شکن استری سے نکالتے۔ ان مفلسی کے ایام میں بھی ایک مرتبہ پہنے ہوئے . . . . . . . . لباس کا دوبارہ پہننے کا موقع مہینوں میں کبھی آتا۔ عطریات کا شوق بھی تھا اور نہایت نفیس ذوق بھی پایا تھا۔ کبھی خلاف موسم کوئی عطر استعمال نہ کرتے۔ اسی طرح صافے کا رنگ بھی موسم اور آسمان کے رنگ کی مطابقت میں ہوتا۔ جس محلے سے ان کا گزر ہو جاتا تو وہاں کے لوگ بغیر دیکھے کہہ دیتے کہ منشی صاحب راستے سے گذر رہے ہیں۔ راقم کے والد اگرچہ عہد شباب میں شہر کے وضع دار کج کلاہوں میں شمار کئے جاتے تھے تاہم سیاح کو اس بارے میں استاد مانتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے وضع داری کی باریکیاں انہیں سے سیکھی تھیں۔ مکان کی بیٹھک میں سفید چاندنی بچھی رہتی اور دیوار سے گاؤ تکئے ہوتے۔ سیاح کا معمول تھا کہ روزانہ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر قلمدان لے کر بیچ میں بیٹھ جاتے اور دو تین گھنٹے خطوط اور دوسری ایسی چیزیں لکھتے رہتے۔ خط وغیرہ لکھتے وقت کبھی کاغذ کو کسی چیز پر نہ رکھتے۔ کاغذ کو ایک ہاتھ سے سامنے پکڑ لیتے اور دوسرے ہاتھ سے لکھتے جاتے۔ دو تین گھنٹوں میں چار پانچ قلم بدلتے جو ترشے ہوئے تیار رکھ لیتے۔ حکیم محمد قاسم صاحب کا بیان ہے کہ اکثر صبح کھیلتے ہوئے سیاح کی بیٹھک میں چلے جاتے۔ سیاح انہیں دیکھتے ہی کہتے بیٹا! چاندنی پر نہ آنا۔ اس کے بعد اپنی اہلیہ کو آواز دیتے وہ آتیں اور محمد قاسم صاحب کے پاؤں دھلاتیں اور کپڑے سے پونچھتیں۔ تب کہیں انہیں چاندنی پر قدم رکھنے کی اجازت ملتی۔ آخری چند سالوں میں جلسوں اور تقریبوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ لیکن روزانہ کا یہ معمول تھا کہ شام کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھر کے قریب بازار لیمڑی چوک میں ایک تاجر کتب سراج الدین کی دوکان پر جا بیٹھتے۔ اس دوکان پر دوسرے بھی اہل ذوق کی نشست تھی۔

---

[33] تاریخ گجرات (مخطوطہ) مرتبہ سید عبد الرحمن عیدروس۔
[34] یہ اتفاق ہے ورنہ آج بھی سورت میں کپڑوں کی سلائی میں نفاست پائی جاتی ہے۔ یہاں عورتیں ۴۴، ۴۲ کلی کا کرتہ پہنتی ہیں۔ پشواز کا بھی بہت رواج تھا۔

# مناقب راز الٰہی

از سید جناب شیخ فرید صاحب برہانپوری

"مناقب راز الٰہی" ایک منظوم رسالہ ہے جو محمد یوسف بن محمد طاہرؒ کی تصنیف ہے۔ ناظم نے اپنے پیر و مرشد حضرت برہان الدین راز الٰہی کی منقبت میں اختصار کے ساتھ چند واقعات کو نظم کیا ہے۔ اجمال کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ طول ناظرین کی ملال طبع کا باعث نہ ہو۔ ناقدین سے عواٸب کی چشم پوشی اور اصلاح کی درخواست بھی کی ہے۔

حمد و ثنا کے بعد رسالہ یوں شروع ہوتا ہے ـــــ

"ایں رسالہ ایست منظوم و موسوم بہ مناقب راز الٰہی کہ بہ نظم آوردہ است۔ آں را احقر عباد اللہ محمد یوسف بن محمد طاہر غفر اللہ ذنوبہ و ذنوب والدیہ وکشف کروبہ وکروب والدیہ ـــ بالفاظ و عبارات واضحہ متعارفہ در مناقب پیر خود قدوۃ الواصلین و برہان المحققین شیخنا و مرشدنا و مقتدانا و من عارف العلوم الصوفیۃ اعتمادنا حضرت شیخ برہان الحق والدین الملقب بہ شیخ راز الٰہی عجمیاً یسر اللہ عربیاً قدس اللہ تعالیٰ روحہ واصل الینا و فتوحہ و از آں جا کہ ملال طبائع مطالعہ کنندگان نگردد۔ بہ سبیل اختصار و اجمال بزنگاشتہ و تفصیل آں واگذاشتہ۔"

توقع از اخلاق و مراسم اشفاق نقادان سخن و ناقدان معنی آں کہ چشم از عواٸب زیر دستاں بپوشند بلکہ در اصلاح آں بکوشند کہ ایں بیچارہ بہ عجز و قصور معترف است" ـــــ

مناقب کا زیر نظر نسخہ مولوی سید احکام اللہ صاحب کے قلمی نوادرات میں محفوظ ہے۔ مخطوطہ عمدہ حالت میں ہے۔

مناقب عنوانات ذیل پر مشتمل ہے۔

(۱) حمد (۲) مناجات و تضرع بہ درگاہ الٰہی (۳) نعت (۴) آغاز داستاں (۵) بیانِ ولادت (۶) بیانِ واقعات (۷) سالِ وصال (۸) بیانِ ندامت و حالِ خود۔

---

ص۱ محمد یوسف بن محمد طاہر التخلص بہ یوسف برہانپوری المولد ہے۔ حضرت برہان الدین راز الٰہی کا مرید تھا۔ تقریباً بیس سال تک انکی خدمت میں رہا ؎ مدتے بست سال یا کم و بیش صحبتے داشتم باں بے خویش

عربی فارسی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ (لب الدقائق نثر میں ایک اور تصنیف ہے) رسالہ زیر نظر کی تصنیف کے وقت اس کی عمر تقریباً چالیس تھی ؎ عمر من شد قریب تا چہل سال بر نگشتم ز طفلیم احوال

افسوس کہ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے ـــــ

مختصر نثری دیباچہ کے بعد ۴۲ اشعار پر مشتمل حمد ہے۔ جس کے آخر عربی اشعار مصنف کی عربی دانی کا بین ثبوت ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

کل حمد الحمد المحمود الیک    فلک الحمد والثنا علیک
کلت الالسنۃ من ادعا فک    قصرت عن بیان اعطایک
ماعرفناک حق عرفانک    ماوجدناک حق وجدانک
احدانت واحد وحید    انت تفعل بما تشاء و تردید
قد بدالارض فلک والافلاک    فی الارض والسماء سوارک

حمد کے آخری دو اشعار ہیں۔

اے زبانم ز نام تو گویا    وے روانم بہ صنع تو جایا
طبعم از حکمت سخن زا شد    سخنم از تو روح افزا شد

"بندۂ نیاز" اور "دانائے راز" کی درگاہ میں اپنی تکالیف اور بیچارگی کا ذکر شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

بستہ محنتم کشا دم دہ    نامرادم توام مرادم دہ
بیکسی ام نگر تو لطف کن ما    وارہانم مرا تو از من وما
من بیچارہ را تو چارہ نما    غرقۂ ورطہ ام کنارہ نما

اٹھائیس اشعار پر مشتمل مناجات کے بعد نعت سرور کائنات ان اشعار سے شروع ہوتی ہے۔

اے رسول محمد عربی    من و نعت تو این چہ بے ادبی
لیس عروالی عنی الی احد غا    یارسول الالہ خذ بیدی
لیس عندی حب من ذکرک    لیس غافل ضمیری عن فکرک
سنگریزہ بہ حکم تو ناطق    برسالت گواہ تو صادق
خسرو تخت و تاج لولاکے    شاہ قدوسیان افلاکے
خاکپائے تو عرش را سرتاج    اولیاء را در تو شد معراج

نعت کے بعد آغاز داستان ہے۔ اس کے اولین اشعار میں حضرت برہان الدین راز الٰہی کو "پیر انس و جان" "ہادی شمع نعت نبوی" "برہان دین مصطفےٰ" "شہنشاہ کسوۃ تجرید" "فرقۂ بحر توحید" اور مرد فرد طریق شطاریہ" کے معزز خطابات سے [یاد کیا] ہے۔

ولادت کے بیان میں آپ کے مولد۔ جائے نشو و نما اور سال ولادت کو یوں نظم کیا ہے۔

موضع را نجھنی کہ مولد اوست    جان فدائش کہ موضعے نیکوست
یافت در خاندیش نشو و نما    گشت از او خاندیش جلوہ فزا
خطۂ خاندیش از و معمور    مرقد او بہ شہر برہانپور
گر ز سال ولادتش گوئی    سال تاریخ "فیض حق" جوئی
۹۹۵ھ

"فیض حق" سے سال ولادت ۹۹۲ھ نکلتا ہے۔

آغاز داستان کے بعد دوسرا باب حضرت راز الٰہی کے بچپن کے ذکر میں ہے۔ اس باب میں ایک واقعہ نظم کیا ہے ...ب حضرت موصوف کی عمر نو ماہ کی تھی ایک دن وہ دایہ کی گود میں تھے۔ ایک کریہہ المنظر عورت نے اُن کو دیکھا۔ اس کو دیکھ کر ...ں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نظر بد کے اثر سے پانچ روز تک نہ آنکھیں کھولی نہ دودھ پیا۔ والدین بے حد پریشان ...ے۔ ایک رات ان کی والدہ کو بشارت ہوئی کہ یہ لڑکا بزرگ ہوگا اور اس کا شمار قدوۂ کبار میں ہوگا۔ خواب تسلی کا باعث ہوا۔ اس واقعہ کو ناظم کی زبانی سنیۓ:—

بود روزے بہ دوش دایۂ خویش — کز زنے زشت روئے آمد پیش

زن بدرو بدیدہ بینا او — خود چہ گویم ز زشتیِ بیناو

نظر پاک او بر د افتاد — برخِ زشتِ او چشم کشاد

دیدۂ خود ز دیدنش بربست — ہم ز شیر و غذا و حال بگریست

پنج روز ایں چنیں در اگذشت — کار از حکمت و دوا بگذشت

والدینش ازاں غمیں گشتند — ہمہ اقربا حزیں گشتند

مادرش کو بہ صدق یکتا بود — زبدۂ خاندانِ زہرا بود

رفت در خواب و خوش بشارت یافت — در بشارت چناں اشارت یافت

کیں پسر بس بزرگ وار شود — یکے از قدوۂ کبار شود

ناظم نے اس واقعہ کی یوں تشریح کی ہے کہ دنیا کریہہ المنظر بڑھی عورت کی شکل میں تھی۔ جسے دیکھ کر انھوں نے آنکھیں ...لی تھیں اور اصل غذا (دودھ) سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔

چہ عجب کان زنے کریہ آخر — بود دنیا بہ صورت ظاہر

پیشش آمد کہ در پذیر مرا — خدمت لست ناگزیر مرا

او بناز التفات نمود بہ شش — دیدہ بر دوخت زاں و فرمودش

کہ دریں پنج روزہ عمر و بقا — تکم؟ ریختہ بہ تو اصلا

ایں مرادست و ایں عبارت ازو — آنچہ کردم بیاں کنایت او

...م سنی میں حضرت موصوف سے جو کرامات ظاہر ہوئیں ناظم نے عقیدتاً ان کو بھی نظم کر دیا ہے۔ حق کی طلب اور پیر کی جستجو ...ی میں لکھا ہے کہ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد یگانۂ عصر محدث کامل شیخ علم اللہ سے حدیث، فقہ اور سلوک ...یم حاصل کی اور حضرت حسین بنبانی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ جب طلب مرشد کے شوق میں شدت پیدا ہوئی تو ...کامل کی تلاش شروع کی۔ اتفاقاً محدث موصوف کی مجلس میں حضرت شیخ عبدالقدوس سے ملاقات ہو گئی۔ شیخ موصوف نے ...ی چشمانی سے ولایت کی آثار کی ہویدگی کا ذکر کیا اپنا خرقۂ خلافت دینے کے بعد ان کو حضرت شاہ عیسیٰ جند اللہؒ کی خدمت ...یں گئے۔ جہاں انھوں نے اعلیٰ مراتب حاصل کئے۔

حضرت شاہ عیسیٰؒ سے ان کی ملاقات کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے —

آن مسیحائے عمر و خضر زماں      شیخ عیسیٰ یگانۂ دوراں
از قدومش نشاط افزودہ      در ارادت قبول فرمودہ
ہر دو گشتہ بہم حلاوت گیر      آں یکے چوں شکر دگر چو شیر
آں یکے چوں خضر دگر موسیٰ      آں یکے مہدی ایں دگر عیسیٰ

اس سے پیشتر حسین بنبانی کی خدمت میں جو تلقین پائی تھی اس کو بھی شاعر نے اس ذیل میں درج کر دیا ہے۔

گرچہ زیں پیش یافتہ تلقیں      از یکے پیشوائے اکمل دیں
عارفِ حق ملک حسیں اسمش      برتر از روح مرتبۂ جسمش

حضرت شاہ عیسیٰ کی خدمت میں انیس ۱۹ سال کی عمر میں داخل ہوئے اور پندرہ سال تک سخت ریاضت کی۔

نوزدہ ۱۹ سالہ بود آں دل خواہ      کہ شد از فیض آفتابش ماہ
پانزدہ ۱۵ سال خدمتش ورزید      پس ز فیضش بدید انچہ بدید
برکشیدہ بسا ریاضاتے      گشت حاصل ازاں کمالاتے

چلہ کشی میں جو "وقائع بدائع" رونما ہوئے ان کی تفصیل کے بیان کے لئے شاعر نے لکھا ہے کہ ایک عمر کی ضرورت ہے۔

خود نیارم بجز تحیر تقریر      درکنم سالہا ازو تحریر

صرف ذیل کے تین ۳ واقعات کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔

(۱) پہاڑ کا گویائی حاصل کرنا (۲) معرفت الٰہی کا حاصل ہونا (۳) اپنے ہر عضو سے "برہان" سننا

خرق و کرامت کے عناصر کی بنا پر شاعر کا انداز بیان اس مقام پر بوالعجبانہ ہو گیا ہے۔ مگر تصوف کی یہ خصوصی شان ہے اور دنیا کے ہر گوشے میں جہاں تصوف نے نشو و نما پائی ہے۔ یہ شان پائی جاتی ہے۔

حضرت مسیح الاولیاء نے ہر بُنِ مو سے برہان کی آواز نکلنے کی تفسیر میں بتلایا کہ یہ فنا کا مرتبہ ہے۔

یعنی آں مرتبۂ فنا باشد      وین اشارت سوئے بقا باشد
آں کمال آید ایں بود اکمل      آں بود فاضل ایں بود افضل

ناظم نے لکھا ہے کہ اپنے پیر و مرشد حضرت مسیح الاولیاء کے وصال کے بعد تقریباً بیس ۲۰ سال تک وہ گوشہ نشیں رہے۔ اس عرصہ میں دور دراز تک ان کی شہرت پھیل گئی۔ ہر خاص و عام کو ان سے عقیدت ہو گئی۔ کئی امراء حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ شوق ملاقات میں جب خانقاہ پر لوگوں کا اژدحام ہو گیا تو انھوں نے کنج عزلت ترک کر دیا۔ توکل پیشگی اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ حاکم صوبہ برہان پور امید بیگ نے تعمیر خانقاہ کی اجازت طلب کی تو انکار کر دیئے۔

ملبوس کا ذکر کرتے ہوئے شاعر نے لکھا ہے کہ لباس میں سنت کی اتباع کرتے ہوئے گراں بہا اور بیش قیمت لباس کبھی زیب تن نہیں کیا بلکہ اس جسم پر جامۂ عنصری بھی گراں تھا۔

ہم چناں کز لباس فاخر را      انچہ زیبندہ است اکابر را
چوں قمیص و بزرگ تر دستار      شال طوسی و خرچے شلوار
بر تن پاک وے ندیدم ما      نہ ز خدام وے شنیدم ما

بضرورت عمامہ برسر     داشتے او وجامہ برسر
آن ضرور اتباع سنت بود     اتباع یعنی ضرورت بود
ورنہ از بہر خود گران بودش     جامۂ عنصری گراں بودش

غذا کی سادگی اور نیند کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نیند میں بھی خدا کی یاد کیا کرتے تھے۔ سنجیدگی کا یہ عالم تھا کہ صاحب رسالہ تقریباً بیس سال تک ان کی خدمت میں رہا۔ مگر کبھی قہقہہ لگاتے نہ دیکھا۔

مدتے بست سال یا کم وبیش     صحبتے داشتم بآں بے خویش
ہرگز آں دہاں تبسم کردہ     ہم نفرمودہ قہقہہ خندہ

حسن اخلاق اور درگذر کے ذیل میں لکھا ہے ایک ہم سایہ بڑھئی بدخوئی کی وجہ سے ہمیشہ ان سے اور مریدوں سے لڑتا رہتا تھا۔ اتفاقاً وہ بیمار ہوگیا۔ بے ہوشی کے عالم میں ایک بدرو کو دیکھا اور بے حد خوف زدہ ہوگیا۔ حضرت نے ازراہ کرم اس زشت رو کو دفع کردیا اور بڑھئی کو اس سے نجات دلائی ــــ

یاد دارم حدیث آں نجار     کہ بداں حضرت او گرفتہ جوار
بود خویش ہمیشہ جنگ وجدل     ناگہانش رسید پیک اجل
از قضا در فتاد وشد بیمار     ظاہر آثار مرگ شد یک بار
وندراں بیخودی حال بدید     کہ یکے زشت روئے گشت پدید
دو مہیبے دگر بہ پہلوئے او     می برندش گرفت بازوئے او
تاکہ آں والیٔ زماں دردم     گشتہ حاضر زروئے فضل وکرم
کفش بہ زد بروئے آں بدرو     کہ زبیمش اگہی گداختہ او
وانگہ گفت آں دو خوش رو را     واگذارید مدتے او را
درزماں ہر دو باز برگشتند     بستر او داشتند وبگذشتند
یافت نجار زاں سہ شخص نجات     مدتے چند سال عیش حیات

وصال کے ضمن میں لکھا ہے کہ جب حضرت برہان راز الہیٰ کے وصال کا وقت قریب آیا تو انھوں نے کہا کہ اگرچہ ایک دنیا مجھ سے محبت کرتی تھی۔ مگر کسی نے مجھے نہ پہچانا۔

یافت ہشتاد وپنج سال بقا     عنصر پاک او بداں فنا
گفت آوخ کہ کس مرا نشناخت     گرنطقے زجہری گداخت [1]
پس باصحاب خود وداع بگفت     چشم پوشیدہ زیں جہاں وبخفت
چشم او شد بخواب دجاں پندار     ہم چو اصحاب کہف اندر غار

خاتمہ میں شاعر نے اپنی درماندگی کا پھر ذکر کیا ہے ــــ

لیک من در سخن چو ما ہیچم     نیست چوں بہرۂ ازاں ہیچم

---

[1] مولانا روم     ہر کسے از ظن خود شد یار من     وز درون من نجست اسرار من

ملکہ باعلم کہ از مراتب او    برنگارم دگر مراتب او
بود کانش متاع من چہ بود    بے فروغم شعاع من چہ بود
عمر من شد قریب تا چل سال    بر نگشتم ز ظلیم احوال[1]
ہم چناں ماندہ در ہوائے ہوس    قافلہ پیش رفت و من واپس
نیست پروائے خویش کودک وار    غافلم ہمی ہنوز آخر کار
بر نیاید دمے بیاد خدائے    وائے بر عمر چو زندگی اے وائے
گشتہ آغازِ موسپیدیٔ من    تا شدہ آہ برف ناسپیدیٔ من
شب بپایاں رسید و صبح دمید    نہ میدہ ہنوز صبح امید

آخر میں یوں دعا مانگی ہے ــــــ

چوں ندارم بجز تو یارب کس    وقفِ حسرتم تو باشے و بس
بردرِ پیر من چو کردی پیر    زانکہ ہیچ خطر تو دستم گیر
یارب آخر بحقِ خدمت او    بطواف حریم حرمت او
یا الٰہی بحق دیدارش    سجدۂ کوئے تا صیہ زارش
مگذار این چنین تو یوسف را    پسند این غم و تاسف را

یہ طویل دعا ذیل کے اشعار پر جاکر ختم ہو جاتی ہے ــــــ

خاتمہ عنبریں شمامۂ من    ختم اینجا نمود نامۂ من
بیش ازیں خواستم کہ برجوشم    لمم غیب کرد خاموشم
کہ خموشی علاج مسکینی ست    گفت طوطی ز خویشتن بینی است

---

[1] سعدی    چہل سال عمر عزیزت گذشت    مزاج تو از حال طفلی نگشت
ہمہ با ہوا و ہوس ساختی    دمے با مصالح نپرداختی

# حضرت میراں حسینی غوث الثانی رحمۃ اللہ علیہ

از:۔ جناب سید مراد علی صاحب طالعؔ

حضرت سید شاہ میراں حسین نام، لقب شاہ ابدال اور عرف غوث الثانیؒ ہے۔ آپ حسب مندرجہ ذیل چودھویں پشت میں حضرت سیدنا غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پوتے ہوتے تھے۔

سید شاہ میراں حسین بن سید شاہ مسعود حسن الحسینی قادری البغدادی الحموی بن سید جلال الدین بن سید علی بن سید عبداللہ بن سید مرشد بن سید محمد قاسم بن سید حسین ثانی بن سید موسیٰ بن سید محمد بن سید حسین بن سید احمد بن قاضی القضاۃ سیدنا عماد الدین ابی صالح نصر محمد قادری بن قطب الآفاق سید تاج الدین عبدالرزاق قادری بن شیخ الثقلین غوث الکونین الشیخ والسید سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

آپ حسباً نسباً سادات حسنی حسینی۔ آپ کا اور آپ کے آبا و اجداد کا مقدس وطن شہر حماۃ تھا جو ملک شام کا مشہور اور مردم خیز شہر ہے جس کو ۱۶ہجری میں بعہد خلافت فاروقی ابو عبیدہ عامر بن الجراح نے رومیوں سے فتح کیا تھا۔ بیشتر سادات عظام اور قادریہ سلسلہ کے مشاہیر بزرگ یہاں سے پیدا ہوئے ہیں۔ (تذکرۂ حضرت عمر ص۹۶ و ص۱۰۱)

اوائل عمر سے ہی حضرت میں علوم ظاہری کی تحصیل کے ساتھ ساتھ طلب حق کا جذبہ بھی باطن میں موجزن تھا۔ لہٰذا ریاضات و مجاہدات شاقہ کی شدید مشقتیں برداشت کرنے کے بعد اعلیٰ روحانی مراتب طے کر کے عوام کی رشد و ہدایات میں معروف ہو گئے۔ مختصر عرصے میں آپ کے رشد و ہدایت، کشف و کرامات، زہد و تقویٰ، تسلیم و رضا اور توکل و قناعت کا دور دور تک چرچا ہو گیا۔ بالآخر باطنی اشارہ پر آپ نے اپنے وطن مالوف سے ہجرت کر کے ننانوے نفوس مریدین و معتقدین کے ساتھ دکن کا رخ کیا اور سلطان ابراہیم قطب شاہ (۹۵۷ھ تا ۹۸۸ھ) کے عہد میں گولکنڈہ تشریف لائے (خاندانی بیاض حضرت سجادہ صاحب)۔

سلطان ابراہیم قطب شاہ علماء اور فقراء کا قدردان اور معتقد تھا۔ گولکنڈہ کی تاریخ کا زریں اور مبارک دور سلطان ابراہیم کا ہی عہد سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں گولکنڈے کا شمار دنیا کے متمدن ترین ملکوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ ایشیا اور یورپ کے دور دراز ملکوں سے تجارتی کارواں اور سیاح گولکنڈہ آتے تھے۔ تلنگانہ کے نظر فریب مناظر، دل کش تالاب اور حسین پہاڑیاں اور ان کے دامن میں دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے ہرے بھرے کھیت اور کھیتوں میں گونجنے والے مسحور کن نغمات طیور اور ان سب سے بڑھ کر سلطان ابراہیم کی نیک نفسی اور خلوص، محبت اور عقیدت نے اللہ والوں کے دلوں میں بھی جگہ پیدا کر لی تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ چشتیہ کے متعدد بزرگ یکے بعد دیگر تشریف لائے جن میں سید اللہ دال سید شاہ عبداللطیف قادری الحموی اور سید شاہ جمال الدین معشوق ربانی، سید شاہ رفیع الدین احمد اور سید نعیم الدین نعمت اللہ عطاؒ، سید شاہ ابوالحسن قادری اور خواجہ حسینی شاہ ولی کے نام قابل ذکر ہیں۔ بوجہ کمال عقیدت و سعادت سلطان ابراہیم قطب شاہ کی

لڑکیاں حضرت غوث الثانیؒ، شاہ نعیم الدین نعمت اللہ ولیؒ اور خواجہ حسین شاہ ولیؒ سے منسوب تھیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت غوث الثانیؒ سے منسوب شہزادی کا نام کلثوم سلطان تھا جن کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ موضع ملک پور (لنگر حوض) سے متصل جانب شرق موقوعہ آبادی کو آج تک بھی کلثوم پورہ کہتے ہیں جو شہزادی کے نام سے موسوم ہے۔ شہزادی کی قبر حضرت کی چوکھنڈی کے پائیں میں اندرون احاطہ سنگ موسیٰ کی بغیر کسی کتبے کے موجود ہے اور اپنی وضع قطع کے لحاظ سے قطب شاہی دور کے فن تعمیر کی ایک یادگار ہے۔

جب حضرت غوث الثانیؒ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو نہ صرف آپ کے مریدین و معتقدین اور فقراء و خدام وغیرہ نے آپ کا ساتھ دیا بلکہ سید الابدال شاہ عبداللطیف قادری الحموی بھی بوجہ کمال خلوص و یگانگت آپ کے ساتھ ہو گئے اور حماۃ سے چل کر ان اللہ والوں کا کاروان جب گولکنڈہ پہنچا تو گولکنڈہ کے بوڑھے، جوان سبھی قرآن السعدین کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے۔ اور سلطان ابراہیم قطب شاہ نے بھی بڑی قدر و منزلت کی۔ چند روز کے بعد حضرت سید الابدالؒ نے اپنے لئے قمر نگر (کرنول) کو منتخب فرمایا اور وہاں چلے گئے اور حضرت غوث الثانیؒ مع فقراء و خدام جو ان کے ہمراہ رکاب تھے گولکنڈہ ہی میں مقیم رہے۔ اس واقعہ کو غلام علی شاہ مورخ نے لطائف قادریہ کے حوالے سے مشکوٰۃ النبوۃ میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"صاحب لطائف قادریہ گوید از جملہ ہفت اسامی گرامی یکے حضرت سید میران حسین قادری الحموی است کہ از اتفاقات حضرت سید میران حسین حمویؒ و سید الابدال سید عبداللطیف قادری الحمویؒ ہر دو عزیزین باتفاق یک دیگر وارد ملک دکن گشتند۔ چند ایام معدودہ ہر دو عزیزین جائے یکجا مقام و ہم بستر بودند۔ بعد ازاں سید الابدالؒ بطرف قمر نگر (کرنول) رفتند و غوث الثانیؒ بہ حیدرآباد مقیم شدند۔ وقت فراق باہم کلمات یک دیگر درمیان آوردند و گفتند کہ اگر چہ بہ حسب ظاہر "هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ" پیش آمد اما وصال باطن ہمیشہ دست داد طرفین باشد۔ الحق ہم چناں بہ ظہور پیوست کہ بعد انقضائے ایام بسیار نسبت پیوندی سید محی الدین ثانیؒ (ابن سید الابدال) با بنت سید عبدالقادر قادری (بی بی صاحبہ) ابن سید میران حسین حموی شد۔"

(مشکوٰۃ النبوۃ)

حضرت غوث الثانیؒ اولاً زیر قلعہ مسجد میں فروکش رہے اور بعد میں موضع ملک پور متصل قلعہ گولکنڈہ (لنگر حوض) مع فقراء و معتقدین کے منتقل ہو گئے۔

بتاریخ ۲۱ ربیع الثانی ۹۸۸ھ سلطان ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو گیا اور شاہزادہ محمد قلی کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا۔ قطب شاہی حکومت میں اگرچہ ایک خوشگوار انقلاب ضرور آیا لیکن گولکنڈہ اجڑنے لگا۔ وہاں کی ساری رونق اور آبادی آہستہ آہستہ حیدرآباد میں منتقل ہونے لگی۔ کیونکہ حیدرآباد کی تعمیر بقول مولف تاریخ قطب شاہی ۹۹۸ھ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ نے شروع کر دی تھی اور اہل گولکنڈہ کو حکم دیا تھا کہ اس نئے شہر میں آباد ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت غوث الثانیؒ جو سلطان ابراہیم کی وفات کے بعد سے ہی کچھ برداشتہ خاطر ہو گئے تھے وہ یہاں سے بھی ہجرت ثانیہ کر جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن واقعات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی کو بھی آپ کا یہاں سے چلے جانا کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ وہ آپ کے قیام کو بسا غنیمت اور متبرک سمجھتا تھا اور اس کی پوری پوری تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ ستر نفوس فقراء و خدام وغیرہ آپ کے ہمرکاب تھے۔ اتفاق سے تین روز تک فقراء کو کھانے کے لئے کوئی چیز میسر نہیں آئی۔ چوتھے دن استقلال خاں امیر دربار قطب شاہی نے سلطان محمد قلی کے حکم سے پچاس خوان بھیجے۔ آپ نے خوان لئے اور اس میں سے فقراء کو کھانا تقسیم کیا پھر خوانوں کو باندھ کر واپس کیا۔

استقلال خاں کے خادموں نے سب کیفیت بیان کی۔ خوانوں کو کھولے تو تمام کھانے اسی طرح سے آراستہ تھے۔ استقلال خاں اس کیفیت کے دیکھنے سے متعجب ہوا اور سارا ماجرا بادشاہ محمد قلی سے عرض کیا۔ استقلال خاں کمالِ عقیدت سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کے مریدوں میں شامل ہوگیا اور حسبِ ایماء سلطان حیدرآباد میں آپ کے قیام کا باعث ہوا۔ چنانچہ آپ بھی اس کے حسنِ اعتقاد کی وجہ سے ہجرتِ ثانیہ کا ارادہ ترک فرماکر ملکہ پور (لنگر حوض) ضلع حیدرآباد میں ہمیشہ کے لئے سکونت پذیر ہوگئے۔
(اولیائے دکن جلد دوم ص۱۱۹)

آپ بالکل متوکل علی اللہ اور قائم اللیل تھے۔ دنیا و مافیہا سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ظاہر و باطن یکساں تھا۔ ذکر و شغل میں زندگی بسر ہوتی تھی۔ توکل اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ لوگ نذر نذرانے لاتے اور وہ ان کو قبول نہ کرتے تھے۔ بہت ہی رقیق القلب تھے۔ حاجتمند کی طرف بہت جلد رجوع فرماتے تھے۔ کمال زہد و تقویٰ اور روحانی عظمت کا یہ حال تھا کہ ایک دنیا ملاقات کی متمنی رہتی تھی اور خواص و عام آپ کی ذات مبارک سے فیضِ عرفان سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ چنانچہ اس خصوص میں بارھویں صدی ہجری کے ثقہ مورخ سید انوار اللہ نے اپنی تالیف کشف قبوری میں حضرت کے تعلق سے اس طرح لکھا ہے کہ:—

"آں نورِ کونین و آں قبلۂ دارین از مسند نشینانِ جبروت و شاہبازانِ لاہوت باشند۔ بسا صاحب خوارق و تصرف بودند۔ از ذات مبارک الیشان عالمے بفیضِ عرفاں رسیدند۔ الغرض کمالات شاہ ابدال سید میراں حسینی قادری الحموی نہ چنداں است کہ در قید قلم آید۔" (کتاب اس درجہ بوسیدہ اور کہنہ ہوگئی ہے کہ وہ تقریباً ناقابل مطالعہ ہو چکی ہے مشکوٰۃ النبوہ میں ایک مقام پر اس مولف کا نام سید انوار اللہ ہے اور سید عبدالقادر ثانی نبیرۂ سید عبدالقادر بن غوث الثانی رح کا ہم عصر بتایا گیا ہے۔)

آپ کے پانچ صاحبزادے تھے۔ سید عبدالقادر عرف بڑے حضرت صاحب رح، سید عبدالوہاب رح، سید سعدالدین رح، سید محمد اور سید عبدالرزاق۔ بتاریخ ۱۳ ماہ جمادی الاولی ۱۰۹۹ھ بعہد سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ) عشرۂ نہم کے اواخر میں آپ کا وصال ہوا۔ "ابدال بغداد" مستخرجہ راقم مادۂ تاریخ وفات ہے۔ قبر شریف بیرون شہر حیدرآباد متصل قلعۂ گولکنڈہ لنگر حوض کے تالاب کے شمالی جانب محصورہ چوکھنڈی میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ مایوس العلاج اور آسیب زدہ مریض آج بھی یہاں آکر ٹھہرتے اور شفایاب ہوکر جاتے ہیں۔ ہر پنجشنبہ کو عموماً اور نوچندی جمعرات کو خصوصاً زائرین اور معتقدین کا خاصہ ہجوم رہتا ہے۔ چوکھنڈی شریف کے باب الداخلہ کے طرفین میں فارسی زبان کا ایک ایک کتبہ دیوار میں نصب ہے۔ چنانچہ مشرقی پہلو پر استاذی حضرت سردار نور اللہ شاہ قادری قلندر رح المتخلص مست کا حسب ذیل کتبہ ہے:—

ذات معبود است اللہ وصفِ رحمٰن و رحیم — بائے برکت سینِ سامع میم مالک ست میم
آل احمد چوں نہالان گلستانِ بہار — گلشن بغداد آمد عترت صد لالہ زار
در ازل آں نقشبندے راست کرد ایں نقش را — ہر زماں قدر تش باشد بہر رنگ آشکار
تا بہ ابدال اولیا محبوب حق ذوالصفات — حسن سیرت ہم شجاعت داشتہ والا تبار
در دو عالم آنچہ خواہی تو بیا طالب بخواہ — گاہ اعجاز مسیحا گہ زبانش ذوالفقار

گر تنا خواہی بیا و جان نثارِ او بشو — شمع پروانہ بسوزی بر جمال روئے یار
تا بہ کے در غفلتی بیدار شو اے مست خواب — تو بیا بر آستان و جوئے فضل کردگار
بگذر از قیدِ خودی بر عالمِ بالا برو — شو فدا منصور آسا بنگری تا روئے یار
مشت خاکت از کجا و تو صدائے کیستی — در نہانِ خویش بنگر شوق بینی بے قرار
جز خطا از خاک من در پیش تو آید چہ چیز — ناتوانم خستہ حالم اشکبارم حال زار
مست مے کردہ مرا ساقی چہ پرسی مستیم — من غلامان غلام درگہ عالی وقار
فضل رب بر حال من فردا چہ غم روزِ شمار — دست من در دامن میران حسینی استوار

دروازہ کے مغربی پہلو پہ سنگ موسیٰ کا حسب ذیل کتبہ احمد منیرالدین فاروقی قاضی پربھنی (دکن) پہ ستار شاہ نکیال کا نصب ہے۔

ای دل پناہ گیر بہ سرکار قادری — جائے پناہ نشست بہ دربار قادری — پیش آمخش نشین و بیان نکتہ نہان — کارِ کریم و کار پیمی کار قادری
بر یک سوال قیمت ہر دو جہان دہد — دست کریم و پنجۂ دربار قادری — اوج خیال ماست کجا رفعتش ببین — دربارِ لا یزال در بار قادری
قرب قرابت است بقرب فرا قتش — اقبال رو نماست بہ افکار قادری — سرسبز و با کمال و نشاط نگاہبان — مانند سبزہ باش بہ گلزار قادری
می باش با ادب بخلوت سرائے راز — عرش آشناست سایۂ دیوار قادری — دیوانہ و عقل مو دب دیوان دین پناہ — پرسش کند ز شاہ پرستار قادری
پابند در دہو ز طلب گار کبریا — آزاد از دو کون گرفتار قادری — منصور وار بر سر دارم کنون مرا — فارغ نمود صولت سردار قادری
در بحر فیض غوطہ زنی میکند منیر — شد نور احدیت در شہوار قادری — میران حسینی است امیر و فقیر را — شاہی و ہدیہ ہمت و ایثار قادری

حضرتؒ کا سالانہ عرس ماہ ذی الحجہ کی ۲۷ تا ۲۹ تواریخ میں ہوتا ہے۔ اور جمادی الاول (ماہ وصال) کے مہینے میں جو فاتحہ ادا ہوتی ہے وہ چھوٹا عرس یا صندل خورد سے موسوم ہے۔ سالانہ عرس کے موقع پر خصوصی مہمانوں کے علاوہ غربا، اور مساکین کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں کھانا کھلایا جاتا ہے۔ زائرین اور معتقدین کی کافی چہل پہل رہتی ہے۔ بروز چراغاں قلعہ گولکنڈہ کے توپچیوں کی جانب سے جلوس کے ساتھ اونٹ پر چادر گل لائی جاکر سجادہ صاحب کے ہاتھ سے مزار پاک پر چڑھائی جاتی ہے۔ مقامی پولیس کی جانب سے بھی دوران عرس میں معقول انتظام اور نگرانی رہتی ہے۔

یہ مختصر مضمون حضرت میران حسینی غوث الثانی رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات کا بہت ہی معمولی سا خاکہ ہے۔ توفیق ایزدی شامل حال رہی تو حضرتؒ کی تعلیمات اور تصرفات، فیوض و برکات اور آل و اولاد کے تفصیلی حالات اور واقعات کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے گا۔ چنانچہ اس سلسلے میں میں نے کچھ مواد بھی جمع کر لیا ہے۔ اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ حضرت مولانا سید شاہ سعدالدین محمد قادری سجادہ نشین ہیں۔ جو بلحاظ دور عشرۂ پنجم کے اواخر میں ہیں۔ جامعہ نظامیہ کے فیض یافتہ اور اپنے والد مرحوم حضرت سید شاہ نصیرالدین احمد قادری سے خاندانی سلسلہ بیعت و خلافت کے حامل ہیں۔ حلم و متانت اور صبر و قناعت، اخلاق و عادات اور سیرت و کردار میں اپنے آباو اجداد عالیہ کا ورثہ پائے ہوئے ہیں۔ مذہبی تقاریب اور نذر و نیاز وغیرہ بہت ہی تکلف اور حزم و احتیاط سے ادا کرتے ہیں۔ ۱۳۵۱ھ میں حضرت سید شاہ فیض اللہ حسینی نعمت اللٰہی ملک المشائخ بیدر شریف و بیسکھہ تعلقہ سیڑم (گلبرگہ دکن) کی بڑی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا۔ بحمداللہ اس وقت آپ کے چار صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے المسمون سید عبدالقادر قادری اور سید محمد قادری ہیں۔ یہ دونوں ہونہار کالج کے تعلیمی منازل طے کر رہے ہیں۔

# اردو کا مرثیائی ادب (نظم)

از:۔ جناب سفارش حسین صاحب رضوی

اردو مرثیائی ادب (نظم) کا پھیلاؤ لگ بھگ ساڑھے چار سو برس پر ہے جس کی ابتدا، دکن سے ہوتی ہے۔ پندرھویں اور کچھ حد تک سولھویں صدی عیسوی میں دکن شمالی ہند کے حملوں سے بڑی حد تک بچا رہا۔ اس لئے اسے سیاسی یکسوئی نصیب رہی جس کے نتیجہ میں ثقافتی کاموں کی طرف توجہ کا موقع مل سکا۔ دکنی زبان کو جو اردو کی ابتدائی شکل ہے، قبول عام کے کچھ ہی دنوں بعد سرکاری درجہ بھی مل گیا۔ سرکاری درجہ ملنے سے اسے دربار میں جگہ ملی۔ اس طرح یہ امیروں اور بادشاہوں کے دل بہلاوے کا ذریعہ بن گئی، پھر بھی اس نے عوام سے اپنا ناتا نہ توڑا۔ ان کا دم بھرتی اور ان کے بول بولتی رہی۔ دکھ اور سکھ میں ان کی شریک رہی۔ عوام کی زندگی میں عقیدت کے جذبہ کی تسکین کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے ابتدائی ادب میں اس سرمایہ کی عام طور پر فراوانی ہے۔ دکھنی کا بھی یہی حال ہے۔ علاوہ اور قسموں کے مرثیائی ادب سے بھی یہ مالا مال ہے۔

لغت میں مرثیہ کے معنی کچھ بھی ہوں۔ اردو میں اس کا عام مفہوم وہ نظم ہے جو کربلا کے خونی واقعات پر لکھی گئی ہو۔ ابھی تک جس قدیم دکھنی مرثیائی تصنیف کا پتہ چلا ہے وہ سولھویں صدی عیسوی کی شروع کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی ہے۔ اس کا نام "نو سرہار" اور مصنف شیخ اشرف ہے۔ یہ احمد نگر میں لکھی گئی تھی۔

مسلمانوں میں یہ خیال عام رہا ہے کہ کربلا کی خونی داستان کو بیان کرنا یا اس پر کچھ لکھنا خدا اور رسول کی خوشنودی کا باعث ہوتا ہے اور ان کی خوشنودی ثواب دارین کا موجب۔ اسی جذبہ نے اشرف کو آخرت کا توشہ فراہم کرنے پر اکسایا جس میں اپنے بقائے دوام کا احساس بھی شامل ہے۔ اشرف نے واقعات کربلا کو نو بابوں میں کئی عنوانوں کے تحت بیان کیا ہے۔ زبان بہت زیادہ ہندی آمیز ہے لیکن اسے سمجھا جاسکتا ہے۔ امام حسین کی شہادت کو یوں بیان کیا ہے ؎

جھمیں بھوتا گر دلہ تیر — لوہو چلیا یہ جیوں نیر
تیر گزرا شہ رگ پھوت — کھوری پر تھیں اس چھوت
بھوئیں پر یا دورا آؤ — پورا بیٹھا کاری گھاؤ
حسین کہہ عرض کیا — راہ خدا کی جیو دیا

اسی یعنی سولھویں صدی کے دوسرے نصف میں مرثیائی ادب کا مواد خاصہ ہے۔ پھر بھی اندیشہ یہ ہے کہ

بہت کچھ نظروں کے سامنے نہ آیا۔ یہ خیال اس لئے اور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ اس صف میں جو شاعر نظر آتے ہیں وہ آج بھی شاعری کے آسمان کے "مہرِ نیم روز" اور "ماہِ نیم ماہ" ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسرے شاعروں نے کچھ نہ کہا ہو خاص کر ایسی صورت میں کہ شاہی سرپرستی بھی تھی۔ بہر حال اس پچاس سال کی مدت میں وجہی، غواصی اور قطب شاہ جیسے شاعر بھی اس ادب کی پیداوار میں معروف نظر آتے ہیں۔ وجہی کا اندازِ بیان سیدھا سادھا اور فطری ہے۔ کہیں کہیں کلام میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جیسے ایک مرثیہ کے اس شعر میں ؎

محبّ دلاں کوں اجل کا ساقی
پیالے غم کے سو بھر پلایا

غواصی وجہی کا ہمعصر اور اس کا ہم پلّہ شاعر ہے۔ اپنے مرثیہ میں ایک جگہ کہتا ہے ؎

جنداسکوں سوں سوتا، اس دکھ سوں غم کھوتا
تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا

محمد قلی قطب شاہ اس عہد کا اورنگ نشیں حکومت ہی نہیں بلکہ مسند نشیں ادب بھی ہے، اس کا کلیات جس کا ثبوت ہے۔ مرثیہ گوئی میں اس کا مقام اپنے ہمعصروں سے بہت بلند ہے۔ اس نے مرثیہ کو وسعت دی۔ اس میں روایتیں نظم کیں۔ اور فنی حسن بھی پیدا کیا۔ ایک مرثیہ میں کہتا ہے۔

کالے ہوئے دکھ تے مکھی ہر پری شیں مائی سکل
تو بکڑے اس دکھ تے جیگی ہے بے قراری وائے وائے
پھولاں سکے سب کد ستی مکھ مولانے بلبل بھکہ ستی
کوئل حسیناد کو ستی بن بن پکاری وائے وائے

سترھویں صدی کے پہلے نصف میں اس صدی کے دوسرے نصف کے مقابلے میں مرثیہ گو شاعروں کی تعداد کم ہے جبکہ دوسرے نصف میں تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ پہلے نصف کے شاعروں کا مرثیائی کلام یا تو تلف ہو گیا یا ابھی تک نظر کے سامنے نہیں آیا۔ سولھویں صدی کے دوسرے نصف اور سترھویں کے دوسرے نصف کے درمیان کی نصف صدی کے اتنا کمزور ہونے کی اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بہر حال سترھویں کی پہلی نصف صدی کی سب سے نمایاں شخصیت محمد قطب شاہ ظل اللہ والئے گولکنڈہ ہے۔ یہ محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد تھا اور اس کے مرنے پر تخت کا وارث ہوا۔ یہ عالم، بڑا علم دوست اور اونچے درجے کا شاعر تھا۔ دکن کے سارے تذکرہ نگار اس کے مداح ہیں۔ مرثیہ اس نے بھی کہا ہے۔

سترھویں صدی کے دوسرے نصف میں مرثیہ میں دو باتیں خاص ملتی ہیں۔ ایک مرثیہ کے پیکر میں تبدیلی اور دوسری بیان میں تفصیل۔ اب سے پہلے مرثیہ منفرد شکل میں لکھا جاتا تھا۔ اب مربع اور مخمس بھی کہا جانے لگا جس سے بیان میں وسعت کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس لئے واقعات تفصیل سے بیان ہونے لگے۔

اب محض مرثیہ گو شاعر بھی ہونے لگے جنھوں نے مرثیہ کے علاوہ کلام کی دوسری صنف سے زبان کو آشنا نہیں کیا۔ ایک آدھ نے اس معاملہ میں شاہی فرمان کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس وقت کے مرثیہ گویوں میں دکن کے بلند پایہ شاعروں کے نام ملتے ہیں جیسے عبد اللہ قطب شاہ والئے گولکنڈہ، علی عادل شاہ شاہی والئ بیجاپور، نصرتی، نوری، ہاشمی، مرزا بیجاپوری اور بحری۔ محض مرثیہ گویوں میں مرزا بیجاپوری اور کاظم ساکن گولکنڈہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مثنوی نگاروں میں لطیف، سیوک، شاہ محمد اور غواصی قابل ذکر ہیں۔

عبد اللہ قطب شاہ اپنے پیش رووں کی طرح شعر و سخن کا دلدادہ اور خود بھی اچھا شاعر تھا۔ اس کے عہد میں

گولکنڈہ کا سنہری دور انتہائے کمال کو پہنچا۔ اس کا دربار ادبی محفل تھی۔ مرثیے اس کے ترقی یافتہ شکل میں ملتے ہیں۔ رقاصہ اس نے بھی نظم کی ہیں۔ مرثیہ کا ایک شعر ہے ؎

عروس آکر پکڑ دامن چلے نوشاہ جب چھوڑ کر　　　نقابی دیو کو دیکھ کوں سو پیارا سنبھل تماری بھی

علی عادل شاہ ثانی شاہی، بیجاپور کا سلطان شعر و شاعری میں ممتاز درجہ رکھتا تھا اس نے اردو شعر و ادب کی سرپرستی بھی کی۔ زبان بہت زیادہ صاف لکھتا تھا ؎

یک شگفتہ گل نہ اس غم سوں رہیا　　　ہیں خزاں میں نونہالاں ہائے ہائے

مرزا بیجاپوری، علی عادل شاہ ثانی سلطان بیجاپور کا ہم عصر اور بیجاپور کا محض مرثیہ گو شاعر ہے جس نے کسی دوسری صنف سخن سے زبان کو آلودہ نہیں کیا یہاں تک کہ بادشاہ کے ارشاد پر بھی قصیدہ نہیں کہا۔ اس نے منفرد مرثیوں کو طویل بنایا۔ مرزا مرثیے کہے اور مرثیوں میں واقعہ نگاری کا اضافہ کیا۔ امام حسین کی جنگ کی تیاری کے متعلق ایک مرثیہ میں لکھتا ہے ؎

بندے دستار تب سر کا حسین سلطان رہبر کا　　　زرہ پہنے سو حیدر کا کروزاری مسلماناں
سپر حمزہ کا لیتے ہیں ان پر زینب نے دیتے ہیں　　　حمائل بر میں کہتے ہیں کروزاری مسلماناں
لئے صمصام ہت سرور سو شمشیر علی صفدر　　　ہوئے مستعد شیر نر کروزاری مسلماناں

سید شجاع الدین نوری مرثیہ گوئی میں اپنے کو خاص طرز کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کے سلسلہ میں بعض تذکرہ نگار غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اسے فیضی کا ہمعصر نوری سمجھ لیا ہے جو اس نوری سے سوا سو برس پہلے ہوا ہے۔

اس عہد میں مثنویاں بھی لکھی گئی ہیں لیکن ان میں پچھلی مثنویوں کے مقابلے میں کوئی خاص اضافہ نہیں۔ جزوی تفصیل کے علاوہ سب میں یکسانیت ہے۔

اٹھارویں صدی دکن میں مرثیائی ادب کے انتہائی عروج کی صدی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جبکہ بقول مولف "دکن میں اردو" ہر دکنی شاعر نے مرثیہ ضرور کہا ہے۔ اس صدی میں مرثیہ گو شاعروں کی تعداد ہی زیادہ نہیں بلکہ کلام کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ قیس کے متعلق بعض دکنی تذکرہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اگر یہ شاعر مرثیہ گوئی پر پوری توجہ کرتا تو دکن میں بہت پہلے انیس پیدا ہو چکا ہوتا۔ یہ وہ وقت ہے جب دکن کی شیعہ سلطنتیں ختم ہو چکی تھیں مگر مرثیہ کی مقبولیت اور پھیلاؤ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں میں بھی یہ صنف سخن مقبول ہونے لگی تھی۔ بالک جی ترمبک نایک ذرہ کا کلیات حیدر آباد کی سرکاری لائبریری میں ہے جس کے دیکھنے کے بعد اس کے غیر مسلم ہونے کا یقین نہیں ہوتا ؎

سوز جگر سے آہ کو مارے ہیں فاطمہ　　　سر سے ردا کو اپنے اتارے ہیں فاطمہ
بالوں سے جانے تیغ سنوارے ہیں فاطمہ　　　میدان کربلا میں پکارے ہیں فاطمہ

درد و الم بہ جان غریبم پدید شد
فریاد اے خدا کہ حسینم شہید شد

اس صدی کے پہلے نصف میں مرزا گولکنڈہ، یتیم احمد، ولی رکنی؛ ولی ویلوری، درگاہ، امامی، اور

ہاشم علی برہانپوری، اور دوسرے نصف میں عزلت، غلامی، رضا، شیدا اور ذرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن میں اماحی، ہاشم علی برہانپوری، غلامی اور رضا محض مرثیہ گو شاعر ہیں۔

بیجاپور اور گولکنڈے کے خاتمے پر اورنگ آباد مغل سلطنت کا دکنی پایۂ تخت قرار پایا اس لئے اس صدی کے پہلے نصف میں اورنگ آبادی شاعروں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ جب دکنی صوبیدار نے حیدرآباد کو اپنا صدر مقام بنایا تو مرثیہ کا مرکزِ ثقل حیدرآباد کی بجائے گجرات منتقل ہو گیا۔ برہان پور میں مرثیہ نے اتنی ترقی کی کہ دکنی بھی گجراتیوں سے مرثیہ لکھوانے لگے۔

یتیم احمد نے مربع دوہرہ بند مرثیہ کہہ کر مسدس کا چربہ اتارا۔ مرزا ساکن گولکنڈہ بہ قول مولف "مقالاتِ ہاشمی" اپنے وقت کا کامل الفن مرثیہ گو تھا۔ اس نے اپنے مرثیوں میں فنی حسن پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جس کا کچھ اندازہ اس شعر سے کیا جا سکتا ہے ؎

حسن کا احوال عشق کیتیں خدا نہ دکھلائے ان دنوں میں
نین ڈوبے ہیں لوہو میں رو رو زلف پڑی ہے شکن میں غم تھیں

ولی دکھنی مردِ میدانِ ریختہ بھی مگر مرثیہ کے میدان میں گھٹنوں چلتے نظر آتے ہیں۔ ولی دکنی کے سلسلہ میں عام غلط فہمی یہ ہے کہ اس نے دہ مجلس نظم کی ہے مگر ولی کی اس دہ مجلس کو آج تک دیکھا کسی نے نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہمعصر ولی ویلوری نے روضۃ الشہدا کو اردو میں نظم کیا ہے۔ ولی ویلوری، ولی دکنی کے مقابلہ میں غیر معروف شاعر ہے۔ اس لئے تذکرہ نگار ولی ویلوری کو ولی دکھنی سمجھ بیٹھے۔ ہاشم علی برہانپوری اس عہد کا سب سے نمایاں مرثیہ گو ہے۔ اس کا نام علی محمد خاں اور تخلص ہاشم علی تھا۔ ایسا تخلص آج تک کسی اور شاعر کا دیکھنے اور سننے میں نہیں آیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی میں اس کے مرثیوں کا مجموعہ ہے جس کا نام اس نے دیوانِ حسینی رکھا ہے۔ سلیمان ندوی نے بھی "نقوشِ سلیمانی" میں اس کے اس دیوان کا مفصل ذکر کیا ہے جسے انھوں نے پونا میں دیکھا تھا۔ یہ محض مرثیہ گو شاعر تھا۔ خود کہتا ہے ؎

ہاشم علی ہمیشہ ثنا خواں ہے شاہ کا	جز مدح و منقبت سخن اس نے کہا نہیں

اس کے مرثیے بڑے پر اثر ہیں۔ جناب علی اصغر کے حال میں جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں ماں کے جذبات کی بڑی پر اثر تصویر کھینچی ہے ؎

اے میرے پیارے لاڈلے پھر آ کے لگ توں مجھ گلے	انجھوں نین سیں بہ چلے کس کا جھلاؤں پالنا

اس صدی کے دوسرے نصف کے مرثیہ گویوں میں عزلت کا مرتبہ بلند ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مرثیوں پر تنقید کی ہے۔ غلامی اس دور کا مشہور مرثیہ گو ہے۔ اس کے کلام میں اثر بہت ہے ؎

دوہرا غم آ کے گھیرے گا شاہِ زمن کوں آج	جلوہ میں کیوں نکلتے ہیں ابنِ حسن کوں آج
گھر گھر میں سوگ آن پڑے گا دولہن کوں آج	قاسم خدا کے واسطے مت جا توں رن کوں آج

ماتمی دولت آبادی بھی مشہور مرثیہ گویوں میں شمار ہوتا ہے۔ رضا گجراتی بلند پایہ مرثیہ گو اور بہترین شاعر تھا۔ اس نے مرثیہ گو تنقید میں عزلت سے اتفاق نہیں کیا۔ محمد صدیق قیس کے متعلق اس سے پیشتر لکھا جا چکا ہے کہ دکنی تذکرہ نگار اس کو مرثیہ گوئی میں اونچا درجہ دیتے ہیں۔ مالک جی ترمبک نایک ذرہ کی مرثیہ گوئی عوام میں مرثیہ کی مقبولیت

کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اس صدی کے خاتمہ سے پہلے مرثیہ گوئی کا جائزہ لیا گیا۔ اس سلسلہ میں عزلت نے اپنے خیالات یوں ظاہر کئے ہیں ؎

خام مضموں مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا ۔۔۔ پختہ درد آمیز عزلت نت توں احوال بول

لیکن رضا گجراتی کو عزلت کی یہ تنقید نہ بھائی۔ وہ کہتا ہے۔

اے عزیزاں گرچہ عزلت مرثیہ میں یوں کہیا ۔۔۔ خام مضموں مرثیہ کہنے سوں چپ رہنا بھلا
لیکن اس مظلوم بے سر کا بیان کرتا ادا ۔۔۔ تا کہ سن کر لوہیاں ہووے مجاں اشک بار

عزلت اور رضا کی طرح شمالی ہندوستان میں بھی مرثیہ کی پرکھ کے سلسلہ میں سودا اور میر گھاسی میں اختلاف ہوا۔ یہ زمانہ بھی وہی ہے۔

اس دور کے مثنوی نگاروں میں ولی ویلوری کا مرتبہ بہت بلند ہے جس نے روضۃ الشہدا کو فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ مرثیہ اب بھی دکن میں مرثیہ کی مقبول شکل رہی۔

انیسویں صدی دکنی مرثیائی ادب کے لئے بڑی نامبارک ہے۔ اس میں دکنی مرثیہ گوئی کا چراغ گل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پچھلی صدی تک جو شمع بڑی آب و تاب کے ساتھ نہ صرف دکن کو جگمگاتی رہی بلکہ شمال کو بھی منور کرتی رہی وہ اب خاموش ہو گئی۔ مرثیہ گوئی کا مرکز نقل گولکنڈہ اور بیجاپور سے اورنگ آباد منتقل ہوا۔ اورنگ آباد سے گجرات اور برہان پور اور اب شمال میں۔ دکنی مرثیہ گوئی نقش و نگار طاق نسیاں ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بیسویں صدی کے پہلے پچاس سال میں مرثیہ گوئی نے دکن میں پھر سنبھالا لیا مگر وہ بات کہاں۔ دکن کی مرثیہ گوئی آج شمال کی مرثیہ گوئی کا زیادہ سے زیادہ ضمیمہ کہی جا سکتی ہے۔ پھر بھی اس ساڑھے چار سو برس کی مدت میں دکن نے جو کچھ پیش کیا وہ اس کی سربلندی کے لئے بہت ہے۔

# آسمان کا تھوکا

از:- جناب گجندر سنگھ صاحب

رقم گننے کے بعد لالٹین کی مدھم روشنی میں اس نے نوٹ بک میں تحریر کر کے اندر جھانکا اور مطمئن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ واسکٹ کے اندر، جیب میں اس نے ساری رقم جو تھوڑی سی تھی رکھ لی۔ رات ہو چکی تھی تاہم اس نے لالٹین کی لو کم کر کے وہیں چھوڑ دیا اور خود اندر آ گیا۔

وہ گھگنا آدمی ہمیشہ رقم کو اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ روپیہ کے معاملے میں وہ بیحد غور و فکر سے کام لیتا تھا۔ روپیہ اسے بہت عزیز تھا۔ محض یہی ہی نہیں اگر اس کی حفاظت میں کوئی بھی اپنی رقم دے جاتا تو وہ اسی خیال اور انھیں جذبات سے اسے سنبھال کر رکھتا تھا۔

اسی لئے آمدنی وہ اپنے پاس رکھتا تھا اور اس کا ساتھی اسی گندے اور بدبودار تنور پر روٹی پکا دیتا تھا۔ وہ خود اپنے ساتھی سے بہتر کام کر سکتا تھا لیکن وہ اکیلا سب کام کس طرح سرانجام دیتا اور پھر اس کے اپنے بھی پیسے نہیں تھے۔ اس کے ساتھی باورچی کی رقم تھی جو تنور سے تھوڑی سی آمدنی پیدا کر دیتی تھی جسے وہ دونوں بانٹ لیتے تھے۔

اس نے کرسیاں اٹھا کر میزوں پر رکھ دیں۔ ہمیشہ کی طرح آمدنی کم ہوتی تھی اور امید باقی رہ جاتی تھی کہ کچھ اور اضافہ ہو سکتا۔ اس نے ٹھنڈا سانس لے کر بے حد بدوضع اسی چھوٹے سے ہال کو دیکھا اور پیچھے باورچی خانے میں اپنے ساتھی کے پاس آ گیا۔

"سو؟" باورچی نے کہا۔ "سو؟ کام ختم"

اس نے واسکٹ کے اندر رقم کو ٹٹولا۔ "کچھ خاص نہیں ـــ وہی ـــ وہی ـــ" وہ بڑبڑایا اور ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ باورچی نے چکنے برتنوں کو گیلے میلے میز پر رکھ کر اسے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ایک پلیٹ نہیں ہے"

وہ دونوں بڑے فکر مند باورچی خانے سے باہر نکلے۔ تاریک چھوٹے کمرے میں جسے وہ ہال کہتے تھے۔ انھوں نے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سب کرسیاں کھینچ دیں ـــ پلیٹ ندارد تھی۔ باورچی نے حاکمانہ دریافت کیا۔

"کہاں رکھی تھی؟"

"کہاں" اس نے کہا۔ "یہ تم بتا دو تو میں ابھی اٹھا کر دے نہ دوں۔" اسی لمحے باورچی کے پاؤں سے پلیٹ ٹکرا کر دیوار تک پھلانگتی چلی گئی ـــ وہ دونوں سن ہو کر رہ گئے لیکن پلیٹ ٹوٹی نہیں۔ گھگنے نے جو بیوپاری کا کام کرتا تھا جھٹ اٹھا کر پلیٹ باورچی کو دے دی ـــ

دونوں یکدم کھکھیائے اور باورچی نے تیزی سے پلیٹ کو میز پر رکھ دیا۔ انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان دونوں کے چہروں پر نفرت اور چڑچڑاپن نمودار ہوا۔

باورچی نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

"بتا کام کہ یہ چھان کس شخص کو تم نے یہ پلیٹ دی ہے۔"

"کیسے؟" اس نے کہا۔ "یہ تم بتا دو تو میں ابھی اسے ٹھکانے لگا دوں۔"

اور دونوں جھک کر پلیٹ کو بغور دیکھا۔ وہ کاک جس میں پلیٹ پیش کی گئی تھی اپنے عملے میں شریک کیا تھا — اور ایک گوری بچی وہ غلاظت بھی پلیٹ پر جم گئی تھی۔

صحن باہر پڑی لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔

برساتی سیاہ رات اور مینڈکوں، جھینگروں کا لگاتار شور ان کے ذہنوں کو خوامخواہ تشنج دینے کو کافی تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر تاریکی میں کھوئے ہوئے اس کے چہرے پر محض چمکتی ہوئی دو آنکھوں کو گھورا۔

"کیا یہ میرا کام ہے؟"

"یہ جھوٹے برتن تو میں مانجھ سکتا ہوں اور یہ" — اس نے پلیٹ کو اس کے آگے سرکا دیا۔ "یہ —"

بوائے بڑبڑایا: "یہ سراسر حماقت تھی۔ اس شخص کی ایک بدتمیزی تھی۔"

"کون تھا وہ؟" — وہ اور آگے کھسک آیا۔

"یہ تم بتا دو۔"

باورچی ایک دم چنگھاڑا — "میں کیسے بتا دوں — مجھے کس طرح معلوم ہو" — وہ الٹے پاؤں باورچی خانے میں چلا گیا۔

بلب کی روشنی سے بھری وہ پلیٹ اس کے سامنے تھی۔ ان کی تاریکی میں وہ محض ہاتھوں سے چھو کر ہی محسوس کر سکتا تھا۔ آخر ایسی کیا آفت تھی۔ ہاں باورچی کو ایک ہی کوفت [illegible] جہاں سب برتنوں کو وہ ایک چھوٹی بالٹی کے پانی میں [illegible] کر اور ایک چیتھڑے سے پونچھ کر رکھ دیتا تھا۔ [illegible] کو صاف کرنے کے لئے اسے اپنے اصول کے خلاف [illegible] کو پلیٹ پر ڈالنا ہوگا اور پھر اسی کپڑے [illegible] میں مختلف بات کی خاطر اس

طبیعت اور روش بیکار معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ اتنا سا کام نہیں کرنا چاہتا تھا تو وہ خود بالٹی میں سے ایک دو چھینٹے چلو بھر پانی کے پلیٹ پر ڈال سکتا تھا۔

یکایک اسے بھوک لگی — وہ اندر باورچی خانے میں آ گیا۔ "دو تین پتیلیوں میں مختلف مختلف، ایک ترکاری، ایک دال اور گوشت کی بدذائقہ بو تھی۔ اول تو اس کھانے میں کوئی خوبی نہ تھی اور اب آدھی رات کو جب محض کھرچن باقی رہ گئی تھی۔ اس نے ان پتیلیوں میں جھانکا اور بھوکی نگاہوں سے باورچی کو دیکھنے لگا جو اس کے لئے لاپرواہی سے دال ایک پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔

"ایک دو بوٹیاں بھی رکھ دو" —

ایک دو بوٹیاں پلیٹ میں پٹخ کر اس نے ان گنت چھلکوں کو اس کے لئے ایک اور پلیٹ پر رکھ دیا — وہ نہایت خفا ہو کر اکڑا کھڑا تھا۔

بوائے یا منیجر نے اپنے کھانے کے برتن اٹھا کر باہر جانے میں ہی مصلحت سمجھی۔ ایک کونے میں جہاں باہر کی سیاہی اور مدھم لالٹین کو وہ اچھی طرح دیکھ سکتا تھا وہ اپنے کھانے کو لے آ بیٹھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ باورچی اکڑا ہوا اس کے پیچھے کھڑا تھا — "ایک روپیہ دو — میں ایک پلیٹ کہیں سے گوشت کی منگواؤں۔"

اس نے اپنے سامنے پڑی پلیٹوں میں دال اور دو ایک بوٹیوں کو بغور دیکھا اور ہچکچا کر کہا — "کافی گوشت اچھا ہوگا۔"

"تم ہمیشہ ایک ہی بات کہو گے" باورچی چیخا۔ "میں نہیں کھاتا۔"

اس کے ہاتھ جھٹ جیب میں سے روپیہ کا نوٹ نکال کر اسے پیش کر رہے تھے۔ اس نے پھر بھی کہا — "میں کھا رہا ہوں" — غلیظ پلیٹ کو اٹھا کر باورچی جا چکا تھا۔

گیا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بھی ایک روپیہ، اٹھنی ہی کبھی اپنے لئے خرچ کر سکتا۔ لیکن وہ نوٹ اس کی جیب میں بے مد محفوظ تھے کیونکہ یہ اس کی دائمی کمزوری تھی ـــ اور باورچی اپنے پکائے سالن کو کھانے کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ خود اسے گھن آتی تھی ـــــ وہ نٹے پر لیٹے تکتا گیا۔

یکدم قدموں کی چاپ کے ساتھ ایک گاہک لالٹین کی مدھم روشنی میں آوارہ روح کی سنجیدگی، سختی، لاپرواہی کے ساتھ ٹکٹکی باندھے ہال کی سیاہی میں نیم خوابیدہ لگا ہوا سے ٹٹولنے لگا تھا ـــ اگر سارے دن میں آمدنی اتنی اچھی نہ ہوئی تو اب ایک گاہک اور کھڑا تھا۔ اس طرح جن میں سے جسے وہ بیکار سمجھتے تھے ایک پلیٹ سالن اور چند ٹھنڈی تقریباً باسی روٹیاں اس کی جیب کی مالیت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ بیوپار اور تاجر کی ایسی تجارت جو وہ کرتے تھے کس حد تک مشکل یا فائدہ مند ہو سکتی تھی۔ تمام دن بلکہ کئی روز تک ہو سکتا تھا کہ ان ترکاریوں، دالوں اور گوشت کی قیمت بھی آمدنی سے پوری نہ ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ گھڑی سے ہی چند سکے ایک جیب سے دوسری جیب میں پھسل آئیں ـــ وہ پھرتی سے اٹھ کر چلایا "اندر آئیے"

گاہک چونک کر پیچھے ہٹا اور پھر اندر آ گیا ـــ اس نے ٹوپی ایک میز پر پٹخی اور مختصراً پوچھا۔ "کھانے کو کچھ ہے" ـــ یہ فقرہ ایک حکم تھا اور ان کے دیگچوں کی تفصیل کے بارے میں ایک سوال تھا اور اتنی رات گئے ان کی میزبانی کا امتحان تھا اور انھیں کمائی کرنے کی ایک دعوت تھی ـــ اور نفی کی صورت میں وقت ضائع نہ کرنے کا اعلان تھا ـــ اور وہ ایک کرسی میز پر سے اٹھا کر بیٹھ گیا۔

لڑکے یا منیجر نے باورچی کو زور سے پکارا اور ساتھ ہی مہمان کو تسلی دی ـــ "سب کچھ موجود ہے" ـــ گاہک نے جمائی لی ـــ "لاؤ پھر" ـــ اس نے انگڑائی لے کر پوچھا ـــ "اگر میں نہیں آتا تو تم اس سب کچھ کا کیا کرتے۔ تم جانتے ہو دیر ہو گئی ہے۔ آج رات کوئی نہیں آئے گا"

اس نے انتہائی مہمان نوازی سے کہا "یہاں سب چیزیں روز تازہ بنتی ہیں۔ ہم انھیں جتنا کھا سکتے ہیں کھا لیتے باقی پھینک دیتے ہیں" ـــ لیکن گاہک جواب سے بیشتر مطمئن ہو چکا تھا ـــ وہ دونوں کہنیاں میز پر رکھے اس کی چکنی سطح سے میل کا ملگجا سا ناخون سے کرید کرید کر گولیاں بنا رہا تھا۔ ایسی فضا، ایسے ماحول اور اس شغل سے وہ یگانگت محسوس کر رہا تھا۔

اس نے باورچی کو ڈھونڈنے اور کھانا لانے سے پہلے مہمان کی تسلی کے لئے آنکھ بچا کر اپنا پانی کا گلاس اور جگ اس کے سامنے رکھ دیئے۔ دراصل اس ہنگامہ فی الحال محض ایک گلاس ہی بچا تھا ـــ گلاس بھر کر اس نے پیش کیا۔ پیاسے شرابی کی طرح وہ گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں پی کر مونچھوں کو صاف کر کے میل کی گولیاں بنانے کے شغل میں پھر مصروف ہو گیا تھا ـــــ

لپک کر لڑکے اندر باورچی خانے میں پہنچا۔ باورچی ابھی گوشت کی پلیٹ لئے لوٹا تھا۔ خوشبو اس کے نتھنوں میں سے ہوتی ہوئی اس کے ذہن کو مست کرنے لگی۔ اس وقت وہ ساری پونجی ایک ایسے نوالے کے لئے دینے کو تیار معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس نے ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "گاہک ہے" پھلکے اور ترکاری یا گوشت ـــ جلدی"

ایک گاہک کا اعلان اور کھانے کی تفصیل ہی ہوتی تو اور بات تھی لیکن آخری ایک فضول اور فالتو لفظ "جلدی" نے قیامت مچا دی ـــ جلدی؟ وہ جلدی کیوں کرے، کس لئے کرے، اس وقت کیونکر جلدی ہو ـــ وہ اپنا کھانا ٹھنڈا اور بدذائقہ کرے؟ باورچی نے اسے یہ سب کچھ پوچھا۔

بوائے یا منیجر خود ہوٹل کا انتظام کرسکتا تھا۔ وہ گاہکوں کے گندے برتن اٹھا سکتا تھا۔ وہ غلاظت بھی دھو دیتا اور فضول خرچ کے تئے روپے کا نوٹ بھی دینے میں دریغ نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس بات کو وہ بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا ۔۔۔ لیکن اس نے باورچی کو ایک موقع دیا ۔۔۔ اور خود خاموشی سادہ سے باہر آگیا۔ گاہک بدستور میز کی میل کریدرہا تھا۔ جگ خالی ہوگیا تھا۔ اس نے پھرتی سے جگ اٹھایا۔ پانی لینے کے لئے اس نے باورچی خانے کے مٹکوں اور کنستروں کو ٹٹول مارا لیکن پانی کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ برف کا پگھلا پانی اس کی نظروں میں آگیا۔ اس نے سب طرف کسی کپڑے کو ڈھونڈا تاکہ مچھروں، پتنگوں یا تنکوں کو چھان لے۔ کپڑا سوائے اس چیتھڑے کے اور کوئی نہ تھا جس سے وہ برتن مانجھتے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی جیب سے گندے رومال کا ٹکڑا نکالا اور ٹھنڈا پانی چھان کر جگ میں ڈال دیا۔ گو رنگت زرد زرد سی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی وجہ محض برف کی فیکٹری کی لاپرواہی تھی جو برف صاف پانی سے بنانے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ لیکن گاہک نے وجہ نہیں پوچھی۔

اس نے لپک کر ٹماٹروں اور پیاز کے ٹکڑوں کو جمع کیا۔ وہ پلیٹ میں ڈال کر لے ہی جاتا لیکن باورچی کی مضبوط گرفت نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا ۔۔۔ "وہ برتن میں نے صاف کر کے رکھے ہیں ۔۔۔"

"تو میں کیا کہتا ہوں ۔۔۔" اس نے احتجاج کیا۔

"میں بار بار صاف ہی کرتا رہوں گا" اس نے سوال کیا: "یہ لے جاؤ۔ کھلا دو کھانا ۔۔۔" اور وہی غلاظت بھری پلیٹ اس نے آگے سرکا دی جو اسی چیتھڑے سے صاف ہوگئی تھی ۔۔۔

خاموشی سے اس نے ٹماٹروں اور پیاز کے لچھوں کو جمع کر کے اس میں رکھ دیا اور باہر لے آیا ۔۔۔ وہ گاہک اب کچھ پریشان ہونے لگا تھا۔ کھانے کے اس آغاز نے اسے پھر اطمینان بخشا اور وہ پیاز کے لچھوں اور ٹماٹر کے ٹکڑوں کو وقت کے گذارنے کے لئے کھانے لگا۔ اب سالن اور روٹیوں کے آنے میں تاخیر کا کوئی بہانہ نہیں ہوسکتا تھا اور بوائے یا منیجر کو اب اس بدانتظامی پر ہنسی آنے لگا۔ اس نے جیب ٹٹولی۔ جیب کی کل جمع پونجی اوسط سے بھی کم تھی اور ایک قیمتی گاہک سے یہ بے رخی اسے بے حد تعجب خیز اور بدذوقی محسوس ہوئی۔

باورچی خانے میں اس نے باورچی کو گیلے اور کچے پکے پھلکوں کو سینکتے پایا۔ اس نے ایک گندی پلیٹ کو چیتھڑے سے پونچھ ڈالا اور ہمدردی سے کہا۔ "بس ٹھیک ہے۔ بہت گرم بھی کوئی ایسی ضرورت نہیں۔ بس یہ ٹھیک ہے۔" لیکن باورچی ایک پاپڑ کی طرح روٹی کو بھون رہا تھا ۔۔۔ اس کی ہمدردی سے باورچی کے ہاتھوں کی جنبش اور اس روٹی کی حالت بے حد ناگوار ہو رہی تھی۔

وہ صبر سے دیکھتا رہ گیا۔ باورچی نے سلیقے سے ایک صاف پلیٹ میں چپاتیاں رکھ کر اپنے سامنے دسترخوان بچھالیا اور کھانے لگا۔

خود اس نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا تھا اور اس کے کھانے میں بدذائقہ اور بدبودار دال اور ایک دو بوٹیاں گوشت کی تھیں جو پتھر جیسے پھلکوں سمیت ٹھنڈی اور بے ذائقہ ہوکر رہ گئی تھیں۔ اس لقمے کے ذریعے وہ ریتک دانتوں میں سے کریدرہا تھا اور باورچی ایک دولت مند سوداگر کی طرح مزے لے لے کر ایک روپیے میں گوشت کی ایک پلیٹ لاکر بے فکری سے کھا رہا تھا۔ حالانکہ ایک مہمان، ایک گاہک باہر بیٹھا اس انتظار میں تھا کہ چند لمحوں میں تازہ پھلکے اور لذیذ سالن پیش ہوگا۔ گو جیسے پھلکے اور سالن وہ لے کر جانا چاہتا تھا۔ وہ مختلف بات تھی ۔۔۔ ایک منیجر کی حیثیت سے یا ایک بوائے کے فرائض

کے مطابق اس نے اپنا اہم پارٹ ادا کرنے کی کوشش کی۔
"تم کیا کر رہے ہو" اس نے کہا۔ "یعنی باہر ایک گاہک بیٹھا ہے اور تم ـــ"

"وقت کیا ہوا ہے؟"

"میں نہیں جانتا کیا وقت ہوا ہے۔ تم بتا دو ـــ وقت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک گاہک بیٹھا ہے اور تم ـــ"

"چولہے میں آگ ہے؟"

"میں نہیں جانتا کہ آگ ہے یا نہیں ـــ"

"سب باتیں میں کیسے بتا دوں ـــ" باورچی نے ایک گلاس پانی پیا ـــ "ذرا پانی دینا"

وہ اسی چھانے ہوئے پانی کو لے آیا ـــ اس نے خوشگواری اور بہتر فضا کو قائم ہوتا محسوس کر کے فائدہ اٹھانا چاہا ـــ "چلو اٹھو بھی۔ گاہک بیٹھا ہے"

باورچی نے پھر پانی طلب کیا۔

باہر ہال میں سے ہلچل کی آواز آ رہی تھی۔ گاہک واقعی اب تک پریشان بلکہ بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "آیا صاحب ـــ ابھی گرم گرم روٹیاں۔ ابلتا ہوا گوشت"

لیکن نہ روٹیاں تھیں اور گوشت کے محض چھیچھڑے موجود تھے جن پر شوربہ اور تیل کی چکنائی جمنے لگی تھی۔ اس نے ایک میلی کچیلی پلیٹ میں گوشت کے سب چھیچھڑے ڈال دیئے اور انھیں بجھی ہوئی آگ کے پاس سینکنے کے لئے رکھ دیا۔

ـــ پھرتی سے اس نے باورچی کے سامنے رکھے پھلکے اٹھائے ـــ اس پلان کے لئے وہ دیر سے اپنے جذبات و [illegible] کو سنبھال [illegible] اور حماقت کو [illegible] ـــ اب اس نے وہ سب روٹیاں اٹھائیں اور باہر بھاگا۔

وہ ابھی باورچی خانے کے دروازے تک [illegible]

سمجھا تھا کہ باورچی کے مضبوط اور تنومند بازو اسے [illegible] میں لئے کھینچنے لگے ـــ وہ قہقہہ مار کر ہنسا "اسے [illegible]

جانے دو ـــ شور پڑ جائے گا اور روٹیاں کم جائیں گی"

لیکن وہ جارحانہ گرفت سخت ہو رہی تھی۔ اب وہ دونوں باورچی کے دسترخوانوں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ باورچی نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے روٹیاں چھین لیں۔ درد سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے سنجیدگی سے باورچی کے چہرے کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایک بد وضع چمک تھی۔ وہ ایک بار لرز گیا۔ "تم اور پکا لینا" اس نے سہمے ہوئے کہا۔ لیکن باورچی دوبارہ کھانے میں مشغول ہو گیا تھا۔ اس نے ایک کہنی سے اسے دھکیل دیا "جا کر اپنے گاہک کے لئے پکا لو ـــ"

درد، خوف اور حیرت کا مرقع بنا اس اچانک سلوک کے دھچکے سے سہما ہوا ہال میں آ گیا ـــ اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ گاہک وہاں نہیں تھا۔ ٹماٹروں اور پیاز کے لچھوں والی غلیظ پلیٹ تقریباً خالی ہو گئی تھی۔ پانی ختم ہو چکا تھا اور گاہک آخر چلا گیا تھا۔ اسے تمام واقعے میں پہلی بار اطمینان ہوا کہ گاہک کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ کیا عذر پیش کر سکتا تھا یا کیونکر کھانا مہیا کر سکتا تھا۔ پھر اسے اپنی چپاتیاں نظر آئیں اور وہ باہر گاہک کو ڈھونڈنے بھاگا۔ آخر ان روٹیوں سے کم از کم وہ آٹھ آنے وصول کر سکتا تھا اور اس کی جیب میں روزانہ خرچ کے سرمائے کو نکال کر باقی نقد کیا بچا تھا؟ محض ایک روپیہ اور بارہ آنے یعنی چودہ آنے فی کس ـــ اور سوچنے کی بات تھی کہ چودہ آنے سے کیا بنتا تھا جبکہ ان کے کنبے تھے اور بیسیوں فضول رسم اور رواج تھے جن کے لئے معقول رقم چاہئیں تھیں۔

گاہک نے اسے تیار کیا اور خاموش سڑک پر چلتا بنا [illegible]

[illegible] آپ آ گئے ـــ اور ہم [illegible] رکھا اور آپ کا انتظار [illegible]

[illegible] اس نے ضدی بچے کی [illegible]

"میں نہیں جاتا۔"

لیکن وہ گاہک کو کیسے جانے دیتا جبکہ مزید چھ یا آٹھ آنے نفع میں چار آنے فی کس کا اضافہ کر کے چودہ آنے سے ایک روپیہ اور دو آنے کی باعزت اور واجب رقم بن سکتی تھی۔ اور گاہک چلا گیا ـــ

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ نے حکم دیا تھا۔"

اس نے احتجاج کیا ـــ

"نہیں، میں نہیں آتا" ـــ نفی میں وہ شخص سر ہلا ہلا کر کہتا گیا ـــ "میں نہیں آتا ـــ"

گاہک کے بغیر اسے لوٹنا پڑا ـ ایک غم، احتجاج، غصہ لئے ہوئے اسے واپس آنا پڑا۔ باورچی کھانا کھا کر ایک عام فہم گیت مست آواز سے گا رہا تھا۔ وہ پاس کھڑا کڑھتا رہا۔ اس کے دانتوں میں روٹی کے ذرے بھی نہیں رہے تھے۔ وہ اس لاپرواہ شخص کو ستانا چاہتا تھا۔

"آج کی تمہاری آمدنی محض چودہ آنے ہے۔ کر لو لیا کرتے ہو ـــ"

گیت کی لے اونچی ہو گئی۔ اس شخص کی مستی حیرت انگیز تھی اور اس کا گرسنہ عنا بھی عجیب خیز تھا۔ جبکہ باورچی ایک روپیہ کی گوشت کی ایک پلیٹ کھا سکتا تھا اور وہ بیٹھا اس کی صورت ہی دیکھتا رہ جاتا تھا اور پھر وہ آمدنی کو نصف بانٹ لیتے تھے۔

جوش اور غصے میں وہ اٹھا۔ کڑھتے ہوئے وہ پاس کی دوکان پر پہنچا اور اس نے تازہ لذیذ چپاتیاں اور گوشت کی ایک پلیٹ اور ترکاری جی بھر کر کھائی۔

جو دو آنے بچے اس نے سگریٹ اور پان پر خرچ کر دیئے اور پھر اس نے دوسرے مشہور گیت کی طرز ذوق سے گائی۔

بوسیدہ و تاریک ہال میں گنگناتے ہوئے اس نے باورچی کو فاتحانہ مسکراہٹ سے ملنا چاہا۔ لیکن اس کی بلند پایہ دھن سے بے خبر باورچی میٹھی نیند کے خراٹے لے رہا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں کو پھیپھڑوں کی حدود تک جذب کر کے اس نے بغور سوتے ہوئے آدمی کو دیکھا اور اس کی خالی جیب کا شفاف تصور سیاہی میں نمودار ہوا ـــ

اس نے بستر لپیٹ کر بغل میں دبایا اور رفو چکر ہو گیا۔

# تبصرے

ادارہ

**حیات حضرت امیر خسرو** — از خان بہادر نقی محمد خاں صاحب خورجوی۔ مطبوعہ ٹائمز پریس کراچی۔ قیمت دو روپے بارہ آنے

امیر خسرو ہندوستانی شعر و سخن اور موسیقی کی دنیا کے بہت بڑے امام ہیں۔ انھوں نے اس ملک کے مشترکہ کلچر اور تمدن کی تعمیر کی بنا ڈالی۔ فارسی کے بہت بڑے شاعر ہونے کے باوجود اردو کے ابتدائی معمار تھے اور اس زبان کے ابتدائی نمونے انھی سے منسوب ہیں۔ ہندوستانی موسیقی ان ہی کی ایجادوں اور کاوشوں کی رہین منت ہے لیکن اس موضوع پر اب تک کسی نے اس شرح و بسط سے نظر نہیں ڈالی تھی جیسی کہ زیر نظر کتاب کے مرتب نے ڈالی ہے اور وہی اس کے زیادہ اہل تھے کیونکہ ان کو موسیقی سے خاص دلچسپی ہے۔

اس کتاب میں آٹھ باب ہیں جن میں امیر خسرو کے خاندانی سلسلہ، پیدائش، تعلیم، امرا و شاہی، بیعت، ہندی شاعری، فارسی شاعری، دیگر تصانیف اور موسیقی کی ایجادات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ آخری موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کاوش ہے اور یقین ہے کہ قدر و منزلت پائے گی۔

**اطالیہ** — از۔ افضل العلماء ڈاکٹر مولوی عبدالحق ممبر پبلک سروس کمیشن مدراس۔ ناشر، اسلامیہ بک ڈپو کرنول۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق جنوبی ہند میں علوم مشرقیہ کے بہت بڑے ماہر اور سرپرست ہیں۔ ان کو صحیح معنوں میں جنوبی ہند کا سرسید سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے کرنول اور دیگر مقامات پر کئی کالج اور مدرسے قائم کئے ہیں۔

۱۹۲۶ء میں انھوں نے پہلی بار اطالیہ کا سفر کیا تھا اور دوسرے سال پھر اس ملک کی سیر کی تھی۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی اس سیر و سیاحت کو عمدہ اور سلیس اردو میں محفوظ کر دیا۔ ضرورت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ان متعدد مضامین کے مجموعے بھی شائع ہوں جو انھوں نے مختلف موضوعوں میں وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے ہوں۔

**ادبی مطالعے** — مرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد صاحب ایم۔ اے۔ مطبوعہ اعجاز مشین پریس۔ قیمت دو روپے۔

اس چھوٹی سی کتاب میں اردو نظم و نثر کے جواہر پارے منتخب کر کے شائع کئے گئے ہیں۔ حصہ نثر میں شبلی، حالی، عزیز، مرزا، عبدالحق، مسعود حسن رضوی، آل احمد سرور، احتشام حسین وغیرہ کے معیاری مضامین ہیں اور حصہ نظم میں عرشی، امجد، فیض، احسان، ماہر القادری، جگر، مجاز، جگن ناتھ آزاد، علی منظور، مخدوم، جوش اور اختر کے کلام کا انتخاب ہے۔ کالجوں کے طلبہ کے عام مطالعہ اور ذوق کی تربیت کے لئے یہ مجموعہ مفید ثابت ہوگا۔

**سالار جنگ میوزیم** — از، سید مبارز الدین رفعت صاحب ایم۔ اے۔ مطبوعہ اقبال پرنٹنگ پریس۔ حیدرآباد۔ قیمت ایک روپیہ۔

اس کتابچہ میں حیدرآباد کے مایہ ناز مجموعہ نوادر کا تعارف دلچسپ اور شگفتہ انداز میں کرایا گیا ہے۔ تصویریں بھی شریک ہیں۔ ابتدا میں سالار جنگ کے خاندان کی تاریخ ہے اور میوزیم کی تشکیل اور حسن و قبح کی نسبت معلومات شامل ہیں۔

رفعت صاحب اردو کے بہترین مترجم اور مؤلف ہیں۔ ان کی اعلیٰ پایہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یقین ہے کہ ان کا یہ کتابچہ بھی اپنے مقصد کی تکمیل کرے گا۔

# نتائج اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو

## بابتہ جون ۱۹۵۶ء

## اردو فاضل

مرکز اورائی و بلدہ

بلحاظ نشانات محصلہ

۸ محمد صلاح الدین نیر اول مرکز بلدہ

۵ مظہر حسین دوم مرکز اورائی

بلحاظ رول نمبر

۱ محمد قوی سوم

۲ سید علی اشتیاق سوم

۴ نعیم اللہ خاں سوم

۵ مظہر حسین دوم

۶ محمد غوث سوم

۸ محمد صلاح الدین نیر دوم

۱۱ سید مظہر الدین سوم

## اردو عالم

مرکز اورائی و بلدہ

بلحاظ نشانات محصلہ

۴ رشیدہ خاتون اول مرکز اورائی

۷ بی بی ام ہانی دوم مرکز بلدہ اناث

۵ سید عبدالنبی سوم " ذکور

بلحاظ رول نمبر (مرکز اورائی)

۱ نور اللہ حسینی سوم

۲ وحید الدین چشتی "

۳ عبدالمجید خاں دوم

۴ رشیدہ خاتون "

(مرکز بلدہ)

۵ سید عبدالنبی دوم

۶ میر منور حسین سوم

۷ بی بی ام ہانی دوم

## اردو زباندانی

مرکز اورائی و بلدہ

بلحاظ نشانات محصلہ

۲۷ محمد مقبول احمد اول مرکز بلدہ ذکور

۱۶ فاطمہ بیگم دوم " " اناث

۱۱ جمیل احمد سوم " " ذکور

بلحاظ رول نمبر (مرکز اورائی)

۳ سید یوسف اشتیاق سوم

۴ سید ظفر اشتیاق سوم

۶ محمد حامد سوم

(مرکز بلدہ)

۷ محمد عبدالسلام اول

۱۰ رقیہ بی دوم

۱۱ جمیل احمد اول

۱۲ سید جلال الدین سوم

۱۴ زہرہ بیگم دوم

۱۵ رقیہ بیگم دوم

۱۶ فاطمہ بیگم اول

۱۸ گوہر تاج سوم

۱۹ خواجہ بی سوم

۲۰ نسیم فاطمہ سوم

۲۱ عباسی بیگم دوم

۲۳ فاطمہ بی سوم

۲۴ زہرہ بی سوم

۲۵ فاطمہ سلطانہ سوم

۲۶ فاطمہ سلطانہ سوم

۲۷ محمد مقبول احمد اول

۲۸ عبدالحفیظ سوم

۲۹ عبدالرحیم بن محمود سوم

۳۰ ملکفی جی سوم

## اردو دانی

مرکز دیرایع بلوٹی اورائی اور بلدہ

بلحاظ نشانات حصلہ

۲۴ عابدہ بانو — مرکز اورائی اناث

۴۹ میر توفیق علیخان — ر بلدہ ذکور

۹۳ قاسم بی — ر ر اناث

مرکز ویراج پیٹھ

کامیاب بہ امتیاز

۱۔ ظفر علیخان

کامیاب

۲۷ ایس ایچ محمد حسین

۲۸ امان اللہ خان

۳ ناظر النسا

۴ عابدہ خانم

۵ صغیرہ خانم

۶ رحمت النساء

۷ حمیدہ خانم

۳۰ ثریا خانم

مرکز اورائی

کامیاب بہ امتیاز

۱۷ سمیع اللہ خان

۱۸ شفیع اللہ خان

۱۹ محی الدین احمد صدیقی

۲۱ سید افتخار ناظم

کامیاب

۹ اکبر خان

۱۰ عبدالرشید خان

۱۱ عبداللطیف خان

۱۲ سلطان احمد خان

۱۳ نور احمد خان

۱۴ تقی احمد خان

۱۵ ثناء اللہ خان

۱۶ [illegible] اللہ خان

۲۳ سید اظہر اشتیاق

مرکزی اورائی اناث

کامیاب بہ امتیاز

۲۴ عابدہ بانو

۲۵ حمیدہ خاتون

مرکز بلدہ

کامیاب با امتیاز

۴۵ میر توفیق علی خان

۵۰ محمد عبدالصمد

۵۷ محمد صاحب خان

۵۴ نجیب النساء بیگم

۱۲۴ خورشید بانو

۶۸ محمد عبدالرحمن

۷۸ سید جلال الدین

۹۳ قاسم بی

۱۱۴ رفعت النساء بیگم

کامیاب

۲۴ اقبال علی

۴۸ میر فیاض علی خان

۵۱ بدر النساء بیگم

۵۲ ہاجرہ فاطمہ

۵۳ رقیہ بانو

۵۵ رحمن بی

۵۶ زیب النساء بیگم

۵۸ زہرہ خاتون

۵۹ حسین بی

۶۰ محبوب النساء

۱۲۲ محمد بانو

۱۲۷ سراج بانو

۶۳ سید محمد حبیب الدین

۶۴ محمد عبدالمنان

۶۵ سید ناصر علی

۷۷ محمد شریف

۷۹ محمد شیخ محبوب

۸۰ خواجہ معین الدین

۸۳ سرور حسین

۹۴ خواجہ بی

۹۵ آمنہ بی

۹۶ پیاری بیگم

۱۰۰ یوسف بی

۱۲۹ عزیزہ بیگم

۱۰۵ فاطمہ بیگم

۱۰۶ تیلی بیگم

۱۰۸ سعیدہ بیگم

۱۱۷ محمد النساء

۱۱۸ بدر النساء

۱۱۹ محمد اسحاق

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان

ماہنامہ

# سب رس

حیدرآباد دکن

جلد (۲۰)۔ شمارہ ( ۱۱ و ۱۲ )
ماہ نومبر و ڈسمبر ۱۹۵۶ء

نگراں:-
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ادارہ:-
رمن راج سکسینہ
نصیر الدین ہاشمی
جانکی پرشاد

سالانہ چندہ چھ روپے سکۂ ہند
ششماہی " تین "

قیمت :- ایک روپیہ

مہتمم ادارۂ ادبیات اردو کے اہتمام سے "مطبع اعجاز پرنٹنگ پریس" میں چھپ کر دفتر ادارہ خیرت آباد سے شائع ہوا۔

# فہرست

# ابھے چند

اورنگ زیب کے عہد میں سرمد ایران سے ہندوستان میں بغرض تجارت آیا۔ وہ صوبہ سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں مقیم ہوا۔ وہاں ابھے چند نامی ایک ہندو لڑکے پر عاشق ہوگیا۔ عشق جنون کی حد تک پہنچا۔ اسی عالم میں وہ دلی آیا اور یہاں کے کوچہ و بازار میں عریاں پھرنے لگا۔ آخر میں اورنگ زیب کے حکم سے عریانی اور چند دیگر مذہبی وسیاسی وجوہ کی بنا پر اسے جام شہادت پینا پڑا۔ اس نظم میں ابھے چند کے حسن اور دلکشی پر روشنی ڈالی گئی ہے جس میں سرمد کو خدا کا جلوہ نظر آیا۔

رخسار کی تابش میں فروغ مہ وانجم  ہے میکدہ آنکھوں کی سیاہی میں نظر بند
یکتائے زمانہ ہنر عشوہ گری میں  رودِ چمنِ سندھ، فسوں کار ابھے چند

اعجاز تکلم دیا سوسن کی زباں نے  پر کیف ہنسی چھین لی معصوم کلی سے
تابانیٔ عارض میں لئے طور کا جلوہ  رخشندہ جبیں پرتو حسن ازلی سے

اس کے لب ورخسار کی جاں بخش مہک سے  خجلت زدہ فردوس بریں مشکو کا گلشن
اس کے رخ آئینہ کی ضوریز کرن سے  ہر ایک کلی روکش مہ وادیٔ ایمن

اس شہر میں اک جوہری ایران سے آیا  مقصود تھی الماس و نگینہ کی تجارت
لیکن کیا کچھ ایسا ابھے چند نے جادو  پہلی ہی نظر میں ہوا صید غم الفت

خوش فکر یہ تاجر جسے ہم کہتے ہیں سرمد  کرنے لگا سودا گہر اشک رواں کا
سب بھول گیا لعل و زمرد کی تجارت  احساس کچھ اس کو نہ رہا سود و زیاں کا

پھر سندھ کو بھی ترک کیا جذب و جنوں میں  دلی کے گلی کوچوں میں پھرنے لگا عریاں
پینا پڑا اک روز اسے جام شہادت  مہکا گیا دنیا میں محبت کا گلستاں

اللہ رے! ابھے چند کا حسن نظر افروز  پرتو وہ خدا کا تھا کہ تصویر صنم کی
اس کفر کے آئینہ میں ایماں نظر آیا  تھی دیر میں اک روشنی قندیل حرم کی

سلام سندیلوی

# غزل

دل کی بات بنامِ غزل
بنتی ہے پیغامِ غزل

صبحِ غزل اور شامِ غزل
روز و شب ہنگامِ غزل

حسن عروجِ بامِ غزل
جانِ عشق مقامِ غزل

غین و زا و لامِ غزل
تینوں ہیں ایک نامِ غزل

ون یا ٹو ون برائے ون تھرڈ
ایک ہے یکتا نامِ غزل

منبعِ حسن و مرجعِ عشق
سر تا پا اہرامِ غزل

مستِ جامِ غزل ہے دل
جان ہے مستِ جامِ غزل

نارِ کذب و نورِ صدق
کفرِ غزل اسلامِ غزل

بوالہوس اب کہتے ہیں غزال
ان سے ہوا بدنامِ غزل

سید محمد حسین آزاد

# غزل

منہ کے میٹھے ہی رہے دل پہ چلاتے آرے
ایسے محبوب کو کس منہ سے کہیں مہ پارے

صدق کی راہ میں دیکھا گیا اکثر ہارے
لاکھ شیطان بھی سجدے میں اگر سر مارے

خرمنِ امن پہ برسائیں گے جو انگارے
نظر آجائیں گے پھر ان کو بھی دن میں تارے

حاصلِ جنگ تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں
ہارنے والے مرے جیتنے والے ہارے

دعوتِ حسن ہے پھر دل کو تڑپنے کے لئے
دل کہاں سینے میں، عرصہ ہوا جس کو ہارے

ان کی اپنی تھی زباں ایک جو کل تک لیکن
اب اسی بولی پہ ہو جاتے ہیں جھگڑے نیارے

دردِ دل اپنا سلامت رہے جب تک سید
اک نہ اک دن وہ چلے آئیں گے خود مہ پارے

ابو سعد سید اسمعیل سید

# غزل

یہ غزل سنٹرل جیل کی یادگار ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے چند دن گذارے ہیں ——— ظفر عالمگیر

سینۂ ویراں میں معروفِ فغاں ہے آجکل
دل مزارِ آرزو و پرخوں فشاں ہے آجکل

دیکھ میرے حوصلوں کا امتحاں ہے آجکل
بجلیوں کی زد میں میرا آشیاں ہے آجکل

جس کو کہتے ہیں وفا، جس کا محبت نام ہے
ہو تو ہو اگلے زمانے میں کہاں ہے آجکل

حالِ دل کس کو سنائیں دردِ دل کا ماجرا
ہر کسی کی ایک ہی داستاں ہے آجکل

مٹ نہ جائے ہستیٔ گل، لٹ نہ جائے گلستاں
رنگ و بو کی تاک میں فصلِ خزاں ہے آجکل

جراءت رندانہ کیا ہے؟ بات اک بھولی ہوئی
زندگی اندیشۂ سود و زیاں ہے آجکل

وقت تھا جب آپ تھے اور گرمیٔ گفتار تھی
محفلِ انجم ہے اور میری فغاں ہے آجکل

غم تھا پھولوں کی خموشی کا مگر اب کیا کریں
عندلیبِ خوش نوا بھی بے زباں ہے آجکل

سوچ لے اے برقِ سوزاں کچھ تو اب بھی وقت ہے
پاسبانِ تنکوں کا عزم جواں ہے آجکل

ظفر عالمگیر

# ہمسفر

وہ شاہ زادیٔ ماحول مسکرانے لگی
رباب دل پہ نئے گیت گنگنانے لگی
مرے افق پہ ستارے سے جگمگا اٹھے
سحر بدوش نظارے سے جگمگا اٹھے

یہ کون میرے محبت کدے میں آئی ہے
یہ کون میرے خیالوں میں مسکرائی ہے

دل و نگاہ کے خاموش مرغزاروں میں
خیال و فکر کی ہنستی ہوئی بہاروں پہ
نگاہِ ناز میں طوفانِ رنگ و نور لئے
نفس نفس میں مچلتا ہوا غرور لئے
سکوں پذیر بہاروں کی رازداں بن کر
نظر نواز نظاروں کی ہم زباں بن کر

سحاب نور کی مانند چھائی جاتی ہے
فضائے تیرہ و تاریک جگمگاتی ہے

جہانِ حسن و معانی کے دام پھیلائے
بساطِ عالمِ امکاں ذرا سمٹ جائے
مری حیات مری زندگی کے ارمانو
مرے چمن کی شگفتہ کلی کے ارمانو

دیارِ عشق سجانے کا اہتمام کرو
نئے چراغ جلانے کا اہتمام کرو

یہ کوئی بنتِ قمر ہے نہ لعبتِ کشمیر
نہ کوئی ماہ کی رونق نہ مہر کی تنویر

مگر یہ پھول سا چہرہ یہ عنبریں گیسو
یہ جاں نواز ادائیں یہ ہو بہو جادو
شگفتگی کا یہ عالم کہ گلستاں جیسے
نظر نواز بہاروں کی رازداں جیسے

ادائے ناز سے لب پر دیئے جلاتی ہے
دلِ حزیں کو نگاہوں سے گدگداتی ہے
اس اجنبی کو ادیبؔ ہم سفر بناؤں گا
محبتوں کی حسیں رہگذر سجاؤں گا

یہ اجنبی ہی مری زندگی کی مالک ہے
نئی بہار نئی روشنی کی مالک ہے

اس اجنبی کے بہار آفریں تبسم نے
فروغِ مہر نے تنویرِ ماہ و انجم نے
دل و نظر کے چمن زار جگمگائے ہیں
خیال و فکر کے شہکار جگمگائے ہیں

وہ شاہکار جو اظہار میں سما نہ سکیں
وہ شاہکار کہ الفاظ جن کو پا نہ سکیں

اس اجنبی کے تبسم کی شاہراہوں سے
اس اجنبی کی محبت بھری نگاہوں سے
میں چاہتا ہوں کہ ان منزلوں کو اپنا لوں
نئی حیات نئی محفلوں کو اپنا لوں

جہاں حسینۂ ماحول مسکراتی ہے
فضا میں دولتِ کیف و اثر لٹاتی ہے

ماجد ادیب بریلوی علیگ

# آنسو

یاد ان کی دلا گئے آنسو
بخت خفتہ جگا گئے آنسو

دل کو ویرانہ ہم سمجھتے تھے
قدر اس کی بڑھا گئے آنسو

رحم آخر انھیں بھی آہی گیا
اپنی بگڑی بنا گئے آنسو

دل کی تاریکیاں ہوئیں روشن
شمع ایسی جلا گئے آنسو

یوں تو آنکھوں میں کچھ نمی سی رہی
سوزش دل بڑھا گئے آنسو

دھیمی دھیمی سلگتی رہتی ہے
آگ ایسی لگا گئے آنسو

دل تڑپتا ہی رہ گیا لیکن
ایک طوفاں اٹھا گئے آنسو

ان کے نقش قدم میں جذب ہوئے
دولت ایسی کما گئے آنسو

تہنیت پھر مدینہ یاد آیا
اپنی آنکھوں میں آگئے آنسو

تہنیت

# غزل

چاہتے ہیں کہ اس سے پیار کریں
زندگی کا کچھ اعتبار کریں

ہم کو کس طرح سے یقیں آئے
آپ وعدے ہزار بار کریں

دولتِ حُسن جن کو مل جائے
بے رخی کیوں نہ اختیار کریں

ہم کو ان پہ ہے اعتبار بہت
کاش ہم پر وہ اعتبار کریں

اس کی قیمت وصول ہو تہذیب
دل انھی پہ اگر نثار کریں

تہذیب

# دو غزلیں

آباد ہو د سحر کی موجِ رواں سے ہے
میری بقائے [illegible] جاوداں سے ہے
وابستہ زندگی مرے عزمِ جواں سے ہے
امید ہا کو ربط مری داستاں سے ہے
غافل! کہیں یہ موت کی تمہید بن نہ جائے
منظر ہی زندگی خوابِ گراں سے ہے
جو کر رہا عمل سے بدل دے نظامِ دہر
واقف وہی حیات کے رازِ نہاں سے ہے
گر [illegible] نہ ہو تو ہیں زندگی؟
انساں کا وقار تو عزمِ جواں سے ہے
اے باغباں! عمل سے ترے ہم سمجھ گئے
ہاں ہاں! بڑا لگاؤ تجھے گلستاں سے ہے
ہم بھی ہیں اس چمن میں برابر کے حصہ دار
پھر! تمہیں یہ حقِ تصرف کہاں سے ہے
ہم بھی جگہ جگہ پہ بنائیں گے آشیاں
گلشن میں اب مقابلہ برقِ تپاں سے ہے
ہم کو سحر کی آس میں ہے رات کاٹنا
ہونٹوں سے واسطہ ہے نہ مطلب فغاں سے ہے
جینا جو چاہتا ہو، وہ مرتا نہیں کبھی
اثبات زندگی مرے عزمِ جواں سے ہے
جو سو رہے ہیں رات کی ظلمت میں بے خبر
شکوہ، نظیر! کیوں تمہیں ایسے جہاں سے ہے

تخلیق ہے زمیں کی نہ ربط آسماں سے ہے
آغازِ دورِ عشق مری داستاں سے ہے
اتنا سوال دشمنِ آرامِ جاں سے ہے
آغازِ اضطرابِ محبت کہاں سے ہے
شاید مزاجِ حسن پہ ہے اس لئے گراں
اظہارِ دردِ دل کا ہماری زباں سے ہے
پھر انتہائے عشق کا عالم نہ پوچھئے!
جب ابتدا ہی زندگیٔ جاوداں سے ہے
سادہ سا اک ورق تھی یہ دنیائے آب و گل
رنگینیٔ حیات مرے گلستاں سے ہے
اک مشتِ خاک اور یہ بارِ الم اٹھائے
شکوہ سا کائنات کو اس امتحاں سے ہے
الفت وہیں سے دل میں بدلتی ہے کروٹیں
آئینِ احتیاط میں پردہ جہاں سے ہے
دنیائے عشق ہو گی حسیں سے حسین تر
آغازِ کار جب مژدۂ خونچکاں سے ہے
پھولوں کے اشتیاق میں کانٹوں سے کھیلئے
منزل بہارِ باغ کی آگے خزاں سے ہے
دنیائے عقل و ہوش جہاں تھی، وہیں رہی
آگے قدم جنوں کا رہِ کہکشاں سے ہے
جذب و اثر عطائے محبت ہے اے نظیر!
ہاں زینتِ سخن مرے حسنِ بیاں سے ہے

سعادت نظیر

# ن۔م۔ راشد کی شاعری میں ترقی پسند عناصر

از:- جناب احقر کاشی پوری صاحب

ن۔م۔ راشد سے اردو شاعری کے تجرباتی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کی ایک اجتہادی حیثیت ہے کیونکہ یہ اپنے اور ہیئت کے لحاظ سے اس دور کی مروجہ شاعری سے جدا ہے۔ بقول کرشن چندر :-

"ان کی آواز گویا کسی سمت نامعلوم سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ماضی کے تسلسل کو چیرتی ہوئی ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ ۔ بے قافیہ شاعری سے میری یہ مراد نہیں کہ پرانے اصولوں سے انحراف کیا جائے اگر یہ انحراف صرف اسلوب تک ہی محدود ہو تو یہ بہت بڑی جدت نہ ہوگی گو یہ انحراف بھی بذاتِ خود ایک قابلِ قدر چیز ہے لیکن راشد کے ہاں یہ انحراف داخلی اور خارجی فنی اور فکری لحاظ سے مکمل ہے۔"

راشد نے پرانی ترکیبوں، بندشوں، لفظوں کو نئے سانچے میں ڈھالا ہے اور ان سے نئے مطالب پیش کئے ہیں لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ انھوں نے سماجی اور اجتماعی مسائل کی گتھیوں کو کہاں تک سلجھایا ہے اور کہاں تک ادب کی ترقی پسند تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند عناصر تلاش کرنے سے پیشتر اس کو ترقی پسند تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے ترقی پسند ادب کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے قابلِ غور ہیں۔

"ادب نہ صرف زندگی کا آئینہ ہے بلکہ زندگی کو بہتر بنانے کا آلہ بھی۔ ترقی پسند ادیبوں کا بنیادی عقیدہ ہے۔ زندگی کی کشمکش سے نہ ادیب خود الگ تھلگ رہ سکتا ہے اور نہ ادبی تخلیقات کو الگ رکھ سکتا ہے۔ بعض ادیب اور ناقد یہ کہتے ہیں کہ ادب یا آرٹ کو آزاد اور غیر جانبدار ہونا چاہیے اس کو مختلف طبقوں کی باہمی کشمکش سے کوئی تعلق نہیں۔ آرٹ کی دنیا میں ان جھگڑوں کا وجود نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو اس کو کسی فریق کی طرفداری سے کوئی سروکار نہیں۔ غیر جانبداری کا یہ نظریہ ان لوگوں نے ایجاد کیا ہے جو پرانے زمانے کے سماجی نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح کے خوشنما اور دلفریب الفاظ سے عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سماج کا ہر فرد شعوری یا نیم شعوری طور پر سماجی نظام کے موافق یا مخالف ہوتا ہے۔ اس میں بیچ کی کوئی کیفیت بالکل ناممکن ہے.....

...... ادب کی غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کا ایک گروہ تو قدامت پرستوں کا ہے اور دوسرا جدت طرازوں کا۔ آجکل بعض ادیب فرد کی نفسیات کو سماجی ماحول سے الگ کر کے خوردبین کے ذریعہ اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور خاص کر جنسی مسائل کا بیان اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی ادبی تخلیقات غیر فطری نفسیات کے مریضوں کی روداد معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ انسان کی انفرادی

زندگی اس کے سماجی ماحول کی پابند ہے اور اس کی ذہنی کاوشیں اس کے مادی وجود سے آزاد نہیں ہو سکتیں ....
...... ترقی پسند ادیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سماج کی ترقی اور تنزل کے راز کو سمجھنے کی کوشش کرے اور تاریخی طاقتوں کے رخ کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا کرے۔ ادیب سماجی کشمکش سے نہ دور بھاگے بلکہ اس کو اپنی زندگی کا جزو بنانے اور سماج کے دکھ سکھ کو اپنا دکھ سکھ سمجھے۔ جب تک جگ بیتی آپ بیتی نہ بن جائے اس وقت تک ایسا ادب پیدا نہیں ہو سکتا جس میں خلوص ہو اور جو دوسروں کو متاثر کرے "

بقول مجنوں گورکھپوری ——

"ادب کو اس انقلاب اور ترقی میں مدد دینا ہے جو زندگی کی عین فطرت ہے اور ان تمام میلانات اور ضرورتوں کی تکمیل میں حصہ لینا ہے جو نئے دور کی اہم ترین خصوصیات ہیں ...... ادب کے لئے ضروری ہے کہ وہ سنجیدہ، وقیع، امید افزا اور حوصلہ انگیز ہو۔"

بقول میکسم گورکی ——

"ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کجروی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی خام کاریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بے کلی اور تڑپ اس لئے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔ وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پر چاہے لے جا سکتا ہے۔"

مارکس نے بھی صرف ایک جملے میں اسی طرف اشارہ کیا ہے ——

"ادب دنیا کو بدلنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ جس حد تک وہ ایسا ذریعہ بن سکتا ہے اسی حد تک وہ فائدہ مند ثابت ہو گا۔"

ہر دور کے ادب میں وہی تحریک زندہ رہتی ہے جس کے پیش نظر کوئی بلند نصب العین ہوتا ہے اور جو پوری طرح اس دور کے سماجی حالات کا ساتھ دیتی ہے (جو صرف ذہنی تعیش کے اسباب بہم پہنچاتی ہیں یا عوام کو مفلوج کرتی ہیں) فراموش کر دی جاتی ہیں۔ ادب میں صرف انھیں موضوعات کو پیش نظر رکھنا ازبس ضروری ہے جن سے سماجی اور اجتماعی مسائل کے سلجھنے کا امکان ہے۔ جو ادب فراری ذہنیت پر دلالت کرتا ہے اور زندگی کے بنیادی موضوعات پر غالب آتا ہے سماجی زندگی کا بدترین دشمن ہے۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ——

"زندگی کے تمام حالات و واقعات بے شمار مسائل، لاتعداد جذبات و احساسات ادب کا موضوع بن سکتے ہیں، بنتے رہے ہیں اور بنتے رہنے چاہئیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ بعض حالات میں بعض خاص موضوع کی طرف ادب کو خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ خود زندگی میں بڑی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان حالات میں اگر کوئی ادیب ان موضوعات سے چشم پوشی کر کے اور ان کو چھوڑ کر ایسے موضوعات کو اپنائے جو وقت کی آواز نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کو سراہا نہیں جا سکتا اور نہ یہ خصوصیت اس کے باشعور ہونے پر دلالت کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر سماجی زندگی میں انحطاط کے آثار نظر آتے ہیں، ہنگامہ، انتشار اور افراتفری کا دور دورہ ہوتا ہے تو ان حالات میں ادیب عیش و عشرت یا سرور و انبساط کے ترانے نہیں چھیڑ سکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا وہ ایک سماجی مجرم ہے اس کو تو ان حالات میں یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہنگامہ، انتشار اور افراتفری کی کیفیت سماجی زندگی سے

بالکل ختم ہو جائے ورنہ وہ خود اس پر اثر انداز ہوگی کیونکہ بہرحال وہ خود بھی سماج کا ایک فرد ہے۔ اس وجہ سے میں ادب کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ تمام سماجی حالات کو اپنے دامن میں جگہ دے اور آجکل کے پیچیدہ مسائل اور ان کے باعث پیدا شدہ الجھنوں کو اپنا موضوع بنائے تاکہ اس کے ہاتھوں کوئی بڑا کام ہو سکے۔ آج اگر کسی ادیب نے اپنے آپ کو صرف حسن و عشق اور اس کی مختلف کیفیات تک محدود کر لیا اور بے شمار لایعنی باتوں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دے دی تو اس نے ایک ادیب کی حیثیت سے تو درکنار سماج کے ایک فرد کی حیثیت سے بھی اپنے فرض کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

سماجی اور اجتماعی شعور ہی نے نئے انسان کو جنم دیا ہے اور یہ انسان اس طبقے سے متعلق ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد کو مٹا کر اشتراکیت کو فروغ دینے کا حامی ہے۔ ادب کی اشتراکی حقیقت نگاری کے نظریہ ہی نے شاعری سے قنوطیت، اوہام پرستی، فراریت، ابہام، یاسیت اور ستریت وغیرہ کی جڑیں کھود کر پھینک دی ہیں۔

اشتراکی خیالات کی روشنی میں نظر آنے والی راشد کی نظموں میں "انسان" پہلا سانیٹ ہے۔

"الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بیکسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!
ہماری زندگی ایک داستاں ہے ناتوانی کی
بنا لی اے خدا اپنے لئے تقدیر بھی تو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأتِ تدبیر بھی تو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!

راشد نے یہ محسوس تو کیا ہے کہ یہ دنیا جس میں انسان رہتے ہیں غریبوں، جاہلوں، مردوں اور مریضوں کی دنیا ہے لیکن خدا پر یہ الزام کہ اس نے انسانوں سے جرأت تدبیر لے لی ہے کتنا مضحکہ خیز ہے۔ حالات زمانہ کا جائزہ لینے کی بجائے انھوں نے خدا پر انسان کی بے بسی کی تہمت لگائی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس نظم کی تخلیق سے بہت پہلے انسان اس نظام کو جس میں غربت، جہالت اور امراض پلتے ہیں بالکل ختم کر کے اپنے بے بس نہ ہونے کا زندہ ثبوت دے چکا ہے۔ بنی آدم کی ذلت پر محض چیختے رہنا یا خدا کو دو چار کھری کھری سنا کر اپنے دل کا غبار نکال لینا شدید قسم کی فراری ذہنیت کا نمونہ ہے ۔ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

آخر میں راشد نے یہ کہہ کر

کسی سے دردِ بے اندوہ بیاں ہو نہیں سکتا      خدا سے بھی علاجِ دردِ انساں ہو نہیں سکتا

انھوں نے انسان کو سرمایہ دارانہ نظام کی ذلتوں سے نکلنے کا راستہ نہ سمجھا کر اس طرف سے آنکھیں موند لی ہیں۔ یہ آخری شعر ان کے انتہائی قنوطی ہونے کا ثبوت ہے۔

ایک اور سانیٹ "ستارے" میں فرماتے ہیں ۔

" دیارِ زندگی مدہوش ہے ان کے تکلم سے

یہی عادت ہے روزِ اولیں سے ان ستاروں کی
چمکتے ہیں کہ دنیا میں مسرت کی حکومت ہو
چمکتے ہیں کہ انساں فکرِ ہستی کو بھلا ڈالے
لئے ہے یہ تمنا ہر کرن ان نور پاروں کی
کبھی یہ خاک داں گہوارۂ حسن و لطافت ہو
کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

اس نظم کا ہے کہ دنیا میں مسرت کی حکومت ہو اور اگر ستارے بھی یہی چاہتے ہیں تو بہت خوب۔ لیکن ان کے چاہنے سے تو یہ کام ہو نہیں سکتا۔ پھر ستاروں کی یہ دوسری آرزو کہ انسان فکرِ ہستی کو بھلا دے ایک بالکل عجیب آرزو ہے۔ فکرِ ہستی اگر نہ ہو تو انسان کا وجود ہی کہاں رہے گا۔ یہ نکتہ راشد صاحب کے خیال میں صحیح ہو تو ہوا پنی فہم سے تو بالاتر ہے۔ آخر یہ معلوم نہیں انھوں نے کس گم شدہ جنت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مصحفِ تاریخ جہاں کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اب تک نہ کسی جنت کو حاصل کر کے کھو چکا ہے اور نہ دنیا کو جنت بنانے میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے اور اگر راشد صاحب کا اشارہ اس جنت کی طرف ہے جس کا تمام مذہبی کتابیں آج تک نام اچھال رہی ہیں تو یہ شدید قسم کی فراریت ہے۔ انسان جنت کی تخلیق کرنے کی کوششیں کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ لیکن یہ تمام کوششیں گم شدہ جنت کے حصول سے منسوب نہیں کی جا سکتیں۔

ان کی فراری ذہنیت کا جائزہ لینے کے لئے ایک اور نظم "رقص" موجود ہے۔

"اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں
ڈر سے لرزاں ہوں کہیں ایسا نہ ہو
رقص گہ کے چور دروازے سے آ کر زندگی
ڈھونڈ لے مجھ کو نشاں پالے مرا
اور جرمِ عیش کرتے دیکھ لے!

× × ×

کیسی سرگرمی سے غم کو روندتا جاتا ہوں میں!
جی میں کہتا ہوں کہ ہاں
رقص گہ میں زندگی کے جھانکنے سے پیشتر
کلفتوں کا سنگ ریزہ ایک بھی رہنے نہ پائے!

× × ×

جسم سے تیرے لپٹ سکتا تو ہوں
زندگی پر میں جھپٹ سکتا نہیں!
اس لئے اب تھام لے
اے حسین و اجنبی عورت مجھے اب تھام لے!

غم کو روند کر رقص گاہ کی جانب بڑھنا ایک عجیب کوشش ہے۔ اجنبی عورت تو راشد کے اعصاب پر سوار ہے ہی لیکن اس نظم میں انھوں نے فراریت کی سرحدوں کو چھونے کی تکلیف کی ہے۔ اس نظم کی وجہ سے راشد صاحب سماج کے ہی نہیں خود اپنی زندگی کے بھی مجرم ثابت ہوئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی ——

فراری ذہن کی پیدا کردہ یہ انحطاطی کیفیت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی انتہا پسندی اس کو اور کہیں لے جاتی ہے۔ یہ فن کار اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جو کسی سوسائٹی کی نظروں میں مستحسن نہیں کہی جا سکتی۔ یہ منزل وہ ہے جہاں ان کی فراری ذہنیت ان کو ابنارمل (Abnormal) بنا دیتی ہے اور وہ اپنی تخلیقات میں ایسی باتوں کا ذکر مزے لے لے کر کرنے لگتے ہیں جو قطعاً غیر فطری ہوتی ہیں اور جن کا بیمار ذہن و جسم دونوں اعتبار سے سماج کے افراد کے لئے مضر اور نقصان رساں ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان لوگوں کی اپنی کچھ گتھیاں ہیں، کچھ جنسی پیچیدگیاں ہیں جو ان سے اس قسم کے خیالات کا اظہار کراتی ہیں لیکن صرف اس خیال کو پیش کر کے ان کو بخشا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ وہ ادیب ہی کیا جو خود اپنی کمزوریوں کا احساس نہ کرا سکے اور جس کو ان پیچیدگیوں کے بھنور سے باہر آنے کا خیال نہ آئے۔ ادیب کو تو سب سے پہلے ان باتوں کا خیال آنا چاہیئے اور اگر وہ بیمار ہے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے آپ کو سب سے پہلے صحت مند بنانے کی کوشش کرے۔

اس اقتباس کی روشنی میں ان کی نظم "انتقام" ملاحظہ فرمائیے ——

"اس کا چہرہ اس کے خد و خال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے
اجنبی عورت کا جسم
میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے!

اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جنسی جذبے کی کیا اہمیت ہے۔ فحاشی اور عریاں نگاری فن نہیں بدکرداری ہے۔ اس کا اثر ادب اور سماج دونوں پر بہت برا پڑتا ہے۔ ایسی نظموں کو متعفن ذہنیت کی نمائش ہی کہا جا سکتا ہے جو قاری کو انسان کے اعلیٰ فضائل اور کارکردگی سے محروم کرتی ہیں۔ زندگی کے اعلیٰ مقاصد پر پردہ ڈالتی ہیں اور دماغوں کو زندگی کی ذمہ داریوں اور صعوبتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام ایک اجنبی عورت کے برہنہ جسم سے لے کر راشد صاحب نے وطن پرستی کا کتنا حسین مظاہرہ کیا ہے۔ آج تک شاید ہی کسی انقلابی نے اس بلندی تک پہنچنے کی جراءت کی ہو۔ انتقام کا اتنا آسان نسخہ تجویز کر دینے کے لئے راشد صاحب کا مشکور رہنا نامناسب تو نہ ہوگا۔ اور نظموں کی طرح اس نظم میں بھی اجنبی عورت ہی کا ذکر ہے۔ اس نظم کی طرف ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی اشارہ کیا ہے ——

"ترقی پسند ادب وہی ہے جو زندگی کے حقیقی مسائل سے بحث کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب کے ابتدائی دور میں انقلاب، مزدور، کسان اور طبقاتی کشمکش کے عنوانات پر نظمیں اور افسانے لکھے گئے۔ بعض کامیاب و موثر اور بعض کو محض نیت کا ثواب ملا لیکن جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی بیشتر ترقی پسند شاعر اور

> افسانہ نویس خاموش ہو گئے۔ اس لئے کہ موجودہ حالات میں ان کو صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ طبیعتوں میں ہیجان پیدا ہوتا ہے تو رومانی نظمیں یا غزلیں لکھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں یا ارباب وطن کی بے بسی کا "انتقام" لینے کی کوئی اور ترکیب دریافت کر لیتے ہیں۔ اگر ہمارے بیشتر شاعروں کی ترقی پسندی محض سطحی اور ذہنی نہ ہوتی بلکہ ان کے جذبات اور فطری احساسات کا جزو ہوتی تو ان کو آجکل ایسے عنوانات ملتے جن پر ادبی شہ پارے طیار ہو سکتے تھے۔"

ایک عرصے سے عورت فنکاروں کے اعصاب پر سوار ہے۔ یوں بھی جنسیات کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہے مگر اس موضوع پر قلم اٹھانے سے بیشتر شاعر کو اپنے ذہن کی جنسی الجھنوں کی تمام آلائشیں دور کر لینی چاہیئے تاکہ اشعار سے اس کی انفرادی خواہشات نہ جھلک اٹھیں۔ جنسی مسائل کو موضوع بنانے کا مقصد یہ نہیں کہ محض اپنے جنسی جذبات کی تسکین کی صورتوں کو قاری پر لاد دیا جائے جس سے اس کے ذہن میں بھی ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو جائے اور اس کے دل و دماغ دونوں سلگ اٹھیں۔ ایسی نظموں سے قاری کو گناہ کی ترغیب بھی ملتی ہے اور یہ ترقی پسند ادب کا منشاء نہیں ہے۔

راشد نے ہر طرف سے بیزار ہو کر عورت ہی میں پناہ لی ہے۔ ان کی نظمیں "ہونٹوں کا لمس"، "دریچے کے قریب"، "ایک رات" "التفاتات"، "اجنبی عورت" ان کی اسی سستی جنسی لذتیت کے ہاتھوں تخلیق ہوئی ہیں۔

"تیرے رنگین رس بھرے ہونٹوں کا لمس
جس سے میرا جسم طوفانوں کی جولانگاہ ہے
جس سے میری زندگی میرا عمل گمراہ ہے
میری ذات اور میرے شعر افسانہ ہیں

—— "ہونٹوں کا لمس"

"ایک بوڑھا سا تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنو مند بھی ہے
میں بھی اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شب عیش گذر جانے پہ
بہر جمع خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخ گرداں ہے جہاں
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ کہ میں
مسجد شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انھیں عالم رخصت میں شفق چومتی ہے!"

—— دریچے کے قریب

میری محبوبہ کا جسم ایک ناؤ ہے
سطحِ شور انگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل ایک انجانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لئے جاتا ہوں میں
دل میں یہ جانسوز وہم
یہ کہیں غم کی چٹانوں سے نہ لگ کر ٹوٹ جائے!
——— "ایک رات"

ان کے ذہنی خلفشار کو جب عورت اور شراب کی لذتیں بھی دور نہیں کر پاتیں تو وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ (نظم "خودکشی" ملاحظہ فرمائیے)

یہاں بھی وہی سستی لذتیت کارفرما ہے۔ مضمون کی طوالت کا لحاظ رکھتے ہوئے صرف خاص خاص ہی نظموں پر اکتفا کی ہے حالانکہ اور بھی کچھ نظمیں ہیں جن میں جنسی لذت کی جھلکیاں موجود ہیں۔

اب ان کی نظم "ایران میں اجنبی" کی طرف آئیے۔ یہ نظم دوماہی "سویرا" لاہور ۵۶ء میں ادارہ کے مندرجہ ذیل تعارف سے شائع ہوئی تھی۔

"ایران میں اجنبی" ——— ان گہرے تاثرات کے پہلوؤں کا سلسلہ ہے جو راشد کے قیام ایران کی یادگار ہیں۔ راشد اس وقت ایران پہنچا تھا جب رضا شاہ پہلوی کو تخت سے اتارا جا چکا تھا۔ ایران کی سرزمین میں اتحادیوں کے زبردست لشکر پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ ایران اور اجنبی ——— اندرونی خلفشار، اشیا کی ہولناک گرانی، بچے کی بے مائگی اور اربابِ اقتدار کی زر پرستیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان دو برسوں میں انڈین آرمی کے اس کپتان پر ایرانی زندگی نے جو نقوش چھوڑے اور ایرانی شعر و ادب کے زبردست مطالعے نے جس طرح اس پر جلا کی اس کے پر تو اب تیس کینٹوز (Cantos) یا نظم سی پارہ کے قالب میں ڈھل رہے ہیں جس کا نام مصنف نے "ایران میں اجنبی" قرار دیا ہے۔ اس نظم کا چھٹا اور آٹھواں کینٹو ہم پیش کر رہے ہیں:

دورانِ جنگ میں راشد ہندوستانی فوج میں کپتان کی حیثیت سے ایران گئے جہاں انھیں دو سال تک قیام کرنا پڑا۔ یہ نظم ان کے اس قیام کے تاثرات کا نتیجہ ہے۔ وہ زمانہ فاشزم کی شکست کا تھا۔ عوامی دستے ہر مورچے پر فاشسٹوں کو روند کر آگے بڑھ رہے تھے۔ دنیا کے غلام ملکوں میں آزادی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ایران میں بھی محنت کش عوام بیدار ہو رہے تھے۔ رضا شاہ پہلوی کو تخت سے اتارا جا چکا تھا لیکن راشد کو اور کوئی چیز نظر نہ آ کر صرف یہ نظر آیا کہ سوویت روس میں آزادی نہیں ہے۔ وہاں بھی وہی غلامی ہے جو دوسرے ملکوں میں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے رجعت پسند ادیب مظلوم مزدوروں، کسانوں کی تحریک کی مخالفت کی شروعات سے سوویت روس کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرنے اور گندگی اچھالنے ہی سے کرتے ہیں کیونکہ روس ہی دنیا کے جمہوریت پسندوں اور امن دوستوں کی رہنمائی کرتا چلا آتا ہے۔ راشد نے بھی اس نظم میں اسی پر اکتفا کی ہے۔ معلوم نہیں شعر و ادب کے وسیع مطالعے نے انھیں یہ حق کس طرح دے دیا کہ وہ ایران کو عوام سے بچ کر دیکھیں۔

معلوم نہیں انھیں ہمالہ و الوند کی چوٹیوں پر انا کی شعاعوں سے خورشید پھوٹنے کی کیوں امید تھی۔ شاید اس لئے کہ انھیں انقلاب کی آمد کا یقین نہیں تھا۔ اسی نظم کے بارے میں عبداللہ ملک کی رائے قابلِ قدر ہے۔

"راشد بہت دنوں تک نئی شاعری کے پیامبروں میں شمار ہوتے رہے ہیں۔ ہماری اردو شاعری کے افق پر سب سے پہلے راشد اور فیض ہی نظر آتے تھے۔ لیکن راشد اور فیض کا ایک ساتھ نام اس غلطی کا مرتکب ہونا ہے جس کا ہم پندرہ برس سے شکار رہے ہیں یعنی ہر اس شخص کو ہم اپنی صفوں میں جگہ دیتے رہے ہیں۔ جو کوئی بھی نئی چیز لے کر آیا ہے

خواہ وہ زہر کا بجھا ہوا تیر ہی کیوں نہ ہو اور راشد کے بارے میں تو ترقی پسندوں کو بہت دنوں سے علم ہے کہ ان کے ہاں زہر سے بجھے ہوئے تیروں کی افراط بہت ہے اور تریاق بہت کم ہیں۔ ان کا فلسفہ ان کو ایک آمر کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے۔ چنانچہ دو تین برس ہوئے راشد صاحب نے ایران و مصر کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں شاہ فاروق کی جمہوریت پسندی اور آزاد خیالی کو بہت سراہا گیا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ شاید راشد صاحب نے یہ مضمون صرف دامن سیاہ کرنے کے لئے لکھا [illegible] کچھ [illegible] مل جائیں۔ لیکن اب یہ آٹھواں قطعہ [illegible] ہوتا ہے کہ انھوں نے مصر کے جو شاہ فاروق کی تعریف کی تھی وہ صحیح تھی کیونکہ راشد کو آج یہ بہت [illegible] کا [illegible] پرانے مہروں اور مُلّاؤں کی عافیت اور گندگی کا وہ زمانہ کیوں اٹھ گیا۔ بخارا اور سمرقند اور شاہ فاروق کہاں گئے۔ آج جبکہ بخارا و سمرقند آزاد ہیں، آج جبکہ وہاں اشتراکی معاشی نظام [illegible] اور علم و ادب کی شمعیں وہاں روشن ہو رہی ہیں راشد کو بخارا اور سمرقند نظر ہی نہیں آتے [illegible] یہ صحیح ہے کہ جس بخارا اور سمرقند کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ واقعی موجود نہیں ہے اور اس انداز سے تو شاید چند سالوں میں پورا کرۂ ارض ہی نہ رہے اور پھر راشد صاحب بخارا و سمرقند کے بجائے پورے اس جہانِ رنگ و بو کے بارے میں ماتم کریں۔

ان کی ایک اور نظم ہے "تہمت" جس میں انھوں نے ایک اشتراکی کا کیرکٹر اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے اور کچھ اپنے بارے میں بھی لب کشائی کی ہے۔ اور نظموں کی طرح اس میں بھی شراب اور عورت ہی کے ذکر پر زور دیا گیا ہے۔ خوبصورت عورتوں کی تلاش اور ان کے پوشیدہ شبستانوں کو گرمانا ہی راشد کے نزدیک زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔ پھر اگر وہ خود کو خیرخواہ نوعِ انسان سمجھیں تو تعجب کیا ہے۔

اب راشد کی ان نظموں کی طرف آئیے جو ان کی فراریت، قنوطیت اور جنسی لذتیت کا شکار نہیں ہو سکی ہیں۔ "جراءت پرواز"، "مری محبت جواں رہے گی"، "سپاہی" اور "زنجیر" اعلیٰ تخلیقات میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

ان میں راشد بطور رجائی نمایاں ہیں کیونکہ ان کو تباہی کے نہاں خانوں کے اندھیروں میں نور کی منزل آغاز سے شناسا ہونے کا یقین ہے۔ حیثیت مجموعی یہ نظم کامیاب ہے۔ "مری محبت جواں رہے گی" کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے :-

"کیا ہے جب سے نظرِ محبت نے دیدۂ التفات پیدا
نئے سرے سے ہوئی ہے گویا مرے لئے کائنات پیدا
ہوئی ہے [illegible] سے فسردہ [illegible] آرزوئے حیات پیدا
یہ آرزو اب رگوں میں میری شراب بن کر رواں رہے گی
مری محبت جواں رہے گی"

ان کی نظمیں سپاہی اور زنجیر ترقی پسند شعر کی کامیاب ترجمان ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی راشد کی شاعری ایسی منفی رجحانات کی آئینہ دار ہے جس سے ان کی نظمیں سماج کیلئے مفید ثابت نہیں ہوتیں۔ راشد میں شعور کی بیداری تو نظر آتی ہے لیکن وہ خود پرستی [illegible] کی وجہ سے ہوس کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور جس صحت مند ادب کی ان سے توقع تھی پیش نہ کر سکے۔ ان کی فراری ذہنیت ان کو عوام سے دور لے گئی۔ ان کی شاعری میں صبر و ضبط اور تنظیم کی ان تمام قوتوں کا فقدان ہے جو اس فرسودہ سماج کو بدلنے کے لئے ضروری ہیں۔ زندگی کی تنظیم کا آدرش پیش کرنا ادیب اور شاعر کا فرض اولین ہے اور جو اس سے دور ہیں ترقی پسندوں کی صف میں شمار نہیں کئے جا سکتے۔ کوئی ادیب یا شاعر سماج سے الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔

# ثریا اور نسیم

از:۔ جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب

شاعر بنتا نہیں بلکہ پیدا ہوتا ہے۔ البتہ تعلیم شاعری کو جلا دیتی ہے اور صیقل کرتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے زنانہ کالج نے جن شاعر خواتین کو اپنی دامن تربیت میں سنوارا ہے ان میں ثریا اور نسیم پیش پیش ہیں۔ ان کی شاعری دنیائے اردو سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کی دونوں حیدرآباد سے ہجرت کر کے پاکستان کی فضا میں سانس لے رہی ہیں۔ مختصر طور پر ہم ان کی شاعری کا تعارف کراتے ہیں۔ امید کہ موجب دلچسپی ثابت ہو۔

(۱) ثریا: سیدہ احمد النساء، نام ثریا تخلص اور پاکستان میں بیگم ثریا علیم سے متعارف ہیں۔ ان کے والد مولوی سید ظہیر الحق صاحب مرحوم تھے جو عربی فارسی کے ذی علم حیدرآباد کے مشہور عربی ادارے دائرۃ المعارف کے منتظم تھے۔ بعد وظیفہ حال میں انتقال ہوا۔

ثریا کی ولادت حیدرآباد میں ۲۷ رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اردو فارسی کی ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ تعلیم المعلمات میں شریک ہوئیں پھر مدرسہ فوقانیہ (سٹی ہائی اسکول) میں داخل ہوئیں اور عثمانیہ میٹرک کی کامیابی کے بعد زنانہ کالج میں شریک ہوئیں اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔اے اور ایم۔اے اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اردو فارسی ان کے مضامین رہے۔ ایم۔اے کے امتحان کے لئے "مولانا جامی" پر ایک جامع اور معلومات آفریں مقالہ قلمبند کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔ افسوس ہے کہ یہ مقالہ شائع نہیں ہوا ہے۔ اگر اس کی اشاعت ہو جائے تو دنیائے اردو میں مولانا جامی کے متعلق بصیرت افروز قابل قدر مواد کا اضافہ ہوگا۔

ختم تعلیم کے بعد ثریا سررشتہ تعلیمات میں ملازمت کے دائرہ میں منسلک ہوئیں اور صدر معلمہ کی گزیٹیڈ خدمت حاصل کر لی تھیں۔ حیدرآباد کے پولس ایکشن کے بعد پاکستان چلی گئیں اور اب گجرات کے زنانہ ڈگری کالج کی پرنسپل ہیں۔ ساتھ ساتھ علمی ذوق شوق کے باعث دانشگاہ پنجاب (پنجاب یونیورسٹی) سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے ریسرچ کر رہی ہیں۔ ان کے مقالہ کا عنوان "مغلیہ شہزادیوں کی علمی، ادبی، معاشرتی اور سماجی خدمات" ہے۔

ثریا ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ گھر کا ماحول علمی رہا۔ ان کے بھائی بہن نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے۔ کم عمری سے ثریا کو شاعری سے شغف اور مضمون نویسی کا شوق دامن گیر رہا۔ ادبی دنیا میں ناول یا افسانوں کو اپنی فکر کا جولانگاہ نہیں بنایا بلکہ تاریخ اور تنقید کو اپنا محور بنایا تھا۔ زنانہ کالج میں ڈاکٹر آمنہ پوپ پرنسپل کی خاص توجہ ان پر مبذول رہی۔
یہ مختصر تعارف ان کی شاعری کے پس منظر کے لئے کافی معلوم ہوتا ہے البتہ اس امر کی بھی صراحت کی جا سکتی ہے کہ ثریا

کو تقریر کا بھی ملکہ حاصل ہے وہ پر اثر اور معلومات آفریں تقریر کرنے کے لحاظ سے اچھی خطیبہ خیال کی جاتی ہیں۔ مجمع پر اپنے زور بیان سے جادو کر دیتی ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے ثریا کو کم عمری سے شاعری کا شوق ہے مگر ان کو پرگو نہیں کہا جا سکتا۔ وہ اصناف سخن میں غزل بھی موزوں کرتی ہیں اور نظم بھی اردو شاعری کے ساتھ فارسی سے بھی دلچسپی ہے۔ اس طرح دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتی ہیں مگر یہاں ہم صرف اردو شاعری کو پیش کریں گے۔

اگرچہ ہم ثریا سے کالج کے زمانہ تعلیم سے واقف ہیں اور ہماری کتاب "خواتین دکن کے اردو خدمات" میں ان کی شاعری اور نثر نگاری کا تذکرہ اور نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے مگر اس کو عرصہ گزر چکا ہے۔ ابھی حال میں ان کی "بیاض" سے سرسری طور پر استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ اس کے مطالعہ سے جو نتائج اخذ کئے گئے ان کو پیش کیا جاتا ہے۔

ثریا کی نظموں کے مختلف عنوان ہیں مگر سب کے سب دل آویز ہیں۔ جس طرح ان کے عنوان دلکش ہوتے ہیں اسی طرح ان کا کلام بھی دلچسپ ہوتا ہے۔ نظم نگاری کی طرح غزل گوئی میں ان کو خاص مہارت حاصل ہے۔ نظموں کے بعض عنوان یہ ہیں۔ "شالامار" ۔ نقش کیفیا۔ سوز پیہم۔ سوز نہاں۔ کیفیت قلبی حوں محبت وغیرہ۔

شالا مار

اے کہ تو شاہ جہاں کے شاہکاروں میں سے ہے
خاندانِ مغلیہ کی یادگاروں میں سے ہے

تو نے دیکھی ہیں زمانہ کی ہزاروں گردشیں
تیرے دل پر ہیں خزاں کی کیسی کیسی سوزشیں

ہے تری آغوش شفقت میں بہاروں کا ہجوم
جس طرح تنہائی کے شب میں ستاروں کا ہجوم

تو کہ عہد شاہ جہاں کی ایک ہے زندہ مثال
تو نے دیکھے ہیں ہزاروں رنگیوں میں ماہ و سال

تری پیشانی سے ظاہر یاس کا مضمون ہے
تری غم دیدہ نگاہوں سے ٹپکتا خون ہے

ترے آئینہ میں عہد رفتہ کی تصویر ہے
آج بھی افشاں ترے ماتھے کی ہر تحریر ہے

بات کیا ہے کس لئے تو اس قدر خاموش ہے
کیا نگاہ ناز پرور سے تہی آغوش ہے

کیا ثریا دیکھتی ہے دیدۂ خوں بار سے
درس عبرت غیر ممکن ہے تیرے ادوار سے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ثریا کو تاریخ سے خاص شغف ہے۔ اس لئے انھوں نے شالامار پر نظم لکھیں تو اس کے تاریخی حالت پر ہی نوحہ خوانی کی ہے اور یہ چونکہ ثریا کی شاعری سوز و گداز سے مملو ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نظم غم ہی کا آئینہ دار ہے۔
دوسری بعض نظموں کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

کیفیت قلبی

صیاد نظر آئے جب اہل چمن مجھ کو
ہو خاک سکوں حاصل لے چرخ کہن مجھ کو

ہر سمت سے جکڑے ہیں زنجیر و رسن مجھ کو
ہیں جادۂ عالم میں صد رنج و محن مجھ کو

میں قید قفس میں ہوں صیاد نگہباں ہے
کیوں یاد نہ آئیں گے گل ہائے چمن مجھ کو

کیفیت قلبی تھی جو میں نے بیاں کر دی
سمجھے نہ کوئی پھر بھی ہے مشق سخن مجھ کو

آوارۂ غربت کو پوچھا نہ کسی نے بھی
کیا جانے بھلا بیٹھے کیوں اہل وطن مجھ کو

حال دل محزوں کی کیا ان کو خبر ہوگی — کہتے ہیں جہاں والے آوارہ وطن مجھ کو
کیا ذکر نشیمن سے اپنے بھی ہیں بیگانے — افسوس بھلا بیٹھے سب اہل چمن مجھ کو
جس دل میں کبھی شمعیں روشن تھی امیدوں کی — اس دل میں نظر آیا تا ریک گہن مجھ کو
یا آہ اپنی دل سے یا اشک امنڈ آتے — یاد آتے ثریا جب ارباب دکن مجھ کو

## خون محبت

آتی رہے گی فصل بہاراں کبھی کبھی — ہوتے رہیں گے چاک گریباں کبھی کبھی
گلشن میں اب خزاں کی شکایت نہیں ہیں — یوں بھی ہوا ہے خون بہاراں کبھی کبھی
اب جی میں ہے کہ اپنے نشیمن کی یاد میں — کہتے رہیں حدیث دل و جاں کبھی کبھی
اللہ رے غموں کی تبسم فشانیاں — ہوتی ہے جیسے برق خراماں کبھی کبھی
اے جذب آرزو تری واماندگی کی خیر — آئے ہیں بحر شوق میں طوفاں کبھی کبھی
میرے ندیم صرف مرے قہقہے نہ دیکھ — آئے ہیں اشک بھی سر مژگاں کبھی کبھی
وہ اہل دل جو آج سر دار آ گئے — گلشن میں رہ چکے ہیں غزل خواں کبھی کبھی
جس دل نے حسرتوں کو ثریا دبا دیا — وہ دل بھی ہوگیا ہے پریشاں کبھی کبھی

## سوز پیہم

اک تمنا جو خواب ہو کے رہی — جاں صد اضطراب ہو کے رہی
آہ کیا بے نقاب ہو کے رہی — حشر کا آفتاب ہو کے رہی
حاصل انتخاب ہو کے رہی — ہر نظر کامیاب ہو کے رہی
دل کی دنیا میں سوز پیہم سے — آمد انقلاب ہو کے رہی
رنج فرقت کے حشر اے توبہ — زندگانی خراب ہو کے رہی
کیوں ثریا دل حزیں کے لئے — غم کی دنیا عذاب ہو کے رہی

## سوز نہاں

خدا جانے میری منزل کہاں ہے — کہ ہر منزل غبار کارواں ہے
غم دل زندگی کا ہم عناں ہے — تبسم پھر بھی ہونٹوں پر جواں ہے
تری نا مہربانی کا گلہ کیا — نگاہ برق ہم پر مہرباں ہے
خزاں کی فتنہ سامانی سے کہدو — بہاراں پر بہار جاوداں ہے
کہاں لائی ہے سجدوں کی تمنا — خدایا کیا یہی وہ آستاں ہے
قیامت ہے کہ ان کی انجمن میں — وفا شرمندۂ رسم فغاں ہے
جو وا چشم حقیقت آشنا ہے — ہر اک ذرہ مجھ کو بحر بیکراں ہے
ادھر ان کے تغافل کے اشارے — ادھر یہ دل جاں ناتواں ہے

وہی دل میں خلش بھی ہے ثریاؔ وہی غم ہے وہی سوز تپاں ہے

اگرچہ ان نظموں کے متعلق علیحدہ علیحدہ صراحت کی جا سکتی تھی اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کیا جا سکتا تھا مگر مضمون کی طوالت کے خوف سے اس کو نظر انداز کرنا مناسب معلوم ہوا۔ البتہ مجمل طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان نظموں کے موضوع سے جدت آفرینی، ندرت خیال، صفائی، سادگی اور تازگی کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔ خیالات کی بلند پروازی، تخیل کی گہرائی، طرز ادا کی ندرت، دلکشی موجود ہے۔ شاعرہ کو اپنے وطن کی یاد دل میں چٹکیاں لیتی ہے اور اہل وطن کو فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کے نظموں میں رومان ہے اور ان میں حسرت اور یاس بھی۔ آہ و فغاں بھی ہے۔ زمانہ کی نیرنگی کی داستاں بھی جیسا کہ وہ خود کہتی ہیں ــــ

غم دل زندگی کا ہم عناں ہے

ثریاؔ کی شاعری میں زیادہ تر دل کی پرسوز داستاں ہے اور حسرت و ناکامی کی فراوانی ہے۔ زندگی کی المناکی کی تفسیر ہے۔ اشعار نہیں نشتر ہیں جو دل کو چھلنی کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہیں اور حسرت اور نامرادی کی عکاسی کرتی ہیں۔

ثریاؔ کی نظموں کے بعد غزلوں کو دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ان میں کئی خوبیاں ہیں۔ عصر حاضر کے شعرا کا بڑا حصہ میرؔ اور غالبؔ کی پیروی کرتا ہے اور اس کی تتبع کو اپنی شاعری کی جولان گاہ بناتے ہیں۔ ثریاؔ نے بھی اس کی پیروی کی ہے۔ ان کی غزلوں میں میرؔ اور غالبؔ کا رنگ صاف طور سے جھلکتا ہے۔ غزلوں کا اصل موضوع حسن و عشق، ہجر و وصال، شاہد ساقی کی داستاں ہوتا ہے۔ مگر آج کل کی غزلوں میں روایتی محبت اور توصیف حسن کے کرشمے زیادہ نہیں ہوتے۔ محبت کی حسرت بھری داستاں تو ہوتی ہے مگر سرور و مستی حاصل کرنے کی تمنا نہیں ہوتی۔

ثریاؔ کی غزلوں میں مختلف جذبات کی فراوانی ہے۔ ان میں حوادثات زندگی کا احساس ملتا ہے۔ غم دوراں غم جاناں کی کشمکش نظر آتی ہے۔ ماضی کی یاد، ناکامی کا افسوس اور حسرت اور یاس کی آمیزش بڑی پرسوز ہے۔ ساتھ ساتھ رنگینی اور استعارہ آفرینی کا بھی آئینہ دار ہے۔ ہم کو اس امر کا تو موقع نہیں ہے کہ تفصیل سے ان کی غزلوں کا جائزہ لیا جائے کیونکہ ہماری مصروفیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بطور نمونہ یہاں کچھ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

سرور بے خودی انتظار کیا کہنا — نظر نظر میں ہے تصویر یار کیا کہنا
تبسم دل صد داغ دار کیا کہنا — نشاط غم سے ہے سینہ فگار کیا کہنا
فسانے مہر و وفا کے سنائے جاتے ہیں — نفس نفس ہے لب یار کیا کہنا
سکوت لالہ و گل میں نہاں ہے ایک چمن — شکست نالہ بے اختیار کیا کہنا
فسون سلک ثریاؔ ہے یہ نگارش تحقیق — کہ تنہائے شب انتظار کیا کہنا

بڑی مشکل سے دل کی بیقراری کو قرار آیا — کہ جس ظالم نے تڑپایا اسی پر مجھ کو پیار آیا
ارادے لوٹنے والے نہ ارماں لوٹنے والے — مجھے تجھ پر یقیں ہے اے میرا دل لوٹنے والے
تجھے میری محبت کا نہ اب تک اعتبار آیا

کسی صورت سے باقی زندگی کے دن بھی کٹ جاتے — گھڑی بھر کے لئے اے کاش وہ گھڑیاں پلٹ آئیں
وہ گھڑیاں جو میرا دل تری محفل میں گذار آیا

نظر ڈال کر دیکھئے اپنے دل میں — میرے واسطے آپ نے کیا کیا ہے

آرزو دل سے نکل کر رہ گئی — آہ ایک پہلو بدل کر رہ گئی
کیا خبر کیوں موت ٹل کر رہ گئی — زندگانی ہاتھ مل کر رہ گئی
حسرت دیدار تھی دل میں نہاں — ان کے آنے سے مچل کر رہ گئی
جب سہارا ان کی نظروں کا لیا — صورت طوفاں بدل کر رہ گئی
ان کی بے مہری کا جب آیا خیال — اک چھری سی دل پہ چل کر رہ گئی
پوچھئے کیا ہو ہماری داستاں — کس طرح اشکوں میں ڈھل کر رہ گئی

سکون دل ہو میسر تو کس طرح مجھ کو — بپا ہے محشر صد اضطراب سینے میں
رہے گی نگہ عالم سے کب تلک محفوظ — چھپا رکھی ہے جو تصویر یار سینے میں

یہ جو نمونہ پیش کیا گیا ہے اس سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ثریا کا کلام زیادہ تر المیہ ہوتا ہے۔ سوز و گداز ان کے خیالات و افکار اور جذبات کا محور ہے۔ مختلف نہج سے انھوں نے غم زندگی کی ترجمانی کی۔ [illegible] کہ میر کے ساتھ انھوں نے فانی کی بھی پیروی کی ہے۔ اگرچہ عام طور پر غزل کا موضوع حسن و عشق ہوتا ہے [illegible] کو بھی غزل کا موزوں بناتے ہیں گو کہ وہ حقیقت میں [illegible] نہیں ہوتے۔ اسی طرح فلسفہ اور اخلاق بھی غزل [illegible]

ثریا کے کلام کا جائزہ لیا جائے تو ہم کو اخلاق کے جواہر بھی ملتے ہیں۔ نہایت صاف اور سادہ طریقہ پر اخلاق [illegible] اخلاق کے اصلی جوہر کی تعلیم دی ہے ـــــ

ظاہرا سامان شوکت کچھ نہیں — آدمی کا دل بھی اچھا چاہیئے
رونے دھونے سے نہیں کچھ فائدہ — مشکلوں میں صبر کرنا چاہیئے
نام کو جو حشر تک زندہ رکھے — کام کچھ ایسا ہی کرنا چاہیئے

دل کی بہتری، صبر کی تلقین، حیات جاوید حاصل کرنے کے طریقہ کو ان اشعار میں جس طرح واضح اور صاف طور پر بیان کیا ہے اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

آخر میں ایک آدھ شعر "آزادی" کے متعلق بھی سن لیجئے۔ ہر ایک ملک کا انسان آزاد ہوتا ہے۔ یہ ایک بہری لوپوری آزادی میسر ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی پابندیاں بھی ہوتی ہیں جن کے باعث آزادی پوری آزادی تصور نہیں ہوتی۔ اس نظریہ کو کیا خوبی سے بیان کیا ہے۔

آزادی چمن میں بھی کیا کیا فریب ہیں — طائر تمام باغ میں ہے بال و پر بستہ

ثریا کی نظموں اور غزلوں کا جو نمونہ پیش کیا گیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک اچھے شاعر کے لئے جو امور خصوصی طور پر لازم کئے جاتے ہیں یعنی (۱) سادگی و صفائی (۲) نازک خیالی و ندرت (۳) تاثر یا اثر آفرینی [illegible] ان کے یہاں موجود ہیں۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اشعار ایسے صاف ہیں کہ جن کی نثر نہیں ہو سکتی۔ سادگی، صفائی ان کے کلام کے اصلی جوہر کہے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح نازک خیالی ہے۔ ان کے یہاں نازک خیالی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ خیالات کی ندرت ـــــ انداز بیان کی جودت موجود ہے۔ ثریا کا کلام تمام تر سوز و گداز سے مملو ہے گویا سوز و گداز سے ہی وہ کلام کو پر اثر بناتی ہیں۔ اگرچہ

# مشرقی بنگال میں حیدرآبادی شاعروں اور ادیبوں کی قدر

از:۔ جناب محمد عمر یوسفی صاحب

اگست کی ایک سہانی شام تھی اور ٹرین نامپلی اسٹیشن سے اپنی پہلی منزل چھوڑنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کئی منزلیں آئیں اور گزر گئیں آخر ہماری گاڑی نے ایک اسٹیشن پر دم لیا "کلکتہ"۔ یہاں سے ہم ہوائی جہاز کے ذریعہ چاٹگام روانہ ہوئے تھوڑی ہی دیر میں ہم اپنے پڑوسی ملک پاکستان کی سرحدوں میں تھے جہاں کا علم اور قانون ہم سے بالکل مختلف ہے۔ اب ہمارا جہاز پہنچنے کی طرف آ رہا تھا۔

ہوائی اڈے پر ایک قابل لحاظ تعداد میں لوگ ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ بہت جلد ہم اپنی قیامگاہ پہنچا دیئے گئے۔ راستہ میں مکانات کی جگہ ہر طرف پھوس کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں جس کے اطراف ٹین کا احاطہ ہے۔ دو منزلہ مکانات بھی بانس اور پھوس کے بنائے گئے ہیں۔ یہاں ایک ایک مہینہ تک مسلسل بارش ہوتی رہتی ہے۔ اکثر یہ سلسلہ تین تین مہینہ تک لگاتار جاری رہتا ہے۔ لوگ زیادہ تر مسلمان ہیں اور ۹۵ فیصد کے چہروں پر ڈاڑھیاں ہیں۔ یہ لوگ نماز کے ۹۹ فیصد پابند ہیں۔ لباس کرتا اور تہبند پر مشتمل ہوتا ہے۔ بنگلہ عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے مگر پڑھے لکھے طبقے کی زبان اردو ہے۔ معاشی اعتبار سے یہاں کے مسلمان دہیڑوں سے بھی بدتر حالت میں ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جب یہ پست حوصلہ مسلمان کچھ ترقی کرنے لگے تو ہندو بنگالیوں نے بنگالی اور غیر بنگالی تحریک چلا کے اپنی آگ ٹھنڈی کی۔ یہاں قدم قدم پر دریائی سفر کی ضرورت در پیش آتی ہے۔ دریاؤں میں ماجھی کشتی رانی کرتے اور بعض مچھلی پکڑتے ہوئے اکثر نظر آتے ہیں۔ گاڑیاں اور ناؤ تو مسلمان چلاتے ہیں مگر ان کے مالک ہندو ہیں۔ ساری دولت، تجارت، تعلیم سب ہندوؤں تک محدود ہے۔ یہاں کے لوگ خصوصاً ہندو بے حد متعصب ہیں۔ بعض وقت غیر بنگالی کو پانی تک نہیں دیتے۔ قیام پاکستان کے وقت فضا بڑی زہر آلود تھی آج اتنی تیزی نہیں۔ بنگالی کے سوا یہ ہر شخص کو بہاری کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں بنگالیوں کی بیٹیاں بہاری بیاہ کر لے جاتے اور جہیز وغیرہ کھا کر واپس کر دیتے۔ ہر بنگالی باہر والے کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے۔ اگر آپ کسی بنگالی ہندو سے بات کریں تو وہ اپنے مخصوص بنگلہ لہجہ میں دریافت کریگا "کیا تم یہ بات بنگلہ میں بول نا سکتا"۔ مسلم خواتین پردے کی بڑی سختی سے پابند ہیں۔ ہمارے قیام کے دوران میں بڑی مشکلوں سے صرف ایک عورت نظر آئی سو وہ بھی سر سے پیر تک ایک غلاف میں لپٹی ہوئی جب کوئی مرد نظر آتا تو اس کی طرف چھتری کا رخ کر دیتی۔ ایک دن کے لئے ہم ڈھاکہ بھی گئے۔ ماضی کے ویرانے ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ اکثر کا تعلق بدھ مت سے ہے۔ یہاں کا طرز تعمیر ہم سے بالکل مختلف ہے۔ ایک مسجد تو لکڑی کی بنی ہوئی ہے۔

• ہر مرض کی دوا درود شریف" کے مماثل یہاں ہر

مرض کا علاج ناریل کا پانی ہے۔ جب مرض خطرناک صورت اختیار کرنے لگتا ہے تو ڈاکٹری مشورہ سمندری سفر کی طرف ہوتا ہے۔

ہماری آمد کا ایک مقصد کل ہند و پاکستان موسیقی کے مقابلے میں شرکت بھی تھی۔ کئی مہینوں سے جس کا چرچا اخباروں میں تھا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ ایک بڑا وسیع پنڈال بنگالیوں سے پٹا ہوا تھا۔ پھر موسیقی کا مقابلہ شروع ہوا۔ ہندوستان سے بڑے غلام علی، بسم اللہ خاں وغیرہ وغیرہ نے بھی شرکت کی پھر ایک بوڑھے شہنشاہ موسیقی بنگالی پنڈت نے راگ بھروی چھیڑ کر ایک عجیب سماں باندھ دیا۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ اکثر انھوں نے راگنی کے بل پر دریا کے بہتے پانی کو رکا دیا اور آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے والے پنچھی نیچے آ رہے۔ غرض جب یہ راگ ٹوٹا تو گویا سب خواب سے چونکے۔

دوسرے دن ڈرامہ تھا۔ اس پروگرام کا آخری جز بڑا شاندار مشاعرہ تھا۔ اس میں جوش، فراق اور جگر نے بھی شرکت کی۔ مشاعرہ کا داخلہ مفت تھا۔ "دائرہ ادب" کے کارکن اور بانیاں مشاعرہ نے شکایت کی کہ ہندوستان بھر کے شعرا ان کے خرچ پر ہر سال بلائے جاتے ہیں مگر حیدرآباد کے کسی بھی شاعر نے یہاں آنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ بنگالی حضرت امجد کے بڑے معتقد ہیں۔ آٹوگراف بک پر آپ کے دستخط دیکھ کر کسی ایک نے بوسہ دیا۔ ان کی زبانی معلوم ہوا کہ سور جوبلی کے کیسہ زر کے لئے (۵۰۰) روپے کی منظوری ہوئی تھی۔ مگر اس شرط پر کہ حضرت امجد ان کو قدم بوسی کا موقع دیں۔ اس کے علاوہ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر کی نظم "اردو" یہاں بے حد مقبول ہوئی ہے اور ان کے دوسرے کلام کی مانگ ہے۔

یہاں کے پروفیسر دکھنی ادب سے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ان دنوں یہاں ڈاکٹر زور کے انتقال کی افواہ گرم تھی۔ ایک پروفیسر صاحب نے کہا "خدا کرے یہ غلط ہو۔ زور صاحب نے اردو کی جو خدمت کی ہے اسے اردو زبان کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

ادارۂ ادبیات اردو کا یہاں بہت چرچا ہے۔ تقریباً ہر پڑھا لکھا شخص اس کے کارناموں سے واقف ہے اور اس کی خدمات کا مدح خواں ہے۔ ایک ہندو پروفیسر انگلش نے انقلاب حیدرآباد پر آنکھوں میں پانی لا کر کہا "جب بغداد جیسی اسلامی حکومت کی ایک دن اینٹ سے اینٹ بج گئی تو وہ تو حیدرآباد تھا۔ پھر ہم بہت دیر تک ماضی کی یادوں میں گم رہے۔ آخر وقت انھوں نے اعلیٰحضرت حضور نظام کو لاکھوں دعائیں دیں۔

یہاں کے مسلمانوں میں چار سو پانچ سو کا ... نام ہے۔ بعض مولاناؤں کی تو ... ہیں۔ مثلاً مولانا ...... مگر آپ تو ان میں سے کسی سے بھی واقف نہیں۔ چند اصحاب نے حضرت صفی کے آخری وقت سے متعلق سوالات کی بوچھار کر دی۔ ایک صاحب کے پاس حضرت صفی کے خطوط تھے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ لوح پر کس کا کتبہ نصب کیا گیا اور ... قطعات تاریخ بہ زبان عربی میرے حوالے کئے۔ انھوں نے صفی کے مدفن سے متعلق بڑی دلچسپی لی اور مزار کا فوٹو روانہ کرنے کا وعدہ لیا۔ حضرت آپ سے عقیدت تو جنون کی حد تک تھی۔ غرض چند روزہ قیام بہت جلد ختم ہو گیا اور ہم چاٹگام جیسی جنگلی بستی سے ہوائی اڈہ کی طرف روانہ ہوئے۔

الوداع کرنے والوں کی تعداد خاصی تھی۔ وہاں 'دائرہ ادب' کے صدر نے جو ایک بنگالی ہندو ہیں محترمہ بشیر النساء بیگم کی بابت دریافت کیا کہ کیا وہ ہماری دعوت پر آ سکیں گی۔

# رباعیات اقبال

از:۔ جناب سلام سندیلوی صاحب

اقبال نے صرف الفاظ و تراکیب اور اسالیب و موضوعات ہی میں اختراع و اجتہاد سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اوزان اور بحور میں بھی وہ فرسودہ اور مشقیہ راستوں سے ہٹ گئے ہیں۔ ایسا انھوں نے خاص طور سے رباعی کی صنف میں کیا ہے۔ چنانچہ "ارمغان حجاز" اور "پیام مشرق" میں ان کی جو رباعیات ملتی ہیں۔ دراصل وہ بحر ہزج کے اخرب و اخرم کے دائرے میں نہیں آتی ہیں۔ اور یہی رباعی کی مخصوص بحر ہے۔ اگر عروض کے نقطۂ نگاہ سے ان رباعیات کو پرکھا جائے تو ان پر رباعیات کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن "پیام مشرق" میں فہرست مطالب میں "لالۂ طور" کے عنوان سے جو اشعار موجود ہیں ان کے نیچے رباعیات لکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال ان کو رباعیات سمجھتے تھے کیونکہ "پیام مشرق" کی ترتیب اقبال نے خود ہی دی تھی اور اس پر دیباچہ بھی خود ہی لکھا تھا۔

اقبال کی یہ رباعیات اخرب و اخرم کے چوبیس اوزان کے بجائے ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن مفعولن) کی بحر میں کہی گئی ہیں۔ اقبال سے قبل اس بحر کو رباعی کے لئے بابا طاہر عریاں ہمدانی استعمال کر چکے ہیں جنھوں نے قصبہ رے کی دیہاتی زبان میں رباعیاں کہی ہیں۔ ان رباعیات کا ذکر سید محمد عباس نے مجموعہ رباعیات میر انیس[1] میں کیا ہے۔ مگر ان کو رباعی نہیں تسلیم کیا۔

اقبال کی رباعیات اپنی ہیئت اور فارم کے اعتبار سے اصل رباعیات سے اس حد تک ضرور ملتی جلتی ہیں کہ ان میں چار مصرعے ہیں اور زیادہ تر مصرعہ ہائے اول دوم اور چہارم میں قافیہ بھی ہے۔ کہیں کہیں چاروں مصرعے مقفیٰ ہیں اور یہ سب باتیں اصل رباعی کی بھی خصوصیات ہیں۔ اقبال کی رباعیات اصل رباعی سے صرف بحر کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ یہی نہیں کہ اقبال نے فارسی رباعی کے لئے یہ بحر منتخب کی بلکہ اردو رباعیات بھی انھوں نے اسی بحر میں کہی ہیں۔ بجز ایک رباعی[2] کے جو "بانگ درا" میں ظریفانہ کلام کے تحت میں درج ہے اور وہ رباعی کی اصل بحر میں ہے۔ بہر حال موجودہ دور میں جب شاعری ہر قید و بند سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ رباعی کو زنجیر و سلاسل میں جکڑنا شاید اقبال نے مناسب نہیں سمجھا۔ انھیں کے نظریے کے ماتحت اقبال کی رباعیات کو رباعی تسلیم کیا جاتا ہے

---

[1] مجموعہ رباعیات انیس مؤلفہ سید محمد عباس۔ دیباچہ صفحہ ۱۹

[2] مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے
واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں
"بانگ درا" صفحہ ۳۲۵

اور ان کو فارسی رباعی گو شعرا کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

اقبال کی رباعیات فارسی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نہ صرف اسی نقطہ نظر سے کہ ہم کو ان سے رباعی کی ایک نئی بحر ملی ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ انھوں نے ہم کو پہلی بار ایک نئے اور جامع فلسفۂ حیات سے روشناس کرایا ہے۔ اقبال کی تمام تر رباعیات فلسفہ تمدن پر مبنی ہیں۔ وہ قوم اور ملت کے لئے زندگی کا ایک جامع نصب العین پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے اقبال کی آواز فارسی ادب کے لئے بالکل نئی اور دلکش ہے۔ دراصل اقبال نے فارسی کے جامد ادب میں تموج اور ارتعاش پیدا کر دیا۔ اقبال کو خود اس کا احساس تھا جس کا اشارہ انھوں نے مندرجہ ذیل دو رباعیات میں کیا ہے۔

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاع او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت
ز آوازِ درایم کارواں شد

عجم از نغمہ ام آتش بجاں است
صدائے من درائے کارواں است
خودی را تیز تر خوانم چو عرفی
کہ او خوابیدہ و محمل گراں است

اقبال کی رباعیات کافی تعداد میں "ارمغان حجاز" اور "پیام مشرق" میں پائی جاتی ہیں۔ ان رباعیات میں حسب ذیل موضوعات ملتے ہیں۔

## فلسفیانہ رباعیاں

خودی | اقبال سے قبل اردو شاعری میں خودی کا مفہوم غرور اور تکبر وغیرہ تھا جو ایک معیوب شے تھی۔ اسی لئے اس کو فنا کرنے کی تلقین کی جاتی تھی۔ اقبال نے خودی کے معنیٰ "انا" یا "میں" لیا اور انسانی وجود کی اہمیت کو بلند کیا۔ انھوں نے ہم کو بتایا کہ کائنات کی تمام اشیاء کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ ان کا وجود نہ ہو اور ہماری نگاہ دھوکا کھا رہی ہو۔ مگر جو شخص ایسا سوچ رہا ہے کم از کم اس کا وجود تو یقینی ہے۔ یعنی انسان کو اپنی ہستی کے وجود کا یقین ہے اور یہی چیز خودی ہے جو اقبال کی شاعری کا مرکز ہے۔ خودی کے وجود کے بارے میں اقبال نے ایک رباعی میں کہا ہے ـــــ

من از بود و نبود خود خموشم
اگر گویم کہ ہستم خود پرستم
ولیکن ایں نوائے سادہ مستے
کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

ڈاکٹر میر ولی الدین نے[1] "رموز اقبال" میں اقبال کی خودی کے وجود کے متعلق مندرجہ ذیل سطریں سپرد قلم فرمائی ہیں:ــ

"میری روح یا میرے انا یا میری خودی کا وجود میرے لئے ساری کائنات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہے۔ یہی بات بقول پروفیسر وائٹ ہیڈ کے افلاطون کے زمانہ کے بعد سب سے زیادہ عظیم الشان فلسفیانہ دریافت ہے۔ یہی فلسفہ جدید کا نقطہ نظر ہے۔ اور اقبال کا بھی فلسفہ یہیں سے شروع ہوتا ہے اور نقطہ مرکزی کے اطراف گھومتا ہے اور یہیں پر ختم ہوتا ہے اور اس کی روشنی میں کائنات اور خدا، خلق و حق کی توجیہہ کرتا ہے۔ چنانچہ خدا کا پانا خودی ہی کا زیادہ فاش طور پر پانا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے حسب ذیل رباعی پیش کی ہے۔

---

[1] رموز اقبال از ڈاکٹر میر ولی الدین صفحہ ۱۲

بیا بر خویش پیچیدن بیاموز
بناخن سینہ کاویدن بیاموز
اگر خواہی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز

خودی کے ذریعہ خدا کے حصول کو اقبال نے ایک اور رباعی میں نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاش او کنی، جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز او نیابی

خودی کو پہچاننے کی تلقین اقبال نے مندرجہ ذیل دو رباعیوں میں بھی کی ہے۔

رہے در سینۂ انجم کشائی
ولے از خویشتن ناآشنائی
یکے بر خود گشا چو دانہ چشمے
کہ از زیر زمیں نخلے برآئی

—

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور
کہ جاں تو ز خود نا محرمے ہست
قدم در جستجوے آدمے زن
خدا خود در تلاش آدمے ہست

مندرجہ بالا رباعیوں کے مصرعے "ولے از خویشتن ناآشنائی" اور "کہ جان تو ز خود نا محرمے ہست" قارئین کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں اور اقبال کے نظریات میں تضاد پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے قبل اقبال نے یہ کہا کہ انسان اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خود ہی سوچ رہا ہے اور جب خود ہی سوچ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خود سے واقف ہے۔ پھر انھوں نے اپنی ہستی سے "ناآشنا" اور "نامحرم" الفاظ کیوں استعمال کئے۔ دراصل اقبال کے کلام میں تضاد نہیں ہے کیونکہ انسان اپنی ہستی، "خودی"، "ذات"، "انا" اور "میں" سے صرف مانوس ہے، مگر اس کی حقیقت سے واقف نہیں۔ اقبال نے انسان کو اپنی ہستی سے واقف ہونے کا درس دیا ہے۔

اقبال سے قبل بھی طالبانِ حق نے خودی کی یافت کی کوشش کی۔ چنانچہ منصور اور سرمد جیسے خدا رسیدہ بندوں نے خودی کی تلاش میں اپنی جان عزیز سے بھی ہاتھ دھویا مگر اقبال نے خودی کی تلاش میں سر کٹانے اور دار و رسن کا جھگڑا اٹھانے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ جادۂ اعتدال پر چلنے کی تلقین کی اور اپنے ہی نور سے خدا کو تلاش کرنے کا طریقہ بتایا۔

ز من گو صوفیان با صفا را
خدا جویان معنی آشنا را
غلام ہمت آں خود پرستم
کہ با نور خودی بیند خدا را

خودی جو خدا سے ملا دیتی ہے اقبال کی نگاہ میں بہت وقعت رکھتی ہے۔ اسی سے وہ اس کی عظمت کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ کسی بیگانہ کی طرف دست طلب بڑھا کر اس کی قدر و منزلت کو گھٹانا نہیں پسند کرتے ہیں۔

دو رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

دلا نادانئ پروانہ تا کے
نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بہ نور خویشتن سوز
طواف آتش بیگانہ تا کے

—

اگر آگاہی از کیف و کم خویش
یکے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے
شبے خود را برا فروز از دم خویش

خودی انسان کی روح کو استوار اور مستحکم بنا دیتی ہے۔ اگر کوئی شخص خودی کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے تو وہ اسے گم

زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ
ز بیمش زرد مانند زریری
بہ خود باز آ، خودی را پختہ تر گیر
اگر گیری پس از مردن نمیری

اس میں کوئی شک نہیں کہ ارض و سما کی وسعت بے پایاں ہے لیکن انسان اگر اپنی ہستی کا جائزہ لے تو اس کی بھی وسعت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود
خرد ہر جا کہ پر زد آسماں بود
ولیکن چوں بہ خود نگریستم من
کراں بے کراں ... نہاں بود

الغرض خودی اقبال کی رباعیات کا اہم ترین موضوع ہے۔ ان سے بہتر اور کسی شاعر نے اس حقیقت کی نقاب کشائی نہیں کی۔ ان کی یہ رباعیات "پیام مشرق" میں موجود ہیں۔ جس کو انھوں نے "در جواب دیوان شاعر المانوی گوئٹے" ترتیب دیا تھا۔

جبر و اختیار۔ مشرقی ادب میں "جبر و اختیار" کا موضوع ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور سے شعرا جبر کے قائل نظر آتے ہیں مگر کہیں کہیں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں انسان کو با اختیار رکھا گیا ہے۔ اردو ادب میں حالی اور شاد کے یہاں اس قسم کی رباعیاں پائی جاتی ہیں۔ اقبال نے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ انتہا پسندی کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کو میانہ روی عزیز ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ میں دیرو حرم کے درمیان ایک نیا راستہ بتایا ہے۔ اور یہ راستہ ان کو ان کے پیر و مرشد رومی نے دکھایا ہے ؎

چنیں فرمودۂ سلطان بدر است
کہ ایماں درمیان جبر و قدر است

اقبال نہ جبر کے قائل ہیں اور نہ اختیار کے بلکہ محبوب حقیقی کی رضا کے قائل ہیں۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

سراپا معنی سربستہ ام من
نگاہ حرف بافاں برنتابم
نہ مختارم توان گفتن نہ مجبور
کہ خاک زندہ ام در انقلابم

مندرجہ ذیل رباعی میں انھوں نے انسان کو خود مختار کہا ہے ؎

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر
تہ ایں گنبد گرداں رہے ہست
اگر باور نہ داری خیز و دریاب
کہ چوں پا وا کنی جولاں گہے ہست

اقبال تقدیر کے قائل نہیں ہیں۔ انھوں نے تقدیر کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"تقدیر زمانے ہی کی ایک شکل ہے جبکہ اس کے امکانات کے نمود سے قبل اس پر نظر ڈالی جائے۔ یعنی وہ زمانہ ہے جو سلسلہ اسباب کے پھندے سے آزاد ہو جیسا کہ ہم منطقی اس پر ایک مخصوص شکل عاید کر دیتے ہیں۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقدیر وہ زمانہ ہے جسے ہم محسوس کرتے ہیں نہ کہ وہ جس کا ہم تصور کرتے ہیں یا جس سے متعلق حساب نکالتے ہیں[1]"

اسی سے اقبال تقدیر پر تکیہ کر کے بیٹھنے کو سستی کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس دنیا میں لامحدود راستے کھلے ہوئے ہیں۔ انسان ہر راستہ اختیار کر سکتا ہے۔ ان کی ایک رباعی تقدیر کے متعلق ملاحظہ ہو۔

بہ رندے گفت با مرد ... پیر
کہ دارم نکتۂ از من فرا گیر
کند ہر قوم پیدا مرگ خود را
ترا تقدیر ما را کشتہ تدبیر

---

[1] اسلامی الہیات کی جدید تشکیل ص ۲؟

**فلسفۂ موت** سائنس داں موت کا تجزیہ یوں کرتے ہیں کہ جب انرجی یا انسانی قوت کی شکل بدل جاتی ہے یعنی آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن اور نائٹروجن میں توازن نہیں قائم رہتا ہے تب انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے مگر ایک فلسفی کا نظریہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔

اقبال نے اپنی رباعیات میں فلسفۂ موت پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ موت سے صرف جسد خاکی فنا ہو جاتا ہے لیکن روح کو بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ موت انسان کو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف لے جاتی ہے اور یہ منزل پہلی منزل سے زیادہ بلند اور درخشاں ہوتی ہے۔ دراصل موت بھی زندگی کی ترقی کا ایک نام ہے۔ موت سے زیست کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا ہے بلکہ زیست کی صورت بدل جاتی ہے۔ جن لوگوں نے دنیا میں روح کو استحکام و استواری بخشی ہے اور اس کو اپنے عمل و اخلاق سے تابناک بنایا ہے ان کی زندگی موت کے بعد نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ لہذا نیک اور صالح انسان کبھی موت سے ہراساں نہیں ہوتا ہے۔ [illegible] اقبال [illegible] گراں نہیں ہے۔

دل مردہ دار، دان جسم و جان است
نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم
ہنوز اندر ضمیرم صد جہاں است

میر نے کہا تھا کہ "دم کے جانے کا نہایت غم رہا" مگر اقبال کہتے ہیں کہ دم کے جانے کا مجھے کوئی غم نہیں ہے کیونکہ اگر دم چلا گیا تو دل تو باقی ہے۔

چہ غم داری حیات دل ز دم نیست
کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ
اگر دم رفت دل باقیست غم نیست

## متصوفانہ رُباعیاں

اقبال فلسفی، مفکر، محقق اور معلم ہونے کے علاوہ صوفی بھی تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے کہ اقبال تصوف کے دشمن تھے۔ دراصل وہ اس تصوف کے دشمن تھے جو خانقاہوں اور سجادہ نشینوں میں رائج ہے۔ ان کے علاوہ وہ ان صوفیائے کرام کے بھی خلاف تھے جو مسلمانوں کو قنوطیت اور یاسیت کا پیغام دیتے تھے۔ دراصل اقبال نے غلط قسم کے مروجہ تصوف سے گریز کیا اقبال کے نزدیک اصل تصوف شریعت کی پیروی ہے اور شریعت میں جد و جہد کی ترغیب دی گئی ہے۔ مولانا روم بھی شریعت کو علم اور تصوف کو عمل سمجھتے ہیں۔ دراصل تصوف میں وحدت الوجود ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذات باری کائنات میں واحد ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی ساری اشیا نفی ہیں۔ ان کی ہستی محض عارضی ہے جو اس کو خدا کے وصل سے باز رکھتی ہے۔ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہستی یا خودی کو فنا کر دینا ضروری ہے۔ اقبال اس مسئلہ وحدت الوجود کو سطحی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ خدا کی ذات کائنات میں وحدت ہے لیکن وہ یہ ضروری نہیں سمجھتے ہیں کہ خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ہستی کو فنا کر دینا ضروری ہے بلکہ تقرب باری حاصل کرنے کے دیگر ذرائع بھی ہیں۔ مثلاً خدا تک رسائی حاصل کرنے کے لئے انسان اپنی ذات میں خدائی صفات پیدا کر لے۔ اس تجربے سے انسان کی خودی زائل نہیں ہوتی ہے بلکہ قائم رہ کر اور استوار اور مستحکم ہو جاتی ہے اور نور کبریائی سے اور روشن ہو جاتی ہے۔ ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

خودی روشن ز نور کبریائی ست
رسائی ہائے او از نارسائی ست
جدائی از مقامات وصالش
وصالش از مقامات جدائی ست

اس لحاظ سے اقبال نفی خودی کے بجائے اثبات خودی کے قائل ہیں۔ وہ اس تصوف کے قائل ہیں جو انسان کو تحریک عمل کی جانب راغب کرتا ہے۔ ان کی اس قسم کی رباعیاں ہمارے ذوق عمل کو بیدار کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی رباعیات میں بلبل اور قمری کے بجائے شاہین کو جگہ دی۔ کیونکہ شاہین بلند پرواز اور بلند فطرت ہے جو اقبال کی طبیعت سے مطابقت رکھتا ہے اور شاہین کی اسی خصوصیت کو اقبال نے اپنے میں جذب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی دو رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

نہادی از مقام کبریائی
حضور دوں نہادہ چہرہ سائی
تو شاہینی ولیکن خویشتن را
نگیری تا بہ دام خود نیائی

—

قبائے زندگانی چاک تا کے
چوں موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز
تلاش دانہ در خاشاک تا کے

اقبال ہم کو یہ درس دیتے ہیں کہ ہم اپنے تن میں "جان بیدار" پیدا کریں اور اس طرح میدان عمل کی طرف بڑھیں ؎

چو بلبل نالۂ زارے نہ داری
کہ در تن جان بیدارے نداری
دریں گلشن کہ گلچینی حلال است
تو زخمے از سر خارے نداری

ایک کبوتر اپنے بچے کو درس دیتا ہے کہ "خوئے حریری" سے زندگی بسر نہیں کی جا سکتی ہے ؎

کبوتر بچۂ خود را چہ خوش گفت
کہ نتواں زیست با خوئے حریری
اگر "یاہو" زنی از مستی شوق
کلہ را از سر شاہیں بگیری

ایک اونٹ اپنے بچے کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنا بوجھ اپنی ہی پیٹھ پر لادنا فائدہ مند ہے۔ کسی دوسرے کے سہارے پر اپنا کام چھوڑ دینا مناسب نہیں ؎

چہ خوش گفت اشترے با کرۂ خویش
خنک آں کس کہ داند کار خود را
بگیر از من کہ صحرا نورداں
بہ پشت خویش بردن بار خود را

اقبال اس فلسفہ کے قائل نہیں ہیں جو محض فکری ہو بلکہ وہ اس فلسفہ کے قائل ہیں جو عملی بھی ہو۔ اس لئے وہ یہ سوچنے کے بجائے کہ چنگاری تیشہ سے نکلتی ہے کہ پتھر سے پیدا ہوتی ہے، ضرب تیشہ سے بے ستون کو کاٹ ڈالنا بہتر سمجھتے ہیں۔

بضرب تیشہ بشکن بے ستوں را
کہ فرصت اندک و گردوں دورنگ است
حکیماں را دریں اندیشہ بگذار
شرار از تیشہ خیزد یا ز سنگ است

اقبال ساحل پر بزم آرائی کے قائل نہیں ہیں بلکہ منجدھار میں بپھری ہوئی موجوں کے تھپیڑوں سے لطف اندوز ہونے کے قائل ہیں۔

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

## عشقیہ رباعیاں

اقبال نے عشقیہ رباعیاں بھی کہی ہیں مگر ان کا عشق اپنے پیش رو شعراء کے عشق سے بہت جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے محبوب کے حسن کی تعریف نہیں کی اور نہ عشق میں ہجر و وصل کا ذکر کیا بلکہ عشق سے ذاتی وابستگی اور اس کی

بے پناہ قوتوں کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور پھر اس کا مقابلہ عقل سے کیا جس کو انھوں نے ناقص قرار دیا۔ کیونکہ عقل صرف مکانی اور مادی دنیا میں ہماری اعانت کر سکتی ہے۔ کشمکش حیات میں ہم کو آگے بڑھا سکتی ہے۔ تصرف و ایجاد کی صلاحیتوں کو آشکار کر سکتی ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کر سکتی ہے۔ اور ہمارے لئے معاش کے ذرائع فراہم کر سکتی ہے لیکن عرفان خودی کے حالات میں عقل بالکل نااہل ہے۔ اس تک رسائی کے لئے عشق کا زینہ ہی مفید ہے۔ جرمنی کا مشہور فلاسفر شوپنہار بھی عقل کو ایک نہایت مفید آلہ تصور کرتا ہے جس سے زندگی کی عملی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ لیکن عقل کے ذریعہ ہم انتہائی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے اور ان مسائل کو حل نہیں کر سکتے جن کا تعلق مذہب و تاثر سے ہے۔ شوپنہار کے علاوہ جرمنی کے دوسرے مشہور شاعر برگسان کا بھی یہ نظریہ ہے۔ وہ بھی عقل کو عمل کے شعبے کا ایک لاحقہ تصور کرتا ہے۔

دیگر فلسفیوں کی طرح اقبال بھی عقل کی رسائی کو محدود سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں عقل ایک چراغ رہ گذر ہے جو "درون خانہ" کے ہنگاموں سے ناواقف ہے۔ وہ "برہمن زادہ" اور "زنار پوش" ہے۔ لہٰذا ایمان کی دولت میسر نہیں کرا سکتی۔ اقبال کی ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

خرد زنجیری امروز و دوش است
پرستار بتان چشم و گوش است
صنم در آستیں پوشیدہ دارد
برہمن زادہ و زنار پوش است

اقبال کا خیال ہے کہ اگرچہ عقل ہم کو حقیقت کی منزل تک نہیں پہنچا سکتی ہے مگر وہ دل کی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ دل عقل سے نور حاصل کرتا ہے اور عقل دل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے زندگی کی مکمل تصویر بنتی ہے۔ اقبال نے عقل و دل کے اس گہرے تعلق پر مندرجہ ذیل رباعی میں روشنی ڈالی ہے ؎

نوا مستانہ در محفل زدم من
شرار زندگی بر گل زدم من
دل از نور خرد کردم ضیا گیر
خرد را بر عیار دل زدم من

اس تعلق کے علاوہ عقل اور دل میں ایک اور لطیف تعلق ہے۔ جب عقل ذوق تپش سے آگاہ ہو جاتی ہے تب دل بن جاتی ہے اور جب دل ذوق تپش سے محروم ہو جاتا ہے تب خاک ہو جاتا ہے۔

ندانی پیکرا میان سینہ دل چیست
خرد چوں سوز پیدا کرد دل شد
دل از ذوق تپش دل بود لیکن
چو یک دم از تپش افتاد گل شد

عشق بلند مرتبت ہونے کے علاوہ حیات و کائنات کے لئے افادیت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ عشق کے سوز سے دل روشن ہو جاتا ہے اور اس کے اشکوں سے چشم انسان جہاں بیں اور حاذق ہے جیسا کہ اقبال کہتے ہیں ؎

دل من روشن از سوز درون است
جہاں بیں چشم من از اشک خون است
ز رمز زندگی بیگانہ تر باد
کسے کو عشق را گوید جنون است

عشق خام کاروں کو از خود رفتہ بنا دیتا ہے۔ مگر پختہ کاروں کو خود شناسی کا موقع دیتا ہے۔

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد
گہے با سنگ و گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد
مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

عشق ہی سے میخانۂ کائنات میں ہنگامہ ہے ؎

تہی از ہائے و ہو میخانہ بودے
گل ما از شرر بیگانہ بودے

بنودے اشتے واین ہنگامۂ عشق
اگر دل چوں خرد فرزانہ بودے

عشق باغ کو باد فرودیں بخشتا ہے اور راغ کو غنچۂ عنایت کرتا ہے۔ اور یہی عشق ماہی کو دیدۂ رہ بیں سے سرفراز کرتا ہے ؎

بباغاں باد فروردیں دہد عشق
براغاں غنچہ چوں پرویں دہد عشق
شعاع مہر او قلزم شگاف است
بہ ماہی دیدۂ رہ بیں دہد عشق

اس رباعی میں ڈاکٹر یوسف حسین نے ایک نہایت لطیف نکتہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں [1]

"برگ لالہ میں عشق کی رنگ آمیزی سے شاعر کا اشارہ حیاتیات کے اس مسئلہ کی طرف ہے کہ کس طرح پھولوں کی خوشبو اور ان کے رنگ کی شوخی کیڑے مکوڑوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ انھیں کے ذریعہ سے پھول کا زیرہ دوسرے پھولوں تک پہنچتا ہے اور بارآوری کا موجب بنتا ہے۔ فطرت اپنے اس مقصد کو کبھی طائران خوش الحان کے ذریعہ اور کبھی باد صبا کے ایلچی کے توسط سے پورا کرتی ہے اور اس طرح نہایت لطیف اور پراسرار طریقوں سے اپنے منشا کی تکمیل کرتی ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین صاحب فرماتے ہیں۔

"یہ مضمون بالکل اچھوتا ہے کہ سمندر میں مچھلی جو اپنا راستہ تلاش کر لیتی ہے یہ بھی عشق ہی کا کرشمہ ہے۔ اس شعر میں اقبال کا اشارہ اس نکتہ کی طرف ہے کہ ارتقا کوئی اندھی یا بے کیف میکانیت کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ جبلت عشق و شوق و آرزو کی بدولت اپنی تقویت کا ساماں بہم پہنچاتی ہے۔ انسان اور حیوان کے اعضاء دراصل اس احتیاج اور اندرونی جوش حیات سے عبارت ہیں جو وہ اپنے وجود کو خارجی فطرت میں وسیع کرنے اور اس سے مطابقت کے لئے ظاہر کرتے ہیں۔"

لیکن عشق جو اتنی خوبیوں اور بے پناہ قوتوں کا مالک ہے ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ اسی کو نصیب ہوتا ہے جس کو "خدائے بخشندہ" بخشتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نہ ہر کس از محبت مایہ دار است
نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغ جگر تاب
دل لعل بدخشاں بے شرار است

## مذہبی رباعیاں

اقبال کے یہاں مذہبی رباعیاں بھی پائی جاتی ہیں مگر ان رباعیوں کا لب و لہجہ بھی پچھلے شعراء کے لب و لہجہ سے الگ ہے۔ انھوں نے حمد اور رسولؐ کو ایک نئے انداز سے مخاطب کیا ہے اور اس طرح سے ان کے یہاں حمد و نعت موجود ہے مگر ایک بدلے ہوئے لباس میں۔

اقبال نے "ارمغان حجاز" میں حضور حق کے عنوان سے کچھ رباعیات لکھی ہیں۔ ان رباعیات کے مطالعہ سے اقبال کے نظریات خدا کے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض رباعیات کا لہجہ طنزیہ ہے مگر اس طنز کی کڑواہٹ میں بھی خلوص، وفاداری اور صداقت کی مٹھاس پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جہاں از خود بروں آوردہ کیست
جمالش جلوۂ بے پردہ کیست
مرا گوئی کہ از شیطاں حذر کن
بگو با من کہ او پروردۂ کیست

زمن ہنگامۂ ایں ایں جہاں را
دگرگوں کن زمین و آسماں را
ز خاک ما دگر آدم بر انگیز
بکش ایں بندۂ سود و زیاں را

(باقی آئندہ)

[1] روح اقبال مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص ۵۳

# عیاشی

از:- جناب رحمان ساجد صاحب

گاؤں بھر میں زمیندار سرفراز عیاش مشہور تھا۔ گو اب جدید قانون لگانداری کی وجہ سے وہ کاشتکاروں پر ظلم و زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس کی بھی حیثیت ایک بڑے کاشتکار کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن اس کے باپ کے زمانے سے لوگوں پر جو ظلم و زیادتی اور رعب و داب چلا آتا تھا اس کا کچھ نہ کچھ اثر اب بھی باقی تھا۔

جن دنوں سرفراز کالج میں پڑھتا تھا تو سال میں ایک مرتبہ موسم گرما کی چھٹیوں میں اپنے دوست احباب کو ساتھ لے کر شکار کھیلنے کی غرض سے ہمت پور آجایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس کے والد کی جانب سے یہاں ایک مختار عام مقرر تھا۔ وہی مالک کے حکم سے نہایت رعب و داب کے ساتھ زمینداری کے سارے کاروبار چلاتا تھا ــ اور عین چھٹیاں ہونے سے قبل زمیندار کا بنگلہ جھاڑ جھٹک کر اور آہک پاشی کروا کر آئینہ کی طرح صاف ستھرا کروا دیا جاتا تھا جس سے سارے گاؤں والوں کو معلوم ہو جاتا تھا کہ ان کا چھوٹا مالک آرہا ہے اور وہ مارے خوف کے سہم جاتے تھے۔

ہمت پور آتے ہی سرفراز اور اس کے تمام دوست دن بھر بندوقیں لئے شکار کی ٹوہ میں جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ ہرن، سانبھر، چیتل اور دیگر جنگلی جانوروں کا بے حساب شکار کیا جاتا تھا اور شام ہوتے ہی دن بھر کی تکان اتارنے کے لئے شہر سے لائے ہوئے شراب کے شیشے کھل جاتے تھے۔ پھر رات کی تاریکی میں گاؤں کی خوبصورت لڑکیوں کا شکار کیا جاتا تھا ــ یعنی گاؤں کے ذمہ دار افراد کو اس کی اور اس کے دوست احباب کی جسمانی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نوخیز حسینائیں بھی پیش کرنی پڑتی تھیں ورنہ ان کی جان و مال اور عزت کا خطرہ ہو جاتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ سال گذر گئے۔ اس دوران میں زمانے نے کئی رخ بدلے۔ سرفراز کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی دو بیویاں تھیں اور ان سے متعدد اولادیں۔ ساری جائداد تقسیم ہو گئی۔ اتفاق سے شہر کے ایک چھوٹے سے مکان کے ساتھ ساتھ ہمت پور بھی سرفراز کے حصہ میں آگیا۔ کالج کے زمانے میں اپنی لاابالی طبیعت اور آوارہ گردی کے باعث کوئی اعلیٰ تعلیم نہ پا سکا تھا اس لئے کوئی اچھی نوکری بھی نہ مل سکی۔ ٹھوکر کھاتا رہا اور مارے مارے پھرتا رہا۔ آخر کار جب عرصہ روزگار تنگ ہو گیا تو اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لئے ہمت پور چلا آیا اور یہاں اپنی زمینداری کے کاروبار سنبھال لئے۔

اب اگرچہ بہت کچھ اس کی فطرت بدل چکی تھی۔ وہ باپ کا سایہ سر پر نہ تھا۔ وہ بے فکری نہ تھی۔ وہ سرمایہ نہ تھا۔ وہ آغاز شباب نہ تھا۔ وہ حکومت نہ تھی۔ وہ دور

نہ تھا۔ لیکن پھر بھی بعض مخصوص عادتیں باقی رہ گئی تھیں۔ اب بہ جبر اور کھلے طور نہ سہی لیکن چوری چھپے چند پرانے اشغال جاری رکھے تھے۔ کبھی سننے میں آتا تھا کہ فلاں کاشتکار کی لڑکی سے ناجائز تعلقات ہیں، کبھی خبر اڑتی کہ نوکر کی بیوی کو قبضہ میں کر رکھا ہے۔ کبھی کوئی کہتا کہ ساہوکار کی بیٹی سے آنکھ لڑ رہی ہے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ کمّوتین کو "داشتہ" بنا لیا ہے۔ غرض ایسی بہت سی خبریں آئے دن سننے میں آتی تھیں کہ جس کی وجہ سے وہ آج تک عیاش مشہور تھا۔ شاید اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا غیر شادی شدہ ہونا بھی تھا ہوگا۔ لیکن سب کانوں سے سنتے تھے اور خاموش ہو جاتے تھے۔ کبھی کسی کو اس کے روبرو کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔

ایسے ہی ان دنوں بھی رحیمہ سے اس کے معاشقہ کی خبر اڑی ہوئی تھی۔ رحیمہ ایک بیوہ کی لڑکی تھی۔ غریبی کی وجہ سے ماں بیٹی کھیتوں میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔ اس کے دو ماموں تھے سو ان کی علٰحدہ معمولی زراعت تھی —— رحیمہ کی عمر ابھی کوئی برس پندرہ یا کہ سولہ کا "سن" سمجھئے۔ بقول شاعر جوانی کی راتیں مرادوں کے دن تھے۔ بڑی شوخ اور چنچل نکلی تھی۔ کبھی اس سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتی پھرتی تھی۔ کبھی یہاں نظر آتی تو کبھی وہاں۔ چلتی تو زمین سے دھم دھم کی آواز آتی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے "دوڑنے لگتی۔ کبھی راستے میں کسی گھڑے والی سے ٹکرا جاتی اور غریب کا گھڑا ٹوٹ جاتا۔ وہ اگر بولتی تو اس سے گتھم گتھا ہو جاتی۔ گاؤں کی ساری عورتیں اس سے پریشان تھیں اور کہتی تھیں کہ یہ موئی سب گاؤں سے منہ کالا کرے گی نہیں معلوم؟ پھر حسن میں بھی اپنا آپ جواب تھی ظالم! سڈول اور چست جسم۔ کشادہ اور ابھرا ہوا سینہ۔ صراحی دار گردن۔ ستواں ناک۔ رس بھرے ہونٹ۔ لالہ گوں رخسار۔ کھلتا ہوا رنگ۔ بڑی بڑی بے باک آنکھیں اور کچھ الجھے الجھے بال۔ دیہاتی حسن کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھئے۔ زاہد خشک بھی ایک نظر دیکھ لے تو ایک منٹ کے لئے ٹھہر جائے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ گاؤں میں ایک یہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سارے گاؤں کی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔ ہر نوجوان اس کو پانے کے لئے کوشاں تھا۔ لیکن یہ ہرنی بڑی مشکل سے سرفراز کے دام محبت میں گرفتار ہوگئی۔ اس کو پھانسنے کیلئے وہ قریباً ایک سال سے کوشاں تھا۔ مختلف ڈورے ڈال رکھے تھے۔ اس کو اور اس کی ماں کو انجانے طور پر کچھ مزدوری زیادہ دی جانے لگی تھی۔ امداد کے طور پر کبھی کبھار اناج بھیج دیا جاتا۔ عید رمضان آئی تو خوان میں بہتریں حصہ بھیجا گیا۔ اس کے علاوہ ترکاریاں وغیرہ بونے کے لئے (۲۰) گنٹے زمین بغیر کسی قبولی کے دی گئی اور کہا گیا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہے کہ امجد علی مرحوم (رحیمہ کا باپ) زمیندار صاحب کا پرانا نوکر تھا اور اس نے زمیندار صاحب مرحوم کی بہت خدمت کی تھی۔ لیکن تاڑنے والے تاڑ گئے تھے کہ اس میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ خود سرفراز بالکونی پر کھڑے کھڑے آنکھیں چار کرتا رہتا۔ نگاہوں سے پیام محبت بھیجتا۔ ہاتھوں سے اشارے کے جاتے اور کسی سنسان پگڈنڈی پر مدبھیڑ ہو جاتی تو چھیڑ چھاڑ بھی ہوتی۔ اس پر وہ کبھی مسکرا دیتی، کبھی ایک آدھ جملہ کہہ کر معشوقانہ انداز سے نکل جاتی اور اس کو بات چیت کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔

اتفاق سے اس کے کپاس کے کھیت میں کلپائی کا زمانہ آگیا اور اس کو زیر دام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس کا معمول تھا کہ کلپائی کرتے وقت وہ عورتوں پر کڑی نگرانی رکھتا تھا تاکہ کچھ کچرا وغیرہ نہ چھوٹنے پائے —— ایک روز بارہ قطاروں میں بارہ عورتیں کلپائی کر رہی تھیں۔ آخر کی قطار میں رحیمہ صورت جھکائے اپنے کام میں محو تھی اور تیز تیز کام کرنے کی وجہ سے وہ دیگر عورتوں سے کچھ آگے نکلی ہوئی تھی —— ہر عورت کے درمیان کپاس اور تورہ کے پودوں کی گھنی قطاریں تھیں جس کے باعث ایک عورت دوسری عورت کو نظر نہیں آتی تھی اور کام اس قدر انہماک کے ساتھ ہو رہا تھا کہ

ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی ۔۔۔ سرفراز ٹہلتا ٹہلتا رحیمہ کے پاس جا پہنچا۔

"تم کلہاڑی تو بہت اچھی کرتی ہو"

"نہ کروں تو آپ ڈانٹیں گے نہیں مالک؟" رحیمہ نے کام کرتے کرتے دھیرے سے جواب دیا۔

"بڑی سمجھ دار ہو گئی ہو" سرفراز نے پھر چھیڑا۔

"ابھی بچی تھوڑی ہوں جو سمجھ نہ آئے" وہ ہار ماننے والی کب تھی۔

"اچھا تو اب بڑی ہو گئی ہو تم" سرفراز تقریباً ہنس دیا۔

"بہت بڑی" رحیمہ نے منہ بنا کر کہا "سارا گاؤں ڈرتا ہے مجھ سے"

"اور تم کس سے ڈرتی ہو؟" سرفراز کو گفتگو میں مزا آ رہا تھا۔

"میں" (ایک لمحہ رک کر) "میں تو آپ سے ڈرتی ہوں"

وہ ایک ادا سے بولی

"چنچل کہیں کی" سرفراز لطف لیتے ہوئے بولا۔

"میں نے کیا کیا جو آپ کہہ رہے ہیں کہ ڈرتی ہے مجھ سے"

"آپ بنگلے پر کھڑے کھڑے گھورا کرتے ہیں" اس نے وار کیا "ایسا لگتا ہے کہ کچا ہی چبا ڈالیں گے میں ڈر کر بھاگ جاتی ہوں"

"ہم کوئی شیر ہیں جو تم کو چبا ڈالیں گے" سرفراز نے کچھ جھینپ کر کہا "تم بہت خوبصورت ہو اس لئے دیکھا کرتے ہیں اور دل کہتا ہے کہ تم کو دیکھتے ہی رہیں (پیار بھرے انداز میں) کہو اب تو نہیں ڈرو گی نا"

"پر ایک دم ڈر کیسے نکلے گا مالک" وہ شوخی سے بولی۔

"بڑی طرار ہو گئی" سرفراز نے لاجواب ہو کر ایک ہلکا سا چپت اس کے سر پر رسید کیا۔ مڑ کر دیکھا تو دوسری عورتیں بھی قریب آ گئی تھیں۔ آہستہ سے دوسری قطار میں نکل گیا۔

اس طرح روز ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے کرتے سرفراز اس کا دل جیت لیا اور پھر جلد ہی دونوں رات کی تاریکیوں میں گاؤں کے سنسان مدرسہ (گھاس کا چھوٹا سا مکان جو مدرسہ کی نئی عمارت بننے کے بعد زمیندار کے قبضہ میں آ گیا تھا) میں ملنے لگے۔

اور ایک دن اسی طرح دونوں یکے بعد دیگرے رات میں اس مکان سے نکل رہے تھے کہ کسی نے دیکھ لیا اور سارے گاؤں میں بات پھیل گئی۔ یہ سننا تھا کہ اس کے رشتہ داروں اور رقیبوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ویسے بھی گاؤں والوں کا پیمانۂ صبر جو لبریز ہونے کے قریب ہی تھا اب لبریز ہو گیا۔ اور سبھوں نے ایک ہو کر خفیہ طور پر پنچایت کی۔

عینی شاہد اصغر علی نے کہا "میں کل شام کو پرانے مدرسے کے پاس سے آ رہا تھا کہ چوڑیوں کی آواز آئی۔ مجھے کچھ شبہ ہوا۔ میں وہیں رک گیا اور سیم کی بیل کے پتے ہٹا کر جھانکا مگر اندھیرا گھپ تھا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ دوسرے منٹ کھسر پھسر کی آواز آئی۔ رحیمہ کی آواز کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ بولی" جلدی شادی کر لو نہیں تو میں گھر میں گھس جاؤں گی"

پھر پٹہ دار کچھ جواب دیا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر بار دہ سے پتے ہٹانے کی آواز آئی اور رحیمہ اس میں سے نکل کر اپنے گھر میں چلی گئی۔ ادھر پٹہ دار بھی آہستہ سے نکلا اور مدرسے کے گیٹ کی تلک پار لگا کر آہستہ سے اپنے گھر میں چلا گیا"

"تو پھر کاروبار بھی شروع ہو گئے ہوں گے۔ ایک عاشق زار نے کہا۔

"وہ عیاش خاموش رہنے والا ہے" دوسرا دل جلا بولا۔

"ہماری تو عزت چلی گئی۔ پروا نہیں جیل گیا میں رات میں کلہاڑی سے ختم کر دوں گا سالے کو" رحیمہ کے ماموں زاد بھائی اور شادی کے امیدوار نے کہا۔

"نہیں بیٹا یہ ٹھیک نہیں" اس کا باپ ایک دم بول اٹھا۔ "وہ تو چین سے مر جائے گا اور تو عمر بھر کے لئے کھید (قید) میں

پڑ جائے گا۔"

"تو چلو" ایک جوشیلے نوجوان نے کہا "سب مل کر جائیں گے اور ابھی اس کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ ہمارے اتنوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے وہ اکیلا۔"

"یہ بھی اچھا نہیں" ایک دوسرے معمر آدمی نے زبان کھولی۔

"کم از کم جاکر پوچھیں گے ہی۔" تیسرے شخص نے ایک تجویز پیش کی۔ "کہ آپ کو ایک معصوم لڑکی کو خراب کرنے کا کیا حق حاصل تھا۔ دیکھیں گے کہ کیا جواب دیتا ہے۔"

"اوں ہوں" ایک بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ بھی نامناسب ہے، اگر وہ ثبوت مانگے گا تو پھر ہمارے پاس کیا ثبوت ہے۔ الٹا ہم کو ہی شرمندہ ہونا پڑے گا۔"

"یہ بھی ٹھیک نہیں" "وہ بھی ٹھیک نہیں" اس کے ماموں زاد بھائی نے غضبناک ہو کر کہا "تو کیا خاموش بیٹھ جانا چاہیے ہم؟ اگر ہم غریب ہیں تو کیا ہماری کوئی عزت نہیں ہے۔ میری بہن پر ہاتھ ڈالنے کا اس کو کیا حق ہے۔ تم لوگ بزدل ہو جو ابھی تک خاموش بیٹھے ہو۔ میں اکیلا ابھی اس کو ختم نہ کر دیا تو میرا نام مراد نہیں۔" وہ فوراً اٹھ کر ہاتھ میں کلہاڑی لئے تیز چلنے لگا تھا کہ چار چھ لوگ لپک کر اس کو سمجھاتے بجھاتے پکڑ لائے۔

"یہ معاملہ بہت نازک ہے" اس کے باپ نے کہا "ایک دم دیوانے پن سے کچھ حاصل نہیں۔ اس میں تو ہم کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیئے" اس طرح کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

آخر میں سب اس رائے پر متفق تھے کہ خفیہ طور پر دونوں کی ملاقات کی تاک میں رہا جائے اور جب وہ اس مدرسہ میں یا کہیں بھی اور ملیں تو ان دونوں کو عین موقع پر ایک ساتھ پکڑ لیں اور اس سے کہیں کہ اس لڑکی سے شادی کرلے ورنہ ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ اب تو ہمارے کسی کام کی نہ رہی۔ اگر وہ مان لیا تو اچھا ہے ورنہ دونوں کو وہیں بند کر کے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔

تیسرے دن رات کے ڈھائی تین گھنٹے گذر چکے تھے، باہر گھپ اندھیرا تھا۔ فضا پر گہری خاموشی مسلط تھی۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں مست نیند سو رہے تھے کہ دھپ سے رحیمہ کے گھر کی چھت پر پتھر گرا۔ بھلا عشق کا بیمار بھی کہیں جلد سوتا ہے۔ وہ بستر پر خاموش پڑی اپنی منجدھار میں پھنسی زندگی پر غور کر رہی تھی۔ نظر پھیر کر ماں کو دیکھا۔ دن بھر کی تھکی ماندی بڑھیا بے سدھ سو رہی تھی۔ آہستہ سے پلنگ پر سے اتری اور پاؤں بڑھا کر کنڈی کھول دی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل کر چلتے چلتے اس باڑھ کے پاس پہنچ گئی جو اس مکان اور اس کے گھر کے درمیان تھی اور یہاں پر دونوں کی ملاقات ہوتی تھی۔ سرفراز پہلے ہی سے موجود تھا۔ باڑھ پر سے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"[illegible] ایسا کرنا اچھا نہیں" رحیمہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "[illegible] گی [illegible] میں [illegible] سے [illegible] ملنے ہیں [illegible]

"[illegible] ذرا [illegible] سمجھیں [illegible] بیقرار ہو [illegible]"

"[illegible]"

"کیا [illegible]"

"پھر [illegible] پیام [illegible] نہیں [illegible]"

"[illegible] تمہاری اماں کو بلوا کر [illegible] کہلوا [illegible]"

"[illegible] جانے کیا بات ہے [illegible] نہیں آتا"

"[illegible]"

[illegible] کہ میں ایک [illegible] کی بیٹی ٹھہری [illegible] شادی [illegible] نکالے [illegible] باتیں [illegible]

"خاموش [illegible]" اس [illegible] اس کے منہ پر ہاتھ [illegible] تم سے شادی [illegible]

خاطر ہی کنوارا بیٹھا ہوں، سمجھیں۔ ورنہ کبھی کے شادی ہو چکی ہوتی۔ ہزار وقت کہہ چکا ہوں کہ محبت میں امیری غریبی کوئی چیز نہیں لیکن تم وہی رونا لے بیٹھی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دماغ میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔"

"اچھا میں اب جاتی ہوں۔" رحیمہ کو سرفراز کی تھوڑی تسلیوں نے کچھ ڈھارس بندھائی۔ "چھوڑ دو ہاتھ"

"اتنا جلدی چلی جاؤ گی!" سرفراز نے پیار بھرے انداز میں کہا۔ "جاؤ، نہیں چھوڑتا ہاتھ۔"

"اچھا جلدی سے بولو اور کیا بولنا ہے۔" وہ عاشق کا دل بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

"ادھر آ جاؤ نا!" سرفراز نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انگلیوں کو آہستہ دبایا۔

"نہیں نہیں اب نہیں آتی۔ کہیں ماں جاگ جائے گی تو مصیبت ہو جائے گی۔ چھوڑ دو ہاتھ۔"

"بس ایک بار آ جاؤ۔" بڑے التجا آمیز لہجے میں سرفراز نے کہا۔ "پھر نہیں بلاؤں گا تم کو اور جلد ہی شادی کر لوں گا۔"

"توبہ! تم بہت برے آدمی ہو۔" اس نے مجبور ہو کر کہا "اچھا ہاتھ تو چھوڑو، ذرا ماں کو دیکھ آتی ہوں، کہیں وہ جاگ تو نہیں پڑی ہے۔"

ہاتھ چھوٹنے پر وہ دبے پاؤں گئی اور پھر دوسرے منٹ واپس آ گئی۔

"کیا سو رہی ہے ماں؟" سرفراز نے اس کے واپس ہوتے ہی پوچھا۔

"ہاں" ساتھ ہی وہ نیچے بیٹھ گئی اور بیلوں کے تخنی پودوں کو ہٹا کر نیچے باڑھ توڑ کر بنائے ہوئے راستے سے ادھر آ گئی اور کھڑے ہو کر سر اور بالوں کو لگے سوکھے پتے وغیرہ صاف کیا۔ آہستہ سے سرفراز نے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے اور اندر سے کنڈی لگ گئی۔

ادھر پانچ چھ نوجوان جو دوسری باڑھ کے پیچھے پودوں

میں دبکے سب کچھ سن رہے تھے، آہستہ سے اٹھے اور ایک ایک کر گاؤں کے ایک ایک آدمی کو جمع کرنا شروع کیا۔ پھر تین چار منٹ میں ہی تقریباً نصف گاؤں وہاں جمع ہو گیا اور لوگ اس چھوٹے سے گھاس کے مکان کو چاروں طرف سے گھیر کر اس طرح دم سادھے تصویر کی مانند خاموش دروازہ کھلنے کے منتظر کھڑے رہے۔ جس طرح شکار کو دام کی طرف آتے دیکھ کر شکاری مہر سکوت لگائے اس کا شکار کے زیر دام ہونے کا منتظر رہتا ہے۔

کرشمۂ قدرت دیکھئے کہ اسی دم ایک ناگ سانپ چوہے کی تلاش میں ان کے قریب ہی دیوار پر سے نیچے اترنے لگا۔ چوہوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ شبہ پر سرفراز نے فوراً ٹارچ ڈالی "سانپ ...... سانپ" ساتھ ہی رحیمہ کی چیخ حلق میں اٹک گئی۔ سرفراز ہنستا تھا۔ دونوں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل پڑے۔ جیسے ہی وہ نکلے تمام مجمع نے ان کو گھیر کر اپنے حلقے میں لے لیا۔ اپنے آپ کو مجمع میں گھرا دیکھ کر دونوں ایک دم سرد ہو گئے۔ جسم کاٹو تو ایک قطرہ خون نہ نکلے اور ساتھ ہی پسینے شروع ہو گئے۔ یک نہ شد دو شد کا مضمون تھا۔ ادھر معلوم ہونے پر دو چار نوجوان لاٹھیاں لئے سانپ کو مارنے کمرے میں گھسے۔ ایک منٹ تک تو مجمع خاموش کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔

"سرکار یہ کیا کیا آپ نے" ایک بوڑھے نے مہر سکوت توڑا۔

"کیا ہم غریبوں کی عزت نہیں ہوتی مالک؟" دوسرے نے زبان کھولی۔

"آپ گاؤں کے زمیندار ہیں، تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ خود گاؤں کی اصلاح کرتا تھا۔ اس کے بجائے آپ کے یہ کام! بہت افسوس کا مقام ہے۔" گاؤں کے اسکول ماسٹر نے کہا۔ "بتائیے اب اس لڑکی کا کیا ہوگا۔ کیا آپ اس سے شادی کریں گے؟"

"نہ کئے تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔" گرام پنچایت کے صدر نے کہا۔ "آخر بدنام ہوئے اول بدنام ہوئے اب نہیں ڈریں گے ہم۔"

"کاکا" رحیمہ کا ماموں زاد بھائی و شادی کا امیدوار بولا: "اگر حکم ہو تو ابھی مزہ چکھا دیں مالک صاب کو۔"

"ہاں کاکا" دوسرے نوجوان نے تائید کی۔ "ہم سب کا ایک ایک ہاتھ کافی ہے سرکار کو۔"

اور دانت پیستے ہوئے سب اپنی اپنی لاٹھی پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

سرفراز جو آج تک شیر کی طرح گاؤں میں رہتا تھا، بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔ کوشش کے باوجود نظر نہیں اٹھ رہی تھی۔ چٹان کے جیسا عزم رکھنے والا شخص آج بزدل بنا کھڑا تھا۔ اور بزدلی بھی ایسا کہ ایک بچہ اس پر رعب جما دے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ شادی سے انکار کر دے تو سب ملکر اس پر حملہ آور الگ ہوں گے پھر پولیس میں بھی رپورٹ کر دیں گے۔ اور انکار کی صورت میں یقیناً رحیمہ بھی اس کے خلاف ہی بیان دے گی پھر تو اور برا انجام ہوگا۔ اب تو بہت برے پھنسے سرفراز! سچ ہے برائی کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے۔

"یہ ایسا نہیں مانیں گے" گرام پنچایت کے صدر نے رحیمہ کے دو عزیزوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "تم لوگ ابھی پولیس تھانے کو لے کر جاؤ۔ پولیس تھانہ میں رپورٹ کر دو اور صبح تک انسپکٹر صاحب کو لے کر آ جاؤ۔"

"نہیں نہیں ایسا کیوں کرتے ہو۔" سرفراز نے اپنا انجام سوچ کر بمشکل نظریں اٹھا کر کہا۔ "میں رحیمہ سے شادی کرنے تیار ہوں۔"

"تو صبح میں نکاح ہوگا" سب نے ایک زبان ہو کر کہا "اس پر راضی ہو۔"

"ہاں صبح میں نکاح کر لوں گا۔" سرفراز نے حالات دیکھ کر اپنا پہلو بدل دیا۔

"اور اس وقت رحیمہ تمہارے ہی گھر میں رہے گی" رحیمہ کے ماموں نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" سرفراز کو یہ شرط بھی منظور کرلینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

"اب تو ہمارے کسی کام کی نہیں رہی" رحیمہ کے ماموں نے اس سے کہا۔ "اب تو ہمیشہ زمیندار ہی کے گھر رہنا۔ اگر ہمارے گھر میں قدم رکھا تو ٹانگ توڑ دوں گا تیری۔"

اور سارے گاؤں والے مل کر ایک برات کی شکل میں اس نو انکشاف جوڑے کو درمیان میں لے کر زمیندار کے بنگلہ کی طرف فاتحانہ انداز سے چلے اور دونوں کو اچھی طرح مکان میں پہنچا کر باہر نکل آئے اور فوری فیصلہ کیا گیا کہ پچیس نوجوان لاٹھیوں کے ساتھ پٹہ دار کے گھر کا رات بھر محاصرہ کئے ہوئے رہیں اور کڑی نگرانی رکھیں کہ وہ کہیں فرار نہ ہونے پائے اور دو نوجوانوں کو پنڈی دے کر شہر گاؤں بھیج دیا جائے تاکہ علی الصبح قاضی صاحب کو لے کر یہاں پہنچ جائیں اور جلد از جلد نکاح ہو جائے۔ باقی لوگ ابھی سے ضروری کارروائی میں مصروف ہو جائیں۔

فوراً اس پروگرام پر پورا پورا عمل کیا گیا۔ پچیس نوجوانوں نے جان کی بازی لگا کر نگرانی کرنے کے عہد سے پٹہ دار کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ دو نوجوان پنڈی جوت کر قاضی کو لانے چلے۔ باقی لوگ نکاح کے ضروری کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ سارے گاؤں میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا۔ گاؤں کا ہر شخص اس کام میں ہاتھ بٹانے لگا۔ خاصی چہل پہل ہو گئی۔ قندیلیں گھومنے لگیں۔ ڈھولکیاں بجنے لگیں۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ دیوالی کی رات آگئی ہے۔ اور صبح کو نکاح کے انتظار میں [illegible] ہو گئے۔

ٹھیک رات کے دو بجے سرفراز کی ماں نے رحیمہ کی ماں کو بلوا بھیجا۔ عورت ہوشیار تھی۔ دو چار بڑی بوڑھیوں کو ساتھ لے کر پہنچی۔ پہلی بات تو خاطر تواضع کے ساتھ پان دان کھلانے کے بعد سرفراز کی ماں نے کہا

"دیکھو رحیمن! آج میں مانتی ہوں کہ سرفراز بیٹا ایسا [illegible] غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن اتنا غور کرو کہ رحیمہ اب [illegible]

خاندانوں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ تم خود جانتی ہو کہ اس کے باپ نہ صرف بڑے زمیندار ہی تھے بلکہ مہتمم پولیس بھی تھے اور ہمارے سارے رشتہ دار بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور چند اب بھی ہیں۔ تمہاری لڑکی سے شادی کرنے سے اور تو کچھ نہیں ہوگا لیکن خاندان میں ہمارا مرتبہ گھٹ جائے گا۔ اور ہم کو وہ لوگ نیچی نظروں سے دیکھیں گے۔ اس لئے میرے بیٹے سے جو غلطی ہو گئی ہے اس کے معاوضہ میں تمہاری لڑکی کے نام پر دو ہزار کا نمبر کروا دیتی ہوں۔ تم لوگ ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔"

کریمن کی نظروں میں تو کل اس کی بیٹی سارے گاؤں کی مالکن بن رہی تھی۔ بھلا اس کو کب یہ شرط منظور ہوتی کہ دو ہزار کا نمبر لے کر علیحدہ ہو جائے۔ پھر بدنامی کا دھبہ بھی بیٹھا رہتا۔ فوراً بولی "مالکن میں کب چاہتی تھی کہ سرفراز میاں میری لڑکی سے شادی کریں۔ لیکن جب خود انھوں نے ایسا کام کر دیا کہ جس کی وجہ سے دونوں کی شادی ضروری ہے تو اب ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔ ہم غریب ہیں تو کیا ہوا آخر ہماری بھی تو کوئی عزت ہے۔ آپ ہی بتلائیے ہماری تو عزت چلی گئی ہے اگر آپ دو ہزار کا نہیں دس ہزار کا نمبر بھی دیں تو کیا واپس آسکتی ہے؟ اس لئے سوائے شادی کے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔" [illegible] واپس ہو گئی۔ بیچاری سرفراز کی ماں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

صبح ہوتے ہوتے عورتوں نے زمیندار کے گھر میں پہنچ کر رحیمہ کو نہلا دھلا کر جو کچھ بھی کپڑے تھے پہنا کر دلہن بنا دیا۔ ادھر مردانے میں مردوں نے سرفراز کو مجبور کرکے دولہا بنا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اپنی خشخشی داڑھی لئے قاضی صاحب بھی آپہنچے۔ اسکول ماسٹر، پولیس پٹیل، لڑکی کا ماموں وکیل و گواہ بنے اور ایک گھنٹہ کے اندر اندر قاضی صاحب نے نکاح پڑھا دیا۔ جیسے ہی نکاح کی رسم انجام پائی گاؤں کے سارے باجوں نے مل کر شادیانے بجائے۔ نوجوان لڑکیوں نے ڈھولک پر بیاہ کے گیت گائے۔ بنجارنوں نے اپنا ناچ دکھایا اور چند شوخ و شنگ طبیعت رکھنے والوں نے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک دوسرے پر رنگ چھڑک کر اس خوشی پر مزید اضافہ کر دیا اور شام ہوتے ہوتے یہ دھوم دھام اختتام کو پہنچی۔

آج اس واقعہ کو ہوئے دو سال گذر چکے ہیں۔ اب رحیمہ کی گود میں ایک ننھا منا خوبصورت بچہ بھی کھیلتا ہے جسے دادی اماں بڑے پیار سے اپنی گود میں بٹھایا کرتی ہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس تاریخ سے آج تک سرفراز کو کسی نے کسی لڑکی سے آنکھ لڑاتے یا اس کو چھیڑتے نہیں دیکھا اور نہ کوئی ایسی افواہ ہی سنی گئی۔ اب عالم یہ ہے کہ سرفراز صاحب نہایت شریفانہ طریقہ سے اپنی زمینداری و کاشتکاری کے کاروبار چلاتے ہیں اور جب راہ چلتے ہیں تو ان کی نظر کسی عورت پر نہیں اٹھتی۔

**مضمون نگار اصحاب** سے گذارش کی جاتی ہے کہ از راہ کرم مضامین صاف خط میں ارسال فرمائیں۔

ادارہ

# تبصرے

ادارہ

**تاریخ گولکنڈہ (انگریزی میں)** از پروفیسر عبدالمجید صدیقی

پروفیسر صدیقی نے دکن سے متعلق مختلف موضوعوں پر اب تک بیسیوں تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھیں اور شائع کی ہیں۔ اور یہ اب تک زیادہ تر اردو میں تھیں۔ چنانچہ تاریخ دکن عہد وسطیٰ، مقدمہ تاریخ دکن، تاریخ گولکنڈہ، اعظم الامرا ارسطو جاہ، تاریخ سیاسیات جیسی ان کی متعدد کتابیں ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہیں۔ تاریخ گولکنڈہ آج سے سترہ سال قبل ۱۹۳۹ء میں ادارہ ہی کی طرف سے چھپی تھی اور اس میں بعض نادر تصویریں بھی شریک تھیں۔ اس کتاب کی اشاعت کا یہ اثر ہوا کہ اس کے بعد سے اب تک گولکنڈے کی سلطنت اور قطب شاہی بادشاہوں کی نسبت متعدد قلمی کتابیں اور مضامین منظر عام پر آئے اور لوگوں کو اس سلطنت کی تاریخ کی چھان بین اور مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ اور نواب سالار جنگ نے اس کام میں ہماری بڑی مدد اور سرپرستی کی

یہ اردو کتاب جلد ہی فروخت ہو گئی اور پروفیسر صدیقی سے خواہش کی گئی کہ دوسرے ایڈیشن کے لئے اس جدید معلومات کے پیش نظر نظر ثانی فرما دیں۔ صدیقی صاحب نے اپنی مصروفیتوں کے باعث اس نظر ثانی میں دیر لگا دی۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب اس کا انگریزی ایڈیشن شائع کیا ہے۔

انگریزی تاریخ گولکنڈہ کی ترتیب بالعموم وہی ہے جو اردو ایڈیشن کی تھی۔ یہ (۲۲) ابواب اور (۵) حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تین ابواب میں سلطنت کی بنیاد سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصہ میں بھی تین باب ہیں جن میں سلطنت اور اس کے استحکام کی وضاحت کی ہے۔ تیسرا حصہ سلطنت کے عروج دور کے لئے وقف کیا ہے اور چوتھے میں سیاسی انحطاط اور زوال گولکنڈہ کے اسباب سے بحث کی ہے۔ پانچواں حصہ بہت اہم ہے۔ اس میں ایک باب سوشل اور پولیٹیکل ارتقاء پر، ایک باب اقتصادی حالات اور ایک باب علم و فن کی سرپرستی کے لئے وقف کیا ہے۔ آخری باب میں فن تعمیر کی تفصیلات دی ہیں۔

خاتمہ پر دو ضمیمے بھی ہیں جن میں سے ایک میں قطب شاہی سلاطین کا سلسلہ نسب درج کیا گیا ہے اور دوسرے میں ان پچاس انگریزی، فارسی، اردو اور تلگو کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے اس کتاب کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔ اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صدیقی نے ممکنہ ذرائع سے استفادہ کی کوشش کی ہے۔ ابتداء میں (۷) صفحات کا ایک دیباچہ ہے جس میں آندھرا ملک، اس کی خصوصیات، اس کی تہذیب و تمدن اور دیگر امور کو واضح کیا گیا ہے۔

عبدالمجید صدیقی صاحب کو اس ملک سے دلی محبت ہے اور ان کا نقطہ نظر ایک محب وطن کا نقطہ نظر ہے۔ وہ ان مورخوں میں نہیں ہیں جو کسی ملک کی تاریخ ایک بیرونی یا خارجی نظر سے لکھتے ہیں۔ وہ اس ملک کی مٹی سے ابھرے ہیں اور اس کی ہر خصوصیت سے محبت کرتے ہیں اور اس کی مدافعت کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ اہل دکن کی کمزوریوں سے بھی واقف

ہیں اور تاریخ گولکنڈہ میں جب کبھی ایسے مواقع آئے ہیں وہ ایک درد مند دل کے ساتھ ان کمزوریوں کی طرف بھی صاف صاف اشارہ کر دیتے ہیں۔ وہ طنز و تشنیع سے کام نہیں لیتے بلکہ ایسا اسلوب بیان اختیار کرتے ہیں جس سے ان کے اہل ملک اپنی کمزوریوں سے واقف ہو کر اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔

**فردوس** | مجموعۂ کلام ماہر القادری صاحب۔ ایڈیٹر ماہنامہ "فاران" کراچی۔ قیمت تین روپے۔

جناب ماہر القادری صاحب اردو کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے مثلاً محسوسات ماہر، نغمات ماہر، جذبات ماہر اور ذکر جمیل وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "نگینے" اور ایک طنزیہ مزاحیہ ناول "کامریڈ جی داس" بھی چھپ چکا ہے۔ حضرت سرور کائنات کی سیرت "درِ یتیم" ناول کے انداز میں چھپی ہے اور ابھی ابھی سفر حجاز کے تاثرات "کاروان حجاز" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اب یہ مجموعہ فردوس چھپا ہے جس میں ماہر صاحب کی دونوں قسم یعنی اسلامی و اصلاحی اور عشقیہ و رنگین نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ یہ مجموعہ اس قابل ہے کہ جدید اردو شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے اس کے مطالعے سے ضرور لطف اندوز ہوں گے۔

**ذوقِ جنوں** | مجموعہ کلام پروفیسر آل احمد صاحب سرور۔ ناشر ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

سرور صاحب نہ صرف اردو کے پروفیسر، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری، اردو کے بہترین نقاد اور ادیب ہی ہیں بلکہ ایک جدید طرز کے شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک مجموعۂ کلام سالہا سال قبل شائع ہوا تھا لیکن زیر نظر مجموعہ ذوق جنوں میں ان کی شاعری کی اعلیٰ قدروں کو بخوبی واضح کر دیا ہے۔ اس کو انھوں نے وادیٔ گنگ و جمن کے نام منسوب کیا ہے اور اس میں بعض نظمیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کو اپنے وطن سے کتنی محبت ہے۔ ڈھاکہ سے ایک دوست کے بلاوے کے جواب میں انھوں نے جو نظم لکھی ہے اس میں ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے جواب دیا ہے۔ اس کا آخری شعر ہے ؎

ساحل کے سکوں سے کسے انکار ہے لیکن  طوفانوں سے لڑنے میں مزا اور ہی کچھ ہے

اس طرح انھوں نے ہندی والوں کو مخاطب کر کے جو نظم لکھی ہے وہ بھی اردو والوں اور خود ہندی والوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اسی طرح ایک نظم عزم کوہ کنی اردو کی حمایت میں بہت ہی پر اثر لکھی ہے۔

**اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ (حصہ دوم)** | از عبدالشکور صاحب۔ اسلامیہ کالج اٹاوہ۔ مطبوعہ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔

اس کتاب میں شکور صاحب نے دراصل عہد جدید کے (۲۴) تنقید نگاروں پر مضمون لکھے ہیں۔ برج موہن دتاتریہ کیفی سے محمد احسن فاروقی تک کے متعدد مضمون نگاروں پر مضامین لکھے ہیں جن میں سے بعض تنقیدی سے زیادہ تحقیقی بن گئے ہیں۔ انھوں نے تنقیدی خصوصیات کے پیش نظر تنقید نگاروں پر تبصرہ نہیں کیا اور نہ جدید رجحانات کے پیش نظر ان کو اپنے نقطۂ خیال کے مطابق واضح کیا۔ اس طویل فہرست میں تعجب ہے کہ دکن کے موجودہ تنقید نگاروں کے نام شامل نہیں ہیں حالانکہ ان میں سے کئی ایسے ہیں جو تمام اردو دنیا میں روشناس ہیں۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور دلکش ہے۔

**پلاننگ پر ایک تنقیدی نظر** | از عظمت اللہ خاں صاحب ایم۔ اے۔ ناشر مکتبۂ سبیل نو۔ آغا پورہ۔ حیدرآباد۔

حکومت ہند نے پلاننگ کے جو دو منصوبے شائع کئے ہیں اور اس کے بارے میں جو مختلف کتابچے اور اطلاع نامے چھپوائے ہیں ان سے ان منصوبوں کے بارے میں سرکاری اور یکطرفہ معلومات بہم پہنچی ہیں۔ ضرورت تھی کہ ملک کا تعلیمیافتہ اور صاحب نظر طبقہ بھی ان پر تنقیدی نظر ڈالے۔ خوشی کی بات ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک فیض یافتہ نے اس موضوع پر ایک عمدہ تنقیدی کتاب لکھی ہے جس میں انھوں نے پہلے یہ سمجھایا ہے کہ پلاننگ کیا ہے اور اس کے لوازمات کیا ہوتے ہیں۔ دوسرے باب میں پلاننگ کے معاشی نقصانات واضح کئے ہیں۔ پھر سرمایہ دارانہ معیشت اور عوامی نتائج

Regd. No. H. 629